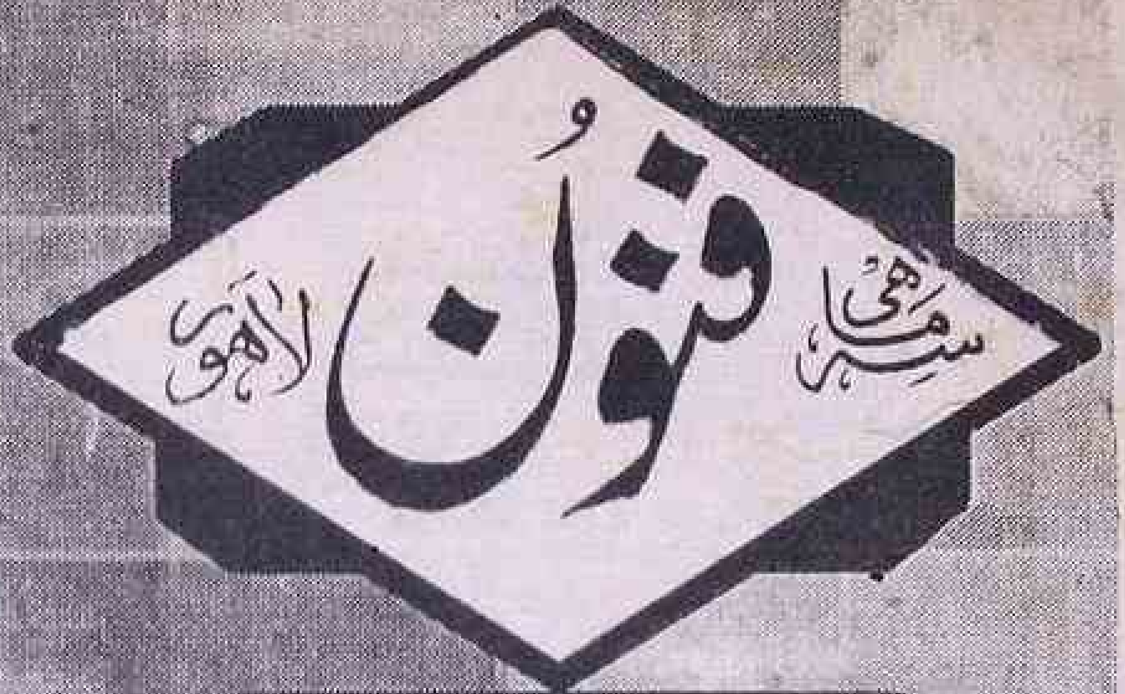

فنون
HaSnain Sialvi



رجسٹرڈ ایل نمبر: ۷۵۷۹، فون: ۶۳۱۵۷۶۳

مدیر

احمد ندیم قاسمی

مدیر منتظم: منصور احمد

تزئین: مُوجد

شمارہ نمبر ۴۲-۴۳

مئی تا اکتوبر ۱۹۹۴ء

دستی ۲۰۰/- روپے، رجسٹری ۲۵۰/- روپے

تازہ شمارہ ——— ۷۵/- روپے

شمالی امریکہ، کینیڈا، یورپ، مشرق وسطیٰ ۱۵۰۰/- روپے

بھارت، چین، جاپان ۱۰۰۰/- روپے

مقام اشاعت

۴۵- اے مزنگ روڈ، لاہور پاکستان

مندرجات

افسانے

طویل مختصر افسانہ

سفرنامہ

نثر پارے

انشائیے

غزلیں

اختلافات

سرورق ——— موجد

HaSnain Sialvi

حرفِ اوّل

ندیم

پاکستان میں اسلامی تہذیب کی کارفرمائی کے متعلق گزشتہ بینتالیس برس سے ایک بحث جاری ہے۔ اس بحث میں بڑے بڑے اہلِ علم اور اہل الرائے نے حصہ لیا ہے مگر ایک تخلیقی فن کار اس بارے میں کیا سوچتا ہے اس کی تفصیل قارئین کرام کو درج ذیل سطور میں ملے گی۔

بنیادی عقاید اسلامی تہذیب کا محور اسلام کے بنیادی عقاید ہیں۔ ان عقاید میں توحید کا عقیدہ وہ مرکزی نقطہ ہے جس کے گرد دوسرے عقاید دائرے بناتے ہوئے گھومتے ہیں۔ دائرے کا لفظ میں نے قصداً استعمال کیا ہے کہ مرکزی نقطے سے دائرے کے خط کا فاصلہ، ہر مقام سے، برابر ہوتا ہے۔ خدا کی وحدانیت کا عقیدہ ہمیں غیر اللہ کے خوف سے محفوظ کر دیتا ہے چنانچہ ہماری سیدھی سادی، سچی، کھری، جری، پختہ اور بے نیاز شخصیت کی صورت پذیری بھی اس توحید کے عقیدے سے ہوتی ہے اور یہی عناصر افراد اور قوموں اور ملتوں کی تہذیبی شخصیت مرتب کرتے ہیں۔ حضرت محمد صلی اللہ علیہ وسلم کی ختم المرسلینی کا عقیدہ اس شخصیت کو مزید قوت وصلابت بخشتا ہے۔ ان عقاید میں کوئی پیچیدگی نہیں، کوئی دھندلاہٹ نہیں، کوئی "پُراسراریت" نہیں، ان کی توانائی ان کی سادگی میں ہے۔ اسلام صرف عربوں یا صرف عجمیوں یا صرف مشرق کا دین نہیں۔ ایک حدیث ہے کہ پوری دنیا ایک مسجد ہے۔ اس سے اسلام کی عالمگیری اور ہمہ گیری کا اندازہ ہوتا ہے۔ اسلام کی یہ صفت بھی اسلام کی ایک بنیادی تہذیبی قدر ہے۔

مساوات و اخوت توحید و رسالت کے علاوہ مساوات و اخوت اسلامی تہذیب کی ایک اور قدر ہے۔ اسلام میں نہ رنگ و نسل کا کوئی امتیاز ہے اور نہ ذات پات کی کوئی تفریق۔ اگر کوئی امتیاز ہے تو اس ارشادِ گرامی کے حوالے سے ہے کہ "ان اکرمکم عند اللہ اتقٰکم"۔ اللہ کے نزدیک مستحقِ عزت وہ ہے جو متقی ہے اور خدا ترس ہے۔ آغازِ اسلام میں مساوات و اخوت کی اس تہذیبی قدر کی متعدد مثالیں ہم تک پہنچی ہیں۔ ایک منور مثال وہ ہے جس میں اخوت و مساوات نے ہجرت نبوی کے بعد مدینہ میں مہاجرین و انصار کے حیرت انگیز بھائی چارے میں اظہار پایا اور یوں عقیدے نے عمل کی صورت اختیار کی اور عقیدے صرف یقین کرنے یا تبلیغ کرنے کی چیز نہیں ہوتے، عمل کرنے کے لیے ہوتے ہیں۔ اسلام کی انصاف پروری اور عدل گستری اس کی ایک اور تہذیبی قوت ہے، مگر یاد رہے کہ یہ انصاف معاشرتی بھی ہے اور یہ عدل معیشتی بھی ہے۔ اسلام نے انصاف کو اس قدر اہمیت دی ہے کہ اس نے دین تک میں جبر و اکراہ کی شدید ممانعت کی ہے۔ اسلام کا یہ معیارِ انصاف کسی دنیوی شان و حشمت سے متاثر یا مرعوب نہیں ہوا۔ اخلاقِ حسنہ اسلام کی ایک اور توانائی ہے جس نے ایک عالمگیر جذبۂ اخوت کی صورت میں اسلامی تہذیب کی نوک پلک سنواری ہے۔ اس اخلاق میں اس حسن و خیر

کی دیگر بے شمار خوب صورتیوں کے علاوہ معاف کرنے ــــ درگزر کر دینے کی اخلاقی خوب صورتی نے آغازِ اسلام میں ایک دنیا کو موہ لیا تھا۔

تہذیب کی باطنی قوت

اختصار کی خاطر اسلامی عقاید و اخلاقیات کے صرف ان چند نکات پر اکتفا کرتے ہوئے، میں یہ عرض کرنا چاہوں گا کہ اگرچہ بعد میں اسلامی تہذیب کی صورت پذیری میں ملوکیت اور ملّائیت حائل ہوگئیں اور انھوں نے اس تہذیب کی جزئیات و تفاصیل منفی طور پر بدل کر رکھ دیں مگر حضور صلی اللہ علیہ وسلم اور خلفائے راشدین کے دورِ مبارک میں اسلامی تہذیب کی جو بنیادیں رکھی گئی تھیں انھیں کوئی بڑے سے بڑا جابر بھی نقصان نہ پہنچا سکا۔ دراصل تہذیب کوئی ٹھوس چیز نہیں ہوتی، نہ اس کے مظاہر براہ راست دکھائی دیتے ہیں بلکہ تہذیب کسی قوم کے عادات و خصائل اور اس کے تمدن میں منعکس ہوتی ہے۔ تہذیب ایک ذہنی کیفیت کا نام ہے۔ یہ ظاہر سے نہیں باطن سے متاثر کرتی ہے۔ اسلامی تہذیب کی اس باطنی؛ اس روحانی قوت کا اعتراف کرتے ہوئے پروفیسر ٹی ڈبلیو آرنلڈ نے THE PREACHING OF ISLAM میں کہا ہے۔ اور یہ ترجمہ ڈاکٹر شیخ عنایت اللہ کا ہے:

"یہ امر قابلِ غور ہے کہ اسلام نے اپنے سیاسی زوال و انحطاط کے زمانے میں بعض نہایت شاندار روحانی فتوحات حاصل کی ہیں۔ مثلاً اسلام کی تاریخ میں دو موقعے ایسے آئے ہیں جبکہ وحشی کفار نے مسلمانوں کو سختی کے ساتھ پامال کیا۔ مثلاً سلجوقی ترکوں نے گیارھویں صدی عیسوی اور تاتاریوں نے تیرھویں صدی عیسوی میں۔ مگر ان دونوں موقعوں پر فاتحین نے اُس قوم کا مذہب اختیار کر لیا جس کو انھوں نے مغلوب کیا تھا۔"

اسلامی تہذیب کا نچوڑ

علامہ اقبال نے دوسرے بے شمار مقامات کے علاوہ اپنی ایک نظم "مدنیتِ اسلام" میں اسلامی تہذیب کا نچوڑ پیش کر دیا ہے۔ انھوں نے مسلمانوں کی زندگی کو ــــ یعنی اس کے تہذیبی اور تمدنی انعکاس کو "نہایتِ اندیشہ اور کمالِ جنوں" قرار دینے کے بعد فرمایا ہے کہ نہ وہ حیا سے بیزار ہے، نہ وہ عہدِ کہن کے افسانہ و فسوں سے متاثر ہے۔ اس کی اساس حقائقِ ابدی پر ہے اور اس کے عناصر میں روح القدس کا ذوقِ جمال اور عجم کا حسنِ طبیعت اور عرب کا سوزِ دروں شامل ہیں۔ یہ الگ بات ہے کہ بعد میں مدنیتِ اسلام کے اس پاکیزہ تصور میں سے حسن و جمال کے الفاظ کو غیر اخلاقی قرار دے کر انھیں اور ان کے مفاہیم کو ایک طرح سے خارج کر دیا گیا مگر اسلامی تہذیب کے حقیقی خد و خال یہی ہیں۔ قرآن حکیم میں عقل و استدلال اور تجربہ و مشاہدہ سے بصیرت حاصل کرنے کے احکام کے حوالے سے اسلام کو بجا طور پر روشن خیالی کا مذہب قرار دیا گیا ہے جو انسان کی روحانیت اور مادیت دونوں کے تقاضے بیک وقت پورے کرتا ہے۔ اس لیے اسلامی تہذیب کے مؤرخین نے بھی اعتراف کیا ہے کہ جب عقیدہ یقین سے گزر کر عمل کی صورت اختیار کرتا ہے تو وہ تہذیبی قدر بن جاتا ہے۔ یہی تہذیبی اقدار کرۂ ارض کے جس حصے میں بھی جاتی ہیں ان میں وہاں کی نسلی اور علاقائی روایات یوں تحلیل ہو جاتی ہیں کہ اس تہذیب کا ایک ناگزیر حصہ معلوم ہونے لگتی ہیں۔ مراکش سے لے کر انڈونیشیا تک یہ جو اسلامی تہذیب کے مختلف مظاہر نظر آتے ہیں، وہ اس اصولِ قدرت کی کارفرمائی ہیں۔ چنانچہ اسلامی تہذیب کے حوالے سے انھیں مختلف مظاہر کی بجائے متنوع مظاہر کہنا چاہیے۔

انتشار و خلفشار

اتنی بڑی ــــ اتنی عالمگیر تہذیب اُس وقت انتشار و خلفشار کی نذر ہونے لگی جب مسلمانوں نے عقل و دانش سے دست کشی اختیار کر لی اور اس لیے بعد میں جب مغرب، ہم سے سیکھے ہوئے علوم کے سبھی امکانات پر چھا گیا تو ہم نے علوم کی ان نئی ہیئتوں سے نہ صرف اجتناب کیا بلکہ ان سے نفرت کی۔ ہم جدید علوم اور تہذیبی روایات کے درمیان رابطے کا کوئی امکان

تلاش نہ کرسکے اور ایک خلا میں معلق ہو گئے۔ ہمارے آس پاس تمدن بدلنے لگا مگر ہم اپنی تہذیب اور اس کے بدلتے ہوئے تمدن کے ملاپ یا رابطے کی کوئی راہ تلاش نہ کر سکے۔ ہمارے دینی عقاید تو آسان اور سادے اور عقل و فطرت کے مطابق تھے مگر آخر کیا وجہ تھی کہ ہم نے اپنی تہذیب کو اس نے تمدن کا ہمانہ بنایا جو غلطی ہم نے صدی ڈیڑھ صدی پہلے کی تھی اس پر آج بھی بضد معلوم ہوتے ہیں۔ قیام پاکستان کے بعد ہمیں ایک ایسا خطۂ ارض میسر آگیا تھا جس میں ہم اسلامی تہذیب اور جدید علوم کی وجہ سے صورت پذیر ہوتے ہوئے تمدن کے ارتباط و اختلاط کی ایک جنت تعمیر کر سکتے تھے مگر خدا کی وحدانیت کے پرستار رہنے کے باوجود ہم غیر اللہ کے خوف سے بے نیاز نہ رہ سکے۔ اس لیے ہماری شخصیت مستحکم اور مستغنی نہ ہو سکی۔

اب ہم اور اپنے آپ سے چند سوال

اپنی طرف سے کچھ عرض کرنے کی بجائے مجھے پاکستان میں اسلامی تہذیب کی صورت حال کے بارے میں آپ سے اور خود اپنے آپ سے بھی چند سوال پوچھنے کی اجازت دیجئے۔

— کیا ہم نے اپنے دین کو کھرا اور سادہ اور غیر پیچیدہ رہنے دیا ہے؟

— کہیں ہم نے اسے دھندلا اور پُر اسرار تو نہیں بنا دیا؟

— کہیں ہم نے اصلی اور نسلی مسلمانوں کی تفریق تو پیدا نہیں کر دی؟

— کیا ہم اپنے ایمان کے ساتھ کہہ سکتے ہیں کہ ہم اسلام کی معاشرتی اور معاشی مساوات و اخوت کے اصولوں پر عمل پیرا ہیں؟

— کیا ہم ذات پات اور برادری قبیلے کے امتیازات سے بلند ہو سکے ہیں؟

— کیا ہم منصف اور عادل ہیں؟

— کیا ہم دین میں جبر و اکراہ کی ممانعت کا احترام کرتے ہیں؟

— کیا ہم معاف کر سکتے ہیں؟

— کیا ہم میں درگزر کر دینے کا حوصلہ ہے؟

— کیا ہم برائی کے بدلے نیکی کا برتاؤ کر سکتے ہیں؟

— کیا ہم نے "ان الارض للہ" کے ارشاد کا عملاً احترام کیا ہے؟

— کیا ہم نے "قل العفو" کا کوئی عملی پیمانہ وضع کیا ہے؟

— اگر ان سب سوالوں کا جواب نفی میں ہے، اور یقیناً نفی ہی میں ہے تو کیا ہمارے تہذیبی نصب العین اور ہمارے عمل کے درمیان پہاڑ حائل نہیں ہو چکے ہیں؟

اجتہاد — اجتہاد

ہم نے پورے عالم اسلام کی طرح پاکستان میں بھی اسلامی تہذیب کے باطنی نظام اقدار کے ساتھ اچھا سلوک نہیں کیا، مگر اب بھی کچھ زیادہ نہیں بگڑا۔ اگر آج بھی ہم اپنے افکار و خیالات کو تخلیق و اجتہاد سے روشناس کرا دیں اور اس جرأتمندانہ اجتہاد کے ذریعے اسلامی تہذیب کو ایک جیتی جاگتی، سانس لیتی اور دھڑکتی ہوئی تہذیب بنا دیں جس کے باطن میں بڑی فراخی ہو اور جس کے ظاہر میں جلال و جمال برابر برابر تناسب سے جلوہ گر ہوں تو کوئی وجہ نہیں کہ پوری دنیا پاکستان کو اسلامی تہذیب کی تجسیم نہ کہنے لگے۔ اگر ہم سکڑے اور سمٹے ہوئے کرۂ ارض میں کارفرما تازہ دم اور تازہ کار عناصر کو محتسبانہ غصے میں آ کر ایک دم منسوخ و ممنوع قرار دینے کے بجائے انھیں اپنے دینی اصولوں کی کسوٹی پر پرکھ کر اپنانے کا عمل جاری کر دیں تو ہم اسلامی تہذیب کا صحیح معنوں میں احیا بھی کر سکیں گے اور ان غیر ملکی اثرات سے بھی محفوظ ہو جائیں گے جنھوں نے ہمیں بعض نئے آفاق تو یقیناً دکھائے مگر نقالی اور بے عملی اور بے ہنری سے بھی لاد دیا۔ ہمارے پاس اسلام اور قرآن اور حضور اکرمؐ کے ارشادات و اسوۂ حسنہ کی صورت میں اتنی بڑی دولت ہے کہ آج کے نہایت نامساعد اور تاریک حالات میں بھی ہمارے اندر خود اعتمادی کی مشعلیں روشن ہو سکتی ہیں۔

وفیات

اس دوران میں شعروادب اور تنقید و صحافت کی چار بڑی بڑی شخصیتیں ہم سے چھن گئیں۔ **رضا ہمدانی** ایک عمدہ شاعر اور عمدہ انسان تھے اور انھوں نے فارغ بخاری کی رفاقت میں اعلیٰ پشتو ادب کو اردو داں طبقے سے نہایت محنت کے ساتھ یوں متعارف کرایا کہ خوشحال خاں خٹک اور رحمان بابا کا ذکر اردو پڑھنے والوں کے ہاں نہایت اپنائیت کے ساتھ ہونے لگا۔ **نثار عثمانی** ایک بے بدل صحافی تھے۔ وہ ہمیشہ اعلیٰ صحافتی اصولوں پر عمل پیرا رہے اور بڑے بڑے آمروں کو برسرِ عام نہایت جرائت مندی کے ساتھ ٹوکا۔ وہ اس دور میں دیانت داری کی ایک روشن مثال تھے۔ **ڈاکٹر ابواللیث صدیقی** ایک معروف نقاد اور محقق تھے۔ قیامِ پاکستان کے بعد انھوں نے پنجاب یونیورسٹی میں اور اس کے بعد کراچی یونیورسٹی میں علم و ادب کے چراغ روشن کرنے کا سلسلہ جاری رکھا۔ اردو لغت کی ترتیب میں بھی ان کا وافر حصہ ہے۔ ان کی تصانیف اردو تنقید و تحقیق کا اہم اثاثہ ہیں۔ **پروفیسر منظور حسین شور** اردو شاعری کی اس جاندار روایت کے ایک وقیع نمائندے تھے جسے جوش ملیح آبادی نے اپنے کمالِ فن سے پروان چڑھایا تھا اور جس سے توانائیاں حاصل کرکے اردو کے متعدد شعرا نے الفاظ کی نئی جہات دریافت کرنے اور اظہار کے نئے سلیقوں سے کام لینے کا سلسلہ اب تک جاری رکھا ہوا ہے۔ پروفیسر شور ادب کے استاد تھے۔ اس سلسلے میں انھوں نے ملازمت کا بیشتر حصہ لائل پور (حال فیصل آباد) میں بسر کیا اور پنجاب میں ان کے شاگردوں اور عقیدت مندوں کا ایک بہت بڑا حلقہ وجود میں آگیا۔ ملازمت سے ریٹائر ہونے کے بعد وہ کراچی چلے گئے اور شاعری کا سلسلہ وہاں بھی جاری رکھا۔ ان کی شاعری مضبوط اور زندہ شاعری ہے۔ ادارۂ "فنون" ان معزز رفتگاں کے پس ماندگان سے دلی ہمدردی کا اظہار کرتا ہے۔

اشاعت میں تاخیر

"فنون" کے قارئین سے ہم معذرت خواہ ہیں کہ سہ ماہی ہونے کے باوجود "فنون" کے دو شماروں کی اشاعت میں طویل وقفے پیدا ہو جاتے ہیں۔ اس کا سبب حالات کا جبر ہے۔ "فنون" ۴۱ میں ہم نے محکمہ ڈاک کے اس جبر کا شکوہ کیا تھا جو ڈاک کی شرح میں ہوش رُبا اضافوں کی صورت میں ظاہر ہوا ہے۔ ریڈ فورڈ (انگلستان) کے معروف ہفت روزے "راوی" کے سوا کسی طرف سے بھی ہمارے احتجاج کی تائید نہیں ہوئی اور یوں ہمارا یہ شکوہ صدا بصحرا ثابت ہوا۔ کاغذ کی یہ چکرا دینے والی گرانی کا جبر الگ ہے۔ یاد ش بخیر ایک انجمن ادبی رسائل پاکستان ہوتی تھی جس کا آخری اجلاس ذوالفقار علی بھٹو مرحوم و مغفور کے دورِ حکومت میں لاہور میں منعقد ہوا تھا۔ اس سے پہلے کے اجلاس میں جو مطالبات اربابِ حکومت کی خدمت میں پیش کئے گئے تھے، ان کا ایک مختصر خلاصہ اس اجلاس میں بھی پیش کیا گیا مگر صدائے برنخاست۔ چنانچہ یہ انجمن اپنی موت مرگئی اور علم و ادب کے ایوان کھوکھلے نعروں سے ہمیشہ کی طرح گونجتے رہ گئے۔ اشاعت میں تاخیر کے متعدد اسباب میں سے نمایاں اسباب یہی ہیں۔ ہم قارئینِ "فنون" سے معذرت کے علاوہ یہ عرض بھی کریں گے کہ وہ اپنے اپنے حلقۂ اثر میں شعروادب کے شائقین کا سراغ لگا کر انھیں "فنون" اور دیگر معیاری ادبی رسائل کے خریدار بنائیں۔ یہ ادب کی بھی خدمت ہوگی اور ادبی رسائل کی بھی جو سلیقے اور باقاعدگی کے ساتھ یہ ادب آپ تک پہنچاتے ہیں۔ وقت ہم سے بہت آگے نکل گیا ہے اس لئے موجودہ شمارے کو ۴۲ - ۴۳ کا مشترک شمارہ قرار دیا گیا ہے کہ ہم وقت سے زیادہ ہی پیچھے نہ رہ جائیں۔

اعتذار

"فنون" ۴۱ کے صفحہ ۲۵۳ پر محب عارفی صاحب کے نام سے دو غزلیں درج ہیں ان میں سے پہلی غزل تو یقیناً محب صاحب کی ہے مگر دوسری غزل جناب حنیف اخگر ملیح آبادی (مقیم نیویارک) کی ہے۔ "فنون" اس فروگزاشت کے لئے معذرت طلب ہے۔

رضا ہمدانی

مناجات

منبر کا اوج دے نہ درِ شہر یار دے
دینا ہی ہے تو کشمکشِ گیر و دار دے

سُوکھے ہوئے نہال کو رنگِ بہار دے
مُجھ سرمہ در گلُو کو نوائے ہزار دے

صحرائے بے یقیں کو خضر آشنا بنا
ذرّے کے دل میں نیّرِ اعظم اُتار دے

فکرِ خودی سے دُور ہے دانشورِ جہاں
مجھکو فقیہہِ شہر کے دل میں اُتار دے

میں ساحلِ مُراد کا اُمّید وار ہوں
ڈوبے ہُوئے سفینے کو پھر سے اُبھار دے

میں ہوں اسیرِ شیشۂ ساعات، مثلِ گرد
میری فضا کو گردشِ لیل و نہار دے

دُھندلا گیا ہے گردِ کدُورت سے آئینہ
سطحِ سراب کو بھی کوئی آبشار دے

اس عصرِ کربلا میں رضاؔ، کیا ہے منفعل
حیدر نژاد کو، ہشرِ ذوالفقار دے

یزدانی جالندھری

حمدِ باری تعالےٰ

فرش تا عرش ترے حُسن کا جلوا دیکھا
کہیں پنہاں تجھے دیکھا کہیں پیدا دیکھا

ایک اک دل میں تری دید کی حسرت پائی
ایک اک آنکھ کو مشتاقِ تماشا دیکھا

قطرے قطرے میں ترے حُسن کا پرتو پایا
ذرّے ذرّے میں ترا نور جھلکتا دیکھا

لالہ و گُل میں مہک چاند ستاروں میں ضیا
تجھ کو ہر رنگ میں، ہر شے میں ہویدا دیکھا

ماورا ہے حدِ ادراک سے تیری ہستی
تجھ کو ہر سوچ کی پرواز سے بالا دیکھا

یہ ترا ہی کرم خاص ہے یزدانیؔ پر
اُس کو ہر حال میں مستغنیِ دنیا دیکھا

حفیظ تائب

اے سیّدِ ساداتؐ

بے رنگ سے دن رات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ
ناگفتنی حالات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ!
موسم ہے اُداسی کا مسلّط دل و جاں پر
بے برگ خیالات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ!
بے راہ روی، فتنۂ زر، تفرقہ بازی
درپے کئی خطرات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ!
اُمڈی ہوئی سب عالمِ اسلام کے سر پر
آفات و بلیّات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ!
آساں نہیں کچھ ملّتِ بیضا کا سنبھلنا
وہ کرب، وہ صدمات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ
یوں خونِ مسلماں سے ہیں تر ساری زمینیں
حیران سماوات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ
کشمیر ہو، صومالیہ یا بوسنیا ہو
اعدا کے کڑے ہات ہیں اے سیّدِ ساداتؐ!
آشوبِ زمانہ سے نمٹنے کے لیے ہم
محتاجِ عنایات ہیں، اے سیّدِ ساداتؐ

خالد احمد

نعتیہ

سُرخ ہوئے، پھر نورِ نمُو سے، پھُولوں کے رُخسار
عکسِ جمالِ یار سے ٹھہرا، ہر چہرہ گلنار

محملِ گُل سے پاؤں نکالا، رات کی رانی نے
رخنہ رخنہ رَچ رَچ اُتری دیواروں کے پار

قدم قدم خوشبو کے الاؤ پھر سے ہوئے روشن
گُل گھوڑوں پہ پھر سے لگے ہیں رنگوں کے انبار

اِک خوشبو سے مہک رہے ہیں آئینہ خانے
زینہ زینہ، نَس نَس اُتری چاہت کی مہکار

قصدِ مدح کئے بیٹھا ہے پھر خالد احمد
شانِ خدا، خوشبو کے کنگن ڈھالے گا لوہار

نطق کی ہر کونپل سے پھُوٹیں لَو بن کر افکار
رنگِ مثال بکھر، اے نافہ آہوئے تاتار

دوشِ سخن پر سیر کو نکلے، تتلی خوشبو کی
گنگ ہنر کے پیڑ پہ اُترے، سات سُروں کی ڈار

کون ہوا کے تار میں گوندھے بُوندیں پانی کی
کون گلوں کے زر سے کھینچے، مہکاروں کے تار

کِس کے عشق کا سُورج چمکا، کیسی رُت آئی
ایک ہی سمت اُڑے جاتی ہے، کونجوں کی ہر ڈار

مدح لکھوں میں کس کی خالد، کِس کی حمد کروں
رحمتِ دو عالم ہیں رحمتِ کُل کے آئینہ دار

کِس کی نکہتِ رنگ سے قریہ قریہ گُل آثار
کِس کے چراغ کی لَو سے جھلمل جھلمل طاقِ بہار

کون دِلوں میں الاؤ لگا دے چاہ کی چاہت سے
کِس کے ذِکر کا پہرہ دینے، جاگیں چوکی دار

کِس کا عشق سماوے رگ رگ کِس کا فضلِ عمیم
سینہ سینہ روشن رکھے ایک تپاں مہکار

کون کرے ہریالی کو غالیچہ تنکوں کا
کون تڑختے تھَل پر ڈالے چادرِ لیل و نہار

کِس زرِ کُن کے گُن ہیں، مٹی، آگ، ہوا، پانی
کِس کے اُفق کا چاند ہیں آقا، یار ہیں کن کے چار

اُن کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے کیا عجزِ اظہار
وہ جانِ جاں، وہ آقا، وہ دلبر، وہ دلدار

کاش کہ اُن کے رُوپ کی دھوپ یہ سطریں چمکا دے
کاش کہ میری بے ہنری کا رکھ لیں وُہ پندار

پَل کے پَل، بس ایک جھلک اے آقا، اے آقا!
دَم کے دَم، اے میرے رہبر، اے میرے سردار!

بے جہت و بے رُخ ہوں آخر، کب تک چکراؤں
میرا گھر پہلے دن سے تھا، میرا گرد و غبار

میرے بچوں، میرے شہروں، میرے قصبوں کا
حافظ آپؐ کے صدقے ٹھہرے ستار و غفار

ایک دل نابینا کر لے ، خوشبو کا دیدار — کاش وہ یہ آنکھیں ٹھہرا لیں ، اپنی راہ گزار
کیا تبلائیں کس رستے کی انگلی تھامی تھی — گردِ راہِ حیات ہُوا ، کیوں دل سا شاہ سوار
دن پر دن ، راتوں پر راتیں ، دھاوا دل پر دھاوے — لمحہ لمحہ پسپا ہوتے پہنچے گورِ کنار
دنیا ایک ہمارے پیروں کی زنجیر ہوئی — لوگ دِلوں پر پاؤں دھرتے کر گئے دُنیا پار

جاں دینے کو جان نہیں تن میں ، دل دینے کو دل
خالی ہاتھ چلے ہیں خالدؔ آئے تھے بازار

نرگس جیسے بیماروں کی ، سُن لے کون پکار — مٹی کب سنتی ہے مولا ، مٹی کی گوہار
کس کا دھڑکا سینہ سینہ دِل دھڑکاتا ہے — کس کا نور دِلوں کو بخشے آہنگِ رفتار
کس کا ہاتھ دُکھوں کو سینوں کے اندر تھامے — کس کا نُور نسوں میں بھر دے سیّال سیّار
کس نے سوچ کو بیج ، بیان کو علم قرار دیا — کس نے آنسو لڑیاں کر دیں ، دانا کی گفتار
کس نے ہوا کی آنکھ میں بھر دی اِک نم کی جھلمل — کس کا ذکر آنکھوں کی ٹھنڈک ، نام دِلوں کا قرار
کون ہوا کو ساکن کر دے ، ہاتھ بڑھائے بغیر — زورِ سکوت سے پانی کر دے ، باقی کا پندار
چاند کے ٹھنڈے ہاتھ سے آگ لگا دے پانی میں — کس کے جھلمل عکس سے ٹھہرے آبِ سحر ، شرار
مٹی کے دریا میں چلا کے ، مٹی کی ناؤ — مٹی کے پتلے لے ڈوبے ، مٹی کی منجدھار
کس کے نورِ لمس سے روشن چہرہ خوشبو کا — کس کے ہاتھ میں ہاتھ مہک کا ، کس کا ساتھ بہار

وہ تاریک توانائی ، وہ روشن اندھیارا
خالدؔ ایسا لطیف بدن اور ایسا سایہ دار

راہ جمال کی روک نہ پائے ، شیشے کی دیوار — عکس کے ساتھ اُتر لے خالدؔ ، آئینے کے پار
مالکِ یوم الدین سے مانگ تو دین بھی دنیا بھی — اُس کے دَم سے تھل کو جَل تھل کر دے رُودِ بہار
اُس کے آگے کم جانوں کو جان کا خوف نہیں — اُس کے آگے برف کے گالے سر بہ فلک کہسار
وہی الاؤ پھولوں کے دہکائے چار طرف — وہی تپش کو رنگ بنائے ، لپٹوں کو مہکار
وہی ہوا کے تار میں گوندھے ، پانی کے موتی — پَل پَل لرزاں رکھتی اُسی کے ہاتھ ہوا کے تار
وہی کھنک سے تڑکتی خاک پکار یہ کان دھرے — کوئی کب سنتا ہے کھنکتی مٹی کی گوہار
اس کی چاہت خاک ملاپ کو بسترِ گُل کر دے — ماں کے سُونے سینے ، ممتا وہی کرے بیدار
باپ کے ہاتھ میں وہی تھما دے بیٹے کی انگلی — وہی عطا کر دے بیٹی کے دِل کو ماں سا پیار

انسانوں کو اِک دوجے کے حُسن سے نِتھرا دے شیشے کے انسان بنائے، پتھر کا سنسار
وہ ہر نعمت کا مالک وہ نعمتوں کے قاسم
کاش مجھے دونوں ٹھہرا لیں رحمت کا حقدار
جاگتی آنکھوں مجھ کو بھی ہو خوشبو کا دیدار لمحہ لمحہ، پَل پَل، دَم دَم، دیکھوں وہ گلزار
کاش مری نیندوں میں اُتریں شاہِ براق نشین دَم بھر، میرے دل میں دَم لے، خوشبو کا رہوار
پَل کے پَل، بس ایک جھلک اے آقا، اے آقا دَم کے دَم، اے میرے دلبر، اے میرے دلدار
آپ کا نام امام مقام سِرِ تسبیح رُسُل آپ کی ذاتِ بلند صفات اِسی تسبیح کا تار
آپ کے ہاتھ قبول کریں تو کنکر بول اُٹھیں آپ کے ذکر کا ہالہ ٹھہرے یہ شعری اظہار
مولاؐ، وقت کی گرد کے ہاتھ نہ چھُو پائیں مجھ کو آپ کے ذکر کے ساتھ بلند رہیں میرے اشعار
آقا، اے آقا، اے آقا، مجھ پر ہاتھ دھریں
آپ کا قُرب نہ جانے کیا ہو؟ آپ کی یاد بہار
آپؐ کی آنکھوں کا مرکز ہو آپؐ کا مدح نگار بار بھی آپ کے دَر تک پائے ایک سپاس سپار
آپ کے در کے سارے رستے خوشبو کے رستے ساری گلیاں کِھلتی کلیاں، شہر تمام بہار
آپؐ کے رخسارے گہوارے یُوسفؑ چہروں کے دِل تک بینا کر دیں آپؐ کے پیراہن کے تار
مجھ کو عطا ہو آپ کے عشق کی گل رنگی چادر باقی ہر خِلعت کی جگمگ رُسوائی کا تار
آپ کے ساتھی جِھلمِل جِھلمِل راہ نما تارے
آپ کا گھر ہے دِین کی کشتی، گھر والے پتوار
صدیقؓ و فاروقؓ ہوں وہ یا عثمانؓ و کرارؓ چاروں راہ دکھاتے تارے، آپؐ ہیں دِین دیار
فقر کو فخر بنایا تھا کیوں، میرے آقا نے بات بس اتنی پُوچھنے جاؤں بابِ علم دوار
کاش سلام، امامِ بلند مقام، قبول کریں فرش پہ بھی تھے عرش مقام وہ دوشِ نبیؐ کے سوار
آپ کی آل کے حُب نے رکھی آنکھ ستاروں پہ اس کے ہاتھ میں دے کر ڈوری، تھام لیے پتوار
اک چپّو ہیں ربِّ احمدؐ کی نوریں آیات اک چپّو ہے نوریں آقاؐ کا نوریں کردار
وہی زمیں پر اپنے دین کا قادر کھیوا تھا تبھی مسیحِ دیں ٹھہرایا، عابد سا بیمار
اُسی نے سجدوں کو پھیلایا، آخری بیری تک اُسی کے علم کا باقر ٹھہرا، سجّادِ بیدار
اُسی نے دِین کی پہنائی، دُنیا کو دکھلائی اُسی نے اہلِ علم پہ کھولے، بام و درِ انوار
دِین کا صدق زمین پہ جعفرِ صادق ٹھہرایا اُسی کے ہاتھ نے تھامے رکھی، ہر گھر کی دیوار
نورِ طریقِ رضا سے رکھا، روشن نامِ رضا اُسی کا نام امام موسیٰ کاظم کا پندار

تقوے کی رُشنائی سے لکھا، نامِ امام تقی
اُسی کا زور نقی کو رکھے کمزوروں کی کُٹار
اُسی کا عسکر، دین کا لشکر، عسکری کون ہوا
کس کے ساتھ گئے در پردہ مہدی کے اطوار
اُسی نے صبحِ مدینہ مالکؒ ابنِ انسؒ ٹھہرائے
اُسی نے ظلم کی رات کو بخشا شافعیؒ بیدار
وہی امام حنبلؒ رکھتے، سمٹ نمائے رسُول
ابوحنیفہؒ کو ٹھہرائے، اُمّت کا پندار

اور بھی کچھ اُونچے ہو جائیں شہروں کے مینار
یہ دُنیا وہ مسجد کر دے، اے رَبِّ امصار!
جس مسجد کے سر کی پگڑی ایک ہرا گنبد
جس مسجد کا ایک سفید اور تین ہرے مینار
سینہ سینہ ایک مدینہ پھر سے ٹھہرا دے
اُٹھتی خوشبو جیسے مہاجر، کلیوں سے انصار
ہر انسان تقدس کا گھر ٹھہرا اے مولا!
ہر دِل وُہ مسجد ٹھہرا دے، ہر سینہ وُہ دیار
اے ربِّ عشاقِ احمدؐ! اے ربِّ احمدؐ!
ہر سینے کو روشن کر دے، اے ربِّ انوار!
چاند کی جھلمل دیکھ کے دُنیا جھولی پھیلا دے
دُھوپ کا خوف نہ کرنے پائے، سورج کا انکار
تیری پوریں چن سکتی ہیں، خوشبو کے موتی
تیری آنکھیں سُن لیتی ہیں رنگوں کی جھنکار

اُن کے دیار کا راہی ٹھہرے ایک غریبِ دیار
نام اُن کے دربار میں پائے، اُن کا قصیدہ کار
ایک جھلک کی کھنکتی چاہ میں دِل کشکول ہا
اب بے حالی کے کاسے میں کھنکے یہ دینار
بھیک ملے مجھ کو بھی اِک گُل خیز تبسّم کی
مجھ پر بھی اب ٹوٹ کے برسیں جھلمل قول و قرار
تصویریں تک چھُو کر دیکھوں، جانے کیسے ہوں
وہ ہریالی، وہ جالی، وہ گنبد، وہ مینار
وہی مری پہچان رہیں تا حشر و دمِ محشر
اور مری بخشش کا وسیلہ ٹھہرے اُن کا پیار
عفو کی بھیک کا طالب ہُوں جھولی پھیلا دونگا
وہ بھی ہولے سے ہنس دیں گے، دیکھ کے دامن تار
کیا جانے کب میری راتیں دن جیسی کر دے
وہ ربِّ عشاقِ احمدؐ، وہ ربِّ غفار

ختمِ رُسل، پیغامبرِ آخر، اتمامِ ادوار!
اے دستِ رَبِّ نعمت! اے قاسم، اے مختار!
سدِّ نگاہ کے پار اُترنا کس کا فخر ہُوا
یہ بھی دیکھ نہ پائے میرے نابینا افکار
قدم قدم معراجِ انسانیت تھا کس کا
کرن کرن روشن تھا کس کا مہتابِ گفتار
کون زمیں پہ فلک سا ٹاٹ بچھانے سوتے رہا
کس کی مہک سے ٹھہری دنیا راہ گزارِ بہار
کس کے بدن کے لمس سے ٹھہری چادر بھی خلعت
تارِ زرِ گل ٹھہرا کس کی اُترن کا ہر تار
کاش کہ ان کے رُوپ کی دُھوپ تپاں رکھے مجھکو
کاش کہ تن من جل تھل کر دے اُن کے نُور کی پھوار

غزل

سُوندھی سُوندھی سوچ سے اُٹھی، جذبوں کی مہکار
راہ مہک کی روک نہ پائی ، لفظوں کی دیوار

مصرع مصرع، اِک جھلمل کار نکلا گھر ٹھہرا
آہستہ آہستہ نکھرے خال و خدِ اظہار

اے گمنامی ! اِس میزان کی تول میں جھول نہیں
وہ ناقد نقادوں کا فنکاروں کا فنکار

وہ آوازوں کے پیچھے روشن جذبے دیکھے
گُن دیکھے، لفظوں کی پتھر دیواروں کے پار

وہ ہر منصُوبہ گر سے بہتر منصُوبہ گر
ہار بظاہر جیت بنا دے، جیت بظاہر ہار

دُنیا سے رُخ موڑ کے بیٹھے ہیں، کیوں آدم بیزار
اِس دلدل میں دھنسنے والے، اُتریں آر نہ پار

وہی مسافر کو ٹھہرائے ، رستے کا پتھر
اُسی کے ہاتھ گرا دیتے ہیں، رستے کی دیوار

اُس سے سفر کی رُخصت لے کر گھر کی راہ لگیں
کیا تارے، کیا سیارے ، کیا ثابت ، کیا سیار

اُسی نے سیاروں کو ساکن گردش میں رکھا
اُسی نے تاروں کو پہنایا پیرہن انوار

وہی پہاڑوں کو پیسے دن رات کی چکی میں
دن کی گرمی ، رات کی ٹھنڈک ، ریت کرے کہسار

اُسی کے رُوپ کا ساون بھادوں جیٹھ کو پوہ کرے
اسی کی دھوپ ہے یہ گرمی، سردی، برسات، بہار

کسی کی گور پہ پتھرا دے مرمر کی ویرانی
کسی کی گور کو آپ بنا دے پھُولوں کا انبار

کسی چراغ کی لو اُبھری یا کشتی کا مستول
شہر کے قبرستان ہیں خالد یا بحرِ مُردار

غزل

رگ رگ رچ رچ اُتری خالد کس تن کی مہکار
کس کی راجائی میں اُترے کس کے باج گزار

ہم پانی میں نمک کہلائے اور زمین پہ شور
مٹی پر چھیتے بستے تھے ، پانی ہیں سنسار

ہر مچھلی کا پیٹ کسی مچھلی کا مرقد تھا
ہر تن رُوح کا برتن تھا، ہر چہرہ، سنگِ مزار

دیکھ اے دُنیا ! ایک سی ذلت سب کا نصیب نہیں
ہاتھ پسار کے دیکھ چکے ہم ، تو بھی ہاتھ پسار

جوگ کے پاؤں میں چکر رکھنا دُنیا داری کا
تن سے کھینچ کے تار نہ کر دیں ، یار قبائے تار

چاند کی جھلمل دیکھ کے خالد جھولی پھیلا دی
دُھوپ کے خوف سے ہم نے کیا تھا سُورج کا انکار

اُن کے رُخ کا ہالہ ٹھہرے یہ عجزِ اظہار
اُن کے ذکر کے ساتھ بُلند رہیں میرے اشعار
میرے ہُنر کے عیب پہ گمنامی کے پردے رکھ
اے رَبِّ عزّت، اے رَبِّ ستّار و غفّار!
ناموروں کو کب بھائے گی، میری رُسوائی
مجھ کو حضورؐ کی اوجھل رکھنا، اے رَبِّ ستّار!
وہ ہر نعمت کا مالک وہ نعمتوں کے قاسم
مجھ کو مرے ہادی ٹھہرا دیں، رحمت کا حقدار
ایک گناہ کی پُوٹ ہوں مجھ کو تولیں رحمت میں
میرے لیے کچھ نیچا رکھیں، بخشش کا معیار
کاش کہ مجھ پر ہر نعمت رحمت بن کر اُترے
اے دستِ رَبِّ نعمت، اے قاسم، اے مُختار!
اے کم جانوں کے ناجی! بلوانوں کے ہادی!
ختمِ رُسل، پیغامبرِ آخر، انتم اوتار!

پَل کے پَل، بس ایک ڈلک لے آقا، اے آقا!
دَم کے دَم اے میرے دلبر، اے میرے دلدار!

لاج وہ رکھ لیں گے میری بھی سائیں کے دربار
صلی اللہ علیہ وسلّم، وہ سچّی سرکار
وہ محبوبِ رَبِّ رحیم، وہ آپ رسُول کریمؐ
وہ محبوبِ رَبِّ علم و حلم، وہ علم دیار
ہر گُل اُن کا پَیرو، ہر گلزار مدینہ ہے
کیا کیا جگمگ شہر بنے دیوارِ نگاہ کے پار
گرد کا ڈھیر زرِ گُل آقا کس نے ٹھہرایا
کس نے مجھ سا بن ٹھہرایا آپؐ کی راہ گزار
مدح کروں میں کس کی خالد کس کی حمد کروں
کس کی راجائی میں اُترا کس کا باج گزار

محسن بھوپالی

نعت

ـا کے قدموں کو فرشِ کہکشاں بخشا گیا
ـہ طیبہ کو فرازِ آسماں بخشا گیا

انہی کے سایۂ رحمت کے ہیں اُمیدوار
کو سائے کے لیے ابرِ رواں بخشا گیا

کے در پر ہر تہی داماں سمجھتا ہے اسے
ی ہے ارض و سما کے درمیاں بخشا گیا

لی کب ہے رسائی، لفظ کی کیا مقدرت
ـنا کہنے کے لیے حسنِ بیاں بخشا گیا

ـہ کم اعجاز ہے محسنؔ درودِ پاک کا
جو کرتا رہا، وہ بے گماں بخشا گیا

جعفر شیرازی

نعت

شرف حاصل کبھی تو ہو گا اُس در تک رسائی کا
کہ میری زندگی تو نام ہے اُن کی گدائی کا

جمالِ سیّدِ لولاک کا پرتو کہاں تک ہے
احاطہ کر لیا ہے نور نے ساری خدائی کا

یہاں ہوتے ہیں خم سر بادشاہوں، کجکلاہوں کے
عجب اعجاز ہے سرکار کی فرمانروائی کا

مدینے سے جو لاکر خوشبوئیں تقسیم کرتی ہے
مجھے کتنا جنوں ہے اُس ہوا سے آشنائی کا

مجھے کیا کچھ دیا ہے، کیا کہوں، انکی غلامی نے
کوئی اندازہ کر سکتا ہے میری اس کمائی کا

اب اس محشر سے بھی مجھکو نکالیں یا رسول اللہ
کہ دل میں حشر برپا کر رہا ہے غم جدائی کا

زمانہ تا ابد احساں نہ بھولے گا اُس انساں کا
دیا جس نے شعورِ انساں کو انساں کی بھلائی کا

یہ جعفر کے لیے کتنا بڑا اعزاز ہے آقا
کہ منصب مل گیا ہے آپ کی مدحت سرائی کا

سید یٰسین قدرت

نعت

میری شب کی دکھا سحر مجھ کو
میرے خوابوں میں آ نظر مجھ کو

ذہن ہی میں سہی، مگر اک روز
دے ملاقات کی خبر مجھ کو

تھی عجب چاپ رات بھر کہ لگا
اپنا دل تیری رہگزر مجھ کو

نورِ احمدؐ رواں رگوں میں ہے
ورنہ کب دعوۂ ہنر مجھ کو

یوں تو بے آسرا ہوں میں قدرتؔ
اُس کا ہے آسرا مگر مجھ کو

سید تنویر حیدر

نعت

غبارِ رہگزرِ آنجنابؐ ہو جاؤں
پھر اُن کا فیض ہو اور آفتاب ہو جاؤں

ورق ورق مری ہستی کو اے مرے آقاؐ
کچھ اس طرح سے سمیٹیں، کتاب ہو جاؤں

چھپے ہوئے مرے جوہر اُچھال دیں کچھ یوں
میں ساحلوں سے پرے دستیاب ہو جاؤں

لپیٹ لینا مجھے چادرِ شفاعت میں
بروزِ حشر اگر بے نقاب ہو جاؤں

درِ حضورؐ سے تنویرؔ کچھ تو نسبت ہو
گدائے کوئے رسالتمآبؐ ہو جاؤں

رضا ہمدانی

○

لگ گئے سینے سے ٹوٹی ہوئی باہوں کی طرح
میرے اعصاب بھی لڑ لڑ کے قبیلوں کی طرح

خضرِ منزل کو بھلا کیسے سمجھتا رہبر
سنگِ میل آئے نظر مجھ کو صلیبوں کی طرح

دیکھ کر زخمِ گل و لالہ کی خونیں جگری
تتلیاں اُڑنے لگیں میرے حواسوں کی طرح

میں کسی ماضیٔ مرحوم کا افسانہ نہیں
مت پڑھو مجھکو مری جان! نصابوں کی طرح

التفاتِ نگہہِ ناز تو رہتا ہے مگر
نہ حبیبوں کی طرح اور نہ رقیبوں کی طرح

دیکھ کر آئینے میں اپنے حقیقی خد و خال
منہ کھلے رہ گئے یاروں کے، رکابوں کی طرح

شبِ تنہائی نے جب مجھ کو دکھائیں آنکھیں
پھر گئے دوست مرے مجھ سے نگاہوں کی طرح

ایک قطرہ بھی نہ برسا مرے گلشن پہ کبھی
بادل اُٹھے بھی تو اُٹھے مری آہوں کی طرح

پابگل گو میں رہا سرو کی مانند رضاؔ
فکر ضوریز رہی پھر بھی، چناروں کی طرح

○

شہر پر پُپ کا پڑ گیا سایہ
ہو کے مجبور، بول اُٹھا سایہ

تنِ عریاں کو ڈھانپنے کے لیے
ہم نے اپنا، پہن لیا سایہ

حدتِ کرب کا یہ عالم ہے
سایہ بھی ڈھونڈنے لگا سایہ

دھوپ بھی خوف سے پکار اٹھی
سائے کو جب نگل گیا سایہ

نفی و اثبات کے ہیولوں میں
ہم نے اپنا بھی کھو دیا سایہ

اپنے سائے میں پیڑ جلنے لگے
سائے پر کس کا پڑ گیا سایہ

ایک بیمارِ غم کی جان گئی
صدقہ لے کے ٹل گیا سایہ

چھتریاں ہیں کہ چھلنیاں ہیں رضاؔ
موم بن کر پگھل گیا سایہ

غلام محمد قاصر

رضا ہمدانی

وہ جمالِ صبحِ بہارِ نو، سرِ دشت جھومتا باغ بھی
سبھی راستوں کا مزاج داں کہ وہ دل بھی تھا وہ دماغ بھی
وہ سفیرِ نکہت و روشنی کہ وہ پھول بھی تھا چراغ بھی

جو سمندروں کو دوام دے تو محبتوں کی وہ لہر تھا
جو بسا ہے دل کے نواح میں وہ دیارِ درد کا شہر تھا
ترے فن میں آبِ حیات ہے ترے روز و شب میں جو زہر تھا

وہ جمال و خیر و سخا نہیں وہ خلوص و مہر نہ اب وفا
میں لغت کے اجڑے نگر میں ہوں جہاں خاک اڑانے لگی صبا
کہ جہانِ لفظ میں چار سُو سبھی کہہ رہے ہیں — رضا! رضا!

شجاعت علی راہی

رضا ہمدانی

صاحبِ درد، رضا کو ڈھونڈیں
صاحبِ صدق و صفا کو ڈھونڈیں
جیسے پھولوں کی ردا کو ڈھونڈیں
نرم آوازِ صبا کو ڈھونڈیں

شعلۂ زخم بجھا چاہتا ہے
آتشِ کرب و بلا کو ڈھونڈیں

کبھی کوئل میں کبھی کونجوں میں
اک شناسا سی صدا کو ڈھونڈیں

کتنی آوازیں ـــ مگر سناٹا!
آؤ، اس شعلہ نوا کو ڈھونڈیں

(جدہ)

محمد عبداللہ قریشی

احمد ندیم قاسمی

یوں تو میں محمد عبداللہ قریشی مرحوم سے گزشتہ نصف صدی سے متعارف تھا مگر پچھلے پندرہ بیس برس میں ان کا بہت قریبی ساتھ رہا اس لیے مجھے ان کے مزاج، ان کی علمی لگن اور ان کے اسلوبِ کار کو سمجھنے کا بھرپور موقع ملا۔ اس سے پہلے ۱۹۴۲ء — ۱۹۴۵ء کے دوران جب میں دارالاشاعت پنجاب کے دفتر (واقع ریلوے روڈ) سے "پھول" اور "تہذیب نسواں" کے مدیر کی حیثیت سے وابستہ تھا اور وہاں سے بلاناغہ دفتر روزنامہ "انقلاب" (خالصہ سٹریٹ، ریلوے روڈ) میں استاد گرامی حضرت مولانا عبدالمجید سالک کی خدمت میں حاضر ہونے نکلتا تھا تو مجھے پروفیسر علم الدین سالک اور محمد عبداللہ قریشی اسلامیہ کالج (ریلوے روڈ) کی طرف جاتے ہوئے یا اُدھر سے آتے دکھائی دے جاتے تھے اور یار لوگوں نے لطیفے گھڑ رکھے تھے کہ اگر کبھی پروفیسر علم الدین سالک اکیلے آتے جاتے نظر آ جائیں تو سمجھ لیجیے کہ وہ پورے علم الدین سالک نہیں ہیں، آدھے علم الدین سالک ہیں کیونکہ ان کی شخصیت کی تکمیل تو محمد عبداللہ قریشی کی رفاقت سے ہوتی ہے۔ مجھے بعد میں جا کر معلوم ہوا کہ سالک صاحب اور قریشی صاحب کا یہ ساتھ علم و ادب کے لیے کس قدر خوشگوار تھا۔ اس کا ذکر آگے آئے گا۔

بعد میں جب میں نے روزنامہ "امروز" کی ادارت سنبھالی تو میں نے کوشش کی کہ مولانا چراغ حسن حسرت کے زمانۂ ادارت میں "امروز" نے ہفتہ وار علمی و ادبی اشاعت کا جو اعلیٰ معیار قائم کیا تھا، اسے برقرار رکھوں۔ میں نے اس ضمن میں ملک بھر کے اہلِ علم سے بالعموم اور لاہور کے اربابِ ادب و فن سے بالخصوص رابطے قائم کیے۔ محمد عبداللہ قریشی اس وقت اقبالیات اور کشمیریات کے موضوعات پر تحقیق کے غیر معمولی جوہر دکھانے کی وجہ سے بڑی شہرت حاصل کر چکے تھے۔ میں نے ان سے بھی "امروز" کی "قسمت علمی و ادبی" میں شمولیت کی درخواست کی اور یوں ان سے مراسم کا آغاز ہوا۔ پھر جب رسالہ "نقوش" کے دفتر میں انہوں نے رسالے کے مدیر جناب محمد طفیل کے رفیقِ کار کے فرائض سنبھالے تو وہاں بھی ان سے ملاقاتیں رہیں۔ حضرت مولانا غلام رسول مہر کے ہاں بھی انہیں کئی بار اپنے تحقیقی کام میں مصروف پایا۔ مگر جب میرے محب عزیز موجد آرٹسٹ میرے رسالہ "فنون" کے انتظامات سنبھالنے کے سلسلے میں انہیں میرے پاس لائے تو میں نے بے حد مسرت کے اظہار کے ساتھ یہ معذرت بھی پیش کر دی کہ "فنون" ان کی شایانِ شان خدمت نہ کر سکے گا۔ میں نے یہ وضاحت بھی کر دی کہ "فنون" کی ادارت کا سارا کام میں نے سنبھال رکھا ہے اس لیے قریشی صاحب صرف حساب کتاب اور رسالے کی ترسیل وغیرہ کے ذمہ دار ہوں گے۔ کچھ عرصے بعد مولانا صلاح الدین احمد کی رحلت کے بعد انہوں نے رسالہ "ادبی دنیا" کی ادارت بھی سنبھال لی اس لیے میں نے انہیں "فنون" کی ادارت کے سلسلے میں کوئی زحمت دینا مناسب نہ سمجھا، البتہ کچھ عرصے بعد یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ قریشی صاحب نے دفتر "فنون" کے انتشار زدہ حسابات اور دیگر انتظامی امور کو نہایت سلیقے اور لگن سے منظم کر لیا۔ یوں وہ "فنون" کو جاری رکھنے کے معاملے میں میرے بڑے مددگار ثابت ہوئے۔

میں نے جب مجلس ترقی ادب، لاہور کی نظامت سنبھالی تو "مشاہیرِ پنجاب" مرتب کرنے کا ایک تاریخی منصوبہ تیار کیا اور اس

سلسلے میں لاہور کے متعدد مورخین و ادبا کا تعاون بھی حاصل کیا۔ محمد عبداللہ قریشی مرحوم سے بھی استدعا کی گئی کہ وہ علمی معاملات میں ناظم کے ایک مشیر کی حیثیت سے معمولی سے معاوضے پر جز وقتی طور پر مجلس کے دفتر میں تشریف لایا کریں۔ اگرچہ "مشاہیرِ پنجاب" کا منصوبہ مجلس کے سقیم مالی حالات کی وجہ سے پروان نہ چڑھ سکا مگر قریشی صاحب علمی و ادبی تحقیق و تنقید کے مسائل کے سلسلے میں ایک مشیر کار کی حیثیت سے مجلس سے وابستہ رہے اور آخری دم تک وابستہ رہے۔ آنکھوں میں موتیا اتر آنے اور دیگر علالتوں کے باعث وہ لکھنے پڑھنے کے کام جاری نہیں رکھ سکے تھے مگر تاریخی اور ادبی معلومات کے سلسلے میں ان سے اب بھی کسبِ فیض کیا جاتا تھا اور حیرت ہوتی ہے کہ بچاسی نوے برس کے اس نحیف و نزار شخص کو کتنے بے شمار واقعات، صحیح تاریخ اور سنہ اور مقامات اور اشخاص کے اسماء کے ساتھ ازبر تھے۔ علمی و ادبی نوعیت کے کسی بھی استفسار کا جواب وہ اتنے تیقن اور صحت کے ساتھ دیتے تھے کہ ان کی یادداشت پر حیرت ہوتی تھی۔

میں نے دفتر "فنون" میں انہیں بحیثیت مینیجر کام کرتے ہوئے دیکھا ہے۔ وہ کام میں اس قدر منہمک ہوتے تھے کہ بظاہر آس پاس کی انہیں کوئی خبر نہیں ہوتی تھی، مگر کسی کی مجال نہیں تھی کہ ان کی میز پر سے ایک ننھی سی چٹ بھی اٹھالے۔ دراصل بحیثیت محقق انہیں رسالوں اور اخباروں کے تراشوں اور کاغذ کے مختلف پرزوں پر درج تاریخوں یا حوالے کی کتابوں کے ناموں وغیرہ کو محفوظ رکھنے کی عمر بھر کی عادت تھی اس لیے وہ گوارا نہیں کر سکتے تھے کہ کوئی اس ترتیب کو بگاڑ دے، جس ترتیب سے وہ علمی خزانے کی یہ کنجیاں محفوظ رکھتے تھے۔ چنانچہ میں نے دیکھا کہ ان کی میز پر برسوں پہلے کے بعض دعوت نامے تک بعینہٖ رکھے تھے۔ شاید انہیں ان تقاریب کی صحیح تاریخوں کے سلسلے میں ان کی ضرورت پڑتی ہوگی۔

ایک بار ہمارے ایک شاعر دوست اور قریشی صاحب کے نیاز مند عارف محمود نے دفتر میں جمع پرانے رسالوں کو ترتیب سے رکھنے کا عزم کیا اور تمام رسالے دیواروں کے ساتھ بڑی خوش سلیقگی سے سجا دیئے۔ شام کو قریشی صاحب دفتر میں آئے اور ترتیب میں اتنا بڑا تغیر دیکھا تو ان کا غصہ دیدنی تھا۔ میں نے پہلی بار انہیں اتنے غصے میں دیکھا۔ دراصل وہ کاغذات اور رسالے بھی عارف محمود کی "دستبرد" سے محفوظ نہیں رہے تھے جو قریشی صاحب کی ذاتی ملکیت میں شامل تھے۔ شروع شروع میں تو عارف محمود اس قدر خوفزدہ ہوتے کہ ادھر قریشی صاحب دفتر میں داخل ہوتے تھے، ادھر عارف کسی بہانے دفتر سے نکل بھاگتے تھے، مگر آہستہ آہستہ قریشی صاحب نے عارف کے وجود کو گوارا کر لیا، البتہ وہ ان کے "ذاتی معاملات" میں عارف کی اس مداخلت کو کبھی بخش نہ سکے۔ میں قریشی صاحب کے گھر بھی کئی بار حاضر ہوا ہوں۔ ان کے کمرے میں داخل ہوتے ہی جو چیز فوری طور پر متوجہ کرتی تھی، وہ ملحقہ الماریوں وغیرہ میں کتابوں، رسالوں اور تراشوں کی ترتیب تھی۔ ان کے اہلِ خانہ نے بتایا کہ اس ترتیب کو کوئی ذرا سا بھی بگاڑ دے تو اس بدنصیب کی قیامت آجاتی ہے۔ میں نے قریشی صاحب کو غصے میں ایک ہی بار دیکھا ہے۔ میرے مشاہدے کی حد تک وہ نہایت نرم مزاج اور شگفتہ طبع انسان تھے۔

ان کی شگفتہ طبعی کی ایک مثال تو یہ ہے کہ جب "فنون" کے دفتر میں احباب جمع ہوتے تھے اور ادب و فن کے مسائل پر گفتگو کے علاوہ لطیفہ بازی بھی ہوتی تھی تو قریشی صاحب ہر لطیفے پر اتنا کھل کر ہنستے تھے کہ معلوم ہوتا تھا وہ کاغذات پر یونہی عادتاً جھکے ہوئے ہیں۔ مگر کاغذات پر اندراجات بھی درست ہوتے تھے اور قریشی صاحب حاضرین کی گفتگو بھی بڑے شوق سے سنتے رہتے تھے۔

اس وقت تو میری حیرت کا کوئی ٹھکانا نہیں ہوتا تھا جب میں سوچتا تھا کہ قریشی صاحب اتنا بہت سا ٹھوس تحقیقی کام کرنے کے باوجود نام و نمود کے معاملے میں اتنے بے نیاز کیوں ہیں۔ درویش کو بھی اپنی درویشی کے اعتراف کا اشتیاق ہوتا ہے مگر یہ عجیب درویش تھا کہ کام کیے جا رہا تھا مگر یہ سوچنے کا تکلف ہی نہیں کرتا تھا کہ اس کے کارناموں کی تحسین ہوتی ہے یا نہیں۔ داد و ستائش سے اس قدر بے پروا آدمی، کم سے کم علمی و ادبی حلقوں میں، میری نظروں سے نہیں گزرا۔ مولانا غلام رسول مہر کے

سے صائب الرائے محقق نے قریشی صاحب کے مزاج کے اس رُخ سے متعلق لکھا تھا:

"علمی انہماک کا ایک خاصہ یہ بھی ہے کہ وہ نمود و نمائش سے بالکل بے نیاز ہوتا ہے۔ ایسے اصحاب کی نظریں ہمیشہ ضروری علمی کاموں کے سرانجام پر جمی رہتی ہیں اور انہیں یہ سوچنے کی فرصت کبھی نہیں ملتی کہ دنیا ان کی خدمات پر تحسین و ستائش کے پھول نثار کرتی اور خدمات کی داد دیتی ہے یا نہیں دیتی۔ گویا وہ تمام خدمات ایک اہم فرض سمجھتے ہوئے انجام دیتے ہیں۔ مولوی عبداللہ قریشی اہلِ علم کے اس شیوے اور اس خصوصیت کی بھی ایک قابلِ قدر مثال ہیں۔ انہوں نے اپنی زندگی کا بیشتر حصہ اہم علمی کاموں میں بسر کیا لیکن دنیا سے روشناسی کی اُلجھنوں میں کبھی مبتلا نہ ہوئے۔"

جہاں تک قریشی صاحب کے علمی کارناموں کا معاملہ ہے، ان کے بارے میں تو محققین کرام ہی کچھ کہتے ہوئے بھلے لگتے ہیں۔ البتہ مدت العمر رسائل و جرائد کی ادارت کی وجہ سے میں تحقیقی اور تنقیدی معیاروں سے ضرور روشناس ہو گیا ہوں۔ میں جب علامہ اقبال کی حیات و شاعری کے سلسلے میں قریشی صاحب کی محنت و کاوش پر نظر ڈالتا ہوں تو ان کے تبحر کا اعتراف کیے بغیر چارہ نہیں رہتا۔ صرف "روحِ مکاتیبِ اقبال" ہی کو لے لیجیے کہ قریشی صاحب نے اس کتاب میں علامہ کے تمام خطوط کو نہ صرف تاریخ وار مرتب کیا ہے بلکہ ساتھ ہی ہر خط کا خلاصہ بھی دیتے چلے گئے ہیں، چنانچہ دیگر محققین کرام کو جب بھی اقبال کے کسی خاص خط کی تاریخ یا اس کے مافیہ کی ضرورت پیش آئے گی، "روحِ مکاتیبِ اقبال" ان کی دستگیری کے لیے موجود ہوگی۔ "مکاتیبِ اقبال بنام گرامی" اپنی نوعیت اور معلومات اور دلچسپی کی وجہ سے اقبالیات میں ایک یادگار اضافہ ہے۔ اسی طرح جب سید وقار عظیم نے "اقبال، معاصرین کی نظر میں" مرتب کی تو قریشی صاحب کو "معاصرینِ اقبال کی نظر میں" مرتب کرنے کی سوجھی اور اس کتاب کا موضوع اس امر پر دلالت کرتا ہے کہ علامہ کے شعری معیاروں اور معاصرین کی حوصلہ افزائی کے سلسلے میں اس کتاب میں جو انکشافات کیے گئے وہ اب تک اقبالیات کے متنوع موضوعات پر لکھنے والوں کے لیے بالکل نئے تھے۔ "اقبال بنامِ شاد" بھی اسی معیار کا کارنامہ ہے۔ پھر "آئینۂ اقبال" اور "مقالاتِ اقبال" اور "تذکارِ اقبال" اور "باقیاتِ اقبال" کی اہمیت پر بھی کسی کو شبہ نہیں ہو سکتا۔ دو ڈھائی سال پہلے انہوں نے "حیاتِ اقبال کی گم شدہ کڑیاں" مرتب کر کے اقبال کے سوانح نگاروں کی راہوں کے کتنے موڑ روشن کر دیے۔ پھر اقبال کی تاریخ گوئی پر سے "حیاتِ جاوداں" کے عنوان سے پردہ سرکایا۔ جاوید منزل میں جو آثارِ اقبال موجود ہیں، ان کی فہرست بھی "فہرست مشمولات آثارِ علامہ اقبال" کے نام سے شائع کرائی۔ ان کتابوں کا مطالعہ کرتے ہوئے مرتب کی دیدہ ریزی پر آفریں کہنے کو جی چاہتا ہے۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر قریشی صاحب اقبال سے متعلق ایک درجن کے قریب یہ کتابیں مرتب نہ کرتے تو اقبالیات میں کتنے خلا باقی رہ جاتے۔

کشمیر پر بھی انہوں نے "ایرانِ کبیر و ایرانِ صغیر" کے نام سے جو کتاب مرتب کی ہے وہ اپنے موضوع کی واحد کتاب ہے۔ "آئینۂ کشمیر" اور "شعرائے کشمیر" کا بھی جواب نہیں۔ اپنے استاد اور محسن جناب محمد الدین فوق کی "تاریخ اقوام کشمیر" کی جلد سوم مرتب کر کے نہ صرف فوق مرحوم کی شخصیت سے عقیدت و محبت کا اظہار کیا بلکہ اپنی معلومات کی چند اور نئی پرتوں سے بھی قارئین کو حیرت زدہ کر دیا۔

قریشی صاحب نے بچوں کے لیے بھی متعدد کتابیں لکھیں۔ مولانا فیض الحسن سہارنپوری اور ان کے ادبی کارناموں کو بھی ایک الگ کتاب میں محفوظ کر دیا۔ "نمودِ غبار" اور "غلامانِ رسول" اور "لطائف الادب" اور "حکمتِ رفاعی" کی سی کتابیں بھی قارئین علم و ادب کے لیے نعمت غیر مترقبہ ہیں۔ حضرت عمر بن عبدالعزیز کے بارے میں "اسلامی زندگی کا سچا نمونہ" کے عنوان سے ایک اچھی کتاب

لکھی ہے۔ "معرکۂ اسرارِ خودی" بھی اقبالیات کے موضوع پر ان کا ایک اور کارنامہ ہے۔ "اسرارِ خودی" کے شائع ہوتے ہی ادبی اور علمی حلقوں میں جو ایک طوفان اُٹھ کھڑا ہوا تھا، اسے محمد عبداللہ قریشی مرحوم نے بڑے سلیقے اور سچائی سے سمیٹا۔

پروفیسر علم الدین سالک کے جتنے بھی مضامین اخبارات و رسائل میں شائع ہوتے رہے ہیں، قریب قریب ان سب کے "متن نگار" محمد عبداللہ قریشی ہی ہیں۔ علم الدین سالک مرحوم کی افتادِ طبع ایسی تھی کہ لکھنے سے گریزاں رہتے تھے البتہ جب بولتے تھے تو ان کے منہ سے ادب و تواریخ کے موتی جھڑنے لگتے تھے اور قریشی صاحب ان کی گفتگو کو سمیٹ کر مقالے کی صورت میں لکھ لیتے تھے اور انہی کے نام سے چھپوا دیتے تھے۔ یوں سمجھیے کہ اگر قریشی صاحب کا وجود نہ ہوتا تو پروفیسر علم الدین سالک کی شہرت صرف ایک اچھا استاد ہونے تک محدود رہتی مگر اب قریشی صاحب کی عقیدت و ارادت کی برکت سے ان کا شمار ماضی کے باوقار اہلِ علم میں ہوتا ہے۔

حکومتِ وقت کا فرض تھا کہ وہ محمد عبداللہ قریشی کی علمی و ادبی خدمات کا اعتراف و اعلان کرتی۔ پنجاب کی طرف سے دو تین بار ان کا نام پرائیڈ آف پرفارمنس کے لیے بھیجا گیا مگر فیصلہ کرنے والوں کی نگاہ اس درویش کے حسنِ کارکردگی پر نہ رک سکی۔ ہماری حکومتوں پر بیشتر ایسے اصحاب چھائے رہتے ہیں جنہیں ادبی تحقیق سے زیادہ بے مصرف کوئی اور کام سوجھتا ہی نہیں۔ بہرحال حکومتوں کا موقف کچھ بھی ہو، قریشی صاحب کو نام و نمود سے کوئی دلچسپی نہیں تھی۔ انہوں نے عمر بھر اپنے کام سے کام رکھا۔ ہماری علمی و ادبی دنیا میں اتنی خاموش کارکردگی کا اعزاز شاید ہی کسی اور کے حصے میں آیا ہو۔

جس روز ان کا انتقال ہوا، میں جشنِ آزادی کے سلسلے میں منعقد ہونے والے مشاعرے میں شرکت کے لئے اسلام آباد میں تھا۔ علیل تو وہ ایک عرصے سے تھے مگر ان کی علالت کچھ ایسی تشویش ناک نہیں معلوم ہوتی تھی۔ خدا کو کچھ اور منظور تھا چنانچہ یہ گوشہ نشینِ عالم، نقاد اور محقق خاموشی کے ساتھ، ۱۲۔ اگست (۱۹۹۴ء) کو عالمِ جاودانی کی طرف کوچ کر گیا۔ اناللہ وانا الیہ راجعون۔

محمد عبداللہ قریشی ۱۹۰۵ء میں پیدا ہوئے۔ انہوں نے پروفیسر علم الدین سالک کے سے عالم و مؤرخ اور منشی محمد الدین فوق کی سی ہمہ گیر شخصیت کی حوصلہ افزائی اور رہنمائی میں تحقیق و تنقید علم و ادب کا سلسلہ شروع کیا اور ان کے مضامین نیرنگِ خیال، عالمگیر، قوسِ قزح، ادبِ لطیف، تہذیبِ نسواں، مخزن، ادبی دنیا، نقوش، فنون، اقبال، المعارف، اقبال ریویو، فردوس، حقیقتِ اسلام اور دیگر معروف رسائل کے علاوہ روزناموں کی ادبی اشاعتوں میں شائع ہوتے رہے۔ قریشی صاحب ۳۸ سال تک ریلوے ہیڈکوارٹرز آفس میں ملازمت کرتے رہے اور ۱۹۶۰ء میں سبکدوش ہوئے۔ اس کے بعد مسلسل سات سال تک رسالہ "نقوش" کے مدیرِ معاون رہے۔ "نقوش" کے مکاتیب نمبر، غزل نمبر، لاہور نمبر، طنز و مزاح نمبر، پطرس نمبر اور آپ بیتی نمبر میں ان کی تحقیقی صلاحیتوں کے جوہر جگمگا رہے ہیں۔ اس سے پہلے وہ چار رسائل کی ادارت کر چکے تھے۔ مارچ ۱۹۶۵ء میں "ادبی دنیا" کی ادارت سنبھالی اور ۱۹۷۲ء تک اسے کامیابی سے چلایا۔ ۱۹۶۵ء کی پاک بھارت جنگ کے بعد "ادبی دنیا" کا کشمیر نمبر نکالا جو اتنا مقبول ہوا کہ کئی ہزار کی تعداد میں بار بار چھپا۔ بعد میں اسے "آئینۂ کشمیر" کے نام سے کتابی صورت میں شائع کر دیا گیا۔ حکومتِ آزاد کشمیر نے بھی انہیں ایک کتاب کی ترتیب کے لیے منتخب کیا۔ یہ کتاب "ایرانِ کبیر و ایرانِ صغیر" کے نام سے شائع ہوئی اور بہت پسند کی گئی۔ ان کی کتابوں کی فہرست یہ ہے: آئینۂ اقبال۔ مقالاتِ اقبال۔ تذکارِ اقبال۔ مکاتیبِ اقبال بنام گرامی۔ معاصرینِ اقبال کی نظر میں۔ روحِ مکاتیبِ اقبال۔ باقیاتِ اقبال۔ حیاتِ اقبال کی گمشدہ کڑیاں۔ حیاتِ جاوداں (اقبال کی تاریخ گوئی)۔ اقبال بنام شاد۔ فہرست مشمولاتِ آثارِ علامہ اقبال۔ معرکۂ اسرارِ خودی۔ تاریخِ اقوامِ کشمیر، جلد سوم۔ شاعرِ کشمیر۔ آئینۂ کشمیر۔ ایرانِ کبیر و ایرانِ صغیر۔ حکمتِ رفائی ——— وغیرہ وغیرہ

جمیل ملک

حسن طاہر کی یاد میں

اِن بستیوں کو اور بھی سنسان کر گیا
جاتے ہوئے ہمیں تو وہ ویران کر گیا

تھی اُس کے دل میں جو بھی وہی ٹھان کر گیا
وہ کب بھلا کسی کا کہا مان کر گیا

ایک ایک کر کے توڑ دیے اُس نے بت سب
ہم سے وہ کتنے وعدہ و پیمان کر گیا

وہ پُرخلوص شخص تھا شاید اِسی لیے
ہر ایک کے خلوص کو پہچان کر گیا

وہ موت کا تو راز نہ شاید سمجھ سکا
وہ زندگی کا بھید مگر جان کر گیا

تاریخ ساز موڑ کو کاٹا کچھ اس طرح
مشکل ہر ایک راہ کی آسان کر گیا

دنیا سے اُس نے کچھ نہیں پایا تو کیا ہُوا
وہ اپنی آخرت کا تو سامان کر گیا

چھوڑا نہیں تھا اُس نے کبھی سچ کا راستہ
اس راستے میں جان بھی قربان کر گیا

نظروں سے ایک پل میں وہ غائب ہوا جمیلؔ
اِس شعبدہ گری سے تو حیران کر گیا

خاطر غزنوی

جلیل حشمی کی یاد میں

خود نگر، خود پرست و خود آزار
خوش نظر، خوش نگار و خوش افکار

اپنے ہی سائے پر فدا بھی رہا
گاہ اپنے ہی عکس سے بے زار

خواب اس کے متاعِ فن ٹھہرے
زندگی اس کی، زندگی سے فرار

غم میں کھو کر جلایا دل اپنا
غم میں کُھل کر کِھلا دیئے گلزار

خود بھنور سوچ کے کیے تعمیر
خود ہی کشتی بھی اپنی کر دی پار

مثلِ درویش حال مست کبھی
مثلِ شاہاں کبھی ہوس کا شکار

اُس نے چوسا گلِ حیات کا رس
اور لٹائے مثلِ شہد اشعار

موڑ کر اب جہاں سے مُنہ اپنا
وہ سجائے ہوئے ہے اپنا مزار

شہزاد میر

کلیمِ عصر

اختر حسین جعفری کے لیے

کلامِ شاعر کسی سمندر کا معجزہ ہے
صدف کے گوہر سے ساحلوں تک
خیال بن کر بکھر گیا ہے
کلامِ شاعر کسی قلندر کا تجربہ ہے
اسی فسوں کار روشنائی کے ہاتھ میں جو بکھرے ہوئے ہیں
وہ لفظ
شب کی جہالتوں کے کشادہ ماتھے پہ صبح کا اک نیا جنم ہیں
اور اُن کے معنی بھی دیوتا ہیں
جنھوں نے ایسے تفکّراتِ حیات حاصل رقم کیے ہیں
کہ زندگی سے تھکے رویّے بدل گئے ہیں
خوشی کا اظہار اب لباسوں کے رنگ سے منتقل ہوا ہے
ہر ایک چہرے پہ کاٹناتی نقوش بن کر ٹھہر گیا ہے
ٹھہر گیا ہے ہر ایک جادُو حیاتِ کل کے ہر اک دھرم کا
کہ اَب جو راہوں پہ قافلے کی صفات لیکھ ہُنر بڑھا ہے
وہ جانتا ہے
تمام رستے کہ جن پہ الہام بولتے تھے
اسے ٹھہرتے ہر ایک موسم کا دُکھ پتہ ہے
ہر ایک ٹوٹے ہوئے شجر کی خبر ہے اس کو

اُسی کو حاصل ہے حافظہ وہ
کہ جس میں روحوں کے درد
جسموں کو بن بتائے بسے ہُوئے ہیں
اور اس کے اظہار و آگہی کا بلند پرچم جہاں گڑا ہے
وہیں پہ ادراک کا مقدّر تمام ہونا لکھا ہوا ہے
وہیں سے پہلا قدم ہوا نے
ابھی لیا ہے
کہ خوشبوؤں کا سفر تو پھُولوں کی منزلوں سے شروع
ہوتا رہا ہے اب تک

کلامِ شاعر
فلک سے، بادل سے، کوہساروں سے بہتے دریا تلک کا
گہرا مشاہدہ ہے

کلامِ شاعر
کسی سمندر کا معجزہ ہے!

احمد ندیم قاسمی

اختر حسین جعفری کے لیے چند شعر

دل میں سوچا تھا کہ ہم عمر بسر کر لیں گے
تجھ سے نظمیں تری سنتے، ترے نغمے گاتے

بس جو چلتا تو ہم اس دور کے ویرانوں پر
چار جانب سے تری نکہتِ فن برساتے

ہم نے کوشش تو بہت کی، مگر اے یارِ عزیز!
تیرے اوصاف نہیں ہم سے سمٹنے پاتے

یہ حقیقت ہے مسلّم کہ ہر اچھا شاعر
اپنی تمثال تو دے جاتا ہے جاتے جاتے

بزمِ فن میں ترا کوئی بھی نہ ہمسر نکلا!
ہم ترے بعد کہاں سے ترا ثانی لاتے؟

مجذوبِ فرنگی — ۴

(بیادِ اختر حسین جعفری)

محمد ارشاد

"چونکہ ہمارے پاس کوئی عضو، کوئی ذریعہ (Faculty) موجود نہیں جو سچائی کو ہم پر منکشف کرتا ہو اور جسے ہم نے "سچائی" کا نام دے رکھا ہے، ہماری اپنی تعبیر و ترجمانی ہے، اس لیے سقراطوں، برونوؤں اور سپینوزاؤں، جنہوں نے "سچائی" کی خاطر جان قربان کی یا دکھ اٹھائے تو، نیطشے کے نزدیک، انہوں نے درحقیقت اپنے ضمیر کی معصومانہ اور لطیف غیر جانبداری کو قربان کیا۔ شہادت کی تمنا اسی وقت پیدا ہوتی ہے جب "سچائی" ضد کی صورت اختیار کر لے اور اس ضد کے پورا ہونے میں جو لوگ مانع ہیں اُن سے جھگڑا شروع کر دیا جائے۔ "سچائی" کسی بے بس اور معذور ہستی کا نام نہیں کہ اس کے دفاع میں جنگجوئی ناگزیر ٹھہرے۔ آخر ان لوگوں نے وہ روپ کیوں نہ دھارا جس میں یہ کم ڈراؤنے نظر آتے۔ ان کی "سچائی" نے ان کو اتنا حساس بنا دیا تھا کہ انہیں "سچائی" کے دشمنوں پر، مزعومہ دشمنوں پر بھی، مسلسل نظر رکھنی پڑتی تھی۔ اس حالت نے جس میں انہوں نے اپنے آپ کو مبتلا کر رکھا تھا انہیں ناشائستہ، منتقم اور زہر سے ست کشید کرنے والا بنا دیا تھا۔ وہ روحانیت اور تقدس کا نقاب اوڑھے ہوئے تھے لیکن نقاب میں قامت کیسے چھپ سکتی ہے۔ کسی فلسفی کا "سچائی" پر جان قربان کرنے کا مطلب یہی ہے کہ وہ فلسفیانہ حسِ مزاح کھو چکا ہے[1] اور لوگوں کو بھڑکانے والا اداکار بن چکا ہے۔ کسی بھی سچائی کے لیے اپنے آپ کو شہید کروانا خودکشی ہے جس میں حکومت یا عدالت کو آلۂ خودکشی کے طور پر استعمال کیا جاتا ہے۔ سقراط مسخرہ تھا لیکن چاہتا تھا کہ اسے سنجیدگی سے لیا جائے۔ اس میں وہ پورے طور پر کامیاب رہا۔"

کوئی بھی نظامِ افکار، بظاہر کتنا ہی روحانی اور آسمانی کیوں نہ ہو، انسانی، سراسر انسانی ہے۔ اسے انسانی چھاپ سے مبرا قرار دینا، نیطشے کے نزدیک حقیقت سے چشم پوشی ہے۔ ہر فلسفہ اپنے فیلسوف کے، ہر فکر اپنے مفکر کے، اعترافات کا، اس کی غیر ارادی اور لاشعوری یادداشتوں (memoir) کا مجموعہ ہے، نفس کے اس اولین گھر کی طرف مراجعت ہے جس میں کئی اکساہٹیں (drives) قیام پذیر ہیں۔ ہر اکساہٹ، ہر انگیزش، بجائے خود سلطان (tyrant) ہے اور دوسری اکساہٹوں پر تسلط کی خواہاں۔ تسلط حاصل کرنے والی اکساہٹ اپنے تسلط کو قائم رکھنے کی خاطر جاننے کی اکساہٹ (drive to knowledge) کو آلے اور ہتھیار کے طور پر استعمال کرتی ہے تاکہ اپنے آپ کو ہستی کے نصب العین اور منتہائے مقصود کے طور پر پیش کر سکے۔ پس یہ کوئی نہ کوئی اکساہٹ ہوتی ہے جو تفکر و تفلسف کا، دھیان اور گیان کا، عرفان و مکاشفے کا مرکز ہوتی ہے۔ غیر جانبدارانہ سوچ، نیطشے کے نزدیک،

---

[1] گیلیلیو نے اپنی فلسفیانہ حسِ مزاح نہیں کھوئی۔ عدالت کا فیصلہ تسلیم کر کے باہر نکلتے ہوئے کہا "عدالت کا فیصلہ بجا، لیکن لگتا ہے زمین اپنی روش نہیں چھوڑے گی۔"

مفہوم سے عاری نقطہ ہے۔ چونکہ یہی اکساہٹیں کردار کا رُخ متعین کرتی ہیں اس لئے فیثا غورس سے لے کر آج تک کسی بھی بڑے سے بڑے فلسفی کے مابعد الطبیعاتی افکار کتنے ہی آسمانی کیوں نہ دکھائی دیتے ہوں اس سوال کا جواب ہیں کہ اس کے پیشِ نظر کس قسم کا کردار اور خلق (morality) ہے۔ جیسا خلق ویسی ہی مابعد الطبیعیات۔

رواقی (Stoic) فلسفے کا اصل اصول "فطرت کے مطابق زندگی کرو" تھا۔ نیطشے کے نزدیک یہ اصول بے مغز لیکن پُر فریب الفاظ پر مشتمل ہے۔ "فطرت حد سے زیادہ خراج، بے انتہا غیر جانبدار، بغیر قصد و ہدف کے، رحم اور عدل دونوں سے عاری، بیک وقت ثمر بار اور بے ثمر، فیاض اور بے فیض اور غیر یقینی (uncertain) ہے۔ کیا ایسی زندگی کرنا، فطرت کے مطابق زندگی کرنا، ممکن ہے؟ زندگی کرنا کیا فطرت سے مختلف ہوا چاہنا نہیں۔ زندگی کرنا پسند و ناپسند کرنا، ترجیح دینا، تعدی اور تجاوز کرنا، محدود ہونا اور مختلف ہوا چاہنا نہیں تو پھر کیا ہے؟ اگر فطرت سے مراد زیست ہے تو رواقی فلسفی زیست سے، زندگی سے، مطابقت پیدا کرنے میں ناکام کیوں رہے اور خواہشاتِ نفسانی کو جو زندگی کا لازمہ اور خاصہ ہیں، مارنے میں کیوں مصروف رہے؟ وہ اس گمان میں مبتلا رہے کہ رواقیت فطرت کے سانچے میں ڈھلی ہوئی ہے، فطرت کے عین مطابق ہے جبکہ معاملہ دگر گوں تھا۔ وہ فطرت کو رواقیت کے سانچے میں ڈھالنا چاہ رہے تھے، فطرت کو رواقیت کے مطابق بنانا چاہ رہے تھے۔ ان کے غرور فریب نے انہیں یہ جاننے کا موقع ہی نہ دیا کہ جس اصول کو وہ فطرت سے ماخوذ سمجھ رہے ہیں ان کی اپنی اکساہٹوں سے ماخوذ ہے۔ وہ اپنے ضابطۂ حیات، طورِ زندگی، نصب العین اور آئیڈیل کو فطرت کا ضابطۂ حیات، نصب العین اور آئیڈیل سمجھ رہے تھے۔ وہ فطرت پر رواقیت کا نقش ثبت کرنا چاہ رہے تھے تاکہ رواقیت لازوال اور آفاقی حیثیت اور شان و شوکت کی حامل نظر آئے۔ شجر، حجر، سورج، چاند، تارے ہر شے انہیں رواقیت پرکاربند دکھائی دے رہی تھی۔ وہ پوری کائنات کو رواق (چھجا) سمجھنے لگ بیٹھے تھے۔ رواقیت اپنے اوپر تسلط (self-tyranny) کا فلسفہ، اپنی تسخیر کا فلسفہ، ہے۔ فطرت پر بھی تسلط حاصل کیا جا سکتا ہے۔ اسے مسخر کیا جا سکتا ہے۔ آخر رواقی فلسفی بھی تو فطرت کا ٹکڑا ہیں .... لیکن یہ ایک لمبی اور نہ ختم ہونے والی کہانی ہے۔ جو کبھی رواقیوں کو پیش آیا آج بھی جونہی کوئی فلسفہ (نظامِ افکار) اپنے آپ پر ایمان لے آتا ہے یہی کچھ پیش آتا ہے۔ فلسفہ ہمیشہ فطرت کو، ہستی کو، اپنی صورت (image) پر تراشتا ہے، اپنے ڈھب پر ڈھالتا ہے۔ یہ اس کے علاوہ کرتا ہی نہیں۔ فلسفہ اپنے اوپر تسلط (self-tyranny) کی، اپنے آپ کو تسخیر کرنے کی اکساہٹ ہے، علوی ترین خواہش برائے حصولِ قدرت (the most spiritual will to power) برائے "تخلیقِ کائنات"، برائے علتِ اولیٰ ہے۔"

وہ چیز جس کا نام ہم نے "سچائی" رکھ چھوڑا ہے، کیا واقعی ہمارے ہاتھ لگ سکتی ہے؟ ہمارا علم، ہمارا عرفان کسی مانوس چیز کو غیر مانوس چیز کا حوالہ بنانا ہوتا ہے۔ عقل اور وجدان، ذہن کی مختلف حالتیں ہیں۔ عقل و وجدان ہم پر کسی چیز کی ماہیت کا، حقیقت کا انکشاف نہیں کرتے۔ جو بات ہم پر منکشف ہوتی ہے، یہ ہے کہ ہمیں کسی نہ کسی شے کا شعور ہے۔ "شعور کا معاملہ ہماری سمجھ میں اس وقت آسکتا ہے جب ہماری سمجھ میں یہ بات آجائے کہ ہم کس حد تک اس کے بغیر گزارا کر سکتے ہیں۔ فزیالوجی اور حیوانات کی نیچرل ہسٹری ہماری سمجھ کا در کھول سکتی ہیں۔ (....) ہم سوچ سکتے، محسوس کر سکتے، ارادہ کر سکتے، یاد کر سکتے اور اسی طرح عمل کے کسی بھی مفہوم میں عمل کر سکتے ہیں اور ان امور میں سے کسی بھی امر کو شعور میں داخل ہونے کی حاجت اور ضرورت نہیں۔ پوری زندگی اسی طرح، جیسی کہ تھی، ممکن ہوتی چاہے یہ اپنا آئینہ نہ بھی ہوتی اور اب بھی، یقیناً جیسا کہ ہمارے ساتھ ہوتا ہے، ہم اپنی زندگی کا زیادہ تر حصہ بغیر کسی قسم کی آگہی (reflection) کے، اسے شعوری سطح پر لائے بغیر، گزارتے ہیں۔ اور یہ حصہ ہماری سوچ، ہمارے جذبات و محسوسات، زندہ رہنے کی خواہش تک کو

شامل ہے، چاہے یہ بات گزرے دنوں کے فلسفیوں کو ناگوار ہی کیوں نہ گزرے۔ اگر شعور فالتو شے ہے تو پھر اس کا نصب العین اور مصرف کیا ہے؛ مجھے یہی دکھائی دیتا ہے کہ شعور کی طاقت اور شستگی انسان (یا حیوان) کے ابلاغ و ترسیل کی صلاحیت کے ہمیشہ متناسب رہی ہے اور ابلاغ و ترسیل کی صلاحیت ابلاغ و ترسیل کی ضرورت و حاجت کے مطابق۔ (....) اس مشاہدے کو درست فرض کرتے ہوئے میں یہ قیاس کرنے کی جرأت کر سکتا ہوں کہ شعور کا ارتقا و تکامل ضرورتِ ابلاغ کے دباؤ کے تحت ہوا ہے۔ کہ یہ شروع ہی سے صرف آدمی اور آدمی کے درمیان ضروری اور کارآمد (useful) تھا (حکم دینے والے آدمی اور تعمیل کرنے والے آدمی کے درمیان)، اور اس کا ارتقا بھی اسی کارآمدگی کے درجے ہی کے متناسب بھی ہوا۔ شعور درحقیقت آدمی اور آدمی کے درمیان connecting network ہے اور ایسا ہوتے ہوئے ہی اسے مرتقی و متکامل ہونا تھا، سو ہوا: تنہا آدمی کو، ایامِ تاریخ سے پہلے کے آدمی کو اس کی حاجت نہ تھی۔ یہ کہ ہمارے افعال، سوچوں، جذبات و محسوسات، حرکات یا ان کا کوئی حصہ ہمارے شعور میں داخل ہوتا ہے تو یہ عادت نتیجہ ہے اس خوف سے بھرے جبر کے تسلسل و تواتر کا جس سے انسان دوچار رہا کہ سب سے زیادہ خطرات میں گھرے ہوئے حیوان ہونے کی حیثیت میں اسے مدد کی ضرورت رہتی تھی اور بچاؤ کی بھی، اپنی ہی نوع کی مدد اور بچاؤ کی ضرورت اور اس کے لئے اپنی ضرورتوں اور حاجتوں کا اظہار لازمی تھا، اور اس کے اظہار کا طریقہ، دوسروں تک اس کے ابلاغ کا طریقہ، اپنے آپ کو سمجھوانے کا طریقہ، جانے جانے کا طریقہ ہی اس کے لئے مشکل کشا ہو سکتا تھا۔ حلِ مشکلات کے لیے اسے سب سے پہلے شعور چاہیے تھا دوسرے لفظوں میں اسے یہ "جاننے" کی ضرورت تھی کہ وہ چاہتا کیا ہے، کیا محسوس کرتا ہے، کیا سوچتا ہے (اس پر کیا گزر رہی ہے)۔ انسان، بات کو دہرانا پڑ رہا ہے، ہر ذی حیات مخلوق کی طرح مسلسل سوچتا ہے لیکن اس بات کو جانتا نہیں، اس کا شعور تک اسے نہیں ہوتا کہ وہ سوچ رہا ہے۔ جس سوچ کا اسے شعور ہوتا ہے وہ اس مسلسل سوچ کا انتہائی معمولی حصہ ہوتی ہے، سطحی حصہ، بدترین حصہ کیونکہ یہ شعور سے متصف سوچ ہی لفظوں میں، ابلاغ کی علامتوں میں رونما ہوتی ہے۔ مختصراً شعور اور زبان کا ارتقا (عقل استدلالی (Reason) کا نہیں بلکہ عقل استدلالی کی خود آگہی کا) ساتھ ساتھ ہوا ہے۔ شعور اور زبان ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر آگے بڑھے ہیں۔ اس حقیقت میں یہ اضافہ ضروری ہے کہ یہ صرف زبان ہی نہیں بلکہ نگاہ، گرفت، چہرے کے آثار چڑھاؤ بھی ابلاغ کا کام کرتے ہیں۔ پس حسی ارتسامات سے ہماری آگاہی و شعور، انہیں ٹکا رکھنے کی طاقت اور انہیں اپنے سے باہر منتقل کرنے کی صلاحیت اسی نسبت سے بڑھی ہے جس نسبت سے ان حسی ارتسامات کو دوسروں تک پہنچانے کی مجبوری میں اضافہ ہوا ہے۔ نشانات (signs) وضع کرنے والا، علامتیں (symbols) وضع کرنے والا آدمی نشانات و علامات وضع کرتے وقت پہلے سے کہیں زیادہ باشعور ہوتا ہے۔ پس بحیثیت ایک سماجی حیوان کے ہی انسان نے اپنا شعور حاصل کرنا، اپنے آپ سے آگاہ ہونا سیکھا ہے۔ یہی وہ اب بھی کر رہا ہے "زیادہ سے بھی زیادہ تر۔ میرے نزدیک، ظاہر ہے کہ شعور کا علاقہ و رشتہ، انسان بحیثیت فرد کے ساتھ نہیں، یہ کسی بھی انسان کے اندر کے فرد سے متعلق نہیں بلکہ اس کے اندر اس شے سے متعلق ہے جو اُسے اپنی کمیونٹی سے، اپنے گلے (herd) سے وابستہ رکھتی ہے اور بطور نتیجہ اس میں جو شستگی اور رُفتگی پیدا ہوئی بلکہ مرتقی ہوئی ہے وہ کمیونٹی اور گلے کے لیے کارآمد (useful) ہونے کے حوالے سے ہوئی ہے۔ پس ہم میں سے کوئی بھی شخص کمیونٹی اور گلے کے ساتھ اپنے علائق سے ماورا ہو کر بحیثیت ایک مجرد فرد کے، اپنے آپ کو جاننے کی پُرخلوص اور بہترین کوشش کے باوجود معرفتِ نفس اور عرفانِ ذات حاصل نہیں کر سکتا۔ اس کی فردیت، اس کی خودی اس پر کبھی آشکارہ ہو ہی نہیں سکتی کہ اپنے آپ کو جاننے کی کوشش کرتے وقت لامحالہ وہ اپنی فردیت کو نہیں بلکہ اپنی "اوسط" (average) کو شعور میں لے آئے گا۔[1] ہمارا

لہ "اوسط" سے مراد ہے انسان کی وہ شے، وصف، جو اُسے کمیونٹی اور گلے سے متعلق کرتا ہے اور شعور اسی "اوسط" کا تانا بانا ہے۔ محمد ارشاد

شعور، ہمارا 'نبوغِ انواع' (genius of the species)، ہماری سوچ کو ہر لمحے پامال کرتا اور اس پر اپنا ٹھپا لگاتا رہے گا اور اس کا وہی ترجمہ و تعبیر کرتا رہے گا جو اس منظر (perspective) سے ہوگی جو گلے (herd) کا ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ہمارے افعال از اول تا آخر ہر لحاظ سے، شخصی، یکتا اور بے حد و نہایت انفرادی ہوتے ہیں لیکن جونہی ہم انہیں حیطۂ شعور میں لاتے ہیں تو ہم ان کا ترجمہ کر رہے ہوتے ہیں اور وہ اپنے اصل اوصاف سے محروم اور عاری ہونے لگتے ہیں۔ یہ جیسا کہ میں سمجھتا ہوں حقیقی منظریت (phenominalism) اور مناظر (perspectives) کا اطلاق ہے۔ حیوانی شعور کی ماہیت اور نوعیت سے یہی ظاہر ہوتا ہے کہ ہم جس کائنات کا شعور رکھتے ہیں محض ایک سطح (surface)، نشانات و علائم سے بنی کائنات ہے جسے ہمارے کلی (یونیورسل)، عمومی (جنرل)، اور مشترک (کامن) شعور و آگہی نے ابلاغ کی خاطر تعمیر کر رکھا ہے۔ شعور سے مس ہوتے ہوتے ہی ہر شے پایاب، پتلی، نسبتاً بے مغز، عمومی، نشان (sign)، گلے (herd) کا وصف بن جاتی ہے۔ کسی چیز کا شعور ہونا اس چیز کو بگاڑنا اس کی تغلیط کرنا، سطحیت سے دوچار کرنا اور اسے اس کی انفرادیت سے محروم کرکے عمومیت سے ہمکنار کرنا ہے۔ آخری بات یہ ہے کہ بڑھتا ہوا شعور خطرہ ہے اور ہر وہ شخص جو انتہائی باشعور اہل یورپ میں رہتا ہے جانتا ہے کہ بہت زیادہ شعور بیماری ہے۔ جو کچھ میں کہہ رہا ہوں اسے موضوع اور معروض کے درمیان دعوی اور ردِ دعوی کے حوالے سے نہ دیکھا جائے کہ یہ تفریق ماہرینِ علمیات (epistemologists) کا کام ہے جو صرف و نحو (عوام کی مابعد الطبیعات) میں مشغول رہتے ہیں اور نہ یہ ظہور (appearance) اور شے فی نفسہ (thing in itself) کے حوالے سے کہی گئی باتیں ہیں کہ ہم اتنا زیادہ "جانتے" ہی نہیں کہ یہ فرق کرنے کے مجاز ہوں۔ اس لئے کہ ہمارے پاس کوئی ایسا عضو ہے ہی نہیں جو علم کو، "سچائی" کو ہم پر منکشف کرے۔ ہم وہی "جانتے" ہیں (یا زعم رکھتے ہیں کہ جانتے ہیں) جو انسانی گلے (herd) کے مفادات کی خاطر کارآمد ہے اور حتی کہ یہ کارآمدگی بھی بالآخر محض ایک عقیدہ، ایک خیال کرلی گئی بات ہے اور شاید قطعی طور پر بیارۂ حماقت جو ہم سب کو ایک دن تباہی سے ہمکنار کردے۔"

ہماری سوچ ترجمہ ہے اور افلاطون کی زبان میں حقیقت سے سہ گونہ دور۔ اس سے یہ نہ سمجھ لیا جائے کہ نیطشے افلاطون کی ہاں میں ہاں ملا رہا ہے۔ "حقیقت سے سہ گونہ دوری" سے نیطشے کی مراد کچھ اور ہے۔ اس کے نزدیک ہماری زبان بلکہ کسی بھی شے کے بارے میں ہمارا بیان جو ظاہر کرتا ہے وہ اس شے کے ساتھ ہمارے علائق ہیں۔ نیطشے کے نزدیک ہر لفظ علامت ہے، استعارہ ہے بلکہ علامت کی بھی علامت اور استعارے کا بھی استعارہ۔ "عصبی ہیجان (stimulus) تمثال (image) میں ڈھالا جاتا ہے۔ پہلا استعارہ (metaphor)۔ تمثال کی نقل آواز سے اتاری جاتی ہے۔ دوسرا استعارہ۔" اس بنا پر شے اور لفظ (آواز) میں تطابق ہمیشہ ناپید رہتا ہے۔ لفظ معنی کو اور معنی شے کو ٹھیک ٹھیک ظاہر کرنے سے قاصر رہتے ہیں۔ یہی وجہ ہے کہ دنیا اب تک جسے صداقت اور سچائی کہتی چلی آئی ہے نیطشے اسے التباس اور فریب کہتا ہے۔ اس کے نزدیک صداقت اور سچائی "انسانی علائق کے مجموعے کا نام ہے۔" انسانی علائق سے ماورا صداقتیں (صداقت کا کلاسیکی تصور) نیطشے کے نزدیک مفہوم سے عاری بیانات ہیں، "التباسات ہیں، وہ التباسات جن کا التباسات ہونا انسان فراموش کر چکا ہے، استعارے ہیں جو اس حد تک فرسودہ اور بوسیدہ ہو چکے ہیں کہ ان میں حسی قوت باقی نہیں رہی۔ سچا ہونے کا مطلب انہی مروجہ استعاروں کے مطابق گفتگو کرنا ہے۔ اخلاقیات (morality) کی زبان میں: بندھے ٹکے رواج کے مطابق جھوٹ بولنے کا فریضہ پورا کرنا، ایک ایسے سٹائل میں جھوٹ بولنا جو پورے گلے (herd) پر بولنا واجب ہے۔"

نطشے کے نزدیک فکر کا ہدف کوئی غیر مبہم اور غیر متغیر سچائی نہیں، نہ تحولات و تغیرات سے ماورا وجود ہے اور نہ مثالی معنی کہ سچائی، وجود اور معنی تغیر پذیر ہیں۔ ان کے نزدیک اصل کام، جسے فکر کا ہدف ہونا چاہیے ان امور کی نشاندہی ہے جو ہمیں ان رواجوں (مروجہ "سچائیوں") کی پیروی پر آمادہ رکھتے ہیں۔ پس جو بات معرض سوال میں ہے یہ ہے کہ ان رواجوں کو، ان کوڈ کو decipher کیا جائے جو ان اصطلاحات کو، "سچائیوں" سے متعلق اصطلاحات کو، قدر و قیمت سے متصف کرتا اور وہ قواعد متعین کرتا ہے جن کی پابندی کرتے ہوئے ان اصطلاحات کو استعمال کیا جاتا ہے۔ لیکن چونکہ ہم ان codes سے ناواقف رہتے ہیں اس لئے ضرورت اس بات کی ہے کہ جملہ اصطلاحات کو بحیثیت نشانات کے موضوعِ مطالعہ بنایا جائے اور اس کے لیے ہمیں ایک نئے نظریۂ ترجمانی کی ضرورت ہے۔ نطشے اسے theory of semiotics کا نام دیتا ہے، جس کا ذکر اس کی ٹیکنیکل پیچیدگیوں کی بنا پر یہاں ترک کیا جاتا ہے۔ آئندہ کسی موقعے پر اس کا اجمالی ذکر کیا جائے گا۔ (مسلسل)

دانش و حکمت

(۱) والٹیئر

(۲) عبدالعزیز خالد

(۱)

—٭— روئے زمین پر ظلم و تشدد سے بچاؤ کے لیے کوئی پناہ گاہ، کوئی حفاظتی حصار نہیں۔

—٭— ٹاسو (Tasso) کے بد خواہ زندگی بھر اسے اذیتیں پہنچاتے رہے۔

—٭— گلیلیو (Galelio) کے حاسدوں نے زمین کی حرکت دریافت کرنے کی پاداش میں ستر سال کی عمر میں اسے پسِ دیوارِ زنداں دھکیل کر آہوں اور آنسوؤں کے حوالے کر دیا اور اس سے بھی شرمناک تر یہ کہ اسے اپنے بیان سے انحراف پر مجبور کیا۔

—٭— نیکی آزادی مانگتی ہے۔ زبردستی میں کوئی نیکی نہیں اور نیکی کے بغیر کوئی مذہب نہیں —— مذہب جس کی روحِ رواں انتخاب اور آزادی ہے۔

—٭— میرے عقائد و افکار اسی طرح ہیئتِ حاکمہ سے لاتعلق ہیں جس طرح میری بیماری اور موت۔

—٭— ارسطو یوں آغازِ کلام کرتا ہے کہ: بے یقینی دانش کا سرچشمہ ہے۔

—٭— ہم خدا سے دعا و مناجات اس لیے کرتے ہیں کہ ہم نے اسے اپنے پر قیاس کر رکھا ہے۔ ہم اسے ایک بادشاہ یا سلطان کی طرح سمجھتے ہیں۔ غیظ و غضب جس کی فطرت ہے۔ انتقام جس کی عادت ہے۔ جو الحاح و زاری سے رام اور نیاز و نیائش سے، مدح و ستائش سے مائل بہ کرم ہو جاتا ہے۔

—٭— مردِ دانا صاحبِ تسلیم و رضا اور اطاعت کوش ہوتا ہے۔ ہمیں بھی اسی کی طرح توکل و قناعت کی روش اختیار کرنی چاہیے۔

—٭— میکسی مس ٹائیریس (Maximus Tyrius) کہتا ہے:

خدا کی تقدیریں ازل سے موجود ہیں۔ اگر جس چیز کی دعا کی جاتی ہے وہ اس کی تقدیرِ مُبرم کے مطابق ہے تو اس سے اس چیز کا سوال تحصیلِ حاصل ہے جس کے کرنے کا وہ ارادہ کر چکا ہے۔ اور اگر جس امر کا وہ ارادہ کر چکا ہے اس کے الٹ دعا کی جائے تو گویا اس سے کمزور ضعیف الارادہ اور متلون مزاج بننے کی درخواست کرنا ہے۔ ایسی دعا کا مطلب یہ ہے کہ اس کی شانِ خداوندی کو ایسا ہی گمان کیا جاتا ہے۔ اور یہ اس کے استخفاف کے سوا کچھ نہیں۔ یا تو ہم اس سے اس شے کی دعا کرتے ہیں جو جائز اور درست ہے تو اس صورت میں اسے بہر صورت اسے کرنا ہی چاہیے۔ اور فی الواقع یہ بغیر کسی مناجات و دعا کے ہو بھی جائے گی اور ہمارا اس کے لیے اسے پکارنا اس کی معدلت گستری پر عیاناً عدمِ اعتماد کے اظہار کے مترادف ہے۔ یا ہم جو درخواست

کرتے ہیں وہ ناواجب ہے اور اس طرح ہم اس کی جناب میں بے ادبی اور دریدہ دہنی کے مرتکب ہوتے ہیں۔ اگر رحم کرنا اس کی ذات کا تقاضا ہے تو اس سے کہنے کی کیا ضرورت ہے؟ ہم جس رحمت کے خواستگار ہیں۔ جس انعام واکرام کے امیدوار ہیں۔ یا تو اس کے حقدار ہیں یا نہیں۔ اگر ہیں تو وہ ہم سے بہتر اس بات کو جانتا ہے۔ اور اگر نہیں تو ہم مزید، ایک مزید جرم کا ارتکاب کرتے ہیں کہ جس چیز کے اہل نہیں اس کی مانگ کرتے ہیں!

(۲)

اہلِ مشرق میں بھی کچھ خوش نوا میکسی مس کے ہمنوا معلوم ہوتے ہیں:

اربابِ حاجتیم و زبانِ سوال نیست — در حضرتِ کریم تمنا چہ حاجت است؟
—— حافظ

جامِ جہاں نماست ضمیرِ منیرِ دوست — اظہارِ احتیاج خود آنجا چہ حاجت است؟
—— حافظ

سوال نیست مگر بر خزائنِ کرمش — سوال نیز چہ حاجت، کہ عالم است بہ حال
—— سعدی

چو کارساز زحاجات آگہی دارد — برائے چیست دعا وچہ سُود حرفِ سوال؟
—— ؟

شہ را ہر آنچہ باید وشاید مقرر است — بے منتِ ستائش و بے منتِ دعا
—— قاآنی

کریم! جو تجھے دینا ہے بے طلب دے دے — فقیر ہوں پہ نہیں عادتِ سوال مجھے
—— انیس

"لیکن یہ جانتے اور مانتے ہوئے کہ اللہ تعالیٰ وہی کرتا ہے۔ جو ہمارے لیے بہتر ہے کیا آپ اسے تسلیم نہ کریں گے کہ ہمیں خاص مقصد کے لیے دعا نہ مانگنی چاہیے۔ ذاتی طور پر تو میں اللہ تعالیٰ سے ہدایت کا طالب ہوں۔ اپنے لیے تکلیف سے نجات یا حصولِ عیش وراحت کے لیے دعا نہیں کرنا چاہتا۔"
اقبال بنام لمعہ
۸ نومبر ۱۹۳۵ء

کریں کیا حضور اس کے عرضِ تمنا — وہ سب دیکھتا ہے، وہ سب جانتا ہے ——

مگر یہ تو بات کہنے کا محض ایک شاعرانہ اور حکیمانہ انداز ہے۔ وگرنہ حقیقتاً "مذہب کا اساسی عقیدہ ہے کہ دعا کے ذریعے سے خفتہ روحانی قوتیں بیدار ہوتی ہیں!"۔ (اقبال)

بطور مثال حافظ کے دو شعر پیشِ خدمت ہیں۔ دوسرے شعراء کے یہاں بھی اس مضمون کے بہت شعر مل جائیں گے:

ہر گنج سعادت کہ خدا داد بہ حافظ — از یُمن دعائے شب و وردِ سحری بود

سزائے قدرِ تو شاہا بدستِ حافظ چیست بجز نیازِ شبی یا دعائے صبحدمے ؟

خود مغرب میں بہت لوگ شاعر ٹینی سن (Tennyson) کے ہم خیال ہوں گے :

دعا سے کتنے ایسے کام سر انجام پاتے ہیں کہ جن کا اہل دنیا کو گماں تک بھی نہیں ہوتا —

قرآن حکیم میں دعا و استعانت کی کتنی ترغیب و تاکید ہے :

أُجِيبُ دَعْوَةَ الدَّاعِ إِذَا دَعَانِ ۲ : ۱۸۶

پکارتا ہے مجھے جب پکارنے والا

تو میں پکار کا اس کی جواب دیتا ہوں

(دعا کو اس کی بلاشک قبول کرتا ہوں)

پکارے جب کوئی اس کی پکار کو پہنچوں

اُدْعُوا رَبَّكُمْ تَضَرُّعًا وَّخُفْيَةً ۷ : ۵۵

پکارو اپنے رب کو گڑگڑاتے اور چپکے

سکوت و لجاجت سے اپنے خدا کو پکارو —

فَادْعُوا اللهَ مُخْلِصِينَ لَهُ الدِّينَ ۴۰ : ۱۴

خدا کی عبادت کو خالص بنا کر اس کے لیے

تم پکارو اسے

اُدْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ ۴۰ : ۶۰

کرو (اے میرے بندو!) مجھ سے دعا

میں قبولیت اس کو بخشوں گا

رسولِ اکرمؐ کے اس ضمن میں متعدد ارشادات ہیں :

إِنَّ اللهَ يُحِبُّ أَنْ يُّسْئَلَ

پسند اس بات کو کرتا ہے اللہ

سوالی بن کے مانگا جائے اس سے

کرتا ہے سوال کو خداوند پسند —

مَنْ لَمْ يَسْئَلِ اللهَ يَغْضَبْ عَلَيْهِ

جو اللہ سے نہ مانگے

ہو اللہ اس پہ غصے

کرے سوال نہ اللہ سے جو، وہ اس پہ خفا ہو

مَنْ لَمْ يَدْعُ اللهَ سُبْحَانَهُ غَضِبَ عَلَيْهِ

دعا جو نہ مانگے ، نہ اس کو پکارے جو کوئی اس پر

غضب ناک ہو پاک پروردگار

إِنَّ الدُّعَاءَ هُوَ الْعِبَادَةُ ثُمَّ قَرَأَ : وَقَالَ رَبُّكُمُ ادْعُونِي أَسْتَجِبْ لَكُمْ

(۴۰ : ۶۰)

دعا ہی عبادت ہے بے شک۔ پڑھا پھر :
تمہارے خدا نے کہا : تم پکارو مجھے
تم کو دوں گا میں اس کا جواب
—— مجھ کو پکارو دوں گا جواب اس پکار کا

اُدْعُوا اللّٰهَ وَ اَنْتُمْ مُوقِنُونَ بِالْاِجَابَةِ وَ اعْلَمُوا اَنَّ اللّٰهَ لَا يَسْتَجِيبُ دُعَاءً مِنْ قَلْبٍ غَافِلٍ

کرو اللہ سے دعا رکھ کے اجابت کا یقیں
مگر اس بات کو بھولو نہ کبھی
قلبِ غافل کی دعا کو نہیں کرتا وہ قبول
—— (دعا قلبِ غافل کی پائے نہ حسنِ قبول)

اُدْعُ تُجَبْ وَسَلْ تُعْطَ

دے اسے آواز آئے گا جواب
کر دعا اس سے کرے گا مستجاب
(کر سوال اس سے کرے گا وہ عطا)

اَلدُّعَاءُ مُخُّ الْعِبَادَةِ

دعا مغزِ عبادت ہے
—— جوہر ہے عبادت کا دعا
—— دعا ہے عبادت کا لُبِّ لُباب

اَلدُّعَاءُ رَغْبَةٌ اِلَى اللّٰهِ

دعا درحقیقت ہے رغبت خدا کی طرف

لَيْسَ شَيْئٌ اَكْرَمَ عَلَى اللّٰهِ سُبْحَانَهُ مِنَ الدُّعَاءِ

دعا سے زیادہ کوئی شے مکرّم نہیں بارگاہِ خدا میں

اَشْرَفُ الْعِبَادَةِ الدُّعَاءُ

سب سے اشرف عبادت دعا ہے

اَلدُّعَاءُ يَرُدُّ الْبَلَاءَ

ٹل جائے دعا سے ہر بلا و آفت

— دعا توڑ ہے ہر بلا کا
لا یَرُدُّ القضاءَ اِلّا الدُّعاءُ
تاثیر دعا سے
ٹل جائے قضا بھی
— طاقت ہے دعا میں
تغییر قضا کی
— قضا کو پھیرنے والی ہے کوئی شے تو دعا
— دعا ہی امر مقدر کو ٹال سکتی ہے
اَلدُّعاءُ یَنفَعُ مِمّا نَزَلَ وَ مِمّا لَم یَنزِلْ فَعَلَیکُم یا عِبادَ اللّٰہِ بِالدُّعاءِ
بلائے آمدہ، ناآمدہ دونوں کے حق میں ہے دعا نافع
خدا کے بندو! (اس کے ماننے والو!)
دعا سے مت کرو غفلت
اِیّاکَ وَالسَّجعَ فِی الدُّعاءِ
فَانظُرِ السَّجعَ مِنَ الدُّعاءِ فَاجتَنِبہُ
آرائشِ بیاں سے دعا میں کر اجتناب!

الحاصل:
دعا کثرت سے کرتا رہ
نجانے کب قبولیت کی آجائے گھڑی خالد!
— دعا زادِ سفر ہے رہگزارِ عمر میں میرا!
— ہے مرا رختِ سفر جادۂ ہستی میں دعا!

اُردو میں ہائیکو نگاری

ڈاکٹر مرزا حامد بیگ

اُردو دنیا میں اس وقت، جاپانی صنفِ سخن "ہائیکو" ردّ و قبول کے نازک موڑ پر ہے۔ ہمارے ہاں زوال تنقید کے عدم وجود کے سبب اس اہم مرحلے پر مفروضوں اور غلط فہمیوں کا جنم فطری بات ہے اور شعری توانائیوں کے اکارت چلے جانے کا خیال، بھرپور نکالے کا طالب۔ لہٰذا میری اس تحریر میں سنجیدہ سکالے کے آغاز کے طور پر چند مفروضے اور غلط فہمیاں، نیز اُن کے پیدا کردہ بنیادی اُلجھیڑے زیرِ بحث آئیں گے۔ مثلاً یہ کہ:

۱۔ ہمارے ہاں عام طور پر یہ تصور پایا جاتا ہے کہ ہائیکو جاپان کی سب سے مقبول ادبی صنفِ سخن ہے۔ جبکہ حقیقت میں ایسا نہیں۔

۲۔ یہ فرض کر لیا گیا ہے کہ ہائیکو کے پہلے مصرعے میں پانچ، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ صوتی آہنگ ہوتے ہیں۔ یعنی ہائیکو کا پہلا اور تیسرا مصرعہ برابر اور درمیانہ مصرعہ بقدرِ دو صوتی آہنگ اُن سے بڑا ہوتا ہے۔

۳۔ یہ بھی ایک مفروضہ ہے کہ اُردو میں ہائیکو کا تعارف محض گزشتہ بیس پچیس برس قبل کا قصہ ہے۔

۴۔ ہمارے بعض شعراء نے یہ فرض کر لیا ہے کہ یہ محض تین مصرعوں کی ایک صنف ہے، اور جس طرح چاہیں تین مصرعے موزوں کر کے ہائیکو لکھی جا سکتی ہے۔

۵۔ اس تصور کو بھی ایک غلط فہمی ہی کہنا چاہیے کہ اردو میں محض بحرِ متقارب یعنی:

فِعلُن فِعلُن فَع : ۵
فِعلُن فِعلُن فِعلُن فَع : ۷
فِعلُن فِعلُن فَع : ۵

اس صنف کا قریب ترین وزن و آہنگ ہے۔

۶۔ پھر یہ بھی ایک غلط فہمی ہے کہ (ہائیکو کے موضوع کے اختصاص خصوصاً مناظرِ فطرت سے) جاپانی لوگوں نے زندگی کے جمالیاتی پہلوؤں سے شوقِ لطف اندوزی کے سبب اس طرف رجوع کیا، اور ہمارے لیے ایسا ممکن ہے۔

۷۔ ہمارے چند ناقدین کو یہ غلط فہمی بھی ہے کہ ہائیکو، ایک ہی طویل لائن میں لکھی جا سکتی ہے۔

جاپانی شاعری کی مختصر ترین صنفِ سخن "ہوک کو" ہے، جس نے بعد میں (۱۸۹۰ء) "ہائیکو" نام پایا۔ یہ درحقیقت ملایا کے شعراء کی ایجاد ہے، جو طویل نظم (ہائی کائی) کی تشبیب کے طور پر پانچویں صدی عیسوی تک جاپان میں پھلی پھولی۔ یہ الگ قصہ ہے کہ آج ملایا کے شعراء

اس صنف کے نام سے بھی آشنا نہیں۔

یہ بات یاد رکھنے کی ہے کہ جاپان میں ہائیکو کی مقبولیت کے باوجود یہ الگ سے کوئی صنف نہ تھی بلکہ "ہائی کائی" (طویل نظم) کا ابتدائی حصہ، یعنی پہلا بند ہوا کرتی تھی۔ "ہوک کو" کے معنی بھی شعرِ اولیٰ کے ہیں۔ جیسے ہماری غزل کا مطلع، جو غزل کی پہلی کڑی ہے۔ یا جس طرح عربی شاعری میں غزل، قصیدے کی تشبیب کا حصہ تھی اور بعد میں ایک الگ صنفِ سخن کے طور پر پھولی پھلی۔

جاپانی ہائیکو مقفیٰ نہیں، معریٰ ہوتی ہے۔ نیز پوری بات کہنے کے بجائے صرف اشاروں یا ادھورے جملوں سے کام لیا جاتا ہے۔ مصرعوں کے بیچ شاعر کے پیدا کردہ معنوی ابعاد کو ہائیکو کا قاری اپنے گیان دھیان کے ذریعے پورا کرتا ہے اور یوں شاعر کے تخلیقی عمل میں شراکت دار بنتا ہے۔

"ہوک کو" (ہائیکو) کے پہلے معلوم اور قابلِ ذکر شاعر سوگان (۱۴۵۸ء - ۱۵۴۶ء) کے بعد جاپان میں بھی، چھٹی صدی عیسوی کے اختتام تک "ہوک کو" بطور ایک صنفِ سخن یا شعرِ اولیٰ کے، اپنے عروج تک پہنچ کر مقبولیت کھو بیٹھی۔ ساتویں اور آٹھویں صدی عیسوی میں (چند ایک استثنائی مثالیں چھوڑ کر) جاپانی شعراء نے "ہوک کو" کے بغیر طویل نظمیں لکھیں اور یا پھر "بنٹن" (BANTUN) کی صنف پر توجہ دی۔

مجموعی طور پر نویں صدی عیسوی تا سترھویں صدی عیسوی کے اوائل تک جاپان میں "بنٹن" اور "ہوک کو" خال خال ہی لکھی گئیں۔ جس کا واحد سبب یہ تھا کہ طویل نظموں میں "بنٹن" اور "ہوک کو" کی جگہ ایک اور قدیم مختصر صنفِ سخن "تنکا" نے لے لی۔ "تنکا" کو "واکا" بھی کہا جاتا ہے۔ تنکا یا واکا کے ۳۱ ارکان ہیں جو ۵ - ۷ - ۵ - ۷ - ۷ کی ترتیب سے آتے ہیں۔

"ہوک کو" کو بطور ایک صنفِ سخن دوسرا عروج باشو کے طفیل ۱۷ ویں صدی عیسوی کے وسط میں ملا۔ جب بقول ایک جدید جاپانی شاعر اور ناقد کازو ساتو، "جاپانی معاشرے میں تاجرانہ کلچر عروج پر تھا۔"[۵] "ہوک کو" پہلے بڑے شاعر باشو کے بعد ۱۸ ویں صدی عیسوی میں ایسا (ISSA) اور بوسون (BUSON) نے "ہوک کو" نگاری میں شہرت پائی۔

۱۹ ویں صدی میں "ہوک کو" کو تیسری بار نظریہ ساز شاعر ماسا اوکا شیکی نے ۱۸۹۰ء میں عروج دلایا اور اسی زمانے میں "ہوک کو" نے طویل نظم (ہائی کائی) سے الگ ہو کر "ہائیکو" کے نام سے باقاعدہ صنفِ سخن کا درجہ پایا۔ لیکن اب ہائیکو کو مغرب کی جدید شعری اصناف کا سامنا تھا۔ خاص طور پر فری ورس (آزاد نظم) نے ہائیکو کے لیے مشکلات پیدا کر دیں۔ جاپان کے بڑے شعراء نے آزاد نظم کو "گنیداشی" کے نام سے اپنانا شروع کر دیا۔ بے شک دوسری جنگِ عظیم (۱۹۴۱ء) تک ہائیکو عوام میں مقبول رہی لیکن خالصتاً ادبی درجہ بندی میں اس صنف کا شمار دوسرے یا تیسرے درجے پر کیا جاتا تھا۔ جاپان اور چین کی جنگ (۱۹۲۰ء) کے دوران جاپان سرکار نے عوام میں حُب الوطنی کا جذبہ اُبھارنے کی خاطر ہائیکو شعراء کو جنگ کی حمایت پر مجبور کیا۔ چند ایک نے حکومت کا ساتھ بھی دیا البتہ ہائیکو ایسوسی ایشن، کیوسو یونیورسٹی کے عدم تعاون کے سبب اس کے لگ بھگ ایک درجن شعراء گرفتار ہوئے۔ یہی صورت دوسری جنگِ عظیم (۱۹۴۱ء) کے دوران پیش آئی۔ لیکن ان وقوعوں کا تجزیہ عوام میں مقبولیت اور ادبی درجہ بندی کی دو الگ الگ سطحوں پر کرنا چاہیے۔ ہمارے ناقدین ان دو الگ الگ سطحوں کو باہم گڈمڈ کر دیتے ہیں اور یہ نتیجہ برآمد کرتے ہیں کہ ہائیکو اس دور میں درجہ اوّل کی صنفِ اظہار بنی رہی۔

۲۰ ویں صدی عیسوی کے نصف اوّل میں خالصتاً ادبی درجہ بندی میں "تنکا" اور "گنیداشی" (GENADASHI) سرفہرست تھیں۔ آرتھر ویلی (۱۸۸۹ء - ۱۹۶۶ء) مترجم "جاپان کے نوہ ڈرامے" نے معاصر جاپانی شاعری کا جائزہ لیتے ہوئے "تنکا" کے متعلق لکھا تھا:

"جاپانی شاعری کا حُسن اس فن کارانہ پختگی سے عبارت ہے، جس سے اُن کے ہاں خیال اور آواز کے

امتزاج کو ایک مخصوص شعری پیکر میں ڈھال دیا جاتا ہے۔ تنکا (TANKA) جاپانی شاعری کی بحور میں یوں سما جاتا ہے جیسے پارہ جھریوں میں بھر جائے!!

صنف "تنکا" کی اس بے مثال کامیابی کو دیکھتے ہوئے ۱۹۴۷ء میں "جدید ہائیکو انجمنِ شعرا" کا قیام عمل میں آیا، جس نے طے شدہ پروگرام کے تحت باقاعدہ منصوبہ بندی کرتے ہوئے روایتی ہائیکو کے تین مصرعوں میں جدید دور کی رنگا رنگی کو سمونا چاہا اور موسم کے متعلقات کو یکسر ترک کرنے کا کام کیا، تو ہائیکو کی حالت مزید زبوں ہو گئی۔

اس وقت گینڈیشی (آزاد نظم) کے مقابلے میں ہائیکو اور تنکا کو وہ اہمیت حاصل نہیں جو کسی زمانے میں تھی۔ یہی حالت تنکا کی صنف میں شعرا کی اجتماعی کوششوں بعنوان "رینگا" کی ہے۔ متعدد شعرا کی اجتماعی کوششوں یعنی تنکاؤں کے مجموعے کو رینگا کہتے ہیں۔

ادبی سطح پر روایتی اصنافِ سخن از قسم "تنکا" اور "ہائیکو" کے مقابلے میں گینڈیشی (آزاد نظم) کی مقبولیت اور کامیابی کے اسباب پر غور کریں تو پتا چلتا ہے کہ عالمی سطح پر آزاد نظم کی مقبولیت اور چلن کو دیکھتے ہوئے جاپان کے پیشہ ور شعرا نے اسے اپنایا۔ گینڈیشی کے ارکان کی کوئی مقررہ تعداد نہیں۔ نظم کے اختصار یا طوالت پر بھی کوئی قید نہیں، یعنی ہیئت کے اعتبار سے اسے نظمِ آزاد کہہ لیں۔

کسی بھی صنف کی اہمیت اور مقبولیت کو جانچنے کا واحد پیمانہ ادبی جرائد ہی ہوتے ہیں۔ جدید جاپانی شاعر اور ناقد کازو ساتو کے مطابق اس وقت گینڈیشی سب سے مقبول صنفِ اظہار ہے جس کے ہر سال لگ بھگ نو سو جرائد شائع ہوتے ہیں۔ دوسرے نمبر پر ہائیکو ہے، جس کے سات سو اور تنکا کے لگ بھگ چھ سو جرائد ہر سال شائع ہوتے ہیں۔ لیکن مقبولیت بھی کوئی پیمانہ نہیں۔ اہمیت کے اعتبار سے دیکھیں تو پتا چلتا ہے کہ ہائیکو کی صنف پیشہ ور شعرا کے ہاں بہت کم دیکھنے کو ملتی ہے۔ ہائیکو کے زیادہ تر شعرا کسان، انجینئر، اساتذہ اور گھریلو خواتین ہیں۔ جاپان کے بڑے ادبی جرائد میں گینڈیشی (نظمِ آزاد) اور اخبارات کے ہفتہ وار ایڈیشنوں میں ہائیکو اور تنکا جگہ پاتی ہیں۔

جاپان ثقافتی مرکز کے شائع کردہ اردو ہائیکو کے تین مجموعے بغور دیکھیں تو معلوم ہوتا ہے کہ ہائیکو کا انتخاب کرتے وقت تین مصرعوں پر مشتمل ہائیکو ہی کا انتخاب کیا گیا۔ یعنی ہائیکو کے انتخاب میں کلاسیکی مکتبِ فکر کو فوقیت دی گئی۔ جب کہ جاپان میں چار اور پانچ مصرعوں پر مشتمل ہائیکو بھی لکھی گئی۔

دوسری بات یہ کہ ان تین مصرعوں پر مشتمل منتخب ہائیکو سے یہ قطعاً طے نہیں ہوا کہ لازمی طور پر ہائیکو کے پہلے مصرعے میں پانچ، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پانچ صوتی آہنگ ہوتے ہیں۔ پھر یہ بات ہم نے کیسے طے کر لی کہ ہائیکو کا پہلا اور تیسرا مصرعہ برابر اور درمیانہ مصرعہ بقدر دو صوتی آہنگ ان سے بڑا ہوتا ہے؟ جاپان کے اکثر ہائیکو شعرا کے ہاں تین مصرعے اس ترتیب سے مختلف صوتی آہنگ کے بھی دیکھے جا سکتے ہیں۔ بعض شعرا کے ہاں پہلا مصرع دوسرے اور تیسرے مصرعے سے طویل ہے اور کہیں تینوں مصرعے برابر یعنی ہم وزن۔ یہی نہیں، بلکہ بعض شعرا نے تو اٹھارہ تا بیس صوتی آہنگ بھی برتے ہیں۔ یوں یہ بات طے ہے کہ قدیم اور جدید جاپانی ہائیکو میں ہیئت کی سطح پر کوئی چیز مشترک نہیں، جس سے اردو ہائیکو شعرا کے لیے کوئی اصول سازی ممکن ہو۔

اب آئیے اس اہم معاملے کی طرف، جسے اردو کے نظریہ ساز ہائیکو شاعر ڈاکٹر محمد امین نے بھی تسلیم کیا ہے کہ کلاسیکی مکتبِ فکر کے مقابلے میں جاپانی شاعر اور ناقد ہے کی گو دو نے چار مصرعوں کی ہائیکو کو رواج دیا جو پانچ پانچ، تین، پانچ (۵-۵-۳-۵) کی ترتیب میں اٹھارہ صوتی آہنگ کی حامل ہائیکو تھی۔

یوں یہ معاملہ یہیں پر ختم نہیں ہو جاتا بلکہ ہیئت کی سطح پر ہے کی گو دو کی اس بغاوت کے بعد فری ورس سے متاثر ہو کر جاپان کے نئے شعرا نے جو ہائیکو لکھی، وہ پانچ مصرعوں تک چلی گئی اور صوتی آہنگ بھی مرضی سے چُنے گئے۔

اس صورت حالات میں ہمارے ناقدین کا وثوق کے ساتھ یہ کہنا کہ یہ محض تین مصرعوں کی صنفِ اظہار ہے، قطعاً درست نہیں۔ اسی طرح یہ بھی کس نے طے کیا کہ ہائیکو محض اسماء پر مشتمل ہوتی ہے، یا یہ کہ ہائیکو کا اختتام بہرصورت اسم پر ہونا چاہیے؟ جاپان سے اس کی مثال پیش نہیں کی جاسکتی۔ ہائیکو کا اختتام اسم، فعل یا حرف پر ہوسکتا ہے۔ یعنی کلمہ کی کوئی بھی صورت اختتام پر برتی جاسکتی ہے۔

اب آئیے ہائیکو کے اردو میں چلن / آغاز کی طرف۔ ہمارے محققین اور ناقدین کی تحریروں میں یہ غلط فہمی جڑیں کر چکی ہے کہ اردو میں طبع زاد ہائیکو کے اوّلین نمونے بھارت کے نظم گو شاعر قاضی سلیم نے "تحریک" دہلی، بابت: جولائی ۱۹۶۶ء میں پیش کیے۔ لگے ہاتھوں قاضی سلیم کے ہائیکو بھی دیکھتے چلیں:۔

(۱)

آج تم = فاعلن = ۳

میری یادوں کا اثاثہ ہو = فاعلاتن فعلاتن فَ = ۹

کٹی فصل کا مالک ہوں میں = علاتن فعلاتن فعلن = ۹

(۲)

عکس جو ڈوب گیا = فاعلاتن فعلن = ۷

آئینوں میں تھیں = فاعلاتن فَع = ۶

آنکھوں میں اُتر کر دیکھو = لاتن فعلاتن فعلن = ۸

یاد رکھنے کی بات ہے کہ ہمارے ان قاضی سلیم (۱۹۶۶ء) سے بھی پندرہ برس قبل سعید احمد اعجاز "ہمایوں" لاہور، بابت: جولائی ۱۹۵۱ء میں اُردو کے پہلے ہائیکو نگار شاعر کے طور پر سامنے آئے۔ "ہمایوں" کے اس شمارے میں ان کی دو ہائیکو شائع ہوئیں، جن میں سے ایک ماخوذ اور دوسری طبع زاد ہے۔ البتہ اس وقت تک ہائیکو سے مخصوص اوزان / بحور یا سلیبل کا نظام ان پر واضح نہ تھا۔ یہی صورت قاضی سلیم کی مندرجہ بالا دونوں ہائیکو میں بھی دیکھی جاسکتی ہے۔ اب ملاحظہ ہو، سعید احمد اعجاز کی ہائیکو:۔

جھوٹا دل

پوچھا یہ دل سے میں نے گزرتی ہے کس طرح؟
اور دل نے یہ کہا: "شاداب سیب سُرخ ہو بُستاں میں جس طرح"
لیکن یہ جھوٹ تھا

(ماخوذ: از سعید احمد اعجاز)

بیگانگی

چُرا لیتا ہے آنکھیں
مرے غم سے تبسّم
گزر جاتے ہو یونہی مرے نزدیک سے تم

(طبع زاد: از سعید احمد اعجاز)

درحقیقت ہمارے ہاں ہائیکو کا چرچا اُس وقت ہُوا، جب جنوری ۱۹۳۶ء میں شاہد احمد دہلوی نے ماہنامہ "ساقی" دہلی کا جاپان نمبر شائع کیا۔ اردو میں ہائیکو کے اوّلین ناقدین کے طور پر منصور احمد اور فضل حق قریشی کے نام نمایاں تر ہیں۔ گو اسی دور میں نیاز فتح پوری اور کلیم الدین احمد نے بھی ہائیکو کو سراہا۔

منصور احمد نے ہائیکو کا تعارف کرواتے ہوئے لکھا:

"ہاکو (ہائیکو) نظمیں دنیا بھر میں سب سے چھوٹی نظمیں ہیں۔ ان میں الفاظ کی بھرمار نہیں ہوتی۔ سترہ ارکان کے تین مصرعوں پر نظم ختم ہو جاتی ہے۔ لیکن پڑھنے والے کے لیے بین السطور میں تخیل کا ایک دفتر پنہاں ہوتا ہے۔" ۵

فضل حق قریشی نے ہیئت پر بات کرتے ہوئے بتایا:

"اس نظم کے صرف تین مصرعے ہوتے ہیں اور تینوں مصرعوں کے "بولوں" کی کل تعداد سترہ مقرر ہے۔ یعنی پہلے میں پانچ، دوسرے میں سات اور تیسرے میں پھر پانچ۔" ۶

اُردو میں ہائیکو کی صنف کو ترجمے کی معرفت متعارف کروانے میں حمید نظامی (بانی "نوائے وقت" گروپ) کو اوّلیت حاصل ہے۔ حمید نظامی نے "ہمایوں" لاہور بابت: اکتوبر ۱۹۳۸ء کے صفحہ ۷۵۹ اور ۷۶۰ پر "جاپانی" کے عنوان سے سات ترجمہ شدہ ہائیکو شائع کروائیں۔ "ہمایوں" کو اشاعت کی غرض سے تراجم عنایت کرتے وقت حمید نظامی نے تین مصرعوں کی پابندی نہیں کی۔ بہت ممکن ہے ان کی ترجمہ کردہ ہائیکو کو کتابت کرتے وقت کاتب نے یہ کارگزاری دکھائی ہو، یا حمید نظامی کی ترجمہ کردہ ہائیکو کلاسیکی ہیئت کی حامل نہ ہوں۔ لیکن یہ ہی ہائیکو اس لیے کہ جن شعراء کے تراجم پیش کیے گئے ہیں وہ ہائیکو شعراء ہیں:

ایک سوال

تم تنہا خزاں کے پہاڑ کو کیسے عبور کر سکو گی؟
وہ تو اس وقت بھی بڑا دشوار گزار تھا
جب ہم دونوں اکٹھے وہاں گئے تھے

(می نیاشو / حمید نظامی)

میری محبت

میری محبت اس گھاس کی طرح ہے جو پہاڑ کی گہرائیوں میں پوشیدہ ہے
اگرچہ یہ روز بروز بڑھ رہی ہے لیکن کسی کو اس کا علم نہیں

(کاکن شو / حمید نظامی)

گُلِ لازوال

دنیا میں صرف انسان کا دل ہی ایک ایسا پھول ہے
جو کبھی نہیں مرجھائے گا

(کاکن شو / حمید نظامی)

وہ صبح

میں جانتا ہوں کہ دن بہت جلد ختم ہو جائے گا
اور رات واپس آ جائے گی
اس کے باوجود مجھے اُس صبح سے کتنی نفرت ہے جو
مجھے یہاں سے چلے جانے کا حکم دے گی

(ہیاکونن شو / حمید نظامی)

❖

اے تیزی سے گرنے والی شبنم!
کیا میں اس ذلیل زندگی کو تجھ سے دھو سکتا ہوں؟

(باشو / حمید نظامی)

❖

اے جھینگر!
تیری مسرور آواز سے
کسی کو شک بھی نہیں گزر سکتا کہ تو بہت جلد مر جائے گا

(باشو / حمید نظامی)

حمید نظامی کی ترجمہ شدہ درج بالا ہائیکو اگر ہیئت کی سطح پر کسی خاص مکتبِ فکر کی حامل دکھائی نہیں دے رہیں تو اس کی ایک وجہ یہ بھی ممکن ہے کہ جاپانی تراجم میں ہائیکو ایک طویل لائن / مصرعہ کی صورت لکھنے کا رواج بھی رہا ہے۔ بہت ممکن ہے کہ اصل جاپانی متن انگریزی کی معرفت حمید نظامی کے سامنے ایک طویل لائن میں آیا ہو۔

اپریل ۱۹۳۸ء میں ہائیکو کو ترجمے کی معرفت متعارف کروانے کے بعد حمید نظامی نے وقفے وقفے کے ساتھ ہائیکو کے متعدد ترجمے کیے۔

❖

جب یہ امر واقع ہے
کہ ہر ذی روح
بالآخر موت کا شکار ہو گا
تو جب تک دَم میں دَم ہے
آؤ ہم عیش کریں

(نام ندارد / حمید نظامی "ہمایوں" جنوری ۱۹۴۰ء)

محبوب سے

تم بادلوں میں چمکنے والی
بجلی کے مانند ہو!

جب میں تمہیں دیکھتی ہوں تو سہم جاتی ہوں
اور اگر نہ دیکھوں تو اداس رہتی ہوں

(نام ندارد/ حمید نظامی۔ "ہمایوں" مارچ ۱۹۴۰ء)

پہلی بار یہ ترجمہ بغیر عنوان کے شائع ہوا تھا۔ عنوان کے ساتھ اسی ترجمے کو "ہمایوں" بابت: جون ۱۹۴۰ء صفحہ ۵۰۴ پر ملاحظہ کیا جا سکتا ہے۔

∴

اے کاش! میرے بعد
آنے والی نسلیں
ہرگز ہرگز عشق کے دام میں
گرفتار نہ ہوں
آہ! میری محبت کا انجام

(نام ندارد/ حمید نظامی "ہمایوں" مارچ ۱۹۴۰ء صفحہ ۲۳۱)

∴

یہ خواب کی ملاقاتیں
کتنی یاس انگیز ہیں
جب دفعتہً بیدار ہو کر
میں ادھر اُدھر دیکھتا ہوں
تو کچھ بھی نظر نہیں آتا

∴

اگرچہ تم مجھ سے
پرسوں ملے تھے
اور کل اور آج بھی
تاہم میں تم سے کل پھر
ملنا چاہتا ہوں

(نام ندارد/ حمید نظامی "ہمایوں" جولائی ۱۹۴۰ء صفحہ ۴۸۰)

درج بالا تراجم میں بھی ہیئت کی پابندی نہیں کی گئی، محض شعری حُسن کی ترسیل مقصود ہے۔ اسی طرح ہائیکو کا ایک ترجمہ میراجی سے بھی یادگار ہے:

∴

ہرکارہ ستیاں سے لایا

جوہی کے پھولوں کی ڈال
اور سندیسہ بھول گیا

یہ تو ہوئے اولیت کے معاملات۔ اب اس تصور کو بھی ایک غلط فہمی ہی کہنا چاہیے کہ ہمارے محققین اور ناقدین نے محض بحرِ متقارب یعنی:

فعلن فعلن فع : ۵
فعلن فعلن فعلن فع : ۷
فعلن فعلن فع : ۵

اور بحرِ خفیف مسدس یعنی: فاعلاتن مفاعلن فعلن، کو ہی اردو ہائیکو کے لیے مناسب کلاسیکی وزن و آہنگ خیال کیا۔ اب اگر ۵۔ ۷۔ ۵ کے صوتی آہنگ ہی برتنے ہیں اور ۱۷ ارکان ہی کی جستجو ہے، تو یہی دو بحریں کیوں؟ بحرِ ہزج اور بحرِ رمل کیوں نہ برتی جائے؟؟

بھارت کے شاعر ناوک حمزہ پوری نے اپنے ہائیکو میں بحرِ ہزج برتی ہے۔ ملاحظہ ہو:

دروپدی کی	مفاعلن فع
دشاسنوں میں گھری	مفاعلن فاعلن
رواں صدی بھی	مفاعلن فع

۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵	۱۷ ارکان
دَ - رو - پ - دی - کی	
۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷	
و - شا - س - نو - مے - گ - ری	
۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵	
ر - وا - ص - دی - بی	

ناوک کی اس ہائیکو میں لفظ "دشاسنوں" کا نون غُنّہ، "گھری" کی ہائے مخلوط، "رواں" کا نون غُنّہ اور "بھی" کی ہائے مخلوط تقطیع میں نہیں۔

اب آئیے ان دو شعراء کا بھی کچھ ذکر ہو جائے، جنہیں اردو ہائیکو لکھنے والوں میں اہم شمار کیا جاتا ہے۔ پاکستان کے محسن بھوپالی نے بحرِ متقارب کو برتا ہے۔

بچھڑی پھر مل کر	فعلن فعلن فع
آخر کب تک رہ سکتی	فعلن فعلن فعلن فع
شبنم پتوں پر	فعلن فعلن فع

۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵
بچ - ڑی - پر - مل - کر
۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷ ۱۷ ارکان
آ - خر - کب - تک - رہ - سک - تی
۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵
شب - نم - پت - تو - پر

محسن بھوپالی کی اس ہائیکو میں "بچھڑی" اور "بھر" کی ہائے مخلوط اور "پتوں" کا نونِ غنہ تقطیع سے خارج ہے۔ جب کہ دوسرے مصرعے میں لفظ "سکتی" کی کمی بُری طرح کھٹکتی ہے۔ اصولاً یہ لائن یوں ہونا چاہیے تھی۔ "آخر کب تک رہ سکتی تھی"۔ اسے عجزِ بیان نہ کہیں، لیکن عروض کی پابندیاں تو رکاوٹ کھڑی کر ہی رہی ہیں۔

اب دیکھیے بھارت کے نظریہ ساز شاعر کرامت علی کرامت کی ایک ہائیکو :-

زندگی ہے کیا	فاعلات فع
پوچھتی ہے شاعری	فاعلات فاعلن
آگہی ہے کیا	فاعلات فع

۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵
زن - د - گی - ہ - کا
۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵ - ۶ - ۷ ۱۷ ارکان
پو - چ - تی - ہ - شا - ع - ری
۱ - ۲ - ۳ - ۴ - ۵
آ - گ - ہی - ہ - کا

کرامت کی اس ہائیکو میں لفظ "ہے"، جو تینوں مصرعوں میں موجود ہے، کی ہائے مجہول، "پوچھ" کی ہائے مخلوط اور "کیا" کی یائے مخلوط تقطیع سے باہر ہیں۔

کرامت علی کرامت کی اس ہائیکو کو بحرِ رمل کے سالم و محذوف و مجحوف ارکان سے بھی تقطیع کر کے دیکھ لیتے ہیں۔

زن - د - گی - ہے - کا	فاعلاتن فع
پو - چ - تی - ہے - شا - ع - ری	فاعلاتن فاعلن
آ - گ - ہی - ہے - کا	فاعلاتن فع

بحرِ رمل میں بھی ہائے مجہول، ہائے مخلوط اور یائے مخلوط تقطیع سے باہر ہیں۔

یہ بات تسلیم کہ ان تینوں شعراء کو رعایت مل سکتی ہے اور ہمارے عروضی نظام میں اس نوع کی چھوٹ ملتی آئی ہے اور اس کی اجازت ہے۔ لیکن بات وہیں رہی کہ ہم کلی طور پر کامیاب نہیں ہوئے۔

ان مجبوریوں کے پیشِ نظر، نزدیک ترین آہنگ کی تلاش میں سرگرداں، ہمارے ایک نوجوان شاعر رفیق سندیلوی نے کارکردن

کے مصداق مجھے اپنی دو ہائیکو عطا کیں اور مجھ سے اس بات کی تائید چاہی کہ اُردو ہائیکو کے لیے کیوں نہ یہ پیمانہ مقرر کر لیا جائے کہ :

۱۔ دو حرفی سلیبل الگ الگ ہو۔ اس لیے بھی کہ جاپانی زبان ایک طرح سے ٹیلی گرافک زبان ہے اور اس کا منفرد ذائقہ بھی اُردو ہائیکو میں برقرار رکھا جائے۔

۲۔ اس اہتمام کے باوجود ۵۔۷۔۵ ارکان کی ترتیب رہے۔

۲۔ آہنگ بھی نہ ٹوٹنے پائے۔

اب اس پیمانے پر بھی ان کی عطا کردہ دونوں ہائیکو پرکھتے ہیں۔ آپ بھی دیکھیے :۔

ہر ستارے میں	فعلن فعلن فع
اکثر باتیں ہوتی ہیں	فعلن فعلن فعلن فع
تیرے بارے میں	فعلن فعلن فع

آخر الذکر دونوں دعاوی بجا، لیکن ستارے کے لفظ میں تشدید ہے۔ یوں دو دو سلیبل الگ کیوں کر رہے؟

اب رفیق سندیلوی کی دوسری ہائیکو دیکھیے :۔

بابرکت ہے دن	فعلن فعلن فع
جالی والے آنگن پر	فعلن فعلن فعلن فع
بوندوں کی رِکن بِن	فعلن فعلن فع

پہلے مصرعے میں پہلے فعلن کی ساؤنڈ "بابر" اور دوسرے فعلن کی ساؤنڈ "کت" بنتی ہے، جب کہ لفظ "بابر۔کت" نہیں، "بابرکت" ہے۔ اس میں فعلن کا "لُن" جھول رہا ہے اور "لُنو" کی ساؤنڈ دے رہا ہے۔ یعنی ہم یہاں بھی ناکام ہی رہے۔ اب سوال پیدا ہوتا ہے کہ دو حرفی سلیبل الگ الگ رکھا تو جائے، لیکن رکھے کون؟

ان ناکامیوں کے بعد آہنگ کے سلسلے میں کیوں نہ جاپانی ہائیکو کے استاد باشو سے رجوع کریں۔ بیٹ کے نظام کے تحت استاد باشو کی اصل جاپانی ہائیکو دیکھیے :۔

کے نا نو م کو	. — — . —
گُن ہشا وا کی تو	— . — — — . —
ش نائے می او	. — — . —

آپ نے ملاحظہ فرمایا کہ استاد باشو کی ہر لائن قطع ہوتی ہے۔ یعنی یہ ایک تصور بھی یہاں رد ہوا کہ ہائیکو ایک لائن میں لکھی جا سکتی ہے، یقیناً نہیں۔ یا کم از کم استاد باشو ہمیں یہی بتاتے ہیں۔

دوسری اہم بات یہ کہ استاد باشو کی اس ہائیکو کا وزن ہے :

فاعلن فعل
فاعلاتن فعلن
فاعلن فعل

تیسری اہم بات یہ معلوم ہوئی کہ اس ہائیکو میں ارکان تو سترہ ہی ہیں لیکن ہائیکو میں الگ الگ نہیں ٹھہرتے۔ سو الگ الگ ارکان

رکھنے والی بات بھی ویسی نہیں، جس طرح کہ ہم تصوّر کرتے ہیں۔

اب دیکھیے ایک اہم جاپانی شاعرہ چی یو کی اصل جاپانی ہائیکو :۔

کو م بو سو ری	—۔— — ۔
رو کیو وا دو کما	—۔— — —۔—
ری آتا یو ہے	—۔— — ۔

اس ہائیکو کا وزن بھی وہی ہے جو استاد باشو کے ہاں ملتا ہے، یعنی :۔

فاعلن فعل

فاعلاتن فعلن

فاعلن فعل

ظاہر ہے کہ اسے بھی ایک لائن میں نہیں لکھا جا سکتا۔ ہر مصرع قطع ہوتا ہے۔

استاد باشو اور چی یو، دونوں عظیم ہائیکو نگار درج بالا آہنگ کی راہ سجھاتے ہیں، لیکن ہم نے اس سے قبل ادھر بھی توجہ نہیں کی۔ ہمارے پھٹے پرانے ناقدین کے طفیل اب یہ غلط فہمی عام ہے کہ ہائیکو کے موضوع کے اختصاص، خصوصاً مناظرِ فطرت کے حوالے سے، جاپانی شعراء نے زندگی کے جاپانی پہلوؤں سے شرق لطف اندوزی کے سبب اس طرف رجوع کیا۔ سو ہمارے بھولے ہائیکو شعراء نے مناظرِ فطرت کی پیش کش کا فارمولا رکھا سامنے اور لکھ لکھ کر انبار لگا دیئے۔

محض موسم کے ذکر اذکار کے حوالے سے بھی جاپانی ہائیکو کے ساتھ رشتہ جوڑنا ہمارے لیے ناممکن ہے۔ اس لیے کہ ہمارے موسم اپنی آمد اور روانگی سے اس طور مطلع نہیں کرتے، جس طرح کہ جاپان میں۔ ہمارے ہاں گل و بلبل باہم دیکھنے کو کب ملے ؟ ہماری غزل کے روایتی شعراء نے ان کا ذکر بعینہٖ یوں کیا جیسے ریاض خیر آبادی نے خمریات کی شاعری کی، اور چکھ کر نہیں دیکھی۔ اور جہاں موسم کے بیان میں بھی جعل سازی جنم لے گی، وہاں اس کے پھلنے پھولنے کے امکانات معلوم۔

یاد رکھنے کی بات ہے کہ جاپان کہنہ روایات سے جڑا ہُوا ملک ہے۔ وہاں کا ہر فرد، خواہ وہ کسی بھی سماجی مرتبے پر فائز ہو، اپنے صدیوں پرانے تجربے سے باہر نہیں جھانک سکتا۔ جاپان کا مذہب شنتو ہے یعنی وہ دیوتاؤں کے راستے کے مسافر ہیں۔ اُن کا یہ سفر صرف اِسی دنیاوی زندگی تک محدود ہے۔ دوسرے جہان کا ان کے ہاں کوئی تصوّر نہیں۔ اس لیے عاقبت سنوارنے کا جھگڑا اُن سے کوسوں دور ہے۔

سماجی اور مذہبی سطح پر اُن کی زندگی کا قرینہ ہمارے شب و روز سے یکسر مختلف بلکہ بعض معاملات میں اُلٹ ہے۔ مثلاً اس دنیاوی زندگی میں وہ جواب دہ ہیں "تن نو" کے سامنے، جو شہنشاہ ہے اور اُس کا حکم رعایا کا عمل۔ شہنشاہ، جو "تن نو" ہے اور آسمانوں تک اس کی بادشاہت قائم و دائم۔

جاپانی لوگ مادر سری اور پدر سری اصولوں سے بہت فاصلے پر جیتے ہیں۔ جب کہ ہند کا باسی دھرتی سے جڑا ہوا ہے اور مسلم، آسمان کی طرف دیکھتے ہوئے دھرتی کو محض اپنی گزرگاہ شمار کرتا ہے۔ جاپان کے ہائیکو شاعر کو زمین اور آسمان کے بیچ میں رہنا ہے اور وہ حافظہٗ ذات سے منسلک ہے۔ وہ مذہبی اعتبار سے "شنتو" ہے، لیکن گوتم بُدھ کے بیان کردہ زندگی کرنے کے آٹھ اصول اسے یاد ہیں۔ لہٰذا وہ مشاہدہٗ ذات کی گواہی کو سب سے بڑی گواہی مانتا ہے۔ دلیری، حیا اور نیک نامی کے تین پیمانوں پر اُس کی کُل کو پرکھا جا سکتا ہے۔ اُس کے بطون سے جب گواہی ملتی ہے کہ حسن مکمل ہُوا اور حُسن کا نظارہ کر لیا، تو وہ ایک لمحے کی تاخیر کے بغیر خودکشی کر لیتا ہے۔

یہی سبب ہے کہ اعداد و شمار کے اعتبار سے جاپان میں دنیا بھر کے مقابلے پر خودکشی کا رُجحان زیادہ ہے۔ اکثر قدیم ہائیکو شعراء عظیم تخت و مسند میں شاہی خاندان کی نمائندگی کا فریضہ بھی انجام دیتے رہے۔

اب ذرا جاپانی ہائیکو شعراء کا مقابلہ اردو ہائیکو کی نئی صنف میں اوّلیت کا سہرا اپنے سر بندھوانے کی خواہش میں ہلکان شعراء سے کریں تو کیا نتیجہ نکلے گا؟ ہمارے ہائیکو شعراء میں سے کتنے ہیں، جو "کرم یوگ" کی کیفیات سے واقف ہیں؟ اور کون ایسا ہے جو "شکان تازا" کے کیف سے سرشار ہے؛ ان کیفیات میں رنگی ہوئی موسمی تبدیلیوں کے حوالے سے بات کرنے کے لیے جاپانی زبان میں کم و بیش پانچ ہزار الفاظ موجود ہیں، جنہیں وہاں کا ہائیکو نگار دھیرج کے ساتھ کات کر اپنی ہائیکو مکمل کرتا ہے۔ اب اس کے مقابلے میں اردو زبان کی بے بسی کا اندازہ لگائیے۔

درحقیقت ہائیکو کے باب میں ہمارے شعراء کی کوششیں اکارت اس لیے بھی گئیں کہ انہوں نے جاپانی ہائیکو سے مخصوص آہنگ کو ناروا بوجھ گردانا۔ پھر یہ کہ ہمارے کچھ ناقدین اسے باقاعدہ ایک شعری صنف مانتے ہیں اور کچھ ثلاثی کی طرح کی چیز۔ ہائیکو مقفیٰ نہیں معریٰ ہوتی ہے لیکن ہمارے بعض شعراء یہاں بھی کھُل کھیلے یعنی قوافی برتے گئے۔ اسی طرح اُردو میں بعض ہائیکو مُردّف ہیں اور بعض غیر مُردّف۔ سب سے اہم بات یہ ہے کہ جاپانی زبان کا آہنگ شمار کرنے والا ہجی رکن (SYLLABLE) ہمارے بحور والے نظام سے یکسر مختلف ہے۔ اردو میں دو رکنی یا اڑھائی رکنی مصرعے شاذ ہی دکھائی دیتے ہیں اور یہی معاملہ جاپانی شاعری میں اعجاز دکھاتا ہے۔ یوں جاپانی ہائیکو کی نقل کرتے ہوئے اُردو میں محض پیچیدہ کاریگری ہی ممکن ہے۔ کھینچ تان کر ہم جو بھی نتائج سامنے لائیں، اسے ہائیکو نہیں کہا جا سکتا۔

مختصر یہ کہ ہم نے اس صنف پر بے خبری میں ہاتھ ڈالا یا بالفاظ دیگر ہم اس صنف کو اختیار کرنے کے اہل ہی نہ تھے۔ دوسری زبانوں کی اصناف کے چناؤ کی کوئی نہ کوئی معنویت اور جواز ہونا چاہیے۔ کیا ہمارا "ماہیا" کسی طور بھی ہائیکو سے کم تر دکھائی دیتا ہے؟

ہمارے جعفر طاہر نے "ہفت کشور" میں کتنا زور صرف کیا اور کس درجہ کمال کے کینٹوز رقم کیے۔ لیکن کیا یہ کامیابی ہمارے ہاں برگ و بار لا سکی؟ یہی صورت انگریزی کی شعری صنف لمرک (LIMRIC) کی ہے۔ آج لمرک کے حوالے سے اردو میں نذیر احمد شیخ کے علاوہ کوئی دوسرا نام ہمیں یاد نہیں۔ فرانسیسی صنفِ سخن ترائیلے کو اردو میں لکھنے والے ہمارے بڑے بڑے شعراء تھے لیکن کامیاب نہ ہوسکے یا تادیر اس کے ساتھ نباہ نہ کر سکے۔ احمد ندیم قاسمی جیسے بڑے شاعر نے ۴۴-۱۹۴۳ء میں اردو کے اوّلین ترائیلے لکھے، لیکن جلد ہی اس مصنوعی پن سے اُکتا گئے۔ یہی صورت اردو میں "سانٹ" کی ہے۔ لے دے کر ایک آزاد نظم (فری ورس) اردو میں کامیاب شمار کی جا سکتی ہے اور تصدق حسین خالد کو اس ضمن میں اوّلیت حاصل ہے۔ لیکن نظمِ آزاد کو منوانے کے لیے بھی میرا جی، ن۔م۔ راشد، مجید امجد، ظہور نظر اور اختر حسین جعفری کے قد کاٹھ کا شاعر درکار تھا۔

ایزرا پاؤنڈ جیسا نابغہ ۱۹۱۰ء میں فٹنر جیرالڈ کے تراجم (رباعیاتِ عمر خیام) کی معرفت مشرق کی طرف جھکا، اور بھگت کبیر کے چند دوہوں کا ترجمہ کرنے کے بعد اس نے کینٹوز لکھنے کا آغاز کیا تو اس کے کینٹوز (پاؤنڈ کی طویل ترین نظم، جو ہومر کے رزمیہ "اوڈیسی" کے ماڈل پر تخلیق کی گئی) میں "کہت کبیر" کی گونج صاف سنائی دی، اور جب اس نے جاپانی شاعری کے تراجم کیے تو ہائیکو لکھنے کا تجربہ بھی انگریزی میں کیا۔ لیکن کیا اتنا بڑا نابغہ، انگریزی میں مشرقی لحن یا ہائیکو کو رواج دے پایا؟ پھر یہ ہمارے اپنی سی تُکّی لگانے جانے والے کیا سمجھتے ہیں؟

حوالہ جات: (۱) تفصیلی تعارف کے لیے دیکھیے: "گلِ صد برگ" مرتبہ: سوزوکی تاکیشی، اشتراکِ ترجمہ: محمد رئیس علوی، مطبوعہ: دائمرولانف فاؤنڈیشن، اوساکا، جاپان، طبع اوّل: اپریل ۱۹۸۹ء (۲) مقالہ: "شاعری اور جاپانی لوگ" از کازو ساتو۔ بنگلہ دیش کے مرکز شعر و سخن میں پڑھا گیا۔ ترجمہ: جمیل یوسف۔ مطبوعہ: "ادبیات" اسلام آباد، بابت: جولائی تا اگست ۱۹۸۷ء (۳) دیکھیے: "ہائیکو کے بارے میں" از جمیل جالبی، ڈاکٹر؛ مطبوعہ: "ادبیات" اسلام آباد، بابت: جنوری تا مارچ ۱۹۸۸ء صفحہ ۱۱۳ (۴) ملاحظہ ہو: "جاپانی ہائیکو کا ہیئتی مطالعہ" از محمد امین، ڈاکٹر؛ مطبوعہ: "اوراق" لاہور، بابت: جون جولائی ۱۹۸۸ء صفحہ ۳۹ (۵) بحوالہ: "ساقی" دہلی، شمارہ، جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۲۴ (۶) بحوالہ: "ساقی" دہلی شمارہ، جنوری ۱۹۳۶ء صفحہ ۱۳۲

غالب کا ایک شعر

مشکور حسین یاد

اور وہ مشہور شعر یہ ہے :

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

یہاں ہمارا مقصد اس شعر کی تشریح کرنا ہرگز نہیں ہے ۔ یہ کام تو مولانا حالی ہم سے بہت پہلے کر چکے ہیں اور ہمیں موصوف سے صد فی صد اتفاق نہ سہی بڑی حد تک اتفاق ہے کہ آدمی کو اپنی چند روزہ زندگی میں کام کرنے کی خوشی اسی لیے ہوتی ہے کہ وہ سمجھتا ہے اس نے ایک خاص وقت میں اتنے سارے کام کر دکھائے ۔ اگر مرنا نہ ہوتا تو پھر وہ اپنے بہت سے کاموں کو ٹالتا ہی رہتا — اور یوں کام کی خوشی سے وہ بڑی حد تک محروم رہتا ۔ ہمارے خیال میں غالب نے اس شعر میں صرف اتنی سی بات نہیں کہی اُس نے اپنے انداز میں حالی کے بتائے ہوئے مفہوم سے کہیں بڑھ کر کمال دکھایا ہے ۔

پہلا کمال تو اس شعر میں غالب کا یہ ہے کہ اُس نے اردو کے بدنام زمانہ لفظ ہوس کو نہ صرف نئے معنی بخشے بلکہ اس لفظ کو زندگی کی ساری چہل پہل اور کارگزاریوں کا سرچشمہ قرار دے دیا اور پھر اس کے اصل معنی کو بھی اپنی جگہ برقرار رکھا ۔ آپ جانتے ہیں ہوس کے مفہوم کی بنیاد عجلتِ کار یا جلد بازی پر ہے یعنی اہلِ ہوس ہر کام کو اُس کے مطلوبہ وقت سے پہلے انجام پذیر دیکھنا چاہتے ہیں ۔ وہ صبر و تحمل سے کام لینے کے بجائے جلد بازی سے کام لیتے ہیں جس کی وجہ سے کام کی اصل غایت اور لذت تباہ و برباد ہو جاتی ہے ۔ اس طرح ہوس کے معنی پھل کو پکنے سے پہلے توڑ لینے یا کھا لینے کے بنتے ہیں ۔ لیکن غالب نے اس شعر میں ہوس کے مثبت معنی پیش کر کے انسانی ہوس کو ایک نئے حسن و جمال سے ہمکنار کیا ہے ۔ غالب کے اس شعر کے حوالے سے ہوس کا پہلا حُسن تو یہی ہے کہ اس نے یعنی ہوس نے اس شعر میں اپنے منفی اور مثبت دونوں معنی کو اپنے ساتھ قائم رکھا ہے ۔ عجلت کوئی اچھی بات نہیں لیکن تساہل بھی کوئی اچھی بات نہیں ہے بلکہ تساہل کی تہمت لگنے سے پہلے ہی ہوس کو اپنے کام کا آغاز کر دینا چاہیے ۔ دوسری طرف اس پر بے صبری کا الزام بھی نہیں آنا چاہیے ۔ مگر اتنا صابر و شاکر ہونے کی بھی ضرورت نہیں کہ وہ یعنی ہوس اپنی اصل صورت ہی کو برقرار نہ رکھ سکے ۔ غالب نے ہوس کے منہ میں لگام نہیں ڈالی اُسے اس طرح آزاد چھوڑا ہے کہ وہ خود کو تباہ و برباد کرنے کے بجائے بنانے سنوارنے میں مصروف ہو جائے ۔ غالب بہت حقیقت پسند تھا اس لیے اُسے یہ کیسے گوارا ہو سکتا تھا کہ انسان کی زندگی سے ہوس کا نام و نشان ہی مٹ جائے یعنی ایک ناممکن بات کو تسلیم کرنا کہاں کی عقلمندی ہے — ہاں ہم اس بات کو ضرور عقلمندی کہہ سکتے ہیں بلکہ شاید عقلمندی کہتے ہی اس کو ہیں کہ ممکن کی بدحالی کو دور کیا جائے ۔ ناممکن کے لیے کوشش کرنے کے بجائے یہ بات ہزار درجہ بلکہ صد درجہ احسن کہی جا سکتی ہے کہ ممکن کو اُس کے پورے حسن و جمال کے ساتھ نظارہ کیا جائے ۔ اور نظارہ ہی نہ کیا جائے اس کو تصرف میں لانے کے جتنے اور جس قدر پہلو ہیں اُن سے لطف اندوز بھی ہوا جائے ۔

اور آدمی کے لیے ہوس کا دوسرا حُسن اس سے صحیح معنی میں لطف اندوز ہونا ہے۔ کیونکہ آپ جانتے ہیں ہوس میں آدمی جلدی تو کرتا ہے اور یہی ہوس کی بڑی خرابی ہے لیکن ہوس میں آدمی یہ کبھی نہیں چاہتا کہ وہ پوری طرح یعنی صحیح معنی میں لطف اندوز نہ ہونے پائے۔ لہٰذا اگر کوئی شخص ہوس کے باوجود اس سے صحیح معنی میں لطف اندوز ہو رہا ہے تو سمجھ لیجئے وہ ہوس کے ایک مثالی مقام پر ہے۔ یعنی آدمی بوالہوس ہونے کے الزام سے بھی بچا رہے اور ہوس سے کنارہ کش بھی نہ ہو۔ عام صورت میں ہوس اور بوالہوسی میں امتیاز کرنا خاصا مشکل ہوتا ہے۔ ہوسناک اور ہوس کار ایسے الفاظ کی ساخت سے ہمارے خیال کی تائید ہوتی ہے۔ ہماری رائے میں اسی لئے ہوس کو عام طور پر برا بھی سمجھا جاتا ہے۔ بہرحال ہوس کی اس مثالی صورت کو زندگی میں شامل کر لینے سے آدمی کی زندگی خاصے مزے میں گزرتی ہے۔ اگرچہ یہ خاصی ہوش مندی کا کام بھی ہے مگر مشکل کام نہیں۔ کیونکہ ہوس اپنی جگہ گرہ کشا بھی ہے۔

گرہ کشائی ہوس کا تیسرا حُسن ہے۔ اس میں کوئی شک نہیں کسی مشکل کو حل کرنے کے لئے عقل کا ہونا بہت ضروری ہے لیکن کسی مشکل کو حل کرنے کے لیے خود کو آمادہ کرنا بھی کوئی کم اہم کام نہیں بلکہ اکثر اوقات ہم نے تو یہ دیکھا ہے کہ ادھر آپ نے مشکل کو حل کرنے کا ارادہ کیا اور اپنے قدم اٹھائے اور اُدھر ایک لمحے میں عقل بھی آ موجود ہوئی۔ گویا وہ آپ کے قدم اُٹھنے ہی کے انتظار میں تھی۔ گرہ کشائی کے حُسن کے ساتھ ہی ہوس کا ایک اور حُسن بھی موجود ہوتا ہے جس کے بارے میں آپ ایک ہی سانس میں دو باتیں کہہ سکتے ہیں۔ یہ حُسن گرہ کشائی کے حسن کا مرہونِ منت ہے اور گرہ کشائی کا حُسن اس کا ممنونِ احسان۔ ہوس کا یہ حُسن کیا کام کرتا ہے اس ضمن میں اس وقت ایک بہت ہی عامیانہ سی کہاوت یاد آ رہی ہے لیکن اس حُسن کی کارکردگی کو نمایاں کرنے میں بہت مناسب ہے۔ اس کہاوت کو عموماً ایسے وقت استعمال کرتے ہیں جب کوئی شخص کسی کام کو سرانجام دینے میں تذبذب یا ہچکچاہٹ محسوس کرتا ہے ـــــ چڑھ جا بیٹا سُولی پر رام بھلی کرے گا ـــــ عام زندگی میں ہوس آدمی کو حقائق کی سُولی پر تو خیر نہیں چڑھاتی البتہ سُولی کو ایک طرف پھینک کر حقائق سے دست و گریباں ضرور کر دیتی ہے۔ بغور دیکھا جائے تو آدمی کی روزمرہ زندگی پر ہوس کا یہ بہت بڑا احسان ہے۔ حقائقِ حیات سے مڈبھیڑ کرانے کے لئے انسان کی ارفع و اعلیٰ قدریں اور جذبات اپنے اپنے وقت پر ضرور بیدار ہوتے ہیں لیکن اس کارِ خیر کے لئے ہوس سب سے پہلے اپنا سینہ تان کر سامنے آتی ہے۔

ہوس کا ایک اور حُسن یہ ہے کہ وہ آدمی کے دائرہ کار کو وسیع سے وسیع تر کرتی ہے۔ دیکھئے نا اس تھوڑی سی زندگی میں بہت کچھ کر گزرنے کی خواہش ہوس نہیں تو اور کیا ہے ـــــ لیکن آدمی یہ خواہش کرتا ہے اور تمام تر ہوس کے بل بوتے پر کرتا ہے۔ عقل بھلا آدمی کو بہت کچھ کر گزرنے کا مشورہ کیسے دے سکتی ہے۔ وہ تو وقت کے ایک ایک لمحے کو ناپ تول کر استعمال کرنے کی قائل ہے۔ لیکن دیکھ لیجئے وقت کی یہ باگ ڈور غالب نے کس خوبصورتی کے ساتھ عقل کے بجائے ہوس کے سپرد کی ہے۔ اور پھر سُرود کے عالم میں صدا لگا رہا ہے ـــــ ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا ـــــ!

جیسا کہ ہم پہلے عرض کر چکے ہیں ہوس کا وقت کے ساتھ ایک خاص تعلق ہے۔ اور اس خاص تعلق کے باعث وہ وقت کو اپنے تابع رکھنا چاہتی ہے۔ اہلِ ہوس وقت کی پابندی کرتے ہوں یا نہ کرتے ہوں لیکن وہ وقت کو اپنے قابو میں ضرور رکھنا چاہتے ہیں ـــــ واضح رہے کہ ہم یہاں خواہش کی بات کر رہے ہیں۔ یہ نہیں کہہ رہے ہیں کہ وقت اہلِ ہوس کے قبضے میں آ جاتا ہے ـــــ ہاں یہ ضرور ہے کہ اہلِ ہوس کے ہاتھوں ایسا اکثر ہوتا رہتا ہے۔ اس ضمن میں کوئی اور کچھ مانے یا نہ مانے اُسے اتنا تو تسلیم کرنا پڑتا ہے کہ جس طرح اہلِ ہوس وقت کو اُس کی زلفیں پکڑ کر اپنی طرف کھینچتے ہیں، یہ شرف کسی دوسرے کو شاذ ہی حاصل ہوتا ہے۔ غالب نے وقت اور ہوس کے اسی تعلق کو ـــــ بیک وقت گہرے اور نازک تعلق کو نہ صرف بیان کرنے کی کوشش کی

ہے بلکہ اس تعلق کو ایک حُسن بھی عطا کیا ہے جسے آپ بلا خوفِ تردید اعتدال کا حُسن کہہ سکتے ہیں۔ "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" کہنے کا مطلب یہ ہے کہ ہم کسی کام کو جلدی سے ختم کرنا چاہتے ہیں یعنی کسی مشکل کو وقت کا ایک لمحہ ضائع کئے بغیر حل کرنا چاہتے ہیں اور جب یہ کام، بمشکل ہمارے حسبِ منشا انجام کو پہنچتے ہیں تو ہمیں وہ خوشی حاصل ہوتی ہے جسے نشاطِ کار کا نام دیا گیا ہے۔ یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ نشاط نشط سے ہے اور اس کے معنی آسانی کے ساتھ گرہ کھولنے کے ہیں ـــــ یقیناً آپ یہ بھی جانتے ہوں گے کہ آسانی کا جلدی کے ساتھ کس قدر گہرا تعلق ہے۔ تو گویا جلدی کے ساتھ اور آسانی کے ساتھ کام کرنا کوئی بُری بات نہیں بلکہ فعلِ مستحسن ہے۔ بس کام خراب نہیں ہونا چاہیے۔ آسانی کے ساتھ کام کرنے والوں کی تو سورۂ نازعات کی آیت ۲ میں قسم بھی کھائی گئی ہے۔ وَالنّٰشِطٰتِ نَشۡطًا۔ اور یہ خوبصورت راز تو کسی سے پوشیدہ نہیں کہ قسم اسی چیز کی کھائی جاتی ہے جس کی کوئی خاص قدر و منزلت اور اہمیت ہوتی ہے۔ بہر حال قرآن نے یہ قسم کھا کر وقت کی قدر کرنے والوں کی اہمیت کا احساس دلایا ہے۔

غالب نے نشاطِ کار کو ہوس کے ساتھ وابستہ کرکے دو چار کارنامے مزید بھی سرانجام دیئے ہیں، جن میں سے پہلا کارنامہ تو یہی ہے کہ ہوس کے بغیر آدمی کے پاؤں زمین پر نہیں ٹکتے۔ اور یوں ہوس آدمی کو مابعد الطبیعاتی یا محض خیالی فضاؤں میں اُڑنے کے بجائے زندگی کے سنگین حقائق کا احساس و شعور بخشتی ہے۔ دوسرے لفظوں میں یوں کہہ لیجئے کہ ہوس آدمی کو مادی دنیا کے رُخ سے نقاب اُٹھانے کا حوصلہ عطا کرتی ہے۔ اصل میں مادہ سے اوپر اُٹھنے کے لیے اس کے دل میں اُترنا بھی تو ضروری ہے۔ ہوس مادہ کے عین دل میں اُترنے کا نام ہے اور یہ کام صرف وہی کر سکتی ہے اور کرتی رہتی ہے۔ آدمی کو اس کی خبر نہ ہو یا جان بوجھ کر وہ انجان بنا رہے تو یہ دوسری بات ہے۔ ویسے بھی ہوس کو گالیاں دینا آسان ہے، اس کا شکر گزار ہونا خاصہ مشکل ـــــ، اور مشکل کام کے لئے آدمی عموماً تیار نہیں ہوتا ـــــ اُسے آج اور کل پر ٹالتا رہتا ہے ـــــ غالب نے آدمی کو ہوس کے لئے سپاس گزار ہونے کا پیغام دیا ہے۔ اسے آپ غالب کا کارنامہ نمبر ۲ قرار دے سکتے ہیں ـــــ اور ہوس کی سپاس گزاری کا مطلب ہے اس کرۂ ارض کی خاک کو اپنی آنکھوں سے لگانا۔ یہ خاک صحیح معنی میں آنکھوں کو لگتی ہے تو اس کے بطون میں چھپے ہوئے عرش نظر آنے لگتے ہیں ـــــ ہماری دانست میں عرش و فرش کے اس قدر مستحکم تعلقات کسی دوسری صورت میں ممکن نہیں ـــــ ہوس وقت کی ہر گتھی سلجھا سکتی ہے بشرطیکہ آدمی اسے بالکل ہی ذلیل نہ سمجھے اور نہ ہی حد سے زیادہ سر پر چڑھائے ـــــ مطلب یہ ہے کہ ہوس کو بُرا سمجھنا بھی اتنا ہی ضروری ہے جتنا اسے اچھا سمجھنا ضروری ہے ـــــ خیر و شر کا جس قدر عمدہ سنگم ہوس میں دکھائی دے سکتا ہے اور دکھائی دیتا ہے ایسا کسی دوسری انسانی صورتِ حال میں ممکن نہیں۔ اسی سنگم کو دیکھ کر تو غالب سے یہ صدا لگائے بغیر نہ رہا گیا:

ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا
نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا

لیکن ہوس کو جو چیز اعتدال میں رکھتی ہے، اسے خوب صورت اور خوب سیرت بناتی ہے، وہ موت ہے۔ ادھر ہوس کا معجزہ بھی دیکھنے کے قابل ہے کہ موت جیسے ہی ہوس کو چھوتی ہے اس کی یعنی موت کی آنِ واحد میں قلبِ ماہیت ہو جاتی ہے۔ یعنی ہوس کے ہاتھوں موت چشم زدن میں زہر سے تریاق بن جاتی ہے ـــــ آپ اسے خاک سے اکسیر بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہوس جب موت کے ہاتھ میں ہاتھ ڈال کر قدم آگے بڑھاتی ہے تو اس وقت آدمی کو اپنے چاروں طرف سونا ہی سونا نظر آتا ہے۔ ہم اس سونے کو ہریاول بھی کہہ سکتے ہیں کیونکہ ہوس پہ قابو رہے تو آدمی ساون کا اندھا کبھی نہیں بنتا۔ البتہ اُسے ہر طرف ہرا ہی ہرا ضرور نظر آتا ہے۔ ہوس دراصل مزے لے کر جینے کا نام ہے ـــــ حیات و کائنات کی ہر شے سے مزہ لے کر جینے کا نام، حد یہ کہ موت کو بھی مزیدار بنا کر جینے کا نام ـــــ لیکن

غالب نے تو اس سے بھی آگے بڑھ کر بات کہی ہے — نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا — یعنی آدمی موت کے بغیر جی تو سکتا ہے لیکن مزے کے ساتھ نہیں جی سکتا۔ جینے کے سارے مزے مرنے کے ساتھ وابستہ ہیں۔ دیکھ لیجئے موت جس کو ہم ایک خوفناک چیز سمجھتے ہیں غالب نے اُسے ہوس کے ذریعے کس قدر مزیدار چیز بنا کر پیش کیا ہے۔ آپ جانتے ہیں "لف و نشر مرتب" ایک صنعتِ شعری ہے جس کے مطابق شعر کے پہلے مصرع میں جن چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے اسی ترتیب سے شعر کے دوسرے مصرع میں اُن چیزوں سے متعلق چیزوں کا ذکر کیا جاتا ہے — غالب کے زیرِ بحث شعر کے پہلے مصرع میں پہلے ہوس کا ذکر ہے اور پھر نشاطِ کار کا۔ اسی ترتیب سے دوسرے مصرع میں پہلے مرنے کا ذکر ہے اور بعد میں جینے کے مزے کا ذکر ہوا ہے۔ گویا ہوس مرنا ہے اور نشاطِ کار جینے کا مزا۔ ہمیں نشاطِ کار میں جینے کے مزے والی بات تو آسانی سے سمجھ میں آجاتی ہے لیکن ہوس کا مرنے سے یا موت سے کیا تعلق ہے اس پر ذرا غور کرنے کی ضرورت ہے۔ اگرچہ ہم نے ابتدا میں اس تعلق کے بارے میں کچھ عرض بھی کیا ہے تاہم ہوس کا موت سے تعلق اور بڑا گہرا تعلق اس طرح بنتا ہے کہ دنیا کا ذرہ ذرہ آدمی کو اس کی اپنی خواہش کے مطابق کچھ کر گزرنے کے لئے اُکساتا ہے تو آدمی یہ سب کچھ کرنے کے لئے تیار بھی ہو جاتا ہے مگر پھر اُسے یہ خیال بھی آتا ہے کہ اُسے تو کچھ کرنے کے لیے وقت بہت ناپ تول کر دیا گیا ہے۔ چنانچہ تعینِ وقت کا یہ احساس آدمی کی عملی صلاحیتوں کو تیز تر کر دیتا ہے۔ اور جب وہ اس وقت بھی کچھ کر گزرتا ہے تو اُسے یک گونہ مسرت حاصل ہوتی ہے جسے غالب نے نشاطِ کار کا نام دیا ہے۔ اور آدمی کو یہ نشاطِ کار اور اُس کی وجہ ہوس اس قدر عزیز ہوتی ہے کہ وہ یعنی آدمی موت کی ہوس تو کر سکتا ہے لیکن ہوس کی موت کا خواہاں وہ کبھی نہیں ہوتا۔ گویا ہوس آدمی کو جان سے بھی زیادہ عزیز ہوتی ہے۔ اور ایسا ہو بھی کیوں نہ۔ ہوس آدمی کو ہر عمل کے دوران میں ایک بار تو اس قدر توانا اور بے خوف کر دیتی ہے کہ پھر وہ موت کی پیٹھ پر سوار ہو کر اور اس کے منہ میں لگام دے کر اُسے اپنی مرضی کے مطابق بھگاتا اور دوڑاتا ہے۔ ہمارے کہنے کا مطلب یہ ہے کہ آدمی کی رفتارِ عمل کو دیکھ کر موت کے پسینے چھوٹ جاتے ہیں۔ اور وہ پانی پانی ہو جاتی ہے۔ لیکن غالب اس طرح موت کو ہلکان کرنے کا قائل نہیں۔ وہ نشاطِ کار کے سرور میں رہوارِ مرگ کو چمکارنے، اس کی پیٹھ اور گردن پر ہاتھ پھیرنے کی اہمیت کو بھی فراموش نہیں کرتا کیونکہ اُسے معلوم ہے کہ ایک کام کی تکمیل کے بعد اُسے دوسرے کام کے لئے پھر اس سے کام لینا ہے۔ اور یہ تو آپ جانتے ہی ہوں گے کہ اگر موت سے اس بے خوفی اور اعتماد کے ساتھ سلوک روا رکھا جائے تو پھر موت بھی ایک جذبے اور ولولے کی صورت اختیار کر جاتی ہے جس کو غالب نے اپنے زیرِ بحث شعر میں ہوس کا نام دیا ہے۔ یقیناً آپ نے ہمارے اس بیان سے موت اور ہوس کے تعلق کی نزاکتوں کو ضرور ذہن نشین بلکہ دل نشین کیا ہوگا — یہ کام تھوڑا سا اور کر لیجئے۔

یہ جو زیرِ بحث شعر کے دوسرے مصرع میں غالب نے فیصلہ کُن انداز میں خوش ہو کر دعوے کے طور پر اعلان کیا ہے کہ "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا" تو یہاں بھی صنعتِ تضاد کا سہارا لے کر ایک بہت بڑی حقیقت کا اظہار کرتے ہوئے ہمیں ہمارے شاعر نے ہوس اور موت کے تعلقات کی نزاکتوں کی طرف ہی متوجہ ہونے کی دعوت دی ہے — یہ دعوت کتنی زوردار ہے اس کا پتا آپ کو ایک بہت ہی عامیانہ سے محاورہ سے ہو سکتا ہے۔ ہم نے اس محاورہ کو عامیانہ اس لئے بھی کہا ہے کہ اِس کو استعمال کرتے ہوئے خاص لوگ عموماً شرما جاتے ہیں لیکن عام آدمی اس کو اپنی روزمرہ کی زندگی میں ڈٹ کر استعمال کرتا ہے اور صاف کیجئے اسی لئے وہ یعنی عام آدمی اپنے ہزار درد و الم کے باوجود خواص کی نسبت زندگی کے مزے زیادہ لُوٹتا ہے۔ تو وہ محاورہ یہ ہے۔ "کسی پر مرنا" ہماری مراد مرنا فعل کے محاورۃً استعمال سے ہے۔ ذرا غور فرمایئے ایک تو آپ کسی سے یہ کہتے ہیں "میں آپ سے محبت کرتا ہوں" اور ایک آپ اپنے اسی مفہوم کو اِس طرح ادا کرتے ہیں "میں آپ پر مرتا ہوں" تو چاہنے کی شدت کا اظہار جس طرح

مرنے کے فعل سے ہو رہا ہے وہ خالی محبت کرنے کے فعل سے نہیں ہو رہا۔ دیکھ لیجیے غالب کو زیر بحث شعر والی غزل ہی میں اسی شدت کے اظہار کے لیے اور عامیانہ محاورہ سے بچنے کے لئے ایک الگ شعر کہنا پڑا۔ ہمارا مطلب ہے چاہنے کی اس شدت کے اظہار کو غالب بھی نظر انداز نہیں کر سکا۔ وہ شعر یہ ہے:

جان تم پر نثار کرتا ہوں   میں نہیں جانتا وفا کیا ہے

قصہ مختصر غالب نے زیر بحث شعر کے پہلے مصرع میں "ہوس کو ہے نشاطِ کار کیا کیا" کہہ کر جہاں ہوس کی اہمیت اور قدر و منزلت کو مثبت معنی میں ہم پر واضح کیا ہے وہاں اس شعر کے دوسرے مصرع میں "نہ ہو مرنا تو جینے کا مزا کیا" کہہ کر اس بڑی حقیقت کو بھی ہم پر واضح کر دیا ہے کہ زندگی کے تضادات جینے کا مزا کم کرنے کے لیے نہیں ہوتے بلکہ جینے کا مزا ان تضادات کی حقیقت کو سمجھنے میں ہے اور ان سے کام لینے میں ہے۔ گویا موت جیسا کہ عموماً سمجھا جاتا ہے زندگی کا مزا خراب کرنے کے لئے نہیں ہے۔ یہ تو جینے کے مزے کو دوبالا کرنے کے لئے ہے بشرطیکہ ہم اس کی حقیقت پر ٹھنڈے دل سے غور کریں۔ ایسے ٹھنڈے دل سے جو محبت کی آگ سے بھرا پڑا ہو —— گھبرائیے نہیں یہ کام قطعی مشکل نہیں بلکہ بہت آسان ہے —— اتنا آسان کہ آپ اس کی آسانی کو دیکھ کر حیران رہ جائیں گے۔ بس ذرا ہوس کو سینے سے لگا کر زور سے بھینچنے کی ضرورت ہے۔

اُردو فکشن کی تنقید کا معمارِ اوّل ــــ مولوی کریم الدین

ڈاکٹر ارتضیٰ کریم

مولوی کریم الدین کی شخصیت اور ان کی ادبی خدمات سے اردو ادب کا کم وبیش ہر سنجیدہ طالب علم واقف ہے۔ وہ اپنے تذکروں کی وجہ سے جانے جاتے تھے مگر ان کی شہرت جدید کا باعث "خطِ تقدیر" بنی جب اسے اردو کے برگزیدہ محقق پروفیسر محمود الٰہی نے اردو کا پہلا ناول کہہ کر ۱۹۶۵ء میں جہانِ ادب میں پیش کیا۔

خطِ تقدیر ــــ اردو کا پہلا ناول ہے یا اردو میں تمثیلی قصوں کی ایک کڑی، فی الوقت یہ مسئلہ ہمارے زیرِ بحث نہیں ہے۔ بلکہ ہمیں "خطِ تقدیر" کے دیباچہ پر گفتگو کرنی ہے جو اردو میں فکشن کی تنقید کی بنیادی اینٹ ہے اور اس اعتبار سے مولوی کریم الدین کو اردو فکشن کی تنقید کا بابا آدم کہا جاسکتا ہے۔

اردو ادب کی تاریخ شاہد ہے کہ شاعری میں اصلاح اور رائے کا کام تو قبل سے جاری تھا۔ البتہ نثر میں تنقیدی روایت معدوم تھی اور اگر تھی تو اس کی حیثیت رائے سے زیادہ ہرگز نہیں تھی۔ اگرچہ یہ بات زیادہ تر اربابِ فکر ونظر محسوس کرتے ہیں کہ تخلیق کے بطن سے ہی تنقید جنم لیتی ہے۔ اگر یہ درست ہے تو پھر سب اِس کے دوش بدوش تنقیدی اشاروں کے نشان بھی ملیں گے۔ اس توقع کے ساتھ ہم سب اس کے دیباچہ کا مطالعہ کرتے ہیں تو مایوسی نہیں ہوتی یعنی ملا وجہی قصہ کے تمثیلی اسلوب کا ذکر کرتا ہے اور قصہ میں زبان کی سلاست اور فصاحت پر زور دیتا ہے، وہ قصہ کے فن یا کردار نگاری کی بابت اظہارِ خیال نہیں کرتا اور کر بھی نہیں سکتا تھا کیونکہ عہد ملا وجہی میں زبان کی سادگی ہی بڑا مسئلہ تھی۔ نوطرزِ مرصع میں تحسین بھی زبان وبیان پر ہی گفتگو کرتا ہے۔ حتیٰ کہ اسی نسخے پر انگریزی کے ایک مبصر Vans Kennedy کی جو رائے شامل ہے اس نے بھی زبان وبیان کا ہی ذکر کیا ہے:

> This work appears to me to be written in a pure and correct style, and were it therefore published, it would, in the Great want of Hindu-stani Books, Materially Facilitate the Acquisit-ion of knowledge of that language.

تاریخی ترتیب میں اس کے بعد عجائب القصص نظر آتی ہے اس کا خالق بھی دیباچہ میں یہی ارادہ کرتا ہے کہ ـ "قصہ زبان ہندی میں بہ عبارت نثر کہیے اور کوئی لفظ اس میں غیر مانوس اور خلافِ روزمرہ اور بے محاورہ نہ ہو۔" لیکن اس کے بعد کے جملے میں شاہ عالم ثانی نے جس خیال کا اظہار کیا ہے وہ فکشن کی تنقید کی بنیاد فراہم کرسکتا ہے کہ: "قصہ عام فہم خاص پسند ہووے کہ جس کے استماع سے فرحت تازہ اور مسرت بے اندازہ مستمع کو حاصل ہو اور آدابِ سلطنت اور طریق عرض و معروض دریافت ہوں۔"

میرنے شاعری کے حوالے سے کہا تھا کہ ؎

شعر میرے ہیں گو خواص پسند
گفت گو پر مجھے عوام سے ہے

لیکن نثر کے تعلق سے خصوصاً قصہ گوئی کے ضمن میں شاہ عالم ثانی نے پہلی بار اس خواہش کا اظہار کیا کہ قصہ ایسا ہو کہ سننے والے کو فرحت اور مسرت ملے یعنی وہ قصہ کو تفریح اور دلچسپی کی چیز سمجھتا ہے۔ پھر اس سے بھی زیادہ اہم پہلو یہ ہے کہ قصہ کے وسیلے سے "آداب سلطنت اور طریق عرض و معروض دریافت ہوں"۔ یہاں شاہ عالم ثانی نے قصہ کے سماجیاتی پہلو کی طرف اشارہ کیا ہے۔ ملاوجہی سے شاہ عالم ثانی تک اردو فکشن کی تنقید زبان و بیان کی ضرورت سے نکل کر قصہ میں مقصد کی تلاش تک پہنچ جاتی ہے۔ خواہ وہ مقصد "آداب سلطنت" سے قاری کو واقف کرانا ہی کیوں نہ ہو۔

سترھویں صدی عیسوی (۱۶۰۱-۱۷۰۰) سے اٹھارھویں صدی عیسوی (۱۷۰۱-۱۸۰۰) تک کی اس مدت میں یوں تو ان کے علاوہ اور بھی نثری تصانیف ملتی ہیں لیکن مذکورہ بالا ــــــ نثری قصوں میں ہی کچھ تنقیدی اشارے نظر آتے ہیں۔ ان میں داستان یا قصہ کے فن سے متعلق کوئی بات نہیں ملتی۔ اگر کچھ ہے تو زبان یا اسلوب یا طرز تحریر کے سلسلے میں یہ دعویٰ کہ "ہر گز کوئی فصیح اس فصاحت سوں بات نئیں کیا ـــ یا ـــ آگے اسلف میں کوئی شخص موجد اس ایجاد تازہ کا نہیں ہوا"۔

دراصل یہ دعویٰ بھی غلط نہیں ہے چونکہ یہ اردو نثر کا تشکیلی دور ہے اس لئے ان حالات میں یہی افکار غنیمت نظر آتے ہیں اس لئے کہ اردو شاعری پر صدیوں پہلے سے بہار آئی ہوئی تھی لیکن اردو نثر کے لئے انیسویں صدی کا زمانہ ہی ثمر بار ثابت ہوا۔ اس صدی کی پہلی دہائی میں فورٹ ولیم کالج کا قیام اردو نثر کی ویرانی کو آباد کر گیا۔ یہ بات دیگر ہے کہ آج اردو تحقیق نے فورٹ ولیم کالج سے قبل کی کئی تصانیف کا سراغ پالیا ہے۔ جو اس وقت گوشۂ گمنامی میں پڑی تھیں۔ اس لئے آیئے اردو فکشن کی تنقید ــــ کی تلاش عہد فورٹ ولیم کالج سے ہی کرتے ہیں۔

۱۸۰۱ء میں خلیل علی خاں اشک نے بھی اپنی داستان امیر حمزہ میں زبان کی سلاست پر ہی زور دیا ہے ــــ میر امن نے باغ و بہار میں اس بات کا اعادہ کیا ہے کہ قصہ اس طرح کہو کہ "جیسے کوئی بات کرتا ہے"۔ یہاں میر امن کا اشارہ مکالمہ کی طرف ہے۔ جان گل کرسٹ نے باغ و بہار پر اپنی رائے کا اظہار کیا اور کہا کہ کتاب میں (باغ و بہار) مشرقی آداب و روایات کی دل خوش تفاصیل ملتی ہیں اور پھر کوثر و تسنیم سے دھلی زبان ــــ، لیکن گل کرسٹ بھی بنیادی طور پر باغ و بہار کے اسلوب کا ہی گرویدہ ہے اور قصہ میں اسلوب کو ہی اہمیت دیتا ہے۔

رجب علی بیگ سرور نے فسانۂ عجائب میں اپنی داستان کے تحفظ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا تعلق بھی زبان سے ہی ہے یہ ایک عصری چشمک کا نتیجہ تھا لیکن اس نے اردو میں پہلی بار "تقابلی تنقید" کا رجحان بخشا۔ غالب سے سرور کی ملاقات ۱۸۵۴ء میں دہلی میں ہوئی تھی اور غالب نے فسانۂ عجائب کی تعریف میں "لطف زبان" کے دو الفاظ استعمال کئے تھے۔ اس کا مطلب یہ ہوا کہ غالب بھی قصہ کی اہمیت لطف زبان میں تلاش کرتے ہیں۔

گارساں دتاسی مغربی دانشور اور مشرقی آداب و تہذیب کا دلدادہ تھا۔ اردو زبان سے اس کو خاص دلچسپی تھی وہ ہر سال اپنے طالب علموں کو اردو ادب سے متعلق لکچر دیا کرتا تھا۔ یہ ۱۸۵۴ء کے آس پاس کا ہی زمانہ تھا۔ گارساں دتاسی نے بھی جہاں قصوں کہانیوں پر رائے دی ہے ان کے اسلوب پر ہی زیادہ گفتگو کی ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ چونکہ دتاسی کے مطالعہ میں مغربی ادب پارے بھی آتے تھے اس لئے کبھی کبھی تقابلی تنقید بھی کر جاتا تھا۔ باغ و بہار کے ضمن میں وہ ایک اہم بات

ضرور کہا جاتا ہے کہ "عجائب نگاری سے قصہ کی دلچسپی میں کمی آجاتی ہے۔" دراصل اس کا اشارہ اس بات کی طرف ہے کہ قصہ کو ہماری اپنی زندگی اور مسائل سے زیادہ دور نہیں چاہیئے لیکن اس کا کیا کیا جائے کہ وہ کھل کر اور بہت وضاحت کے ساتھ اپنے تنقیدی خیال کا اظہار نہیں کر پاتا ہے اور اس سلسلے میں ہم اس سے شکایت بھی نہیں کر سکتے کیونکہ ہم اچانک یا یک لخت کسی شے کے ظہور کے متمنی بھی نہیں ہو سکتے۔ خصوصاً ادبی اور سماجی تاریخ جو انسان کے ساتھ چلتی ہے اور انسان کے ساتھ ارتقا پذیر ہوتی ہے چنانچہ فکشن کی تنقید بھی ارتقائی صورت حال سے گذرتی ہوئی نظر آتی ہے حتیٰ کہ مولوی کریم الدین کی کتاب "خطِ تقدیر" شائع ہوتی ہے۔ وہ اس کا دیباچہ بہ عنوان "پیشانی خطِ تقدیر" لکھتا ہے ــــ جو درحقیقت اردو فکشن کی تنقید کی پیشانی ہے جس پر مولوی کریم الدین کا نام لکھا ہے۔ مولوی کریم الدین کے اس دیباچہ سے ماقبل فکشن کی تنقید کا ایسا پختہ شعور نہیں ملتا۔

خطِ تقدیر کے اس دیباچے میں کریم الدین نے قصہ نگاری سے متعلق جن خیالات کا اظہار کیا ہے وہ اس پورے عہد میں اپنی نوعیت کے بڑے "اہم تنقیدی شعور" کی نشاندہی کرتا ہے۔ مولوی کریم الدین روایتی قصہ گوئی سے گھٹن کا اظہار کرتا ہے اور شاید پہلی بار کسی قصہ گو کے یہاں یہ خواہش سر اٹھاتی نظر آتی ہے کہ ــــ "کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سُنے اُس کو خیال ہو کہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے:

اپنے عہد میں قدیم فن قصہ گوئی کے متعلق کریم الدین کی یہ نکتہ چینی، نہایت اہمیت رکھتی ہے۔ اس جملے کو ذہن میں رکھتے ہوئے خطِ تقدیر کی تصنیف تک اردو کے نثری فن پاروں کا تجزیہ کیجیئے تو کریم الدین کی بات باوزن معلوم ہوتی ہے۔ قدیم طرز کے قصوں سے اس کی بیزاری کی وجہ بھی سمجھ میں آجاتی ہے۔ لیکن ان خیالات سے جو وصف مترشح ہوتا ہے وہ ہے کریم الدین کا "تنقیدی شعور" جس کا اظہار وہ دیباچہ میں کر رہا ہے اور اپنے عہد کے اعتبار سے بڑی بیباکی اور صاف گوئی سے کہ:

(۱) جو باتیں اس (قصہ) میں درج ہوں وُے اخلاق و اطوار و تجربات انسانی اسی طرح کے ہوں جن (واقعہ) کا اثر طبع انساں پر ہو کے بہت نتیجہ (مقصد) پیدا کریں اور کہانی ایسے طور پر ہو کہ جو شخص پڑھے یا سُنے اس کو خیال ہو کہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے ــــ اور مضامین حقیقہ لکھنے کی ترغیب ہو ــــ مگر ایشیائی قصوں کی روش اور طور کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔"

کریم الدین کی یہ خواہش جو گرہیں کھولتی ہے وہ یہ کہ قصہ کی بنیاد انسانی تجربات و مشاہدات پر تعمیر کی جائے، جب ہی ان کا اثر طبع انسانی پر ہوگا اور فرد کے متاثر ہونے کے بعد ہی، وہ قصہ اس قابل ہوگا کہ "بہت نتیجہ پیدا کرے"۔ "بہت نتیجہ پیدا کرے" ایسا جملہ نہیں ہے جس سے سرسری طور پر گذرا جا سکے بلکہ یہ ادب برائے مقصد یا ادب برائے زندگی کی طرف دھندلا سا اشارہ ہے۔ جو زیادہ واضح شکل میں مرزا رسوا اور پریم چند کی تحریروں میں نظر آتا ہے۔ کریم الدین آگے کہتا ہے کہ: "جو سُنے اس کو خیال ہو کہ قصہ میرے ہی حسب حال لکھا گیا ہے:"

ایسا قصہ تخلیق کرنا جس میں ہر انسان کو اپنی کہانی سنائی دے، ایک مشکل امر تھا خصوصاً عہد کریم الدین میں۔ لیکن کریم الدین کے خیالات سے گمان ہوتا ہے کہ اس کے ذہن میں نئے زمانے کروٹ لے رہے تھے اور وہ یہ محسوس کر رہا تھا کہ یہ گھِسے پٹے قصے جن میں سننے یا پڑھنے والوں کو اپنی زندگی، اپنا سماج دور دور تک نظر نہیں آتے، ان سے اجتناب اور احتراز ضروری ہے۔ اس کے نزدیک ایسا اس لیئے بھی ضروری ہے کہ قصے انسان کی ذہنی تربیت کرتے ہیں اور اگر حقیقت نگاری سے کام لیا جائے تو ممکن ہے "آنے والے ادیب و شاعر کو مضامین حقیقیہ لکھنے کی ترغیب" مل سکے۔ یہاں لفظ "حقیقیہ" سے سرسری طور پر نہیں گذرا جا سکتا، بلکہ یہ لفظ توجہ طلب ہے۔ حقیقیہ یعنی حقیقی اور حقیقی کے معنی بیان کرنا "حکمت بہ لقمان آموختن" کے مترادف ہوگا۔ لیکن واضح اشارہ ضروری ہے کہ کریم ۱۸۶۲ء میں "ادب میں حقیقت نگاری" کا متقاضی اور متلاشی ہے۔ افسوس ہے کہ یہ عہد جس پر شاعری کا غلبہ تھا اور پوری تہذیب شاعری سے عبارت تھی، اردو نثر کو منہ لگانا خود کو اندھے کنویں میں ڈالنے

کے برابر تھا — نتیجہ میں کریم الدین ہوں یا بادشاہ وقت ان کی نثری کاوشیں گوشۂ گمنامی میں چلی جاتی تھیں۔ غالباً یہی وجہ ہے کہ اردو شاعری کی تفہیم اور تذکرے، تنقید اور تشریح کرنے والے ہمارے پیشروؤں کی نگاہ کریم الدین کے اس اہم دیباچہ پر نہیں ٹھہری ورنہ فکشن کی تنقید شعری بوطیقا کے سہارے آگے نہیں بڑھتی بلکہ بہت پہلے بالغ نظر ہو جاتی۔ اس لئے کہ کریم الدین نے اپنے دیباچہ میں صاف لفظوں میں کہا ہے کہ "ایشیائی قصوں کی روش اور طور کو چھوڑ کر نئی چال چلنا بہتر ہے۔" آپ کی اجازت ہو تو میں روش کو "موضوع" اور طور کو "اسلوب" کا نام دے دوں تاکہ بات اور زیادہ واضح ہو سکے۔ کیونکہ مولوی کریم الدین کی قدیم قصوں سے بیزاری موضوع اور اسلوب ہر دو اعتبار سے ہے ورنہ نئی چال چلنے کی تمنا ہی کیوں کرتا۔ وہ خود کہتا ہے:

"سات سو برس سے عربی اور ترکی میں اور ایک سو برس سے ہندی یا اردو میں قصہ نویسی کا جو شوق لوگوں کو ہوا تو اس دن سے آج تک یہ دستور رہا ہے کہ ان مصنفوں نے بادشاہوں یا تاجروں یا فقیروں کی کہانیاں لکھی ہیں کوئی قصہ مضامین عشقیہ اور محاورات واجب التحریر سے خالی نہیں ہے اور جس راہ پر اول مصنف چلا تھا وہی سڑک آج تک جاری ہے۔ کسی نے دوسری روش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں کیا ——"

اس اقتباس میں کریم الدین نے ہندی اور اردو قصہ نگاری کے پورے ادبی اور تخلیقی رویے پر سخت نکتہ چینی کی ہے اور اظہارِ حیرت بھی کہ آخر بادشاہوں اور تاجروں (یعنی طبقۂ اعلیٰ) کی کہانیاں ہی کیوں لکھی گئیں کسی نے دوسری روش اختیار کرنے کا خیال بھی نہیں کیا۔ پھر وہ خود ہی اس سوال کا جواب دینے کی کوشش کرتے ہیں کہ:

"شاید ان (قصہ گویوں) کے ذہن میں یہ خوف سمایا ہوگا کہ نئی وضع کا قصہ ایشیا کے باشندے پسند نہ کریں گے تاآنکہ عشق کی کہانی، چونکہ ہر ملک اور ہر زمانہ کے لوگوں کے دلوں پر زیادہ موثر ہوتی رہی ہے۔"

یہ جملے اس بات کے غماز ہیں کہ مولوی کریم اس پورے عہد کے سماجی، تہذیبی اور فکری پس منظر سے خوب واقفیت رکھتے تھے۔ وہ عہد جس میں قصہ نگاری کو شاعری کے مقابلے میں مناسب جگہ نہ مل سکی تھی، جہاں شاعری اور ادب کو ہی ایک معنی میں استعمال کیا جاتا تھا جبکہ شاعری ادب کی ایک شاخ ہے — کریم الدین کو عام انسان کی ذہنی سطح کا بھی اندازہ ہے اس لئے وہ کہتے ہیں کہ عشقیہ قصوں یا بادشاہوں کے قصوں کا رواج یوں عام ہوا کہ قصہ گویوں نے یوں تصور کر لیا کہ قصہ گوئی کا مقصد صرف تفریح طبع ہے چنانچہ تفنن طبع کی خاطر انھوں نے جھوٹی باتیں اختراع کیں پر انھوں نے اس پر غور نہیں کیا کہ قصہ کا اثر طبع انسانی پر پڑتا ہے جو معاشرہ یا ماحول یا انسان کو بدل کر رکھ دیتا ہے۔ کریم الدین کے الفاظ میں —" قصہ نویسی کے نتیجۂ اہم" اور "غرض اعظم" کی طرف ان کا (قدیم قصہ نگاروں کا) ذہن نہ گیا۔ وہ یہ تھا کہ جس طرح پر قصہ خوانی سے دل بہلتا ہے اور آدمی کا غم غلط ہوتا ہے، اسی طرح طبائع انسانی پر اس قصہ کا اسی طرح پر اثر ہو جایا کرتا ہے۔"

وہ قصہ نویسی کے "نتیجۂ اہم" اور "غرض اعظم" کے درپردہ وہ بڑی اہم بات کہہ رہا ہے کہ ادب سماج کی تصویر کشی کرتا ہے اور ادیب جس طرح کی دنیا تخلیق کرتا ہے، جس نوع کے کردار و افراد اس کی کہانیوں میں بستے ہیں ان کی دو صورت ہو سکتی ہے۔ پہلی جیسے افراد اس عہد میں پائے جاتے ہیں، دوسری جیسے افراد اس عہد میں ہونے چاہئیں۔ یہاں ادب کے بنیادی سوال کیا ہے؟ اور کیا ہونا چاہئے؟ کی طرف آ جاتے ہیں۔ اور جب مولوی کریم کے خیالات کا جائزہ لیتے ہیں تو معلوم ہوتا ہے کہ وہ ادب میں کیا ہونا چاہیے کے قائل ہیں جبھی تو نئی چال چلنے کی بات کرتے ہیں اور قصہ میں غرض اعظم اور نتیجۂ اہم تلاش کرتے ہیں۔ اس کے نزدیک قصہ کا اثر پڑھنے والوں پر ہوتا ہے اور وہ اپنے اندر ایک قسم کی تبدیلی محسوس کرتے ہیں۔

اس تناظر میں ارسطو کے ان خیالات کو پیش نگاہ رکھیئے جہاں وہ المیہ اور طربیہ سے بحث کرتے ہوئے المیہ کو ترجیح دیتا ہے کہ

اس کے باعث قاری کے جذبات اور خیالات کی تطہیر (Catharsis) ہو جاتی ہے۔ اب اگر طربیہ کو بادشاہوں اور تاجروں کی کہانیوں سے جوڑ دیں اور المیہ کو عمومی زندگی سے، تو Catharsis کا یہ عمل ہے نئے معنی دے گا جو برمحل بھی ہوگا۔

اس لئے کہ بادشاہوں اور تاجروں (طبقۂ اولیٰ) کی کہانیوں کا ایک بڑا حصہ عیش و طرب پر مشتمل ہوگا، وہاں مسرتیں ہوں گی مسائل بھی ہوں تو کچھ اور دلچسپ ہوں گے اور ان کے حل بھی انسان کی بجائے مافوق الفطری کردار تلاش کریں گے ـــــــ اس کے برعکس مولوی کریم جس نوع کی کہانی لکھنے کی خواہش ظاہر کر رہے ہیں۔ وہ عام آدمی کی کہانی ہوگی، جہاں زندگی کا ایک بڑا حصہ احتجاج اور احتیاج کی نذر ہو جاتا ہے جہاں مسائل قدم قدم پر منہ پھاڑے کھڑے ہوتے ہیں اور ان کے حل کے لئے انسان کو صرف اپنی عقل اور تدبیر کو کام میں لانا پڑتا ہے ـــــــ

چنانچہ مولوی کریم کا یہ خیال کہ قصہ گوئی چونکہ طبائع انسانی کو متاثر کرتی ہے اس لئے ہمیں بادشاہوں کی کہانیاں چھوڑ کر عام انسانوں کی کہانیاں لکھنا چاہیئے، در اصل ارسطو کے نظریہ کیتھارسس کی طرف اشارہ کرتا ہے وہ بھی تو المیہ سے تزکیۂ نفس کی ہی بات کرتا ہے۔

حقیقت یہ ہے کہ کریم الدین نے اس دیباچہ میں قدیم قصہ گوئی کے موضوعات کو بھی نشانہ بنایا ہے اور اسلوب پر بھی نکتہ چینی کی ہے۔ اس کا خیال ہے کہ اب ہمیں داستانوی موضوعات اور اسالیب کو ترک کر کے ایسے "مضامین حقیقیہ" لکھنا چاہیئے، جن سے کوئی "نتیجۂ اہم" حاصل ہو۔ جن میں عام انسان کی زندگی نظر آئے۔ وہ اس بات پر زور دیتا ہے کہ شاہی معاشرت کے بجائے ہم عام زندگی کی پیش کش کے ذریعہ بھی قصہ کو دلچسپ بنا سکتے ہیں نیز عوام کی زندگی کو یا سماج کو جو شاہی سماج سے یا طبقۂ اولیٰ سے قطعی الگ ہے اس کے دکھ درد کو اس کی آپ بیتی کو بھی اپنے قصہ کی بنیاد بنا سکتے ہیں، جو مقبول بھی ہوگا کہ اس میں سننے والے کو ایسا محسوس ہوگا کہ کہانی اس کے حسب حال ہے۔ اس سے قبل اتنی وضاحت اور استدلال کے ساتھ کسی نے اردو قصہ نگاری پر تنقید نہ کی تھی۔ دیکھا جائے تو ادبی اور تنقیدی لحاظ سے کریم الدین کے یہ خیالات خاصے انقلابی، فکر انگیز، تغیر آفریں اور دور رس نظر آتے ہیں۔

انیسویں صدی کی ساتویں دہائی میں جب اردو میں تمثیل نگاری مستحکم ہو چکی تھی اور داستانوی روایت حالات کی تبدیلیوں کے باعث دم توڑ رہی تھی، سرسید احمد خاں کی تحریک نے ادبی اقدار اور معیار کے پیمانے بدل دیئے تھے خصوصاً اردو شاعری کو نیچرل شاعری کے قریب کر دیا تھا ناول کا خمیر بھی تیار ہو رہا تھا ـــــــ ان حالات میں مولوی کریم کی یہ تحریر اور بامعنی اور اہم ہو جاتی ہے۔ کریم الدین کا تنقیدی شعور پختہ کار اور بالغ نظر آتا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ اپنی تنقیدی بصیرت اور بصارت کا ثبوت وہ عملی طور پر "خط تقدیر" میں نہ پیش کر سکے۔ ایسا محسوس ہوتا ہے کہ وہ "سوچ رہے تھے ناول" اور "لکھ رہے تھے تمثیل"۔ پروفیسر محمود الٰہی نے بھی لکھا ہے کہ "خط تقدیر کے دیباچے میں انھوں نے قصہ نگاری کے فن پر جو کچھ لکھا ہے اسے روایتی قصہ نگاری کی پہلی شدید مخالفت اور نئے طرز کے قصوں کو رواج دینے کی پہلی شعوری کوشش سے تعبیر کرنا غلط نہ ہوگا۔"

حقیقت حال یہی ہے کہ خط تقدیر کے دیباچے کی روشنی میں مولوی کریم اردو میں افسانوی ادب کا پہلا باضابطہ نقاد بن کر ہمارے سامنے آتا ہے جس نے داستان اور قصہ گوئی کی پرانی روش پر تنقید کی اور اس سے انحراف کی کوشش کی۔ نیز اردو میں پہلی بار ادب برائے زندگی کا تصور پیش کیا۔ اس کے علاوہ قصہ خوانی کی اہمیت پر زور دیا۔ اس کے مطابق یہ انسان کو مسرت اور انبساط کے ساتھ بصیرت اور بصارت بھی بخشتی ہے۔ مولوی کریم سے قبل اردو کے کسی ادیب یا دانشور نے افسانوی ادب کے تعلق سے اتنے واضح سوال نہیں اٹھائے اور یہی سوالات بعد میں نذیر احمد، سرشار اور شرر اور مرزا رسوا کے دیباچوں اور تقریظوں میں نظر آتے ہیں۔

اردو فکشن کی تنقید کی تاریخ اور ارتقا کے تناظر میں مولوی کریم کی تحریر نہایت اہمیت اختیار کر لیتی ہے۔ اس اعتبار سے ہم اگر انھیں اردو فکشن کی تنقید کا معمار اول کہیں تو نامناسب نہ ہوگا۔

ادا جعفری اور متاعِ قلم

ڈاکٹر حنیف فوق

اردو شاعری میں اثباتِ زندگی کے مختلف رنگ ملتے ہیں۔ ادا جعفری نے ہماری تہذیبی شائستگی سے اپنی شاعری کا دامن باندھا ہے اور عصری رجحانات کی نقش گری کرتے ہوئے اپنی غزلوں اور نظموں پر دل آویزی کے پر سے اپنے دستخط ثبت کئے ہیں۔ ان کی متعدد شعری تصویروں میں بولنے کی صفت پائی جاتی ہے۔ احساسِ زندگی کے ساتھ شائستگی، دل آویزی اور صدا آفرینی کی یہ مرکب خصوصیت ہر شعری تخلیق کو نصیب نہیں ہوتی، لیکن ادا جعفری نے اپنے شعری ارتسامات میں اس کی مسلسل کوشش کی ہے اور وہ اپنے دل نشیں انداز میں ذاتی واردات کے کرب اور اجتماعی حالات کے اضطراب کو زبان بخشتی رہی ہیں۔ ان کی شاعری میں طویل اور مختصر خاموشی کے وقفے بھی آتے ہیں، لیکن ان کا فن خوب سے خوب تر کی جانب رواں رہا ہے۔ ان کے چار شعری مجموعے، جن کے نام بھی ان کی تلاش کے گواہ ہیں، ان کے تخلیقی جوہر کا تعین کرتے اور اردو شاعری میں ان کی انفرادی پہچان کو مستحکم بناتے ہیں۔ ادا جعفری کا ذکر اس اعتبار سے بھی اہم ہے کہ وہ شاعرات میں ایک نئے سلسلۂ شعور و کیفیت کی ارزیابی میں پیش رو کی حیثیت رکھتی ہیں۔ برصغیر کی سیاسی اور تمدنی زندگی میں جو تبدیلیاں آئیں، وہ راجہ رام موہن رائے، امیر علی، سرسید اور اقبال تک متعدد فکری و تہذیبی مظاہر کی محرک رہی تھیں۔ جن میں جمہوری بیداری کے پیشِ نظر سیاسی اور ادبی تحریکوں کے مختلف النوع سلسلوں کا اضافہ ہوتا رہا تھا۔ تجدد پسندی، ترقی خواہی اور روشن خیالی کی صفات خواتین میں بھی اپنا اثر دکھا رہی تھیں۔ ادا جعفری کی شاعری میں ان صفات کے روشن نشانات پائے جاتے ہیں۔ ان نشانات کا جائزہ لیتے ہوئے، یہ بات بھی ظاہر ہوتی ہے کہ ادا جعفری کی شاعری کے مطالعے کے بغیر، مجموعی حیثیت سے جدید اردو شاعری کا منظر نامہ مکمل نہیں ہوتا۔

برصغیر کے بدلتے ہوئے معاشرے کی زندگی جہاں نئے موضوعات کو راہ دے رہی تھی، وہاں نئی احساساتی کیفیات اور نئے شعری تجربات سے نئی معنویتوں کے دروازے بھی کھل رہے تھے۔ چنانچہ شرر، نظم طباطبائی، اسمعیل میرٹھی اور نادر کاکوروی سے عظمت اللّٰہ خاں تک اور عظمت اللّٰہ خاں سے جدید اور جدید تر شاعروں تک ایک بڑا قافلہ ملتا ہے، جن سے اردو شاعری کے امکاناتِ اظہار میں اضافہ ہوا ہے۔ اردو شاعری میں موضوعات اور اسالیب کے اعتبار سے جو نئی وسعتیں آئی ہیں، ان کا مطالعہ اس دور کے اہم شاعروں کے کلام میں کیا جا سکتا ہے۔ جدید شاعری کی نیرنگیٔ ہیئت اور شکل آفرینی میں تصدق حسین خالد ہوں یا سلام مچھلی شہری سب کا کچھ نہ کچھ حصہ ہے۔ قومی یا دو قومی سیاسی زندگی کی ترجمانی جو حالی اور آزاد سے شروع ہوئی تھی، جوش، سرور جہان آبادی، چکبست، ظفر علی خاں اور اقبال کے کلام میں نئے ابعاد اور نئے تضادات کو پیش کرتی ہے۔ اردو غزل میں شاد، حسرت، یگانہ، اصغر، جگر اور فانی وغیرہ نے نئے عصری احساس کے جو خطوط کھینچے تھے، وہ خصوصاً فیض، ندیم، مجروح اور شاد عارفی کے یہاں خواب و حقیقت کی نئی کشمکشوں کی سمت نمائی کر رہے تھے۔ فراق اپنی بعض نظموں کی جدید رنگ آمیزیوں، اپنی رباعیات کی جمالیاتی نوعیتوں کے علاوہ غزل میں نئی محسوساتی آگہی اور غائر نظری کے پیکر تراش ہیں۔ ان کے مقابلے میں اثر لکھنوی جن سے ان کے ادبی مناظرے رہے، صحتِ زبان کے نگہدار اور کلاسیکی سرمایۂ بیان سے ہم آہنگی کے علمبردار تھے۔ داغ نے بول چال کی زبان پر

توجہ کرتے ہوئے، اس میں جو شگفتگی اور تیزی پیدا کی تھی، اس کا اثر ایک رجحان کے طور پر صرف دہلی تک محدود نہ رہا، جہاں ان کے سائل اور بےخود جیسے قابلِ قدر تلامذہ موجود تھے۔ صفی لکھنوی نے بعض مسائل کے اظہار کے باوجود سادگیٔ بیان کو ہنر بنایا۔ جہاں یگانہ نے زبان کی کاٹ کے ساتھ جامد روایات کی سنگلاخی اور ماحول کی سنگینی سے اپنی شاعرانہ انا کو ٹکرایا، وہاں آرزو لکھنوی نے ہندی الفاظ کی آمیزش اور متناسب آوازوں کے آہنگ سے ایک نیا ترنم پیدا کیا۔ ثاقب لکھنوی، عزیز لکھنوی اور اثر لکھنوی تینوں شاعری میں تازہ کاری کے باوصف تہذیب و ثقافت کے تسلسل اور لسانی تناظر کی ترجیح کے قائل تھے۔ دراصل یہ ذہنی پس منظر، اندازِ نظر کی مختلف صورتوں کی آئینہ داری کرتا ہے اور اس میں کئی رجحانات کی آمیزش نظر آتی ہے۔ مگر دو باتیں ان سب لکھنے والوں کے یہاں مشترک حیثیت رکھتی ہیں۔ اوّل وقت کی تغیر پذیری کا احساس، دوسرے یہ کہ زمین اور زمین کے مسائل سے تعلق رکھتے ہوئے، ان کو اپنے اپنے تصورات سے منطبق کرنے اور بقدرِ ہمت و توفیق فنی اظہار کے سانچے میں ڈھالنے کی سب نے کوشش کی ہے۔ چنانچہ ادا جعفری نے بھی آگے بڑھتی ہوئی زندگی کے بعض تصورات کا اثر قبول کیا، جس سے ان کی شاعری میں نئی رسائی آئی ہے۔ ان کی اپنے سرمایۂ تہذیب کی ارفع خصوصیات سے وابستگی اتنی گہری رہی ہے کہ حال کے معاشرتی انتشار کے عالم میں جب اقدار کے زوال اور اداروں میں خرابی کے ساتھ ساتھ خود ادب میں سطحی رویّوں کا بازار گرم ہوا اور حیلہ گری خود خواہی نے اپنا جال پھیلایا تو اُن کی گوشہ گیر استقامت کو کارِ تخلیق ہی سے سروکار رہا۔

کسی ایک دور کی ذہنی فضا کے بیان کے لیے اے، این، وائٹ ہیڈ (A. N. WHITEHEAD) نے "خیال کے موسم" (Climate of opinion) کی اصطلاح عام کی تھی۔ ادا جعفری کی فکری نشوونما جس آب و ہوا میں ہوئی وہ بیداری و حرکت سے عبارت تھی اور مختلف شکلوں میں ادب پر اثر انداز ہو رہی تھی۔ خواتین کی زندگی میں بھی اس تحرک کی جھلک ملتی تھی۔ وہ معاشرے کے رجعت پسندانہ تصورات کے باوجود تعلیم و ادب کے میدانوں میں آگے بڑھ رہی اور نئی زندگی کی تشکیل میں حصّہ لے رہی تھیں۔ اردو شاعری کی بعض اصناف میں مَردوں کی جانب سے پست یا اعلیٰ سطحوں پر عورتوں کے جذبات کی عکاسی، اپنے جذبات کی عورتوں کی زبان میں توضیح اور ان کی زبان کی ترجمانی ہوتی رہی تھی۔ لیکن حالی کی "مناجاتِ بیوہ" سے معاشرے میں عورتوں کی صورتِ حال کے بارے میں جس سلسلے کا آغاز ہوا تھا، اسے نئی ذہنی فضا میں عظمت اللّٰہ خاں، مقبول حسین احمد پوری، اندرجیت شرما اور دوسرے متعدد شاعروں کی نظموں اور گیتوں میں نئی جہتیں ملی تھیں، جن کا ظریفانہ اظہار راجہ مہدی علی خاں کی بعض نظموں میں بھی نظر آتا ہے۔ رومانوی تخیل پسندی نے بھی زنجیریں توڑنے کی خواہش کے ساتھ بیان کی رنگینی اور نسائی دلکشی کی جانب خاص توجّہ کی تھی۔ عورتوں میں شعر گوئی کی روایت تو قدیم سے موجود تھی، لیکن اسی روایت کے مطابق خواتین، مَردوں کی زبان میں اظہارِ خیال کرتی رہی تھیں اور خود مَردوں میں عورتوں سے براہِ راست تخاطب کا انداز نیا نیا آیا تھا۔ ادا جعفری کی خصوصیت یہی نہیں کہ نسائی احساسات کا اظہار نسائی انداز میں کیا، اس سے زیادہ اہم یہ ہے کہ انھوں نے اپنی شاعری کے ذریعہ عصری آگہی کو عورت کی سوچ کے قالب میں ڈھالا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ فکری اور تخلیقی محاذ پر ڈاکٹر رشید جہاں کی شخصیت پہلے سے موجود تھی۔ وہ مَردوں اور عورتوں دونوں کے لیے زبردست محرکِ نظر کی حیثیت رکھتی تھیں اور ان سے متاثر ہونے والوں میں عصمت چغتائی اور فیض دونوں شامل تھے۔ پھر سماجی زندگی کی مجلس آرائی اور تہذیبی تزئینات کے نگار خانے میں عطیہ فیضی بین الاقوامی شہرت کی حامل تھیں۔ ایک آواز حجاب امتیاز علی کی بھی تھی جو اس زمانے کی تحریروں میں اجنبی اور نامانوس فضا کا جادو جگا رہی تھی۔ ادا جعفری نے اپنے دَور کا اثر قبول کرتے ہوئے بھی، اپنے موقلم کی جنبش سے کچھ نقش الگ بنائے ہیں۔ حسرت نے جو جرأت فکر میں ناقابلِ فراموش حیثیت رکھتے ہیں، اپنی غزلوں میں ایک گھریلو فضا کی تعمیر سے تہذیبِ رسمِ عاشقی کو نمایاں کیا تھا۔ ادا جعفری نے اپنی شاعری کے شہرِ درد میں گھر کی خوشبو، ماحول کی تربیت اور روایت کے تہذیبی مزاج سے کام لیا ہے اور احتجاج کی راہوں پر آگے

بڑھتے ہوئے بھی وہ بادِ صبا کی اس خوشبو کی پابند رہی ہیں، جس میں گزشتہ فصلِ بہار کی بوئے یاسمن باقی ہے۔ وہ اپنے طبقۂ نسواں سے تشخص کی مختلف حیثیتوں کو "شہر بانو بھی مرا نام رہا، مریم بھی" کہہ کر ظاہر کرتی ہیں۔ لیکن ان کی شاعری اپنے عہد کی صداقتوں، خوابوں اور امیدوں کی شاعری بھی رہی ہے۔

اردو ادب میں رومانوی تحریک کی خیال آرائی نے قدیم فکری سانچوں سے انحراف کرتے ہوئے، ایک جذباتی اضطراب پیدا کیا تھا۔ فرینک سوئنرٹن (FRANK SWINNERTON) نے کہا تھا کہ اگر رومان مردہ ہے تو اسے رابرٹ لوئی اسٹیونسن (ROBERT LOUIS STEVENSON) نے قتل کیا ہے۔ اردو ادب میں اس قتل کی ذمہ داری یلدرم پر نہیں، کسی حد تک نیاز اور بڑی حد تک اختر شیرانی پر عائد ہوتی ہے۔ نیاز کی محدود ادبی بصیرت میں لفظی اہتمام اور خیالی افراط کے ساتھ، مطالعۂ قدیم کی گنجائش تو تھی، ان کی عقلیت پسندی کو ظاہر ہونے کا موقع نہیں ملا۔ اختر شیرانی کی شاعری میں محدود رومانیت کی گلو سوز شیرینی اور "لعنت گہہ ہستی" سے کہیں دُور جانے کی خواہش فرار نے ترقی پسند تحریک کے ساتھ ہی اپنا ردعمل پیدا کیا اور احمد ندیم قاسمی نے حقیقت پسندانہ نقطۂ نظر کے تحت خیال و خواب کی دنیا سے بھاگ کر جہان کو جنت بنانے کے عزم کا اظہار کرتے ہوئے کہا تھا کہ "میں اپنی خاک سے نکہت بنا کے دَم لوں گا"۔ رومانویت نے مغرب میں کلاسیکی صورتوں کی مخالفت کی تھی اور اس میں فکری فسون اور جذباتی صورت گری کے کئی پہلو تھے۔ اردو میں بھی اس نے تخیل پرستی، جمال دوستی، الم پسندی اور جذباتی آہنگ سازی کے کئی گوشے عام کیے تھے۔ اختر انصاری جو پہلے رومانوی اور بعد میں ترقی پسند رجحانات سے متاثر ہوئے، کہتے ہیں کہ

یادش بخیر عہدِ محبت کی شاعری
اک آہ تھی کہ گیت کے سانچے میں ڈھل گئی

لیکن جس طرح مغرب میں رومانوی تحریک کے رد کیے جانے کی کئی منزلوں کے بعد بھی اسٹیفن اسپینڈر (STEPHEN SPENDER)، ہرمان ہیسے (HERMANN HESSE) اور تھامس مان (THOMAS MANN) کی تحریروں میں کچھ نہ کچھ رومانی عناصر کا سراغ ملتا ہے، اسی طرح اردو ادب کی ترقی پسند تحریک میں بھی، مجاز، فیض، اور مخدوم کی شاعری میں خصوصاً انقلابی رومانیت کا پرتو نظر آتا ہے۔ ادا جعفری نے فطرت کے حسن اور رومانی اضطراب کی ترجمانی کی ہے۔ محبت کی تفسیروں سے کام لیا ہے۔ جوہی کی کلیوں کی خوبصورتی کو محسوس کیا ہے۔ برہ کی آنکھوں سے بھوروں پہ تتلیوں میں یادوں کو پرفشاں دیکھا ہے۔ "سانجھ بھئی پردیس" میں عورت کے دل کے دکھ کو محسوس کیا ہے۔ "دو نین کنول" جیسی خوبصورت نظم لکھی ہے اور شگوفوں کی صورت میں بہاروں کے جیسے سپنوں کا رومانی حیرت سے نظارہ کیا ہے۔ جدید اردو شاعری میں احساسات کی تجسیم کے اثرات بھی ان کے کلام میں نظر آتے ہیں اور یہ آرزومندی بھی کہ غم کے ہاتھوں ہی سہی دیواروں کی سنگینی میں شگاف پڑنے سے کوئی آوارہ سی چنچل سی کرن آ نکلے اور ایک لمحے کے لیے ان کے تاریک گھروندے میں اُجالا ہو جائے۔ لیکن وہ رومانیت سے حقیقت پسندی کی جانب بڑھی ہیں اور اس احساس کے ساتھ کہ

وقت کے ہاتھ میں یادوں کا دیا بھی نہ رہا
ریت کے ماتھے پہ نقشِ کفِ پا بھی نہ رہا

انہیں انسانوں کے زخم کھائے ہوئے، ٹھکرائے ہوئے قافلے کے سر اٹھانے اور بپھرنے کا اندازہ بھی ہوا ہے۔ اس اندیشۂ آرزو کے باوجود کہ نظامِ نو بھی انہیں ساز دے سکے گا یا نہیں، ان کے چشم و دل نے نظامِ نو کی آہٹیں بھی سنی ہیں۔ ان کا یہ دوہرہ کہ

نغمہ دینے کا سہارا لے کر
زندگی چل بھی سکے گی کہ نہیں

—— پوری تحریک رومانویت کے لیے ایک ایسا بلیغ سوالیہ نشان بن جاتا ہے کہ آج بھی ذہنوں کو جھنجھوڑتا ہے۔ "میں ساز ڈھونڈتی

رہی" میں ان کا یہ تجزیہ کہ "زندگی میرے لیے خواب نہ تھی، گیت نہ تھی"۔ "شہرِ درد" میں "میراثِ آدم" کے اجتماعی تجربے میں تبدیل ہو جاتا ہے کہ

ہاتھ کٹتے رہے اور ننھا سا اک روشنی کا دیا
ہاتھ سے ہاتھ تک منتقل ہوتا جاتا رہا
جگمگاتا رہا

"شہرِ درد" میں زباں بندی اور جبر کی شاعرانہ تصویر کشی بھی ملتی ہے اور احتجاج کا لطیف اظہار بھی۔ وہ کہتی ہیں کہ

امتحانِ رسن و دار پہ آمادہ ہو
اشتیاقِ رسن و دار سے آگے نہ بڑھو

گماں بھی کر نہ سکے تھے سحر کے متوالے
نظر فریبِ ضیا کھا گئی تو کیا ہو گا

ہم قطرۂ نیساں نہ گہر پارۂ شبنم
کیوں تشنگیٔ خار پہ شرمندہ رہے ہیں

ہماری معاشرتی زندگی میں ذات اور سماجی نصب العینیت کی کشش اور دوری کی کشمکش جاری رہی ہے اور اس دھوپ چھاؤں نے تخلیقی ذہنوں پر بھی اپنا اثر ڈالا ہے۔ لیکن ادا جعفری کا یہ سوال کہ "ظلم کی رات کا انجام قریں ہے کہ نہیں" اس دور کی نوائے سینہ تاب کی صورت ہی سامنے آتا ہے۔

روسو (JEAN-JACQUES ROUSSEAU)، جس کے خیالات نے انقلابِ فرانس پر گہرا اثر ڈالا تھا، اپنے تعلیمی نظام میں عورتوں کی ساری تعلیم کو مردوں کے حوالے سے دیکھتا تھا۔ اقبال بھی مظلومیٔ نسواں سے غم ناک تھے مگر اس عقدۂ مشکل کی کشود ممکن نہیں جانتے تھے۔ البتہ جان اسٹوارٹ مل (JOHN STUART MILL) کی کتاب "عورتوں کی محکومیت" (SUBJECTION OF WOMEN) اور میری وُل اسٹون کرافٹ (MARY WOLLSTONECRAFT) کی "اثباتِ حقوقِ نسواں" (Vindication of the rights of woman) سے اب تک متعدد لکھنے والوں نے عورت کی مظلومیت اور حقوق سے بحث کی ہے۔ ان میں خاص طور پر جارج ایلیٹ (GEORGE ELIOT)، ہنرک ابسن (HENRIK IBSEN)، ڈورا رسل (DORA RUSSEL)، سی، ای، ایم جوڈ (C.E.M. JOAD)، ایچ، جی، ویلز (H. G. WELLS)، اساڈورا ڈنکن (ISADORA DUNCAN)، برنارڈ شا (BERNARD SHAW)، ایڈنا ڈسینٹ ملے (EDNA ST. VINCENT MILLAY)، فریڈرک اینگلز (FRIEDRICH ENGELS) اور ورجینیا وولف (VIRGINIA WOOLF) کا نام لیا جا سکتا ہے۔ اس میں شک نہیں کہ علمی طور پر بعض نفسیاتی دبستانوں اور سیاسی طور پر نازیت جیسے حکومتی نظاموں نے بھی مراجعت کی کوشش کی تھی، لیکن مجموعی طور پر عورتوں کی حق طلبی کی تحریک آگے بڑھی ہے۔ البتہ اس کی پیچیدگی سے انکار نہیں کیا جا سکتا کہ کہیں کہیں

تحریک حمایتِ نسواں نے تحریک طرف داریٔ زناں کی شکل اختیار کر لی ہے۔ تحریک حمایتِ نسواں کا مقصد دو صنفوں کے درمیان سیاسی، اقتصادی اور سماجی برابری کے نظام کا قیام تھا۔ لیکن موخر الذکر نے دو صنفوں کو دو مخالف فریقوں کی حیثیت دے دی تھی۔ پھر مردوں اور عورتوں دونوں کی زندگیوں میں طبقاتی اثرات بھی نمایاں رہے ہیں۔ جہاں محنت اور زندہ رہنے کی جد و جہد نے دو صنفوں میں زندگی کی ساری محرومیوں اور تلخیوں کے درمیان کسی نہ کسی حد تک توازن قائم کیا ہے، وہاں تھورسٹین ویبلن (THORSTIEN VEBLEN) کے نظریۂ طبقۂ فراغت (The theory of leisure class) کے مطابق بورژوازی طبقہ اپنی ثروت کا اظہار اپنی خواتین کے ذریعے کرتا ہے کہ جن کے گراں مصارفِ خودنمائی ان کے مالکوں، شوہروں اور باپوں کی صنعت و منزلت کی نمائش ہیں۔ اُردو میں نہ صرف یہ کہ عورتوں کی نمائشی حیثیت سے متعلق ابسن کے ڈرامے "گڑیا گھر"، شا کے بعض ڈراموں اور اسی موضوع پر چند دوسری تحریروں کا ترجمہ ہوا تھا، بلکہ "انگارے" کی اشاعت اور پھر ترقی پسند مصنفین کی تحریک نے آزادی خواہی کے ان گوشوں کو جن میں عورت کی آزادی بھی شامل تھی، بڑی تقویت پہنچائی تھی۔ اداؔ نے "شہرِ درد" میں کہا تھا کہ "بنتِ حوا کی یہ کہانی ابنِ آدم کی سمجھ میں کیا آئے گی۔ جب وہ بیک وقت افسانہ بھی ہوتی ہے اور حقیقت بھی"۔ "شہرِ درد" اور دوسرے مجموعوں کی کئی نظموں مثلاً "رنگ کے روپ ہزار" (غزالاں تم تو واقف ہو) "دستک" اور "تم بھی" (سازِ سخن بہانہ ہے) میں اداؔ نے عورت کے درد کو زبان بخشی ہے۔ اس سلسلے میں ان کے کچھ اشعار ملاحظہ ہوں۔

کیا جانیے کس بات پہ مغرور رہی ہوں
کہنے کو تو جس راہ چلایا ہے چلی ہوں (شہرِ درد)

اک پھول ہے وہ زینتِ گیسو ہی مگر
اس انجمن میں چاک گریباں کوئی تو ہے (غزالاں تم تو واقف ہو)

یہی خطا کہ پجارن تھی اور نہ دیوی تھی
بڑی خطا تھی کہ خود کو بھی میں نے چاہا تھا (سازِ سخن بہانہ ہے)

ہتھیلیوں کے گلابوں سے خون رستا رہا
مگر وہ شوخیٔ رنگِ حنا نہیں آئی (غزالاں تم تو واقف ہو)

آنچل کا جو تھا رنگ وہ پلکوں پہ رچا ہے
اب کوئی بھی موسم ہو گل افشاں سا لگے ہے (سازِ سخن بہانہ ہے)

در بھی نہیں تھا کوئی دریچے بھی بند تھے
آنکھوں میں جانے کیسے دھنک سی رچی رہی (سازِ سخن بہانہ ہے)

سر کی چادر بھی ہوا میں نہ سنبھالی جائے
اور گھٹا ہے کہ برسنے کو بہانہ چاہے (سازِ سخن بہانہ ہے)

کہنے والی سچ ہی کہوے
میں دیپک — اور دیپک ساری رین جلے۔ (میرے گیت ادھورے۔ سازِ سخن بہانہ ہے)

آج کے دن بھی
دنیا مجھ کو جانے
خوشبو، روپ، سنگھار
میرا مول ابھی تک ٹھہرے
مہندی، کنگن، ہار (کہ وہ اب تک نہیں پلٹا۔ سازِ سخن بہانہ ہے)

یہ سوچ اردو شاعری میں حقیقتاً ایک نئی سوچ کہی جا سکتی ہے جو اپنا لہجہ بھی اپنے ساتھ لائی ہے۔ ادا جعفری نے عورت کے احساس اور پھر اس کی سوچ کی ترجمانی ضرور کی ہے۔ لیکن ان کی شاعری میں حمایتِ نسواں کا ادعائی انداز اور طرف داریٔ زناں کا حریفانہ رنگ نہیں آیا ہے۔ اس کے کئی سبب ہیں۔ پہلا سبب تو یہی ہے کہ ان کی آواز روایت کی شائستگی اور تہذیب کے حدود کی پابند رہی ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ

نازک تھے کہیں رنگِ گل و بوئے سمن سے
جذبات کہ آداب کے سانچے میں ڈھلے ہیں

پھر کیا ادا جعفری نے زندگی کی مادی آسائشوں سے سمجھوتا کر لیا ہے اور اس سے زیادہ کی طلب ان میں باقی نہیں رہی ہے؟ ایسا نہیں ہے۔ ذہنی طور پر ان کی شاعری میں بے اطمینانی اور احتجاج کا رنگ موجود رہا ہے۔ ان کا شعر ہے کہ

نہ آستاں نہ کوئی بام و در ہی جی کو لگے
چلن سدا سے یہی سرپھری ہوا کا تھا

دوسرا بڑا سبب یہ ہے کہ عورتوں کی آزادی کی تحریک جب مردوں کی بے مہار آزادی کی تقلید کرتی یا اُن کی برائی کی مثالوں کو نمونہ بنانا چاہتی ہے تو وہ مثبت حدود سے تجاوز کر جاتی ہے اور اس میں خود مردوں کے معاشرے کی خرابیوں کا رنگ در آتا ہے۔ کارل مارکس (KARL MARX) نے اس قسم کی محبت کے درمیان جو خانہ داری کے توڑنے کو مدِنظر رکھتی اور اس محبت میں جس کی سمت ازدواج کی بنیاد ہے، وسیع خلیج حائل ہونے کا ذکر کرتے ہوئے بتایا تھا کہ اس خلیج پر عہدِ شجاعت (Age of chivalry) نے کبھی بھی پورے طور پر پُل تعمیر نہیں کیا تھا۔ اس نے اس خیال کا بھی اظہار کیا تھا کہ قدیم دور میں تھوڑی سی ازدواجی محبت بھی کسی طرح داخلی جھکاؤ کے سبب سے نہیں، فرض کی بیرونی مجبوری کے تحت تھی۔ وہ یہ بھی کہتا ہے کہ جاگیر دارانہ اور سرمایہ دارانہ عمل بھی دوسرے اخلاقی ضابطوں کی طرح باہمی محبت کے نئے معیار کو نظر انداز کرتا رہا ہے (MARX ENGLES ON LITERATURE AND ART, PAGES 2+6-215 PROGRESS PUBLISHERS, MOSCOW, 1976/78/84)

ادا جعفری حیات کے تازہ جلووں کی روشنی لیے ہوئے، اپنی ذات سے دوسری ذات تک پہنچی تھیں۔ پھر ان منزلوں سے گزر کر جب وہ حیات کی راہوں میں دوبارہ آئیں تو ان کے فکر و نظر کی جہتوں میں اضافہ ہو چکا تھا۔ وہ اپنے آپ کو فطرتاً ماں بتاتی اور کہتی ہیں کہ "ماں کبھی مایوس نہیں ہوتی"۔ اس کے ساتھ ساتھ ان کا مجموعی انسانیت سے رابطہ استوار ہے۔ ان کا ذہنی احتجاج صرف عورتوں کے پابندِ جبر ہونے کے مظہر تک نہیں رہا ہے بلکہ اس نظامِ ظلم کے خلاف ہے، جس کا شکار مرد و عورت ہی نہیں، ان کے جذبے اور ان کے خواب سب ہیں۔ اپنی نظم "سوادِ شب" (غزالاں تم تو واقف ہو) میں وہ کہتی ہیں کہ

بارشِ سنگ سے ہر پیکرِ گل زخمی ہے
کہیں آدرش ہے گھائل، کہیں دل زخمی ہے

بعض خوش فہم اسے ماننے کو تیار نہیں کہ ایلیٹ (T. S. ELIOT) نے اپنی باتوں کی تکرار کی ہے۔ لیکن اسے کیا کیجئے کہ ایلیٹ کو صرف اس کا اقرار ہی نہیں اس پر اصرار بھی ہے وہ کہتا ہے کہ

You say I am repeating something I have said before. I shall say it again. Shall I say it again?

ایلیٹ ہی نہیں اکثر اچھے یا بڑے شاعروں نے بعض موضوعات دہرائے ہیں۔ خود غالب نے مضامینِ رشک مختلف پہلوؤں سے نظم کیے ہیں۔ ادا جعفری نے بھی بعض باتوں کا اعادہ کیا ہے اور اس اعادے میں وہ شاعرانہ آوازیں بھی شامل ہیں، جن سے جدید شاعری کا مزاج اور اس دور کی ذہنی فضا تعمیر ہوئی تھی۔ چنانچہ اقبال، جگر، ندیم، راشد، فیض، میراجی اور بعض دوسرے شاعروں کے اثرات ادا جعفری کے کلام میں محسوس کیے جا سکتے ہیں۔ البتہ ان سے ابتدا استفادہ کرتے ہوئے ادا نے اپنی نسائی سوچ کی زیبائی اور اپنے شخصی لہجے کی لرزش شامل کر دی ہے مثلاً اختر الایمان نے اپنی ایک مشہور نظم میں کہا تھا کہ "آپ ہوں میں نہیں انسان سے مایوس ابھی" اور ان کی دلیل فطرت کی تازہ کاری تھی۔ ادا جعفری نے اپنی معروف نظم "ماں" میں کہا ہے کہ "آخر انسان ہے، انسان سے مایوس نہ ہو" اور ان کی دلیل ماں کا وہ تصور ہے جو انسان اور فطرت دونوں کو اپنی آغوش میں لے لیتا اور حال کی بدحالی کے باوجود مادریت کے اس منصبِ تاریخ کو سامنے رکھتا ہے کہ "کل کی امید بھی میں آج کا پیغام بھی"۔ دو بعد کے مجموعوں میں ادا جعفری کا اپنی آواز پر تیقن بڑھتا گیا ہے اور فیض نے اپنا مقام ہاتھ آنے کی جو بات "شہرِ درد" میں کہی تھی، وہ ادا جعفری نے "سازِ سخن بہانہ ہے" میں بڑی نزاکت اور دل آویزی سے کہی ہے کہ جب دھوپ ہوا اور بارش ہر پہلو سے اس کو تراشتی ہے تو آئینے میں ساتوں رنگ آپ ہی عکس دکھانے لگتے ہیں۔ وہ یہ بھی کہتی ہیں کہ کچھ باتیں "بہ حدودِ بے سخنی" بھی کہی جاتی ہیں۔

مرے حرف حرف کے ہاتھ میں سبھی آئینوں کی ہیں کرچیاں
جو زباں سے ہو نہ سکا ادا بہ حدودِ بے سخنی کہا

ادا جعفری سے تقریباً سو سال پہلے امریکہ میں پیدا ہونے والی ایک شاعرہ ایمیلی ڈکنسن (EMILY DICKINSON) نے جو اپنی نسائی ندرتِ نظر کی وجہ سے جانی جاتی ہے، اپنی ایک نظم میں حسن کی خاطر اپنے مر جانے کا ذکر کرتے ہوئے کہا تھا کہ اس کے ہمسایہ مزار نے صداقت کے لیے جان دی تھی اور حسن و صداقت کو ایک قرار دیا تھا۔ ادا جعفری نے بھی کہیں کہیں حسن کا ذکر کیا ہے جو اردو شاعری کے عمومی سیاق میں بزبانِ خاتون ایک متضاد اصطلاح معلوم ہوتی ہے، اگرچہ وسیع مفہوم رکھتی ہے۔ البتہ ان کے کلام میں بار بار صداقت کی

تڑپ کا اظہار ہوا ہے۔ یہ تڑپ مزاحمتی اعمال سے زیادہ سچائی کے بیان کے لیے صحیح لفظوں کی تلاش میں ظاہر ہوئی ہے۔ یہ تلاش لہو لہان انگلیاں، زہرِ احساس، نگاہِ بے سکوں، جراتِ آگہی، دھجی دھجی آنچل، دیوارِ شب، جمالِ سحر، کڑی مسافت، تنہائیِ زنداں اور چشمِ نوحہ گر جیسی لفظیات میں عکس دکھاتی ہے۔ دراصل لکھنوی دبستان سے زیادہ قریب ہونے کے باعث ادا جعفری بیان کی خوبی اور لفظی خصوصیات کی جانب ابتدا ہی سے متوجہ رہی ہیں اور صحتِ زبان کے اعتبار سے ان کی شاعری اہم درجہ رکھتی ہے۔ مسامحت کی مثال ان کے یہاں شاذ ہی ملتی ہے۔ ایک جگہ انہوں نے "الِف لیلہ" کا استعمال کیا ہے لیکن ترقیِ اردو بیورو، دہلی کی شائع کردہ لغت میں الف لیلہ کے ساتھ الِف لیلہ بھی درج کیا گیا ہے۔ صحتِ زبان، لفظی اہتمام اور معنوی ادراک کو عصری صداقتوں نے جلا بخشی ہے اور ادا جعفری نے کہا ہے کہ

جس کی لفظ میں پائی ہے صداقت کی مہک
میں نے اس لفظ کے قدموں پہ جبیں رکھ دی ہے

ادا جعفری نے "لفظوں کے برتنے کے سلیقے" کا ذکر کیا ہے، جو ان کی شاعری کی اہم خصوصیت ہے۔ ادا جعفری نے اظہار کے نئے سانچوں سے بھی کام لیا ہے۔ البتہ ان کی بغاوت اثر لکھنوی کے نو کلاسیکی طرزِ شاعری اور اختر شیرانی کے رومانی اندازِ فکر کے خلاف ہوتے ہوئے بھی اپنے اندر توسیعِ روایت کے عناصر رکھتی ہے، جسے عصر کے سماجی شعور نے نئے نقش و نگار عطا کیے ہیں

ادا جعفری کی شاعری اپنے ارتقائی سفر میں بہتر وصفِ زندگی اور خوش تر نظامِ حیات کی طلب کا احساس دلاتی ہے۔ بنتِ حوا کی داستان میں ابنِ آدم کی رازدانی بھی شامل ہو گئی ہے۔ ادا نے صیغۂ تانیث کا آنچل لہرایا اور جہاں ضرورت پیش آئی، وہاں نسائی مزاج سے تعلق رکھنے والی زبان بھی استعمال کی، لیکن انہوں نے عورتوں اور مردوں کی زبان کے حوالے سے مصنوعی دیواریں کھڑی نہیں کی ہیں کیونکہ یہ وہ دور ہے، جب انسانیت کی مشترک جدوجہد میں فاصلے مٹ رہے اور دیواریں ٹوٹ رہی ہیں۔ ادا جعفری کی شاعری میں وہ رنگ آیا ہے، جسے ہم بشریت کا رنگ کہہ سکتے ہیں۔ لورکا (FEDRICO GRACIA LORCA) نے گیہوں کی بالیوں کی بادشاہت کا خواب دیکھا تھا اور سارتر (JEAN-PAUL SARTRE) نے کہا تھا کہ معاشرے کے غیر انسانی ہونے کے سبب فن اپنے آپ کو انسان دوست کہہ سکتا ہے۔ ادا جعفری کی شاعری، اجتماعی انسانی مقاصد کو اس شاعرانہ رُخ سے پیش کرتی ہے، جسے ہم نسائی بصیرت کے علاوہ مردانہ تعقل سے بھی تعبیر کر سکتے ہیں۔ اب ان کا احتجاج پورے نظامِ ظلم کے خلاف ہے اور ذات و اجتماعی خواہشات کی یک جائی سے حرفِ صداقت اعتبار پاتا ہے۔ وہ بڑے خوبصورت انداز میں کہتی ہیں کہ

شبنم سے رہ گزارِ سحر کا پتہ کروں
مٹی سے رنگ و بُو کے خزانے تراش لوں

شاعرانہ ہنرمندی اور رنگا رنگی کے اعتبار سے بھی ادا جعفری کا ارتقائی سفر جاری رہا ہے۔ انہوں نے بعض دوسرے شاعروں کی طرح منظوم سفرنامے لکھے اور ہائیکو کے تجربے بھی کیے۔ کہیں کہیں غزلوں میں گیتوں کی موسیقی سے کام لیا۔ ملی اور مذہبی موضوعات پر خامہ فرسائی بھی کی ہے، جس سے ان کے مذہب سے لگاؤ اور پاکستان سے محبت کی وضاحت ہوتی ہے۔ اپنے منظوم سفرناموں میں واشنگٹن کے "تضادِ رنگ" سے گزر کر "زخم تماشا" میں انہیں سحر کا آنچل سرخ نظر آیا ہے۔ صنم کدوں کی سرزمین بنکاک میں انہیں اپنے گھر کا دیا جلنے یا نہ جلنے کی تشویش رہی اور ٹوکیو (جاپان) کی وادیٔ مہرباں میں انہیں جنگ اور موت کی قہر سامانی اور ہیروشیما کا زخم یاد رہا ہے۔ "مسجد اقصیٰ" کے حادثۂ مرگِ ناموس میں وہ تلقینِ جنوں کا سامان پاتی ہیں۔ ان کی ایسی نظموں میں اعتقاداتی، استعاراتی اور واقعاتی رنگوں کی آمیزش ملتی ہے۔ مذہب کے حوالے سے جارج سنتایانا (GEORGE SANTAYANA) نے کہا تھا کہ "مابعد الطبیعیات

نے نہ صرف یہ کہ تمثیل (ALLEGORY) کی جگہ لے لی ہے، بلکہ بیک وقت تاریخ کا پس منظر بھی بن گئی ہے۔ اس کا یہ قول اساطیری مذاہب کے لیے زیادہ صحیح ہے۔ اگرچہ مسلم ممالک میں بھی تحریکِ تصوف کے زیرِ اثر مشاہدۂ حق، بادہ و ساغر کے پردے میں ڈھلتا رہا ہے لیکن عیسوی روایت، مذہبی رسم اور شاعری میں عشائے ربانی کی شراب کو حضرت عیسیٰ کے خون کی علامت بنا دیتی ہے۔ البتہ مسلم ممالک کے ادبیات میں مذہبی جہات یا پابی نے اخلاقیاتِ تصوف کے ساتھ ساتھ، تجسساتِ سیاست کے اظہار کے مواقع فراہم کئے ہیں۔ چنانچہ ادا کی "مسجدِ اقصیٰ" "الفتح" اور "اندوہ گیں وادیو" کے استعاراتی انداز میں سیاسی واقعیت کی جھلک ملتی ہے۔ ادا کی شاعری میں نظامِ جبر کو زیر و زبر کرنے کا خیال اس عصر کے شعور کی دین ہے اور ان کی شاعرانہ صورت گری میں اس دور کے ذہنی اور مادی احوال ترتیب پاتے ہیں۔ ادا کی شاعری میں اظہار کا سلیقہ تو ابتدا سے موجود رہا ہے لیکن اس میں مظلوم انسانوں کی ہمدردی کے ساتھ جذبات و احساسات کی نئی تہیں بھی ملتی رہی ہیں۔ ان کی شعری دانش نے عصرِ حاضر کی گواہی دی ہے، زندگی کے نسائی پہلوؤں کو پیش کیا ہے، مستقبل کے انسانی امکانات کا جائزہ لیا ہے اور اس کے علاوہ مجموعی اور ذاتی کیفیات کے اظہار میں دل کی دھڑکنیں گو دی ہیں۔ انہوں نے کہا تھا کہ

بہت دنوں تو ہواؤں کا ہم نے رُخ دیکھا
بڑے دنوں میں متاعِ قلم کو پہچانے

اب بھی وہ اپنے دور کے تقاضوں سے منسلک ہیں لیکن ادا جعفری نے متاعِ قلم کو پہچاننے کے ساتھ ساتھ اپنی آواز کی دریافت بھی کی ہے اور ریاضتِ فن میں اک عمر بسر کرنے کے بعد ان کی شاعری اعتبارِ ذات کا اثبات کرتی اور شاعرانہ عمل و اظہار میں اپنی خلاقانہ شناخت کا نقش مستحکم بناتی ہے۔ ان کی شاعری کی تخیلی فضا، اس کی تخلیقی تشکیل، اس کی خواب پرور قوت اور اس کے زبان و بیان کے تلازمات و تناظرات میں ان کی اپنی شخصی استعداد، ذاتی آگہی، اور تہذیبی وجود کی رچاوٹ ہے۔ ان کے ثقافتی پس منظر میں شاعری کے جدید لسانی سانچوں کے ساتھ "پوچھو ہو" "چلے ہے" "مانگے ہے" "کہیو" "لگے ہے" اور "پہچانے تھے" جیسے الفاظ ایک مربوط داخلی آہنگ اور شخصی کلیت کا پتہ دیتے ہیں۔ جدید اردو شاعری کے ذہنی اور اسالیبی نقوش میں ادا جعفری نے نیا تہذیبی رنگ بھرا ہے اور ان کے قائم کردہ نشانات سے اس دور کی کئی راہوں اور منزلوں کا تعین ہوتا ہے۔

ادا کی شاعری کے ارتقائی سفر کا اندازہ ان کی نظموں کے کشادہ فکری جہات اور غزلوں میں تاثر انگیزی کے وسیع امکانات سے کیا جا سکتا ہے۔ اردو میں جدید غزل نے معاشرت و تہذیب کے جن جلوؤں کی نمائندگی کی اور ذات کے داغ و جستجو کے جو نقوش بروئے کار آئے ہیں، ایک انسان دوست نسائی شخصیت کے دل آویز آئینے میں وہ نیا رنگ دکھاتے ہیں خوابوں کی رنگ آمیزی اور تضادوں کی تحیر خیزی کے ساتھ، ان کا مطالعہ ادا جعفری کی غزل میں اُن کے پُر آہنگ لہجہ کا انکشاف بھی کرتا ہے۔ مثلاً

ہونٹوں کو مسکرانے کی عادت سی پڑ گئی
دل بھی کہے میں ہوتا تو کیا تھا بُرا ہمیں

حسنِ طلب بھی کبھی ذوقِ سپردگی
کس نے کہا کہ گلوں کو حیا راس آ گئی

صبح آئی ہی روشن، پھول ویسے ہی خنداں   یاس کے دریچوں سے جب بھی جھانک کر دیکھا

دل اپنا جلایا ہے کسی نے بھی خوشی سے
بن جاتی ہے جی پر تو گزر جاتے ہیں جی سے

کچھ لوگ شرمسار خدا جانے کیوں ہوئے
اپنے سوا ہمیں تو کسی سے گلا نہ تھا

ہاتھ کانٹوں سے کر لیے زخمی   پھول بالوں میں اک سجانے کو

جادۂ تمنا سے دار کی بلندی تک
جانے والے جا پہنچے، فاصلہ ہی کتنا تھا

نازِ وفا کا بت بھی ہمیں توڑنا پڑا
لوگو شکستِ دل سے بڑا سانحہ ہوا

گلوں سی گفتگو کریں قیامتوں کے درمیاں
ہم ایسے لوگ اب ملیں حکایتوں کے درمیاں

سفر تمام ہوا اور حیرتیں نہ گئیں
جو قربتیں تھیں، وہاں فاصلہ بلا کا تھا

خونِ دل میں تو ڈبویا تھا قلم   اور پھر کچھ نہ لکھا تھا شاید

سوچ ہوائے تند خُو! ویسے تو جو مرضی تری
اتنا بتا ہم ناتواں تجھ سے کبھی ہارے بھی ہیں

یہ اشعار ایسے لہجے، ایسی کیفیت اور ایسے فکری و احساساتی زاویوں کا پتہ دیتے ہیں، جو اردو غزل کے سرمائے کو زیادہ باثروت بناتے ہیں اور جن کی رنگینی و دل آویزی ادا جعفری سے عبارت ہے۔

ادا کی ایک عجیب غزل یوسف علی خاں ناظم کی پُرطنز توضیحات "غلط" پر مبنی ایک یادگار غزل کی طرح استادانہ اور پرشکوہ ہے، لیکن اس میں معاشرتی رابطوں کے ادراک التباس کا دائرہ زیادہ وسیع ہے۔ وہ کہتی ہیں کہ

وہ اعتمادِ خوئے ستم بھی بہانہ ساز
یہ افتخارِ کرب و الم بھی بہانہ ساز
کچھ بُت بنا لیے ہیں، چٹانیں تراش کر
دل بھی بہانہ ساز ہے، غم بھی بہانہ ساز
سب سے بڑا فریب ہے خود زندگی ادا
اس حیلہ جُو کے ساتھ ہیں ہم بھی بہانہ ساز

سچائیوں کی پرکھ عصری تقاضوں کے حوالے سے کی جا سکتی ہے لیکن شاعر کا دل مختلف اضطراری و استعجابی کیفیتوں کی آئینہ داری بھی کرتا ہے۔ کوئی اہم شاعر نہ اُن سے روگردانی کر سکتا ہے اور نہ ان کیفیات کو جمالیاتی وصف عطا کرنے کی اس بیاضتِ فن سے دور رہ سکتا ہے، جب حقیقت کی مختلف سطحوں کی کشمکش ذہنی تجربے اور تہذیبی وجود کے ربط کو بیان کے نئے سانچوں میں ڈھالتی اور اظہار کے نئے ابعاد دریافت کرتی ہے۔ حقیقت تو ایک لامتناہی تلاش کا نام ہے۔ لیکن کبھی کبھی حقیقت خود شاعرانہ وجود کو چھُو کر گزر جاتی ہے۔ ایسے لمحات کا عکس جب شاعری کے آئینے میں اتر آتا ہے، تو وہ ایک طلسمی تاثر کا حامل ہوتا ہے۔ شاعرانہ انا کی ربودگی کے وہ انفرادی لمحے بھی جو تہذیب و معاشرے سے یگانگت رکھتے ہیں، تخلیقی طور پر انسانی سوچ کو آگے بڑھانے میں معاون بن جاتے ہیں۔ کیونکہ یہ لمحے موجودات کی سطح سے اُبھر کر تاثرات کے جہانِ ناآفریدہ کی صورت گری کرتے ہیں۔ ایسے لمحات کی سچائی حقیقت کی نفی نہیں کرتی بلکہ اس کی ایک نئی تعبیر سے عبارت ہوتی ہے۔ ادا جعفری نے بعض لمحوں کے اس انفرادی تاثر کو بھی پیش کیا ہے، جب حقیقت ایک منفرد صورت میں ڈھل جاتی ہے کبھی گرٹروڈ اسٹین (GERTRUDE STEIN) کی طرح "گلاب" "گلاب ہے، گلاب ہے، گلاب ہے" ہی کہا جا سکتا ہے کہ مشاہدہ گلاب کا تاثر کسی اور مماثلت کا متحمل نہیں ہوتا اور کبھی والٹ وہٹمین (WALT WHITMAN) کی طرح ایک فاضل ستارہ شناس کی گفتگو سے عاجز، شاعر باہر نکل کر خود ستاروں کے حسن کو محسوس کرتا اور کہتا ہے کہ "رات کی پُر اسرار نم ہوا میں، ستاروں کو کامل خاموشی میں گاہ بگاہ دیکھا!" والٹ وہٹمین کی یہ سطریں ایک نظم کا حصہ ہیں۔ لیکن غزل کی تجریدی صفت سے فائدہ اُٹھاتے ہوئے، ادا جعفری نے متوازی بیان کا جادو یوں جگایا ہے کہ

نہ جانے لوگ کہاں تھے، زمانہ تھا کہ نہیں　　زمیں پہ میں تھی فلک پہ بس اک ستارا تھا

ذات کی ماورائی سرشاری کے کچھ اور رنگ یوں ادا ہوتے ہیں کہ

مرے روز و شب بھی عجیب تھے، نہ شمار تھا، نہ حساب تھا　　کبھی عمر بھر کی خبر نہ تھی، کبھی ایک پل کو صدی کہا

خوشبو کے ساتھ ساتھ نہ جانے کہاں تھی میں　　پھر یوں ہوا کہ گردشِ دوراں تھمی رہی

ادا جعفری کی شاعری نہاں خانۂ دل کے مختلف گوشوں کو سامنے لاتی اور عصری زندگی کے متعدد مسائل و میلانات کو پیش کرتی ہے۔ اس کے مطالعے سے یہ احساس بھی جاگتا ہے کہ نئے نظام کی بات جہاں سے بھی چلے، اس کا قیام و استحکام معاشی اور سیاسی انصاف کے بغیر ممکن نہیں۔

ادا جعفری کی شاعری ایک خوبصورت شال کی ماہرانہ بُنت میں خواب و حقیقت کی وہ دل آویز نقش گری ہے، جس کے رنگوں کی گویائی میں لکھنؤ سے کشمیر اور ویٹ نام تک کی انسانی تاثر پذیری اور تہذیبی تابانی ملتی ہے۔ ادا جعفری کی شاعرانہ خدمات کی پذیرائی ایک ہم عصرانہ تہذیبی صداقت کا اعتراف ہے۔

نسیم سیّد کی شاعری

احمد ہمدانی

شاعری اپنی نوعیت میں ایک ایسا حق ہے جو بیک وقت دو طرح کی فعلیتوں (ACTIVITIES) کے تانے بانے سے تشکیل پاتا ہے اس میں پہلی فعلیت شاعر کے اپنے جذبہ یا احساس کی ہوتی ہے اور دوسری فعلیت اس جذبہ یا احساس سے ملتی جلتی ایسی فضا تخلیق کرنا ہے جو شاعر کے جذبہ میں دوسروں کی شرکت کو ممکن بنا سکے۔ اس طرح شاعری کا محرکِ اوّل شاعر کا اپنا جذبہ یا احساس ہوتا ہے جس کی نوعیت داخلی ہوتی ہے لیکن جب شاعر اس داخلی یا موضوعی حقیقت میں دوسروں کو شریک کرنے کی خواہش کے تحت ایسی فضا تخلیق کرتا ہے جو اس شاعر کے احساس کے مماثل بھی ہوتی ہے اور جو اس احساس میں دوسروں کی شرکت کو ممکن بھی بناتی ہے تو وہ داخلیت یا موضوعیت (Subjectivity) کو معروضیت یعنی (Objectivity) میں بدلنے کے عمل سے گزرتا ہے۔ اس طرح ہم کہہ سکتے ہیں کہ شاعری کا محرک موضوعی ہوتا ہے لیکن یہ محرک بالآخر جس صورت پر منتج ہوتا ہے وہ اپنی نوعیت میں معروضی ہوتی ہے۔ شاعری کے محرکِ اوّل یعنی جذبہ یا احساس کی اصلیت کو پال ویری زندگی اور ذات کے اتصال سے پیدا شدہ ایک پُراسرار چیز بتاتا ہے۔ اس پُراسرار چیز یا خالص ذاتی کیفیت کو دوسروں تک منتقل کرنے کے لیے ضروری ہے کہ شاعر اپنی عقل کی قوتوں سے استفادہ کرے اور اس جذبہ یا کیفیت کو جو اپنی نوعیت میں انوکھی، منفرد اور بالکل نجی ہوتی ہے اسے دوسروں کے لیے قابلِ فہم بنائے۔ اپنے جذبے کو دوسروں کے لیے قابلِ فہم بنانے کے واسطے شاعر ایسے استعارے تخلیق کرتا ہے جو اس کے انوکھے اور منفرد جذبے سے ملتی جلتی صورتیں اُبھارتے ہیں۔ یہ استعارے اس کی تخلیقی یا تخیلی عقل (Imaginative or Creative Intelect) کے مرہونِ منت ہوتے ہیں۔ استعاروں کی تخلیق کے اس عمل کو ہم شاعر کے شعور کی دو جداگانہ جہتوں کا تعاون بھی کہہ سکتے ہیں۔ یہ دو جداگانہ جہتیں انا اور غیر انا سے تعبیر کی جا سکتی ہیں جنہیں ہم دوسرے الفاظ میں موضوعیت اور معروضیت سے بھی موسوم کرتے ہیں۔ استعاروں کی ایجاد کے اس تجزیے سے عقل و شعور کا کردار واضح طور پر اُبھر کر سامنے آتا ہے جس سے ظاہر ہوتا ہے کہ وہ تمام حضرات جو شاعری کو غیر عقلی (Irrational) یا خالص لاشعوری عمل ٹھہراتے ہیں وہ شاعری کے محرک اور اصل شاعری میں فرق کرنے سے قاصر ہوتے ہیں۔ نسیم سیّد کی شاعری کے مطالعہ سے شاید ہم اپنے اس خیال کی وضاحت کر سکیں کہ شاعری کا محرک جب شاعر کی قوتِ متخیلہ کا تعاون حاصل کرتا ہے تو شاعری وجود میں آتی ہے۔

نسیم سیّد ایک خاتون ہیں لہٰذا ان کے جذبات و احساسات کا مردوں کے جذبات سے قدرے مختلف ہونا ایک فطری امر ہے لیکن جب وہ اپنے جذبات کا اظہار شاعری کی صورت میں کرتی ہیں تو عورت اور مرد کی تفریق ختم ہو کر رہ جاتی ہے اور ان کی شاعری مردوں پر بھی اسی طرح اثر انداز ہوتی ہے جس طرح عورتوں پر۔ گویا ان کی شاعری نسوانی موضوعی حقیقت کو خالص انسانی حقیقت میں تبدیل کرنے کا عمل ہے جسے وہ تخیلہ یا تخیلی عمل (Imaginative Intelect) کی مدد سے انجام دیتی ہیں۔ مثال کے طور پر ان کی نظم "ایشیا کی مزدور عورت" کے یہ اشعار ملاحظہ ہوں:

تمہاری سر پہ دھرے تربتر پسینے سے — اُٹھائے ماتما کا بوجھ نو مہینے سے
رُتوں کے قہر کو یہ امتحان لگتی ہے — یہ چاندنی سے بنی اک چٹان لگتی ہے
پھٹے لباس پہ محنت کی شال اوڑھے ہے — بدن کے شیشے پہ لوہے کا جال اوڑھے ہے
پہ چڑھے گی زینہ بہ زینہ سیڑھی ساری — اگرچہ بوجھ بھی بھاری ہے پیر بھی بھاری
یہ بھٹ پٹے کو تھکی ہاری گھر کو جائے گی — تو اپنے کنبے کی ہر بھوک یہ مٹائے گی
غریب ہے سو بدن کا خراج دیتی ہے — یہ خود کو پیس کے گھر کو اناج دیتی ہے

ان اشعار میں جو حقائق ابھارے گئے ہیں انہیں جذباتی اور احساساتی سطح پر صرف عورت ہی بخوبی سمجھ سکتی ہے۔ مثلاً "اُٹھائے ماتما کا بوجھ نو مہینے سے" "اگرچہ بوجھ بھی بھاری ہے پیر بھی بھاری" "تو اپنے کنبہ کی ہر بھوک یہ مٹائے گی"۔ یہ تینوں مصرعے ایسے ہیں جن کا تجزیہ عورت اور صرف عورت ہی کر سکتی ہے، یعنی ماتما کا بوجھ نو مہینے تک اٹھانے میں یہ جو دکھ اور لذت کا ملا جلا احساس ہوتا ہے اس کا اندازہ مرد کے لیے ممکن ہی نہیں۔ اسی طرح "پیر بھاری" یعنی حاملہ ہونے کی صورت میں سر پر بوجھ لادنا جس قدر مشکل ہوتا ہے اس کا اندازہ صرف عورت ہی کو ہو سکتا ہے۔ تیسرے مصرعہ میں "تو اپنے کنبہ کی ہر بھوک یہ مٹائے گی" میں پیٹ کی بھوک کے ساتھ جنسی بھوک مٹانے کی طرف نہایت بلیغ اشارہ ہے۔ یہ تینوں مصرعے ایسے دکھوں کی تصویریں اُبھارتے ہیں جن کی شدت کا اندازہ مرد تو کیا آرام و آسائش سے بسر کرنے والی عورتیں بھی مشکل ہی سے کر سکتی ہیں۔ ان مصرعوں کے موضوعات کے علاوہ ذرا ان تراکیب، استعاروں اور تمثالوں پر بھی توجہ فرمائیں —— "پھٹے لباس پہ محنت کی شال" "بدن کے شیشے پہ لوہے کا جال" "چاندنی سے بنی ہوئی چٹان" "خود کو پیس کر اناج فراہم کرنا" یہ سب ایسی تراکیب یا تمثالیں ہیں جو ایک طرف ایشیا کی مزدور عورت کی محنت، عزم اور ہمت کی تصویر کشی کرتی ہیں تو دوسری طرف نسیم سید کی قوتِ متخیلہ کی ایسی شہادت پیش کرتی ہیں جس کو تسلیم کیے بغیر کوئی چارہ نظر نہیں آتا۔ اس پوری نظم میں ایشیا کی مزدور عورت کا نقشہ کچھ اس طرح اُتارا گیا ہے کہ عورت کے بجائے انسانیت کا دکھ اور معاشرہ کی ناانصافیاں ابھر کر سامنے آتی ہیں۔ ان کا یہ عمل انا کو غیر انا اور موضوع کو معروض میں ملانے کا عمل ہے اور ہمارے تجزیہ کے مطابق شاید اسی عمل کا نام شاعری ہے۔

نسیم سید کی اسی طرح کی ایک اور نظم "تم سے ممکن ہو تو پھر" ہے۔ اس نظم میں بھی عورت کو مختلف انداز سے محنت کر کے روزی کماتے ہوئے دکھایا گیا ہے اور نہایت موثر انداز سے شکوہ کیا گیا ہے کہ عورت کی تمام تر ہمت و حوصلہ کے باوجود اس کی بڑائی کو ابھی تک تسلیم نہیں کیا گیا ہے۔ کاش کوئی آگے بڑھے اور عورت کے مرتبہ کو تسلیم کرے۔ ملاحظہ ہو:

تم مرے گاؤں میں آ کے دیکھو
جیٹھ کی دھوپ میں وہ دھوپ بدن
پھول ہاتھوں میں درانتی تھامے
پکی عمروں سے جواں خوابوں تک
خواب کی عمر سے بوڑھے سر تک
دھانی فصلوں پہ جھکے رہتے ہیں
تم مرے شہر میں آ کے دیکھو
کارخانوں میں مرے ساتھ چلو

کسی دفتر کسی مکتب کسی تحقیق کے مرکز میں چلو
ہم قدم اپنے نظر آئیں گی وہ
انگلیاں جن کے سبک ہاتھوں کی
پہنچ جاتی ہیں

تم سے ممکن ہو تو پھر
اپنی عقیدت کی کتابوں میں کوئی ایک کتاب
ان غریب ہاتھوں سے منسوب کرو

وہ گاؤں ہو یا شہر، زمینداری ماحول ہو یا صنعتی معاشرہ، ہم عورت کو ہر جگہ مردوں کے شانہ بشانہ مصروفِ عمل دیکھتے ہیں لیکن عورت کی تمام تر محنت و مشقت اور اس کی اعلیٰ صلاحیتوں کے باوجود اس کو ہر جگہ نظر کم سے دیکھا جاتا اور اس کے استحصال کو روا رکھا جاتا ہے۔ البتہ استحصال کی صورتیں ضرور مختلف ہوتی ہیں۔ نسیم سید نے اس ناانصافی یا معاشرتی بدصورتی کو نہایت موثر اور فکر انگیز طور پر ابھارا ہے جس سے ان کی شاعری قابلِ تعریف شاعری کی صف میں شامل ہوتی نظر آتی ہے۔

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ ہم یہاں ایک غلط فہمی دور کرتے چلیں۔ آجکل کچھ نام نہاد جدیدیت کے علمبردار شعراء اور ادیب اکثر و بیشتر ایسی شاعری کا مذاق اڑاتے ہیں جس میں کوئی معاشرتی اصلاح کا پہلو ہو۔ ان کا یہ رویہ شاعری یا فنونِ لطیفہ کے بارے میں عدم تفہیم کا نتیجہ معلوم ہوتا ہے کیونکہ جدیدیت کے باوا آدم "بودلیئر" نے شاعری کا مقصد خود شاعری کو بتاتے ہوئے معاشرتی یا اخلاقی اصلاح کے پہلو کو لازمی قرار دیا ہے۔ وہ کہتا ہے "اگر ہم اپنے اندر کی گہرائیوں میں اتر کر اپنی روح سے پوچھیں اور ایسے لمحوں کو یاد کریں جب کسی جذبہ نے ہماری روح پر قبضہ کر رکھا تھا تو ہمیں یقین ہو جائے گا کہ شاعری کا مقصود خود شاعری ہے لیکن اس سے یہ مراد ہرگز نہیں ہے کہ شاعری اخلاق کو رفعت نہیں بخشتی اور اس کا نتیجہ یہ نہیں ہوتا کہ وہ انسان کو اسفل اور عامیانہ مفادات کی سطح سے بلند کر دے۔ اس قسم کا دعویٰ واضح طور پر خلافِ عقل ہوگا۔" دراصل بودلیئر جو کہتا ہے وہ صرف یہ ہے کہ اخلاقی، معاشرتی یا تہذیبی اصلاح کو پہلے سے موضوع بنا کر شعر نہیں لکھنا چاہیے، یعنی شاعر کسی اصلاحی مقصد کو سامنے رکھ کر شاعری نہیں کرتا بلکہ وہ تو اپنے جذبے یا احساس کے اظہار کے لیے بے تاب ہوتا ہے۔ اس کا یہ اظہار ہی شاعری ہے لیکن یہ اظہار اپنی نوعیت میں انسان کو اخلاقی اور معاشرتی طور پر بلند کرتا ہے، گویا شاعری کا مقصد تو اصلاح نہیں ہوتا لیکن شاعری انجام کار معاشرتی اور اخلاقی اصلاح پر منتج ضرور ہوتی ہے۔ اس سلسلہ میں یہ وضاحت کرنی بھی ضروری ہے کہ ترقی پسند شعراء جب مقصدیت اور افادیت کی بات کرتے ہیں تو ان کا مطلب بھی یہی ہوتا ہے کہ شاعری کا مقصد تو خود شاعری یا حسن آفرینی ہے لیکن حسن آفرینی انجام کار اخلاق کی بلندی پر منتج ہوتی ہے۔

نسیم سید کینیڈا میں رہتی ہیں لیکن اپنے اصل وطن پاکستان سے ان کا تعلق انہیں بے چین رکھتا ہے۔ پاکستان میں جو دہشت گردی اور لاقانونیت کا رجحان بڑھ رہا ہے وہ ان کے لیے سخت تکلیف دہ ہے۔ انہوں نے اپنی اس تکلیف کا جگہ جگہ اظہار کیا ہے مثلاً ان کی نظم "ہائے وہ شہر دلآرا میرا" کراچی کی تباہی اور یہاں پائے جانے والے قتل و غارت گری کے رجحان کا مرثیہ ہے جس سے نسیم سید کی وطن سے محبت کا بخوبی اندازہ ہو سکتا ہے۔ چند اشعار سنیے:-

اب کے گھر لوٹ کے جانا تو نگاہوں میں بسے
سارے شاداب مناظر کو بھلا کر جانا
جاگ کے یادوں میں

سوچوں میں، گنوانا نہ سفر
شہر سے اپنے ملوگے تو بہت دکھ ہوگا
راستے وہ
جو قدم تھام لیا کرتے تھے
اب تو آہٹ بھی کوئی سن کے لرز جاتے ہیں
جہاں آوازوں کا میلہ سا لگا رہتا تھا
صحن وہ
غیر کیا اپنوں سے گھبراتے ہیں
شادماں گلیاں، نہ بچوں کی وہ چہکاریں ہیں
جس طرف دیکھوگے دیواریں ہی دیواریں ہیں

اور پھر یہ نظم ان مصرعوں پر ختم ہوتی ہے۔

اب کر گھر جانا تو اس شہر دلآرا کے لیے
کوئی امید، کوئی حرفِ دعا لے جانا
بے یقیں دل کو ذرا چین سا آجائے گا
چند لمحوں کو مرا شہر بہل جائے گا

یہ پوری نظم موجودہ حالات کا بڑا دلدوز مرثیہ ہے۔ اس مرثیہ میں جو تراکیب اور تمثالیں استعمال ہوئی ہیں وہ نہ صرف اچھوتی اور پر اثر ہیں بلکہ فکر انگیز بھی ہیں۔ مثلاً "خوف کی چاپ"، "مثیالی سی مجبوری کی چادر"، "امید کی ڈیوڑھی پہ کر ٹیکنا" وغیرہ وغیرہ۔ ایسی تراکیب اور تمثالیں ہیں جو ہمارے اطراف اثر انگیزی کا عجب طلسماتی ہالہ سا کھینچ دیتی ہیں اور ہم پر فکر و نظر کے نئے دروازے کھلتے محسوس ہوتے ہیں۔ انہوں نے اپنی نظم "سال کی آخری شب" میں بھی اپنے وطن سے محبت کے اظہار کے ساتھ اپنے وطن میں پھیلی ہوئی فتنہ و فساد کی فضا پر ماتم کیا ہے۔ وطن سے بہت دور اجنبی دیس میں اپنے وطن کو یاد کر کے رونا اور یہاں کی خوف و دہشت سے بھری فضا کی دلدوز تصویریں ابھارنا ان کی پہچان بن گیا ہے۔

اپنے دیس سے دور غیر ملکوں میں لوگوں کی زندگی کا ڈھنگ انہیں اجنبیت و بیگانگی کی نئی صورت سے دوچار کرتا ہے۔ اجنبیت کی اس نئی صورت کا آغاز یوروپ کی جنگِ عظیم اوّل کے بعد مغربی ممالک میں افرادی قوت کی کمی سے ہوا۔ مغربی ممالک کے کارخانوں کے لیے مزدور درکار تھے اور یہ مزدور مشرقی ممالک میں کثرت سے دستیاب تھے۔ لہٰذا شروع شروع میں لوگوں کو مشرقی ممالک سے نسبتاً بہتر شرائط پر درآمد کیا گیا لیکن رفتہ رفتہ مشرق سے آئے ہوئے مزدور اور ان کے خاندان کے افراد نئے مسائل کا سبب بننے لگے۔ مغربی ممالک میں موجود مشرقی ممالک کے لوگوں کی بہت بڑی تعداد وہاں کی معیشت و معاشرت پر خاصے ناخوشگوار اثرات مرتب کر رہی ہے۔ مغربی ممالک ان ناخوشگوار اثرات سے چھٹکارہ حاصل کرنے کے لیے مشرقی ممالک سے آئے ہوئے یا آنے والے افراد کی طرح طرح سے حوصلہ شکنی کرتے ہیں جس کی وجہ سے مشرقی ملکوں کے افراد کے لیے بہت سی مشکلات پیدا ہوگئی ہیں۔ مثلاً ابتدا میں مشرق سے آنے والے مزدوروں کو اجازت تھی کہ وہ اپنے گھر والوں کو بھی اپنے ساتھ لے آئیں لیکن اب یہ رعایت ختم کر دی گئی ہے لہٰذا وہ لوگ جو مغربی ممالک میں کام کرتے

ہیں اپنے گھر والوں کو اپنے پاس بلانے کے لیے ضابطہ کی تحت کارروائیوں سے گزرتے ہیں اور خاصی مدت کے بعد اپنی بیوی اور اپنے بچوں کو اپنے پاس بلانے کے حق دار ہوتے ہیں۔ قانون و ضابطہ کی عائد کردہ مشکلات کے علاوہ ہجرت کے کچھ جذباتی مسائل بھی ہوتے ہیں مثلاً کسی اجنبی ملک میں مختلف زبان اور مختلف معاشرتی ماحول سے سابقہ پڑتا ہے۔ اس اجنبی ماحول میں انسان خود کو بہت تنہا اور اطراف سے بالکل کٹا ہوا محسوس کرتا ہے۔ اس کا یہ احساس اسے اجنبیت و بیگانگی (Alienation) کے جان لیوا عذاب سے دوچار کرنے کے ساتھ اس کی شخصیت کو ریزہ ریزہ کر دیتا ہے جس کی وجہ سے اس کی شخصیت کو ایک ایسے بحران کا سامنا کرنا پڑتا ہے جو اسے خود اپنی محنت سے حاصل کردہ ثمرات سے بھی بیزار کر دیتا ہے۔ یعنی اجنبی ملکوں میں آباد یہ لوگ ہر طرح کی مادی آسائشوں کے حصول کے باوجود جذباتی و احساساتی سطح پر نہایت تکلیف دہ زندگی گزارتے ہیں۔ مغربی ملکوں کے علاوہ ہم دیکھتے ہیں کہ پچھلے کچھ دنوں سے روزگار کی تلاش میں ترقی پذیر ملکوں کے بہت سے لوگ سعودی عرب، امارات، لیبیا، اور کویت جیسے تیل پیدا کرنے والے ملکوں میں بھی جا رہے ہیں اور تقریباً ویسی جذباتی ناآسودگی سے دوچار ہوتے ہیں جیسی کہ مغربی ممالک میں آباد مشرقی ملکوں سے گئے ہوئے لوگوں کو پیش آتی ہے۔ غیر ملکوں کے علاوہ خود اپنے ملک میں بھی ہجرت کا مسئلہ کچھ کم پریشان کن نہیں ہے۔ صنعتی معاشرہ میں روزگار کے مواقع زیادہ تر بڑے شہروں ہی میں دستیاب ہوتے ہیں لہٰذا لوگ دیہاتوں اور چھوٹے شہروں سے ان بڑے شہروں میں آ کر آباد ہو جاتے ہیں جو صنعت و تجارت کے بڑے مرکز ہوتے ہیں۔ صنعت و تجارت کے ان بڑے مراکز کا طرزِ زندگی دیہاتی رہن سہن سے بالکل مختلف ہوتا ہے۔ بعض لوگوں کے لیے ان مراکز کی زبان بھی بالکل مختلف ہوتی ہے جس کی وجہ سے بڑے شہروں میں آنے والے دیہاتی یا چھوٹے شہروں کے لوگ خاصے پریشان کن احساسِ اجنبیت کا شکار ہو جاتے ہیں اور اسی وجہ سے ہم یہ نتیجہ اخذ کرنے میں حق بجانب ہوں گے کہ صنعتی معاشروں میں ایک اہم مسئلہ ہجرت کے دکھوں کا ہے جو بالآخر احساسِ اجنبیت پر یا تو منتج ہوتا ہے یا احساسِ اجنبیت میں اضافے کا سبب بنتا ہے۔ نسیم سید نے ہجرت کے اس دکھ کو نہایت موثر انداز سے پیش کیا ہے:

اجنبی دیس سے سمجھوتہ نہیں گر ممکن
کوئی پوچھے ہمیں ہجرت کی ضرورت کیا ہے

کسی زمیں پہ تو شاداب ہو، کہیں تو کھلے
ہماری سوچ کے پودے میں یہ ہنر بھی نہیں
سفر کے بعد یقیں ہو کہ گھر بھی آئے گا
مرے نصیب میں ایسا کوئی سفر بھی نہیں

یہ کیا ہے کہ جس شہر میں جا بستے ہیں ہم لوگ
اس شہر کے حالات ہمارے نہیں ہوتے

بڑے دنوں میں جو گھر کی مراد بر آئی
وہی مراد ہمیں دربدر بھی کر آئی

یہ اور ایسے دوسرے بہت سے اشعار نسیم سیّد کے ان دکھوں کا اظہار ہیں جن کا سبب وطن سے ان کی ہجرت ہے۔ ہجرت کے ان دکھوں کے علاوہ انہیں مغربی معاشرہ کی بہت سی چیزیں سخت تکلیف دہ نظر آتی ہیں مثلاً مغربی ملکوں میں بوڑھے لوگوں کے لیے جو گھر بنائے جاتے ہیں اور جہاں کے تمام انتظامات سرکاری سطح پر انجام پاتے ہیں وہ نسیم کو بالکل پسند نہیں آتے کیونکہ یہ گھر بوڑھے لوگوں کے لیے قید تنہائی کے احساسات ڈھالنے والے کارخانوں سے زیادہ کچھ بھی نہیں ہوتے۔ بوڑھوں کے ساتھ مغربی ممالک کا یہ سلوک غیر انسانی ہے جس کی وجہ شاید یہ ہے کہ مغرب کی بڑھتی ہوئی مادیت پرستی کے نزدیک انسان صرف جسمانی وجود تک محدود ہے، یعنی روٹی کپڑا مکان کے علاوہ اس کی کوئی اور ضرورت نہیں ہے۔ گویا مغرب کو انسان کی جذباتی، روحانی اور جمالیاتی زندگی سے کوئی سروکار نہیں ہے لہٰذا بوڑھوں کو روٹی کپڑا اور مکان کی طرف سے بے فکر کرکے یہ سمجھ لیا جاتا ہے کہ ان کی تمام ضروریات پوری کر دی گئی ہیں، جبکہ بوڑھے ان گھروں میں اپنے بچوں، عزیز و اقارب اور اپنے ہم جنسوں کی رفاقت و دمسازی کے دلآویز لمحوں کی تلاش میں بے چین رہتے ہیں۔ نسیم سیّد کی نظم "نرسنگ ہوم" کے چند اشعار ملاحظہ ہوں:

وادیٔ گل میں محبت کے ثمر لگتے ہیں
ان کو باہر سے جو دیکھو تو یہ گھر لگتے ہیں
یہ جو گھر جیسے نظر آتے ہیں، ویرانے ہیں
زندہ تابوت ہیں جن میں وہ عزاخانے ہیں
آخری عمر کے مجرم یہاں دن کاٹتے ہیں
بات کرنی ہو تو دیواروں سے دکھ بانٹتے ہیں
اپنے دن انگلی پہ دن رات گنا کرتے ہیں
جانے کس آس میں یہ در کو تکا کرتے ہیں
صبح سے آس کی دہلیز پہ جا بیٹھتے ہیں
دن ڈھلے یاس کو چوکھٹ سے لگا دیتے ہیں
جسم ہر عمر میں چاہت سے نمو پاتا ہے
ہو نہ رشتوں کی حرارت تو یہ مر جاتا ہے

یہ نظم مغربی معاشرہ کے ایک انتہائی ہولناک گوشہ کی جھلک بڑے موثر انداز سے پیش کرتی ہے اور یہیں اسطور میں موجود تصور انسان کی زبردست خامی کو نمایاں کرتی ہے۔ اس سے انکار ممکن نہیں کہ مغرب نے سائنس اور ٹکنالوجی میں زبردست ترقی کی ہے لیکن اس کی ترقی نے اسے طمانیت و آسودگی کی ٹھنڈک کے بجائے ریزگی و بےگانگی کے جہنم میں دھکیل دیا ہے جس کی وجہ وہاں کی بڑھتی ہوئی مادیت پرستی ہے۔ اس مادیت پرستی نے نہ صرف خاندان جیسی مضبوط اکائی کو ٹکڑے ٹکڑے کرکے رکھ دیا ہے بلکہ خود انسان کو اپنی کلیت سے محروم کر دیا ہے۔ مغرب کے موجودہ فکر کے مطابق انسان صرف مادی وجود ہے جبکہ مادی وجود اس کی نصف صفت ہے۔ اس نصف صفت کو کُل کا درجہ دے کر مغرب نے شخصیت کے جس بحران اور شکست و ریخت کے جس طوفان کا آغاز کیا ہے اس سے نمٹنے کے لیے ضروری ہے کہ انسان سائنسی شعور میں اضافے کے ساتھ اپنی ذات کی آگہی کی طرف بھی توجہ دے اور سائنسی انکشافات کے بل پہ تکنیکی ترقی کے ساتھ تزکیۂ نفس کے ذریعہ اپنی ذات کی تسخیر بھی کرے۔ تسخیر کائنات اور تسخیر ذات انسان کے عمل تسخیر کی دو لازمی

جہات ہیں۔ ان میں سے کسی ایک کی طرف سے بھی غفلت برتنا اپنے پورے عمل کو برباد کرنے کے مترادف ہے۔ نسیم سید نے مذکورہ نظم میں اس خیال کو جذبے اور احساس کی زبان سے ادا کیا ہے اور نہایت موثر اور فکر انگیز انداز سے ادا کیا ہے۔

نسیم سید نے زندگی کے گمبھیر، سنجیدہ اور نہایت فکر انگیز مسائل کے علاوہ خالص نرم و نازک جذبات کی عکاسی بھی بڑے سلیقہ سے کی ہے:

یہ موسم نیاز ہے
لہو میں اک سنہری آگ جل گئی
کوئی اسے خبر کرو
کہ جس کے شوقِ دید میں
یہ موسموں کا سارا اہتمام ہے
کہ یہ دعا سی شام جس کے نام ہے   (غزال کا جشن عام)

دیکھ کے ہم کو
پریشان سے ہو جاتے ہو
دو قدم بڑھتے ہو
گھبرائے سے رُک جاتے ہو

جانے کیا سوچ کے
ماتھے پہ نمی آتی ہے
اب کسے کہتے ہو "جاناں"
کبھی پوچھا ہم نے ؟
ہم پہ تو خیر جو گزری
کبھی ٹوکا ہم نے ؟
پر یہ الجھن
یہ تردد
یہ شکایت کیسی
ہم ہوئے غیر
تو غیروں پہ
عنایت کیسی ؟   (ترکِ تعلق)

اور اب یادِ وطن کی صورت میں ان کے احساس کی نزاکت ملاحظہ ہو :

ہریالی کی کھوج نے

تنہائی کے شہر بسائے
باہر سبزہ مہکے
اندر پت جھڑ
بڑھتی جائے

جب جب تیرا سبز سجیلا
ہرا بھرا
تن دیکھوں
"میپل[1]"! مجھ کو
اپنا زرد سا
رنگ بہت یاد آئے

نظموں کے علاوہ نسیم سید کی غزلیں بھی جدید حسیت کی ترجمان ہیں۔ ان کی غزلوں میں ہمارے معیشی و معاشرتی مسائل کو جس طرح استعاروں اور علامتوں میں بیان کیا گیا ہے اس سے ان کی تخلیقی استعداد کا بخوبی اندازہ ہوتا ہے۔ نظموں کی طرح وہ غزلوں میں بھی فکری مسائل کے ساتھ نرم و نازک جذبات کی عکاسی بڑے سلیقے سے کرتی ہیں۔ چند اشعار ملاحظہ ہوں:

ہر شخص میں مت کھوئے وفا ڈھونڈ مرے دل
ہر سیپ میں موتی مرے پیارے نہیں ہوتے

اک انجان سفر سا دل پر ہر دم طاری رہتا ہے کس لمحہ کی کھوج ہے مجھ میں، کیوں اتنی حیرانی ہے

یہ سوچ کر کہ زمانہ ہوا دعا مانگے
دعا کو ہاتھ اُٹھائے تو آنکھ بھر آئی
میں خود پہ سات کواڑوں کے قفل ڈالے تھی
پھر اس کی سوچ یہ کس طرح مجھ میں در آئی

جواب دوں ترے لہجہ میں دل یہ کہتا ہے
میں چپ رہوں یہ تقاضہ مرے وقار کا ہے

اپنی گہرائی کا مجھ کو خود بھی اندازہ نہیں خود میں جب ڈوبوں، سمندر سا نظر آئے مجھے

---

[1] کینیڈا کا ایک پیڑ جو اس ملک کے جھنڈے کا نشان بھی ہے۔

میری ہستی کو وہ جیسے چاہے ویسے حل کرے
ضرب دے مجھ کو کبھی تقسیم کر جائے مجھے
حسرتِ نغمہ میں بھی مٹی مری برباد ہو
جرأتِ اظہار دیواروں میں چنوائے مجھے

مجھے خبر ہے دعا میں مری اثر ہی نہیں
میں کیا کروں کہ دعا سے مجھے مفر ہی نہیں
تمام شہر عیادت کو آیا بیٹھا ہے
شفا ہے دید میں جس کی، اسے خبر ہی نہیں

مری چاہتوں کا صلہ نہ دے، مرے حوصلے کی تو بات کر
نہ خدا سے تجھ کو طلب کیا، نہ ہی تجھ سے کوئی سوال ہے
تو سمندروں پہ فریفتہ، مجھے کوہسار پسند ہیں
تجھے تند خوئی پہ ناز ہے، مری خامشی مرا حال ہے
بڑے رکھ رکھاؤ سے عشق میں مری وحشتوں نے گزار دی
ترے ذکر میں بھی ہو نم، کہاں مری آنکھ کو یہ مجال ہے

یہ اور ایسے بہت سے شعر ہیں جنہیں پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ نسیم سیّد کے ہاں جدیدیت کوئی اوپر سے اوڑھی ہوئی چیز نہیں ہے اور نہ وہ جدیدیت کو فیشن کے طور پر اپنانے کی قائل ہیں۔ وہ عصری حالات سے مثبت طور پر اثر قبول کرتی ہیں اور حالات کی یہ اثر پذیری ہی ان کی جدیدیت کی بنیاد ہے۔ وہ نامانوس کو مانوس بنانے کے فن سے بخوبی واقف ہیں اور بظاہر یہ واقفیت روایت کے بھرپور رچاؤ اور ندرت و جدت کی مخصوص صلاحیتوں کے امتزاج کے بغیر ممکن نہیں ہے۔ نسیم سیّد کی شاعری میں اس امتزاج کی جھلکیاں جگہ جگہ نظر آتی ہیں جو مجموعی طور پر ہماری شاعری کے لیے ایک نیک شگون ہے۔

تیسری تصویر — قائم نقوی کی شاعری

غلام محمد قاصر

(۱)

میرے گیارہ سالہ بچے عماد کو کرکٹ اور مصوری کا بہت شوق ہے اور بہت سے دوسرے بچوں کی طرح عمران خاں اس کا بھی ہیرو ہے۔ کچھ عرصہ پہلے جب اُسے معلوم ہوا کہ عمران خاں، کینسر ہسپتال کے سلسلے میں ان کے سکول کا بھی دورہ کرے گا تو اس نے اپنی پسندیدہ شخصیت کا پورٹریٹ بنایا اور عمران خاں کو پیش کیا۔ کچھ دن بعد وہ سکول سے تین فوٹوگراف لایا۔ پہلی تصویر میں وہ عمران خاں کو اپنا "شاہکار" پیش کر رہا ہے۔ دوسری تصویر میں عمران خاں مسکرا کر اس سے ہاتھ ملا رہا ہے اور تیسری تصویر میں عمران خاں کوئی بات کر رہا ہے غالباً شکریہ ادا کر رہا ہوگا لیکن اس تصویر میں عماد کے آگے ایک صحت مند سا لڑکا کھڑا ہے اور یوں لگتا ہے کہ عمران خاں اسی لڑکے سے ہم کلام ہے، عماد بلاوجہ اس کے پیچھے کھڑا ہو گیا۔

"زادِ ہجر"[1] کے شاعر نے پہلی تصویر میں دنیا کے درد و غم جمع کیے۔ دوسری تصویر میں انھیں دیوان کیا، اور تیسری تصویر میں جہاں دنیا اس کا اعتراف کرتی بہت سے متشاعروں، ناشاعروں اور عیدی خوانوں[2] کا ایک گروہ درمیان آ گیا اور اس کے حصے کی ستائش اپنے کھاتے میں ڈالنے لگا۔ قائم نقوی شریف آدمی ہے:

ہوگا اک روز سویرا، یہ اندھیرا کب تک (وقت عادل ہے)

کہہ کر ایک قدم پیچھے ہٹ گیا۔

(۲)

قسمت کو دیکھ ٹوٹی ہے جا کر کہاں کمند
کچھ دور اپنے ہاتھ سے جب بام رہ گیا

کعبہ اگرچہ ٹوٹا تو کیا جائے غم ہے شیخ
کچھ قصرِ دل نہیں کہ بنایا نہ جائے گا

مجلسِ وعظ تو تا دیر رہے گی قائم
یہ ہے مے خانہ ابھی پی کے چلے آتے ہیں

اے عشق مرے دوش پہ تو بوجھ رکھ اپنا
ہر سُو متحمل نہیں اس بارِ گراں کا

---

[1] زادِ ہجر۔ قائم نقوی کا مجموعۂ کلام۔ قیمت: ۶۰ روپے ناشر: الحمد پبلی کیشنز۔ لاہور

[2] مشاعرہ بازی کے زمانے میں اساتذہ بہت سے لڑکوں کو طرحی غزل لکھ کر دیتے اور انھیں ساتھ لے جاتے۔ ان لڑکوں کا شاعر کہلانے کا شوق پورا ہوتا اور استاد کو بہت سے داد دینے والے میسر آ جاتے۔ ان لوگوں کو عیدی خواں کہتے ہیں جو شاعر جتنے عیدی خواں لے جاتا مشاعرے میں اتنا ہی کامیاب ہوتا۔ قاصر

دنیا میں ہم رہے تو کئی دن پہ اس طرح (۵) دشمن کے گھر میں جیسے کوئی میہماں رہے

ہوتے ترے محال ہے ہم درمیاں نہ ہوں (۶) جب تک وجودِ شخص ہے سایہ نہ جائے گا

نے وعدہ اس کے ساتھ نہ پیغام کیا کہوں (۷) پوچھے کوئی سبب جو مرے انتظار کا

یہ اشعار قائم چاند پوری کے ہیں۔ ہانگی سے اناج کے ڈھیر کا حال معلوم کرنے والے اس شاعر کا مقام متعین کر سکتے ہیں۔ ساتویں شعر کو سامنے رکھتے ہوئے فراق کا شعر دیکھیئے:

نہ کوئی وعدہ، نہ کوئی یقیں نہ کوئی امید مگر ہمیں تو ترا انتظار کرنا تھا

مگر فراق نے بھی کہیں قائم چاند پوری کو خراج تحسین پیش نہیں کیا۔ ایک بار جناب محبوب خزاں نے بتایا تھا کہ وہ فراق سے ملے۔ فراق اس وقت سچ بولنے کے موڈ میں تھے۔ کہنے لگے کان پور جا کر نشور واحدی سے ملو۔ اس نے چالیس پچاس غزلیں ایسی کہی ہیں جو میں نہیں کہہ سکتا مگر کسی نقاد میں اتنی جرأت نہیں کہ یہ بات لکھ دے۔ اور میں خود اس لئے نہیں لکھتا کہ مجھے ایک مقام ملا ہے میں اسے کم کیوں کروں؟ شاعر جب تنقید لکھتا ہے تو وہ غیر شاعر سے بہتر ہوتی ہے یا اُسے بہتر ہونا چاہیئے لیکن یہاں ایک مصیبت اور پیش آتی ہے وہ ایسے شاعروں کے ذکر سے گریز کرے گا جن کے مصرعے اس کے اپنے کلام پر شب خون مارتے ہوں۔ غالب جس غزل میں نظیری سے "استفادہ" کرتے تھے اس کے مقطع میں رائے عامہ کو گمراہ کرنے کے لئے ظہوری کا ذکر کر دیتے۔

قائم چاند پوری کو شاید اس لئے بھی نظر انداز کیا گیا ہے کہ وہ کسی کو خاطر میں نہیں لاتے تھے۔ کہتے ہیں دہلی کے ایک بادشاہ نے ایک کشتی صرف اس لئے ڈبوائی تھی کہ ڈوبنے کے وقت کا نظارہ دیکھنا چاہتا تھا اس سانحے پر رعایا تو رو پیٹ کر بیٹھ گئی لیکن قائم نے اسے معاف نہیں کیا۔

کیسا یہ شاہ، ظلم پہ اس کی نگاہ ہے
ہاتھوں سے اس کے ایک جہاں داد خواہ ہے

احمق تو اور بھی ہیں پہ یہ بادشاہ ہے

قائم نقوی نے بھی اپنی پہلی قابل ذکر نظم اور کجے ان بے تاج بادشاہوں کی ہجو میں کہی جو تخلیق کاروں کو ڈوبتے دیکھ کر اپنا جی بہلاتے رہتے ہیں[۸]:

[یہ لوگ کیا ہیں]
یہ چائے کی بھاپ
سگرٹوں کا دھواں
یہ بے رنگ قہقہے
زہر میں بجھے تیز تیز جملے
سفید لفظوں کے پیرہن میں غلیظ باطن
سیہ ذہانت کا سرخ اظہار
سبز دعوے
یہ لوگ کیا ہیں؟ یہ روگ کیا ہیں؟؟

---

[۸] اس نظم کے اور بھی بہت سے رخ ہیں۔ قائم

قائم چاندپوری سے قائم نقوی تک ہر سچے اور کھرے شاعر کا المیہ یہی رہا ہے کہ اسے وہ پذیرائی نہیں ملتی جس کا وہ مستحق ہوتا ہے۔

(۳)

قائم چاندپوری کی شاعرانہ صلاحیتوں کا اعتراف (کسی حد تک سہی) محمد حسین آزاد، میر باقر حزیں، مرزا لطف علی، شیفتہ اور مصحفی نے کیا ہے۔ قائم نقوی کسی بھی قابلِ ذکر نقاد کے ایک توصیفی جملے تک سے محروم ہے اس کی وجہ یہ ہے کہ آج اول تو تنقید ہے ہی نہیں اور اگر کہیں ہے تو حد درجہ بددیانت ہو گئی ہے۔ یہاں ایک نقاد کے بارے میں ایک دو باتیں دلچسپی سے خالی نہیں ہوں گی۔

دس بارہ برس پہلے موصوف نے اردو غزل کے دس سال کا جائزہ لیا تھا۔ چاہیئے تو یہ تھا کہ وہ اس عرصے میں چھپنے والے شعری مجموعے سامنے رکھتا یا معیاری ادبی رسائل و جرائد کی مدد سے اچھی غزلیں دیکھتا اور منتخب اشعار پر نظر ڈالتا مگر انہیں تو لکھنے نے پڑھنے کی بھی فرصت سے بھی محروم کر رکھا تھا چنانچہ اس مضمون کا انداز کچھ اس طرح ہے۔ "ایک دفعہ میں گوجرانوالہ جا رہا تھا۔ راستے میں ایک نوجوان ملا اُس نے یہ شعر سنایا۔ کتنا اچھا شعر ہے —— سبحان اللہ" اور جو لوگ انھیں اس طرح شعر سنانے کی سعادت سے محروم رہے ان کا تذکرہ کیسے ہو سکتا ہے۔

یہی نقاد جب ایک شاعر کے دوسرے شعری مجموعے پر تبصرہ فرماتے ہیں واضح رہے یہ تبصرہ انھوں نے "سرکاری خرچ" پر لکھا ہے ورنہ ان کے معیارِ نقد سے ایسی چھچھوری حرکتوں کی توقع نہیں کی جا سکتی۔ تبصرے کا آغاز وہ کچھ اس طرح سے کرتے ہیں۔ "اس شاعر کا نام کچھ نیا نیا سا لگتا ہے" حالانکہ اس مجموعے سے گیارہ سال پہلے جب اسی شاعر کا پہلا مجموعہ چھپا تھا تو سید محمد عبداللہ، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی، احسان دانش، رئیس امروہوی، شہزاد احمد، عبدالعزیز خالد، ظفر اقبال، محمد سلیم الرحمٰن، مرزا ادیب اور قتیل شفائی جیسے لوگوں نے اسے جانا پہچانا شاعر کہا تھا۔ اس طرح کے نقادوں سے خدا قائم نقوی اور ان کی شاعری دونوں کو محفوظ رکھے —— قائم کا شعر انہی کی شان میں لکھا ہوا قصیدہ ہے:

سچ کو سچ لکھنے سے قائم ہم اکثر گھبرائے ہیں ۔۔۔ جانے کتنے جھوٹ گھڑے تو دانشور کہلائے ہیں

(۴)

قائم نقوی چاند، ستارے اور جگنو نہ ہونے سے افسردہ نہیں ہوتا اسے اپنے ہاتھوں کے اجالے میں رفو کرنے کا ہنر آتا ہے اس کی شاعری میں جو زندہ اور توانا کردار ہمیں نظر آتا ہے وہ زیادہ وقت مصلحت اندیشیوں کے خلاف نبرد آزما رہتا ہے:

شہر کی سڑکوں پر دن بھر گھومتے رہتے ہیں ہم ۔۔۔ مصلحت کا رستہ ہم نے اب تک اپنایا نہیں

اندر کا آدمی کبھی باہر نہ آ سکا ۔۔۔ پتھرا گیا وہ جسم کے اندر پڑے پڑے

مصلحت سے پیڑوں کے
سائے کتنے گہرے ہیں
(چھدرے چھدرے خیال)

دوسری طرف وہ گھروندے کو گھر بنانے کے عمل سے دوچار ہے اور اسے اپنی پہچان کے لئے محالی شانوں پر سر بنانے کی اذیت سے بھی گزرنا پڑتا ہے:

چند ٹوٹتی سانسیں شہرِ جاں میں زندہ ہیں ۔۔۔ شہر کے مکیں سارے اک مکاں میں زندہ ہیں

گھر کے حوالے سے بستر کی راحت اور آسودگی بھی بار بار اس کا دامن کھینچتی ہے۔ "زادِ ہجر" میں بستر کا حوالہ ایک مکمل رجحان کی حیثیت سے

سامنے آتا ہے جس نے شاعر کے تخلیقی سفر کو دشوار گزار بنا دیا ہے فن کی دنیا میں یہ بہت نازک مقام ہوتا ہے جہاں بڑے بڑے حوصلہ مند معاملہ بندی سے آگے نہیں بڑھ سکتے۔

چاند پڑا ہے بستر پر
شکن شکن اجیالے ہیں
(ایک گلی میں آخری آہٹ)

عکس پا بادل پہ تھے
سلوٹیں بستر پہ تھیں
(گہری خاموشی میں ایک رات)

پھر اترتیں منڈیر سے کرنیں　　　پھر وہ بستر سے اٹھ گیا ہوتا

قائم نقوی کی شاعری خواب گری سے زیادہ خواب شکنی کے عمل سے دوچار ہے جو اپنے خالق کو کسی بھی محاذ پر پسپائی کا راستہ نہیں سجھاتی :

غلام گردش میں سازشوں نے
مبارزت کی ہر ایک آواز روند ڈالی
(اے اسرافیل آ)

معاصر شاعری میں گھر کا لفظ نت نئی معنویتوں کے ساتھ طلوع ہو رہا ہے۔ قائم نقوی کے دو شعر دیکھئے :

صبح کا بھولا ہوا گھر لوٹ کر آیا نہیں　　　دور تک راہوں میں قائم دھوپ ہے سایہ نہیں

گھر سے ہی جب نکلے تھے ہم شام ہوئے　　　رستے میں اب رات نے آگھیرا تو کیا

مصلحت کے خلاف جنگ ہو یا گھر بنانے کا عمل، کسی کی رہنمائی کے بغیر سب کام مشکل ہوتے ہیں اور رہنما کے بارے میں اردو شاعری کی رائے کچھ زیادہ اچھی نہیں ہے۔ کلاسیکل شعرا میں سے کسی کی شاید ہی کوئی غزل ہو جس میں رہنما اور رہبر کو برا بھلا نہ کہا گیا ہو لیکن یہ بزرگ کسی نہ کسی کی انگلی پکڑ کر آگے بڑھتے رہے ہیں۔ قائم نقوی نے جو بات کہی ہے اس کا عملی ثبوت بھی پیش کیا ہے۔ اس نے اپنی کتاب کو کسی رہبر کی رائے سے آلودہ نہیں ہونے دیا اور رہنما کے موضوع پر قائم کے اس شعر سے بہتر شعر شاید ہی کہیں نظر آئے :

مجھ میں زندہ ہے رہنما میرا　　　آنکھ کی لو میں ہے ضمیر کی لو

اس شعر میں "پیمبر دل ہے قبلہ دل، خدا دل" سے لے کر "رستہ بھی ڈھونڈ خضر کا سودا بھی چھوڑ دے" تک تقریباً تمام قابلِ ذکر شعر سمٹ آئے ہیں لیکن یہ شعر آگے، بہت آگے جاتا ہے۔ آپ اپنی رہنمائی کے ساتھ ساتھ اگر واقعی کسی اور کو رہنما تسلیم بھی کیا جائے تو اس کے "اقوال زریں" یاد کر لینے سے بات نہیں بنتی بلکہ اس کی بات بات کو جزو جاں بنانا ضروری ہے اور قائم کے شعر میں یہ بات بھی موجود ہے۔ اس میں کسی رہنما کے ارشادات کو نہیں خود رہنما کو وجود کا حصہ بنایا گیا ہے جس کی جھلک ضمیر کی لو میں دیکھی جا سکتی ہے۔

ایک ایسا کردار جو مصلحت کے خلاف ہو اور آپ اپنا رہنما ہو اس کے لئے زندگی کرنا عموماً مشکل ہوتا ہے۔ گروہ میں چلنے والے آرام سے رہتے ہیں۔ آگے یا پیچھے چلنے والوں کے لئے قدم قدم پر رکاوٹیں ہوتی ہیں۔ لیکن ہر مصلحت سے بلند ہو کر اپنا سفر، اپنی رہنمائی میں طے کرنے والے وقت کی آنکھوں میں آنکھیں ڈال کر دیکھنے کی طاقت رکھتے ہیں اور یوں قرطاسِ وقت پر ایک ایسے عالم میں اپنی

ابدیت کی مہر ثبت کرتے ہیں جب عام انسان خسارے میں ہوتے ہیں۔ کربلا وہ زندہ استعارہ ہے جو مظلومیت اور ابدیت کے درمیان کبھی نہ ٹوٹنے والا رشتہ قائم کرتا ہے۔ قائم نقوی نے بھی اپنی شاعری میں مظلومیت کے ساتھ غیر مشروط وابستگی کی قسم کھائی ہے۔ کربلا کے حوالے سے "زادِ ہجر" میں ایک ایسا شعر ہے جو شاعر کی عظمت کے لئے اکیلا گواہی دے سکتا ہے۔ ایسی گواہی جس کو جھٹلانا شاید ممکن نہ ہو:

ہمارا قتل ہوا دفتروں کی کربل میں ہم اپنے نقش فقط فائلوں میں چھوڑ گئے

فائل اور دفتر کے الفاظ آج کی غزل کے لئے اجنبی نہیں رہے اور نہ ہی کربل کا لفظ پہلی بار استعمال ہوا ہے مگر قائم نے ان دُور کے الفاظ میں جو ربط پیدا کیا ہے اسی سے اس کے انفرادی لہجے کی نشاندہی ہوتی ہے۔

ذرا شعر کے لفظوں پر غور کریں۔ اس میں ایک طرف تو ایک کلرک ہے جو مظلوم ہے اور جس کی یادگار اگر کہیں ہوئی بھی تو صرف فائلوں میں ملے گی۔ یہ مظلومیت کا ایک رنگ ہے۔ دوسرا رنگ اس میں ایک ایسے فن کار کا ہے جو فن کی جلا اور اپنے جوہروں کو نمایاں کرنے کے لئے کچھ نہیں کر سکتا۔ اسے زندہ رہنے کے لئے فائلوں کا پیٹ بھرنا پڑتا ہے۔ اس کا نقش جو لوگوں کے دلوں میں ہونا چاہیئے تھا فائلوں کے مردہ کاغذوں پر بن رہا ہے۔

اس شعر میں ایک اور رنگ اُن مظلوموں کا ہے جن کی یاد روحی کنجاہی کا یہ شعر دلاتا ہے:

عدل گیا کہ عمر بھر مظلوم سفر کا غذات کاٹیں گے

اور وہ مظلوم عدل ڈھونڈتے ڈھونڈتے انہی فائلوں کے انبار میں قتل ہو جاتے ہیں۔ مظلومیت کے ایک قدیم استعارے کو اپنے عہد کی صداقت سے ہم آہنگ کرنا اور ایسا پہلو دار شعر نکالنا صرف روایت کو گھول کر پی لینے سے نہیں آتا — یہ فن اپنے لہو کو گھونٹ گھونٹ پینے کا تقاضا کرتا ہے۔ قائم نقوی ان مراحل سے گزر رہا ہے۔ وہ راہوں پر اپنے ہونے کے نشان چھوڑتا ہوا — مستقبل کے آفاق کی تسخیر کر رہا ہے — خاموشی سے لَو لگائے ہوئے اور غیرتِ عشق کو بچائے ہوئے۔

ضیا جالندھری

لاہور

شہرِ خوش باش! تری گردِ ہمہ گیر میں گُم
کئی سورج، کئی ماہ و انجم

تیرے گلزاروں میں
یادِ ماضی کی ہوا زمزمہ خواں ہے
کسی وارفتہ مغنّی کی طرح

شہرِ خوش باش! تری مسجدوں، میناروں میں
تیرے افسانہ در افسانہ گلی کوچوں میں، بازاروں میں
زندگی سلسلۂ موجِ رواں ہے
ترے دریا، ترے راوی کی طرح

مدفنِ تاجوراں! خوابگہِ نکتہ وراں!
مسندِ زندہ دلاں! بزم گہِ راہبراں!
تختِ درویش و غنی! انجمنِ کوتہ نظراں!

تیری ہر خشت کتاب
تیرا ہر برگ ورق
تیری تحریر ہے سہل
اور معانی ہیں ادق

قہوہ خانوں میں ترے
اہلِ علم، اہلِ سخن، اہلِ قلم
جن سے اظہار کی پیچیدگیاں دست و گریباں ہمہ دم

اس سے پہلے کہ مری آنکھیں تری دید سے روشن ہوتیں
تو مرے خون میں تھا
مرے اجداد کا تو مولد و گہوارہ تھا

میں نے دیکھا تھا تجھے پہلے پہل عمر کے اس موسم میں
انکھوے جب شاخوں میں ڈھل جاتے ہیں

شہرِ خوش باش! تری رہگذاروں پہ، خیابانوں میں
تیرے خوش پیرہناں، گُل بدناں
تتلیاں، پھول سرِ بادِ بہاراں جیسے
رقصِ طاؤس سے رخشندہ گلستاں جیسے

خاک پر گریۂ شبنم کی طرح آج بھی ہیں
حسرتیں وہ جو کبھی زینتِ افلاک ہوئیں
شعلہ پوش آرزوئیں، لالہ قبا اُمیدیں
سب عطائیں تری خاکستر و خاشاک ہوئیں

میرے محرم! مرے لاحاصل ارادوں کے امیں!
اوّلیں عشقِ جنوں خیز کی یادوں کے امیں!
کتنے گھاؤ ہیں جو وابستہ ترے نام سے ہیں
نسبتیں کتنی تجھے اس دلِ ناکام سے ہیں

گو غمِ رزق لیے پھرتا رہا دیس بدیس
زندہ رہنے کو کبھی عادتیں بدلیں، کبھی بھیس
پر تری گلیوں کے دن رات مرے ساتھ رہے

رُت پہ رُت بدلی، نہ تو وہ ہے، نہ میں وہ ہوں مگر
رنگِ ماضی مری آنکھوں سے اُترتا ہی نہیں
تیری یادوں کی کرامت ہے کہ اِک نقطے پر
وقت یوں آکے رُکا ہے کہ گزرتا ہی نہیں

احمد ظفر

اُوپر نیچے درمیان

نیم کے پیڑ کے نیچے کوئی سنیاسی ہوں
یا کسی سوچ کے سائے میں پڑا رہتا ہوں
سرد موسم کا نہ گرمی کا اثر مجھ پہ کبھی ہوتا ہے
زندگی عشوہ گرِ رنگ حسینہ کوئی

دُور جو مجھ سے بہت دُور رہی
ساتھ رہتی ہے مرے ساتھ مگر ایک تلاش

مجھ کو چلنا ہے، بہت چلنا ہے
میں وہی صدیوں کا بن باسی ہوں

نیند آتی ہے تو میں ہوش میں آجاتا ہوں
رقص کرتی ہوئی دوشیزہ مرے سامنے آجاتی ہے
اس کی پازیب کی جھنکار پہ مرتا ہوں، تو ٹیکا اس کا
ایک سُورج کی طرح دل میں اُتر جاتا ہے
ایک نغمہ سا کسی شاعرِ خود رفتہ کا
میں جو سُنتا ہوں تو ہر شے پہ بہار آتی ہے
بول سارنگی کے، طبلے کے تگّے تھے ہمیں
ہر بنِ مُو سے لہو جیسے ٹپکنا چاہے

کون یہ شیشہ گرِ وقت ہے، میں
جس کی عبادت میں مگن رہتا ہوں

آنکھ کھلتی ہے تو میں سوچتا ہوں
زندگی کیا ہے؟ وہی صدیوں کا بے کار فریب
نیم کے پیڑ کے نیچے کوئی سنیاسی ہوں
میرا آسیب پہن لیتا ہے چُپ چاپ کوئی کہنہ نقاب
دل کے تالاب میں اشنان جہاں کرتا ہوں
آئنہ سامنے آجاتا ہے دانائی کا
خواب جتنے تھے وہ سب جھُوٹے تھے، میں جھوٹا تھا
میں نہ گیانی ہوں نہ سنیاسی نہ بن باسی ہوں
نیم کا پیڑ جو ہوتا تو یہ اچھا ہوتا
میں کسی راہ گزر میں کوئی سایہ ہوتا

جمیل ملک

ہائیکو

اتنی تھوڑی سی زندگی میں اگر
ہم محبت کریں تو ہر لمحہ
عمر اپنی بڑھا بھی سکتا ہے

شبنم، موتی، جگنو، تارے
تیری یاد آئے تو آنسو
کس کس روپ میں ڈھل جاتے ہیں

ایسے تیری یاد نے چھیڑا مجھے
جیسے بے آواز ساکت جھیل میں
راہ چلتے کوئی کنکر پھینک دے

پہلی دستک پہ یہ آواز آئی
ہم سے ملنے تو چلے آئے ہو
کیا کبھی خود سے ملاقات ہوئی؟

وقت کا ایک سلسلہ ہے مگر
دل کے دریا کی مضطرب لہریں
ایک ہی سمت کیوں نہیں بہتیں!

میں وہ نقطہ ہوں جس کے چار طرف
گھومتے ہیں یہ آسمان و زمیں
میں سبھی کچھ ہوں اور کچھ بھی نہیں

چھ دروازے کھول دیے ہیں
میرے خوابوں کی تعبیر۔ بس
ساتویں در سے بھی آ گے ہیں

بلراج کومل

ہماری گلی

گلی اپنی تھی یا وہ غیر کی تھی، کل
جونہی ہم اس طرف نکلے
تو کچھ ایسا لگا، ہم تو یہیں کے رہنے والے ہیں
شناسا، ناشناسا، اجنبی، چھوٹے، بڑے، جو بھی
ملے، کچھ اس طرح کھُل کر ملے، جیسے وہاں ہم نے
ہزاروں سال اِک جشنِ مسلسل کی تمازت میں گزارے تھے
کبھی بچھڑے گھڑی بھر کے لیے
یا ہو گئے اِک دُوسرے سے ہم جُدا
برسوں کسی سیلِ بلا میں
موجِ فتنہ خیز میں
لیکن
ہماری خوش نصیبی تھی، ہمیں محسوس ہوتا تھا
کہ ہم موجود تھے اِک دوسرے کے ساتھ روز و شب
کے رشتوں کی مسافت میں

گلی باقی نہیں امروز، وہ جو کل ہماری تھی
گلی کے رہنے والے اور ان کے بولتے، ہنستے
چہکتے، شادماں، روشن گھروں کے
دور تک پھیلے ہوئے ملبے پہ
اب میرے
دریدہ جسم سے لپٹا ہُوا
نوزائیدہ اِک طفلِ حیراں
میرے زخموں سے
ٹپکتے خُون کے لمسِ مسیحائی سے خوابِ شیرِ مادر میں
ذرا سا مسکراتا ہے
ذرا سا رو کے
گرتے آسماں کو تھامتا ہے
ننھے ہاتھوں سے
اسے اُوپر اُٹھاتا ہے!

گلزار

درختوں کا نوحہ

پہاڑوں کو سناتی ہیں چٹانیں، داستانیں پچھلے پیڑوں کی
وہاں دیودار کا اک اونچے قد کا پیڑ ہوتا تھا
وہ بادل باندھ لیتا تھا کبھی پگڑی کی صورت اپنے پتّوں پر
کبھی دوشالے کی صورت اُسی کو اوڑھ لیتا تھا
ہوا کی تھام کر باہیں — کبھی جب جھومتا تھا،
اس سے کہتا تھا —
'مرے پاؤں اگر جکڑے نہ ہوتے تو میں تیرے ساتھ ہی چلتا'

اُدھر شیشم تھا، اُس کیکر سے کچھ آگے
بہت لڑتے تھے آپس میں
مگر سچ ہے کہ کیکر اُس کے اونچے قد سے جلتا تھا
سُریلی سیٹیاں بجتی تھیں جب شیشم کے پتّوں میں
پرندے بیٹھ کر شاخوں پہ اُس کی نقل کرتے تھے

وہیں اک آم بھی تھا، جس پہ اک کوئل کئی برسوں تلک آتی رہی،
جب بُور آتا تھا

اُدھر دو تین تھے جو گل مُہر، اب ایک باقی ہے
وہ اپنے جسم پر کھودے ہوئے ناموں کو بھرتا ہے —

اِدھر اک نیم تھا جو چاندنی سے عشق کرتا تھا
نشے میں نیلی پڑ جاتی تھیں ساری پتّیاں اُس کی

ذرا کچھ اور — اُس جانب
بہت سے جھاؤ تھے جو لمبی لمبی سانسیں لیتے تھے
مگر اب ایک بھی دِکھتا نہیں ہے اُس پہاڑی پر

کبھی دیکھا نہیں، سُنتے ہیں اس وادی کے دامن میں
بڑے برگد کے گھیرے سے بڑی اک چمپا رہتی تھی
جہاں سے کاٹ لے کوئی وہیں سے دودھ بہتا تھا
کئی ٹکڑوں میں بیچاری گئی تھی اپنے جنگل سے

پہاڑوں کو سُناتی ہیں چٹانیں، داستانیں اُونچے پیڑوں کی
کہ جن کو پست قد انساں نے کاٹا ہے، گرایا ہے
کئی ٹکڑے کئے ہیں اور جلایا ہے !!

محمود علی محمود

شہر بے صدا

ننھی، چلبلی، "آمچھو آمچھو" کھیلتی چڑیو!
بھرّا مار کے اُڑتی پریو!
آنگن گم، ڈالی بے والی ہو جاتی ہے
دُنیا خالی خالی ہو جاتی ہے
برف کا طوفان گزر رہا ہے

وادیِ ذہن و قلب ہے "شہرِ صدا" ہو جیسے
لب ہلتے ہیں اور اعصاب نہیں کھلتے ہیں
جذبوں کے بے چین الاؤ کی لپٹیں گہنا گئیں
حدّتِ خون کے تیز بہاؤ کی لہریں برفا گئیں
فیل آسا، خونخوار بگولوں کی یارو دیکھ۔ گمٹی۔ بر
نام، کلس، اجلال، سبھی کاغذ کے پرزوں کے انداز
میں چکراتے ہیں
میری کمک کا حوصلہ دے کر خود کو بہلاتے ہیں
چلّاتے ہیں
میں ـــــ ہاں! ایک پکار پہ یورش کرنے والا غازی
جس کے غازۂ جذبۂ جلال سے کانپ اُٹھتی تھی کھیتی
جس کی اک پتلی کے گھماؤ پہ آندھی بل کھاتی تھی
لیکن ـــــ یہ طرّہ ہے جب کا ـ بات ہے تب کی

"آمچھو آمچھو" کھیلتی چڑیو!
سوکھنے اشک! اور "دُعا کٹورے" اب بھی وا ہیں
آج ـ جھجھر کا میں سب مل کر میچ کے آنکھیں
ایک دُعائے عرش رسا ہر حال میں کرنا
اس سے کہنا
"مالک! ان پنجوں کو وہی تیکھے کنکر لوٹا دے
نصف دائرے میں گرتا اُٹھتا لشکر لوٹا دے"

ماجد صدیقی

اک اور آواگون

وہ کہتی تھی سکھی سے
میں کہ ماں ہوں
اپنی بیٹی سے کہوں کیسے :۔
"کہ تو جو پھول اب تک ہے خیاباں کا
تجھے با این شباب اک بار
اِک جا سے اکھڑنا
اور اکھڑنے ہی
کسی اِک اور جا پر جا کے گڑنا ہے
ترے معنی
جو اک بیٹی کی صورت میں اُجاگر ہیں
انھیں یکسر بدلنا ہے
ترے بوسے جو میں لیتی ہوں
یا جو باپ لیتا ہے
انھیں اک اور آتش کی
حرارت سے پگھلنا ہے
تجھے
جو اَب تک لاڈوں پلی ہے
اور ہی انداز کی چاہت میں
پھر اک بار پلنا ہے
تجھے ہے تلملاتا، کسمسانا
اور رہ رہ کر سنبھلنا ہے
جہاں میں تھی کبھی
تجھ کو
انہی خلوت کدوں میں اب
اذیّت ناک و لُطف انگیز لمحوں سے گزرنا ہے
تجھے
جو میں بتا سکتی نہیں
تازہ جنم اِک اور لینا ہے
جسے تیری نظر تیرا بدن پہچان سکتا ہے
تجھے آواگون کے
اور اِک سانچے میں ڈھلنا ہے"

پروین شاکر

ہَوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے

مجھے معلوم تھا
یہ دن بھی دکھ کی کوکھ سے پُھوٹا ہے
میری ماتمی چادر
نہیں تبدیل ہوگی آج کے دن بھی
جو راکھ اڑتی تھی خوابوں کی بدن میں
یونہی آشفتہ رہے گی
اور اداسی کی یہی صورت رہے گی !
میں اپنے سوگ میں ماتم کناں
یوں سر بہ زانو رات تک بیٹھی رہوں گی
اور مرے خوابوں کا پُرسہ آج بھی کوئی نہیں دے گا !
مگر یہ کون ہے
جو یوں مجھے باہر بلاتا ہے
بڑی نرمی سے کہتا ہے
کہ اپنے حجرۂ غم سے نکل کر باغ میں آؤ
ذرا باہر تو دیکھو !
دُور تک سبزہ بچھا ہے
اور ہری شاخوں پہ نارنجی شگوفے مسکراتے ہیں
ملائم سبز پتوں پر پڑی شبنم
سنہری دھوپ میں ہیرے کی صورت جگمگاتی ہے
درختوں میں چھپی ندی
بہت دھیمے سُروں میں گنگناتی ہے
چمکتے زرد پھولوں سے لدی ننھی پہاڑی کے عقب میں
نقرئی چشمہ خوشی سے کھلکھلاتا ہے
پرند خوش گلُو
شاخِ شگفتہ پر چہکتا ہے
گھنے جنگل میں بارش کا غبارِ سبز
سطحِ شیشۂ دل پر
ملائم انگلیوں سے مرحبا کے لفظ لکھتا ہے
کوئی آتا ہے
اگر چادرِ غم کو بڑی آہستگی سے
میرے شانوں سے ہٹا کر
سات رنگوں کا دوپٹہ کھول کر مجھ کو اُڑھاتا ہے
میں کُھل کر سانس لیتی ہوں
مرے اندر
کوئی پیروں میں گھنگھرو باندھتا ہے
رقص کا آغاز کرتا ہے
مرے کانوں کے آویزوں کو یہ کس نے چھُوا
جس سے لَوئیں پھر سے گلابی ہو گئی ہیں
کوئی سرگوشیوں میں پھر سے میرا نام لیتا ہے
فضا کی نغمگی آواز دیتی ہے
ہوا جامِ صحت تجویز کرتی ہے

پروین شاکر

ایک ساؤنڈ پروف نظم

بہت خوش شکل ہے یہ گھر
طلسمی ہے فضا اس کی
دریچوں کا ہے رُخ دریا کی جانب
اور دروازے بھی اکثر باغ کے پہلو میں کھُلتے ہیں!
عروسِ نو کے خوابوں کی طرح نقشیں ہے ہر کمرہ
اور ان کے وسط میں المانوی شمعیں سحر تک جھلملاتی ہیں
بہت آراستہ مہمان خانے میں
طلائی قاب میں رکھّے ہوئے اثمارِ تازہ، سبز و عنّابی
منقش جامِ سیمیں میں شرابِ کہربائی
اور کفِ دہلیز سے لے کر
مکینوں کے نگاریں حجلہ گاہِ خواب
اور دیوان خانے تک
بچھے غالیچۂ شیراز و روما
آپ کے قدموں کی آہٹ اس طرح سے جذب کرتے ہیں
کہ جیسے خانہ زادِ تاج
محلوں میں چھُپے رازوں کو اپنے گنگ سینوں میں
مکیں سرگوشیوں میں بات کرتے ہیں
صدائے شام کا زخمی پرندہ
شیشۂ در سے برابر سر کو ٹکراتا ہے

لیکن باریابی کی کوئی صُورت نہیں بنتی
دریچوں پر کبھی
بارش کی ننھی سی ہتھیلی کی جھلک
مجھ کو دکھائی دے بھی جاتی ہے
مگر دستک نہیں آتی

جہاں میں ہُوں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا

یہاں سے ایک شب کے فاصلے پر
دُور آزادی کی مورت کے جلو میں
شاہراہِ شرقِ اوّل پر
طلسمی رنگ، جادوئی فضا
اِک اور بستی ہے
جہاں دُنیائے سویم کے
کسی کوچے سے آتے بین کو
پروانۂ رہداریِ عظمیٰ نہیں ملتا
جہاں ہم ہیں
وہاں آواز کو رستہ نہیں ملتا!

پروین شاکر

یہ پیاس سماعت کی

حلقومِ سماعت میں
اُگ آئے ہیں اب کانٹے
آواز کا اِک قطرہ
لیکن نہیں مل پاتا
شبنم ترے لہجے کی
کس بَن میں اُترتی ہے
نم تیری ہنسی کا اَب
کِس تن کو بھگوتا ہے
میں پیاس سے بے کل ہوں
اور تیرے تکلّم کا!
اِک گھونٹ نہیں ملتا
اس قحطِ صدا میں دل
اب کے نہ کھِلے شاید
یہ پیاس سماعت کی
جاں لے کے ٹلے شاید!

یہ تمہاری ہنسی

یہ تمہاری ہنسی
روشنی سے بھری
چاندنی میں ڈھلی
رنگ سے تازہ رُو
عشق سے مشکبُو
جب بھی دل نے سُنی
رقص کرنے لگا
رُوح میں جیسے قوسِ قزح کھنچ گئی

آج بھی اُس ہنسی کے وہی رنگ تھے
آج بھی روشنی کی وہی چھُوٹ تھی
آج بھی اُس کی خوشبو جنوں خیز تھی
پر کوئی بات تھی جس سے خالی تھی یہ
آج تو میری صُورت، سوالی تھی یہ!

ثروت محی الدین

دل نے چاہا تھا

دل نے چاہا تھا
کوئی رنگ
کوئی ہو خوشبو

کچھ ستارے
اگر افسردہ نگاہوں میں چمک اُٹھیں
تو کچھ دیر سہی
ڈبڈبائی ہوئی
دھندلائی ہوئی آنکھوں میں
کوئی آسودہ سی ٹھنڈک
کوئی روشن لمحہ
چاہے اک پل کو سہی
آ کے ٹھہر جائے گا

مگر ایسا نہ ہوا
ویسا ہوتا ہی نہیں

کب کوئی لمحہ
کوئی پل
کبھی ٹھہرا ہے کہیں

نہ کوئی رنگ
نہ خوشبو
نہ چمک ہے دائم

یہ ستارے
تو کہیں دُور
بہت دُور
نہ جانے خود بھی
کسی ٹھنڈک کو ترستے ہوئے
چلتے ہیں یونہی !

عورت

دریا کے کنارے پر
رسّی سے بندھی ناؤ
کھاتی ہوئی ہچکولے
پانی میں پڑی ناؤ
رہ رہ کے مچلتی ہے
بہتے ہوئے پانی میں
چلنے کو ترستی ہے

کیوں باندھ کے رکھتے ہو
پانی میں اترنے دو
جس سمت بہاؤ ہو
اس سمت میں چلنے دو

موجوں میں ہے دم کتنا
دریا میں ہے خم کتنا
رفتار بہاؤ کی
یہ اس کو پرکھنے دو

کتنا ہو سفر اس کا
پہنچے وہ کہاں کب تک
یہ ناؤ کی ہمت ہے
تم اس کو نہ یوں روکو
بس دوش پہ لہروں کے
دریا سے گزرنے دو !

امجد اسلام امجد

یہ لمحے اُس کے نام کریں

اِک اور پڑاؤ آپہنچا
جیون کے اس خواب سفر کی اور اِک منزل ختم ہوئی
شام وسحر کی بے معنی تقویم کے تھل میں
پھیل رہی ہے
نصف صدی کی ریت!
نصف صدی کی جلتی ریت پہ چاروں جانب
نقشِ کفِ پا بکھرے ہیں
جس جس راہ پہ میں نکلا ہوں
اور جدھر سے میری جانب لوگ چلے ہیں
ریت پہ سب کا حال لکھا ہے
ریت کے اس صحرا میں ملے ہیں
کیا کیا نخلستان!
اور سرابوں کے سایوں میں کتنی خاک اُڑی
ریت پہ سب احوال لکھا ہے
نصف صدی کی جلتی ریت پہ
ہر لمحے کا حال لکھا ہے۔

مجھے یاد ہے
تری داستانِ جمال میں وہ جو باب تھا
مرے ذکر کا
جو ورق ورق میں بچھی روشنی
وہ جو رمز تھی گلِ حرف میں
مرے شوق کی، ترے ناز کی
مجھے یاد ہے۔ مجھے یاد ہے
ترے پیرہن میں رچی ہوئی
وہ مہک جو تیرے بدن کی تھی
مری جاں میں ہے جو بسی ہوئی،

مری پور پور پہ درج ہیں
وہ جو حرف تیرے سخن کے تھے
مرے کنجِ لب میں مقیم ہیں
وہ جو رنگ تیرے بدن کے تھے

وہ عجیب سے مہ و سال تھے
مگر ایک عصرِ وصال تھے
کبھی ابر تھے، کبھی پھول تھے
کبھی تتلیوں کی مثال تھے

مجھے یاد ہے ـ مجھے یاد ہے
وہ کلام جو کہ نہ ڈھل سکا
کِسی لفظ میں
یہ جو حرف حرف پڑھا گیا
کسی اور بات کے ذکر میں
کسی اور چیز کے دھیان میں
وہ کتاب جو کہ لکھی گئی
تری خامشی کی زبان میں!
مجھے یاد ہے، سرِ راہِ جاں
وہ چراغ سا، کسی آس کا
جسے آندھیاں نہ بُجھا سکیں
کہ وہ روشنی کی اساس تھا
وہ جو پہلے پہلے وصال پر
تری چشمِ خوش میں رواں ہوا
ترے ہجر کی شبِ تار میں
وہی جگنوؤں کا سا قافلہ
مرے راستوں کا شریک تھا

وہ جو حرف تُو نے عطا کیے
مری زندگی کی کتاب کو
یہ تمام ربط اُنہی سے ہے
اُنہی موسموں کی ترنگ کا ہے، جمال یہ
جو بہار میرے سخن میں ہے
اُنہی صحبتوں کی اُمنگ کا ہے کمال یہ
کہ جو حوصلہ سا تھکن میں ہے

گماں آباد ہستی میں وہی اک دُھوپ پھیلی ہے
بہم دیگر اُلجھتے، پھیلتے، بکھرے سوالوں کی!
مگر ابرِ یقیں کا خوشنما سایہ
نہ پہلے تھا، نہ اب اُس کی
کوئی آہٹ،
کسی بھی سمت سے آواز دیتی ہے
کِسی کی چپ سوالوں کو نئے آغاز دیتی ہے
وہ سمندر کی تہوں میں جو سفینے اَن گنت صدیوں
سے ڈوبے ہیں
وہ کس کو یاد کرتے ہیں!
جو پانی اُن کے ملبے کا امانت دار ٹھہرا تھا
انھیں کیسے بُلاتا ہے!
ہَوا، اُجڑے مکانوں کے دریچوں سے گزرتی ہے
تو کیا محسوس کرتی ہے!

ازل کیا ہے !
اگر وہ ہے تو اُس سے قبل کی تقویم کیسی تھی !
اَبد کے جس کنارے کی طرف اپنے تئیں
ہم سب روانہ ہیں
کہاں ہے وہ !
اگر وہ ہے تو اُس کے بعد کی تفہیم کیسے ہو !
بہت ممکن ہے جو چیزیں بظاہر بننے والی ہیں
کبھی کی بن چکی ہوں
اور مستقبل
فقط اِک خواب ہو جو خواب کی تجسیم لگتا ہے !!

زمیں اب تک ہزاروں مرتبہ
بس بس کے اُجڑی ہے کہ پہلی بار
یہ اس کھیل کا کردار ٹھہری ہے ؟
یہ نیلا آسماں
جو اِک حصارِ بے اماں کی مثل چاروں اور پھیلا ہے،
اگر اک استعارہ ہے کسی کی بے کرانی کا !
تو پھر اس مشتِ خاکی کی
بساطِ جستجو کیا ہے ؟
زمیں زادوں کی قسمت میں اگر مٹی ہی لکھی تھی
تو پھر یہ ہاؤ ہُو کیا ہے ؟

زمیں کی بات نکلی ہے تو یاد آیا

یہ جتنے فاصلے ہیں،
آدمی اور آدمی کے درمیاں
ان کی مسافت میں لہو جتنا بھی بکھرا ہے
دلِ آدم سے نکلا ہے
یہ جتنی سرحدیں ہیں
زور و زر، رنگ و نسب، فضل و تمدّن کی
انھیں خود آدمی نے اپنے گرداگرد کھینچا ہے
یہ جتنے تفرقے حالات کے پیڑوں پہ اُگتے ہیں
سبھی کو اس چمن کے مالیوں نے آپ سینچا ہے

ہوس کے اِک مسلسل خواب کی تعبیر ہے دُنیا
جسے تاریخ کہتے ہیں
یہ کچھ طاقت وروں کے ظلم کے قصّوں کا ملبہ ہے

"غلاموں اور کنیزوں کے کہیں بازار لگتے ہیں
سگے بیٹوں کی آنکھوں میں سلائیاں پھیری جاتی ہیں
ہوس میں تختِ شاہی کی
برادر اور برادر زادگاں دشمن ٹھہرتے ہیں
خود اپنے ہاتھ سے گردن اُڑا دیتے ہیں
اُس کی بھی
کہ جس کا خون ہوتے ہیں
ہر اک رشتے کا حلقہ ایک پل میں ٹوٹ جاتا ہے
مگر پھر بھی

مؤرخ — امن، سکھ اور چین لکھتا ہے
(کہ آخر اُس مؤرخ کو بھی کچھ دن اور جینا تھا!)
درندوں سے بھرے جنگل کی اِک تصویر ہے دُنیا

مکانوں سے بھری ان بستیوں کو غور سے دیکھا
تو یہ کیڑوں مکوڑوں کی
پناہ گاہوں سے بدتر تھیں
کوئی دروازہ کھلتا ہے
تو جیسے چیخ سی کوئی فضا میں پھیل جاتی ہے
گلی کوچوں میں چلتے ہیں تو وحشت ساتھ چلتی ہے
کراہیں
قہقہوں کی گونج میں آمیز ہوتی ہیں
تو سب چہرے
عجب بے چہرگی کا دل شکن منظر بناتے ہیں
کسی پہچان کی دُھن میں،
یہ جب اعداد کی صورت میں ڈھلتے ہیں
نہ ان کے نام رہتے ہیں، نہ ان کے نقش بنتے ہیں
شکم کی بھوک کی خاطر بدن نیلام ہوتے ہیں
اور اس کے بعد روحوں تک یہ قبضہ پھیل جاتا ہے
پھر ایسی رات پڑتی ہے
کہ آنکھوں میں سحر تو کیا
سحر کے خواب تک باقی نہیں رہتے

مری عمر کے یہ مہ و سال تو
اِس فشارِ زماں کے
کراں تا کراں پھیلتے دشت ہیں
ریت کے چند ذرّوں کی مانند ہیں
جو فنا کے بگولوں میں اُڑ جائیں گے
(خاک بن کر ہوا میں بکھر جائیں گے)
مگر یہ زمانہ — صدی بیسویں!
جس کے جاتے دنوں کے گواہوں میں ہم ہیں
اِسے دیکھتے ہیں
تو اس کی نگاہیں جواباً پلٹ کر ہمیں دیکھتی ہیں
کہ جیسے یہ کہتی ہوں
"اے اہلِ دُنیا
تمھیں یہ خبر ہے
کہ کن کن ستاروں نے کب کب گزرنا ہے
بامِ فلک سے!
اور آئندہ برسوں میں کیا کہکشائیں
تمھاری کمندوں کے حلقے میں ہوں گی!
تری اور خشکی پہ جو کچھ نمایاں ہے
اس کے علاوہ، تمھاری مشینیں
نگاہوں کی حقیقت کو بھی جانتی ہیں
مرے سو برس میں،
تمھاری رسائی میں وہ کچھ بھی آیا
کہ جس کا تصوّر بھی ممکن نہیں تھا

مری آستینوں میں وہ حیر نہیں ہیں
کہ لاکھوں برس میں بھی یکجا نہ ہوں گی
مگر یہ بتاؤ کہ اس ساری بک بک میں

تم کو ملا کیا ؟
تمھارے دُکھوں میں کمی کوئی آئی ؟
سُلگتی ہُوئی بے اماں بستیوں کو
کہیں سے میسّر نمی کوئی آئی ؟

جو کوئی دیکھے تو سب تماشہ

ہماری آنکھوں کے سامنے ہے
یہ وہ حقیقت ہے
جس کو چُھو کر پرکھ بھی سکتے ہیں
اور جس کی
صداقتوں سے مفر نہیں ہے
مگر نہ دل کو یقین آئے !
مگر نہ دل کو یقین آئے !
کہ ایک جانب اِسی زمیں پر کروڑوں انسان مر رہے ہیں
شکم کے دوزخ نے اُن کو اپنی "طلب" کا ایندھن

بنا لیا ہے

اور اُس طرف یہ مہیب نظر
جو رِزق ان کو نہیں میسّر
اُسے جہازوں میں بھر کے ظالم سمندروں میں بہا رہے ہیں

بتا رہے ہیں

کہ اس کی بازار میں "رسد" سے "طلب" کا میزان خراب ہوگا
برس کے آخر میں جب کتابیں کلوز ہوں گی حساب ہوگا
تو اُس میں ہندسوں کی ـــــ صرف ہندسوں کی بات ہوگی
کہ سارے لیجر فقط دماغوں کو جانتے ہیں
کِسی بھی خانے کی روشنائی میں دل نہیں ہے

جیون کے اس خواب سفر میں چلتے چلتے
آنکھیں تھکتی جاتی ہیں
کِتنی باتیں، اِک دُوجے میں گڈ مڈ ہو کر

کیا کیا روپ دکھاتی ہیں !
نِصف صدی کا قصّہ اِک ارژنگ کی صُورت کُھلتا ہے

تصویریں بنتی جاتی ہیں
اب تک جو کچھ بیت چکا
اور جو کچھ ہونے والا ہے
جیون کے اس خواب سفر کا
یہ دن ایک حوالہ ہے

اے دل، آ، اِس پُل پہ رُک کر
تھوڑی دیر آرام کریں
جس نے "وقت" بنایا ہے
یہ لمحے اُس کے نام کریں

———

خالد احمد

ہَوا مغرب کی بیٹی ہے

ہَوا کی مُٹھیوں میں خاک ہے، خار و خس و خاشاک ہیں،
کاغذ ہیں، پتّے ہیں
ہوا مُہروں کی دشمن ہے، ہوا ویزے نہیں لیتی
ہوا چیک پوسٹ سے ہو کر گزرتی ہے
یہ آنکھیں روز تکتی ہیں
محافظ چوکیاں کب اس کا رستہ روک سکتی ہیں
ہوا اپنی حفاظت آپ کرتی ہے
ہوا مغرب کی بیٹی ہے

ہوا مغرب کی بیٹی ہے
ہَوا آزادہ رَو مغرب کی گُل اندام بیٹی ہے
یہ گُل اندام، کتنے بحر و بَر، کتنے تلاطم پار کر
مشرق کے تپتے ساحلوں پر آفتابی غسل کی خاطر،
مرے ساحل پہ اُترتی ہے
ہوا مشرق کے السلتے ہوئے سورج سے اپنا برف جیسا جسم
جھُلسانے،
سُنہری جلد کچھ سنوّلانے آئی ہے،
ہوا مشرق کی سیاحی پہ نکلی ہے کہ اپنے حُسن سے مشرق
کا السانا بدن
جھُلسانے آئی ہے
ہوا کتنے سمندر پار کر، کتنے بیاباں صحراؤں سے ہو کر
مرے ساحل پہ اُترتی ہے

ہَوا ٹیلے پہ بیٹھی ہے
ہَوا ٹیلے پہ بیٹھی آسماں پر تیرتے بادل کو تکتی تھی
برہنہ آسماں کے نیلگوں تن پر، کسی بالشت بھر بادل کی دھجّی
پورے منظر میں کھٹکتی تھی
ہَوا کو یاد آتا تھا
کمر کے گرد بازو تھے، گلوں کی ہار بانہیں تھیں
وہ سرمستی فقط بدمست انسانوں کا زیور تھی
وہ دُنیا اَن گنت گمنام بندوں کا سمندر تھی
وہ لمحہ اَن گنت بے کیف صدیوں کا تسلسُل تھا
کمر کے گرد بازو تھے، گلوں کی ہار بانہیں تھیں
ہوائے شام کے سیمیں بدن کی ناف پر جھلمل ستارہ جگمگاتا تھا
ہوا کو یاد آتا تھا

ہوائے شام! اِک گدلی گلی سے اِک نئی سج دھج سے نکلی ہے
ہوائے سیم تن، زرد و زر پیراہن پہ گر گر کر پلٹتی روشنی سے
آنکھیں چندھیانے کو نکلی ہے

ہوائے سیم تن کی ایڑیوں پر رقص کرتی پنڈلیاں دیکھو!
ہوائے سیم تن کی مرمریں زرّیں کمر کے گرد چکراتی لچک دیکھو!

ہَوا کی ناف پر تارا جڑا ہے
یہ تارا ایک جھلمل استعارا ہے
ہوس کے سانپ نیلی روشنی کے رقص کرتے دائروں میں جگمگاتی
پنڈلیوں میں پھڑپھڑاتی مچھلیوں کو دیکھ کر
اپنے بلوں میں کلبلا کر، سر اٹھائیں گے
مہذب سانپ آنکھیں پھاڑ کر، پھن کاڑھ کر دم سادھ لیں گے
زہر نیلا زہر، نیلی روشنی کے دائروں میں رقص کرتے
جسم کا انگ انگ ڈستی تتلیوں میں پھیل جائے گا
ہَوا کی ناف پر تارا جڑا ہے
یہ تارا بے سُرے آہنگ پر بے ربط تُک بندی
کا حاصل ہے

ہوائے سیم تن، اِس شور کی بے تال ضربوں پر
ہوس کے زہر سے نَم تتلیوں کے درمیاں،
نیلے منوّر دائروں میں اپنا یہ زرد و زبر پیراہن
سرِ محفل اُتارے گی
ہوائے سیم تن، اس پُر نوا ماحول کی خاموشیوں کے درمیاں
یہ پیراہن خود دھجیاں کر کے اُڑا دے گی

ہوا جامِ شرابِ تلخ کی بدبُو سے بوجھل ہے
ہوائے شام کے سیمیں بدن کی ناف پر تنہا ستارا جھلملاتا ہے
بس اِک لمحے کو گونگی تالیوں کی تھاپ اُبھری ہے
ہوائے سیم تن کے جسم پر اِک داغ روشن ہے
ہوائے شام کی انگلی میں منگنی کی انگوٹھی جھلملاتی ہے

ہوائے سیم تن محبوب کے فاقوں سے ڈرتی ہے
ہوائے سیم تن، دھندا نہیں کرتی
ہوا دھندا نہیں کرتی
ہوا مغرب کی بیٹی ہے
ہَوا آزادہ رَو مغرب کے آزادہ رَوِش سرمائے کے ساحل پہ
چلتی ہے
ہَوا دھندا نہیں کرتی
ہَوا محبوب کی مرضی پہ چلتی ہے
ہجومِ یاس ہے اے جاں، مجھے وحشت سی ہوتی ہے
یہ دُنیا، بے خود و بے نام بندوں کا سمندر ہے
یہ لمحہ، بے ثمر، بے کیف صدیوں کا تسلسل ہے
ہوائے نیم شب، تالاب کے خاموش پانی پر تھرکتے دائرے
میں رقص کرتی ہے
ہوائے نیم شب، پتھریلے پیدل راستوں سے کب سنبھلتی ہے،
کھُلی سڑکوں پہ چلتی ہے
ہوائے نیم شب، سمتِ مخالف سے کوئی رغبت نہیں رکھتی
ہوائے نیم شب، سچائی کے رستے پہ چلتی ہے
ہوائے نیم شب کا اپنا بستر ہے
ہوائے نیم شب کی اپنی راہیں ہیں
ہوائے نیم شب تنہائی کے رستے پہ چلتی ہے
ہوائے نیم شب کی کم نگاہی سے شناسائی ٹپکتی ہے
ہوائے نیم شب پہلو بدلتی ہے تو اس کی ادھ کھُلی آنکھوں سے
دانائی ٹپکتی ہے

میں اس کو جان لیتا ہوں
ہوائے نیم شب کے رُخ پہ اک تِل ہے، میں اس تِل سے اُسے
پہچان لیتا ہوں

ہوائے نیم شب اے جان، دلِ تنہا کی ساتھی ہے
ہوائے نیم شب، مغرب کی بیٹی ہے
ہوائے نیم شب مغرب کی تنہائی سے اُکتائی ہوئی دانائی
کے ساحل پہ چلتی ہے

ہوائے شب، ہوائے شام کے پُرپیچ رستوں سے ذرا ہٹ کر گزرتی ہے
ہوائے شب شکستہ بوتلوں کی کرچیوں کے فرش پر زخمی قدم
گِن گِن کے دھرتی ہے
مگر یہ ماتزائیں کون گِنتا ہے ؟
ہوائے شب کے نازک تن میں زہریلے دھوئیں کے
کنکھجورے سرسراتے ہیں
ہوائے شب کے گرتے جسم میں سرطانِ خوں آشام کا گھر ہے
مگر یہ کھڑکھڑاہٹ کون سُنتا ہے ؟
ہوائے شب، دلِ برباد کے پُرکھوں کی بھیدی ہے
ہوائے شب کے ہونٹوں پر کسی وعدے کی مُہریں ہیں
ہوائے شب کے پیروں میں کسی زنجیر کا بَل ہے
ہوائے شب کلیسا تک نہیں جاتی
خداوندا! اب اس گرتے ستوں کو کون تھامے گا ؟
ہوائے شب کسی شب تاب کی پُوجا نہیں کرتی
ہوائے شب، گزشتہ دن کی بیٹی ہے، دلوں کے ساتھ چلتی ہے
شکستہ ساحلوں کے ساتھ چلتی ہے

ہَوا جذبات رکھتی ہے مگر جذبات پر قابو نہیں رکھتی
ہَوا کے ہاتھ میں ننگے چھتیس تنکوں کی مٹھی ہیں
مگر اے جان، ہوا پر سادگی کے دوسرے پڑتے ہیں
ہَوا اپنی توانائی سے اب بےزار رہتی ہے
ہوائے صبحِ سیمیں رنگ کی نَس نَس میں اک اندوہ بہتا ہے
ہوا اپنے کنارے کاٹ دیتی ہے
ہوا اپنے کنارے چاٹ لیتی ہے
بہاؤ کا کٹاؤ کون دیکھے گا ؟
ہوائے صُبحِ سیمیں رنگ، مغرب کی وہ بیٹی ہے
جسے زردار مغرب کے بہت ماہر طبیبوں نے
مریضِ لادوا ٹھہرا کے مرنے کے لیے
مشرق کی سیّاحی پہ بھیجا ہے
ہوا رنگوں کی دشمن ہے، مگر خوشبو کی ساتھی ہے
ہوائے صبحِ سیمیں رنگ کی نَس میں محبّت کی مہک کے
کنکھجورے کلبلاتے ہیں

ہَوا مَر مَر کے جیتی ہے
ہوا جی جی کے مَرتی ہے
ہوا محشر اُٹھاتی ہے مگر سازش نہیں کرتی
سنو، مشرق کی کٹھالی میں بدن پگھلانے آئی ہے

فرزانہ رضوی

پرواز

اے خدا
میرے پروردگار
میری ناچیز ہستی کا رُخ اُس طرف موڑ دے
جس طرف کچھ نہ ہو
ماسوا نرم، نیلی خلاؤں میں اِک رہگزر

تیری بخشی ہوئی ان توانائیوں کی قسم
جن میں ایمان و ایقان کا حسن ہے
میں اکیلی بڑھوں گی اسی رہگزر پر
وہیں ڈھونڈ لوں گی اک ایسا جہاں
جس میں ہابیل و قابیل کے معرکے سے
نہ آغاز ہو
ابنِ آدم کی تاریخ کا

بے خبری

اِک ستارہ جو میرے نام کا ہے
کیا خبر کہکشاں کی بزم میں وہ
اب بھی شامل ہے یا خلاؤں میں
اِک اکیلا بھٹک رہا ہے کہیں

اور یہ بھی خبر نہیں ہے کہ اب
پہلے جیسا ہے یا شکستہ ہے
ہے فروزاں ابھی کہ ماند ہُوا
کتنے دن ٹوٹنے میں باقی ہیں

سیّد یٰسین قدرت

تو برس جائے

میرے ماضی کے الاؤ میں تری یاد کا پھول
ہو گیا کب کا بھسم
اڑ گیا حسن ترا، شوق مرا
ہجر کی آندھیوں میں زرد پتا ور کی طرح
آنکھ سے اب ترا پیکر بھی گزرتا ہے
کسی بھاگتے منظر کی طرح
دھیان کی کہر میں
دُھندلایا ہُوا عکس ترا
آنکھ کے "لینز" سے گزرے ہے
کس برق کی چم خم کی طرح
درد کی آنچ پہ بھنتا ہُوا دل
اب تڑپتا ہے
تو بے وقت تڑپنے کا مداوا کیا ہے ؟
کاش تو پھر سے برس جائے
مرے صحن میں
بادل کی طرح !

فریب

جب خزاں کھا گئی شاخوں کو
تو تم چھاؤں کہاں ڈھونڈتے ہو ؟
پیاس کے مارے تڑخ جاتا ہے دھرتی کا وجود
اور بادل ہیں کہ چکمہ ہی دیے جاتے ہیں
ریت نے کتنے ہی پیاسوں کو
دکھائے ہیں سراب
چھدری چھاؤں کے شجر چاہتے ہیں
اس سے پہلے کہ امر بیل انھیں کھا جائے
دُھوپ کے قہر سے ایک آدھ مسافر کو اماں مل جائے
طائرو ! تم جو ہواؤں میں اڑے پھرتے ہو
خشک شاخوں پہ اُترنے سے بچو
ٹوٹی، پھُوٹی ہوئی دیوار کے سایے میں نہ دم لے راہی !
دل کشی ـــــ اصل میں دلّالی ہے
دل کے ارمانوں کو بہلانے کی !
جھلسانے کی !

LENS ـہ

نجیب احمد

علم کے موتی

کاغذ اور قلم کا رشتہ تختۂ گل پر کس خوشبو میں درج ہُوا
لوحِ ہوا پر نقش ہُوا ایک اور مہکتا نام
علم کی چاندی، علم کا سونا پل پل جمع کیا
اپنی بساط سے بڑھ کر خرچ کیا

پہلا دن ہے، پہلا اور رو پہلا دن
خواب نما، تعبیر بھرا، جگمگ جگمگ اور جھلمل دن
مکتب کے پہلے زینے پر پہلا پاؤں پڑا
علم کو دولت جاننے والے باپ کے بیٹے کا
تازہ تازہ ہاتھوں میں تھا کتنے پرانے جگمگ جگمگ جھلمل جھلمل
خوابوں کا بستہ
کاغذ اور قلم کا رشتہ تختۂ گل پر پھر خوشبو میں درج ہوا
لوحِ ہوا پر نقش ہُوا اک اور مہکتا نام
چھٹی کی گھنٹی بجنے پر شور اٹھا
میرا بیٹا چاند ستاروں کے اس بھاگتے جھرمٹ سے نکلا
اور میری ٹانگوں سے آلپٹا
اُس کی آنکھوں میں آنسو تھے
اِک ہچکی میں کچھ الفاظ بندھے تھے، مجھ کو دیکھ کے فرش
پہ آن رہے
"ابّو! سر نے مجھ سے پوچھا تھا
"کیا تیرے ابّو تاجر ہیں؟"
اور جب میں نے بتایا، وہ تو شاعر ہیں
تو سارے بچّے قہقہہ مار کے ہنسنے لگے
اور سر بولے!
"مرغا بن جاؤ!
علم غریبوں کی دولت ہے
اور غریبوں کو یہ موتی
مرغا بن کر چگنا پڑتے ہیں"۔

دلِ سادہ

دلِ سادہ!
کبھی سوچا ہے تیرے لفظ کیونکر زہر ہوتے ہیں؟
نکیلی سوچ کے حامل کٹیلے حرف کیوں تلوار جیسی کاٹ
رکھتے ہیں؟

دلِ سادہ! تجھے معلوم ہے؟
تو نے کبھی سوچا؟
ملاوٹ سے تہی سونا کبھی زیور نہیں بنتا

دلِ سادہ!
ابھی شاید ترا بچپن نہیں گزرا

دلِ سادہ!
ذرا سا کھوٹ شامل ہو تو سونا نت نئے گہنوں میں
ڈھلتا ہے
ابھی تُو مصلحت کے فائدوں سے نابلد ہے
جھوٹ سے باتیں بدل جاتی ہیں شعروں میں
کہ جیسے کھوٹ سے کندن بدل جاتا ہے گہنوں میں
سرِ بازار گہنوں کی خریداری کا چرچا ہے
دُوکانیں گاہکوں کا ساتھ دیتی ہیں!

خاقان خاور

چار مختصر نظمیں

تخریب میں تعمیر

آشیانے سے تو بھی میری طرح
گر گیا ہوگا اپنے بچپن میں
روز بپھری ہواؤں سے مل کر
ٹوٹے پتوں کی مثل آوارہ
کتنے شہروں میں تو پھرا ہوگا
کبھی تنہائیوں کی سُولی پر
یاد اُس شاخ کو کیا ہوگا
جس پہ ہوتا تھا گھونسلا تیرا
زخم پر زخم روز سہنے سے
درد کی دلدلوں میں رہنے سے
ہر کوئی مان تو گیا ہوگا
تو بھی یہ جان تو گیا ہوگا
حادثوں نے بنا دیا ہے تجھے
زندہ رہنا سکھا دیا ہے تجھے

دھرتی اور اُس کے بیٹے

کس لیے کاٹتے ہو پیڑوں کو
یہ ہرے پیڑ میرا آنچل ہیں
بیٹے ماؤں کا کھینچ کر آنچل
یوں نہیں تار تار کرتے ہیں
وہ تو ماؤں سے پیار کرتے ہیں

بغاوت

جبر کا زہر جب اُترتا ہے
باغ کا باغ جب بکھرتا ہے
ظلم جب انتہا پہ ہوتا ہے
جب ہوا بولنے سے ڈرتی ہے
ایسی رحم ساعتوں میں آنکھ
رُت بدلنے کی بات کرتی ہے

تصویر کا دُوسرا رُخ

محوِ پرواز، تصویر میں، فاختہ
چونچ میں جس کے ہے شاخِ زیتون کی
پچھلی جانب اُسی ایک تصویر میں
سینکڑوں جسم بچوں کے بکھرے ہوئے
اور بہتی ہوئی نہر سی خون کی

د - سنبل

ترکِ ترک

بہت خوبصورت زمانہ تھا
جب میں نے دل کا ریسیور اُتارا
اُسے ایک جانب رکھا
روح و دل کے سبھی رابطے منقطع کر لیے
اور
قلم ہاتھ سے رکھ دیا!
ایک گوشے میں بیٹھی ہوئی
زندگی کو گزرتے ہوئے
پاس سے
بے تعلق سی ہو کر
میں یوں دیکھتی ہی رہی
جیسے دُنیا کے سارے ہی دھندوں سے
فارغ ہوں
نشچنت!
بے زار و بے صرفہ!
ہوتے نہ ہونے سے بے فکر
جیسے مرا
کچھ بھی کرنے کا
کوئی ارادہ کبھی بھی نہ تھا!

وہ زمانہ بھی کیا تھا!
بہاریں تو اِک جا
خزائیں بھی دلدار و ظالم، ستمگار و کافر ادا تھیں
ہواؤں میں جو بھی مہک تھی
سو وہ جان و دل، میں اُتر جانے والی تھی
تڑپانے والی
نومبر کی راتوں میں
جب رات رانی مہکتی
سمجھ میں نہ آتا تھا، کیا کیجیے
مر ہی جانے کو جی چاہتا تھا!

جدھر دیکھیے، رنگ ہی رنگ بکھرے ہوئے تھے
نظارے، ستارے
کئی رنگ موسم
پہاڑوں پہ بکھرا ہوا حُسن
صحراؤں کی ریت
گاتی ہوئی ندیاں
جا بجا پھوٹ کر بہتے جھرنے
پرندے!

رکھ جن کے پروں جیسے رنگوں میں چُنری
کوئی رنگریز آج تک رنگ کر ہی نہیں دے سکا!)

ہر اک رنگ
ہر ایک جذبہ
ہر اک آرزو
زندگی سے بڑی، زندگی سے زیادہ تھی
اور رنگ ہی رنگ تھی !

اور آتی بہاروں میں
پھولوں کی لَو دیتی خوشبو پہ
منڈلاتے بھنورے
ٹھٹھکتی ہُوئی تتلیاں
اور زمیں پر مہکتا ہوا کاہی سبزہ
اور اس پر تنا آسماں ——،
خوبصورت تریں،
شاعری کے سبھی استعارے کنائے سبھی
خود بخود فہم میں آنے لگتے تھے

'دشت' کیا ہے ؟
جنوں کس کو کہتے ہیں ؟
اور پھر بہاروں میں پاؤں کا زنجیر سے کیا تعلق نکل آتا ہے
اور گریباں و دامن کے چاکوں میں
کیوں فاصلے ختم ہو جاتے ہیں ؟

کچھ عجب کیفیت تھی
کہ گر چاہتے بھی تو شاید
بیاں کر نہ سکتے

مگر اب تو وہ سارے قصے
مری سوچ کی بھی حدوں سے پرے جا چکے !
اُن کے اظہار کا تو زمانہ وہی تھا
جو اَب جا چکا !
اور اب — اُن کے لکھنے کو الفاظ باقی نہیں
اور جو باقی ہیں، کافی نہیں ہیں
(ویسے، پہلے بھی کافی نہ تھے)
مگر اب تو بالکل کہیں کھو گئے
جیسے نابود ہی ہو گئے

سبھی نادر اور خوبصورت، انوکھی تراکیب
سب استعارے
کسی اور ہی ضمن میں
بے نوا ہو چکے
ہم انھیں کھو چکے !
ہم انھیں رو چکے !

افتخار مُغل

ہوا کے ہاتھ گندے ہیں

(کشمیر کے حوالے سے)

ہوا نے آج کی بدصُورتی سے دوستی کر لی
پرانی رسمِ خط کے گنگ میں سُوئی عبارت
اجنبی ہوتے ہُوئے بھی اجنبی کب تھی
ہوا کی بند مٹھی گرم ہے اور ہاتھ گندے ہیں

ہوا نے نامکمل جھُوٹ کے ایما پہ
پورے سچ کا اُجلا پن مٹا ڈالا!

مجھے برزہ[1] کے برزخ میں اُترنا ہے
مکمّل سچ مجھے آواز دیتا ہے
کہ "آؤ ــــ اور میرا اَن کہا کھولو"

مجھے سچ میں اُترنا ہے
مگر بستی کی چاروں اور
گھری دُھند سازش کی طرح پھیلی ہوئی ہے چار صدیوں سے
میں گھری دُھند کے لاکھوں سیاہی کاٹ کے
گھمسان کا رن پاٹ کے
برزخ میں پہنچا ہُوں

مگر میں اپنے پاؤں کے نشاں دُہرا نہیں سکتا
میں تنہا لشکری
اور چار صدیوں سے مسلّط دُھند صف بستہ!
مجھے موجود کی بدصورتی کے مغلِ اعظم کی ولی عہدی سے
ناموجود کا بن باس اچھّا ہے
ہوا کے ہاتھ سے اب روشنی جھڑتی نہیں ہے
خون جھڑتا ہے
ہوا کے ہاتھ گندے ہیں

مگر اس رات کے دُوجے سرے پر بھی تو کچھ ہو گا
رسیلی ٹہنیوں اور سبز گدرائے ہوئے خوابوں بُنی ہر ٹوکری
کے نرم پھندے ہیں
بہت سی شمعیں رکھ کر ان کو جہلم کے ملائم نیلگوں
کندھے پہ لا دا جا رہا ہے
روشنی لنگر اُٹھاتی ہے

---

[1] برزہ ۔ کشمیر میں سری نگر کے قریب ایک تاریخی بستی

وحید احمد

ایک دُعا ہریالی کی

وِردوں کی ہُمّ*، مدھم مدھم
دیواریں لرزاتی ہے
لال اگر بتیوں کی سر چکرانے والی بھاری باس
دُھواں بن کر اُڑتی ہے
سبز ملنگوں کی گردن میں کالے منکوں کی مالائیں
چوغے کے اندھیارے شیشوں سے ٹکرائیں
کنڈ جُھنک دیں
سرد ستون عقیدت مندوں کے لمسوں سے میلے میلے
طاق چراغوں کے رِستے روغن کے نم سے گیلے گیلے
آسودہ مخمور کبوتر
گنبد جن کا آنگن ہے
اور آنگن جن کا نہ خانہ ہے
چوڑی چوکھٹ والا شہ دروازہ
بکھرے ہوئے لوگوں سے بھرا ہوا ہے

پیر سائیں!
وہ عورت تھی یا ساحرہ تھی؟
جب اُس نے تیرے دربار میں اپنے ننگے پاؤں دھرے
تو
تیرے فرش کے مرمر نے رنگت بدلی
دیکھنے والے ٹھہر گئے
اور
سُننے والے چلنے لگے
اُس نے اپنی مخروطی انگشتوں والے ہاتھوں کا کشکول بنایا
اور لرزتے ہونٹوں سے سرگوشی کی:

"بابا!
دیکھ میں باہر سے کتنی آباد ہوں
لیکن میرے اندر اک ویرانہ ہے
میری کوکھ میں مٹی اُڑتی رہتی ہے

پیرا!
اِس میں کالے کالے بادل بھیج
شُوکریں مارتی بارش کر
سوندھی سوندھی باس جگا
دونوں ہاتھ جما کر کھینچ
دَنتر والی مٹی پھاڑ
چھوٹی بڑی دراڑیں ڈال
تاکہ کوئی کونپل اس میں جڑ پکڑے
ہکورے لے
دھڑ پکڑے

سائیں!
مجھے ہریالی دے
پُھولنے پھلنے والی دے"

* HUM

ناھید قاسمی

ایک آنسو، ایک امّید

میرے بزرگو!
(زندگی کے جس شعبے سے بھی آپ تعلّق رکھتے ہوں)
آپ نے یہ کیسا دستور نکالا؟
جب تک سب کچھ آپکے اپنے ہاتھوں میں ہو
تب تک آپ کو سب کچھ ٹھیک اور اچھا اچھا لگتا ہے
اک مسکان سجی رہتی ہے ہر دم آپکے ہونٹوں پر
لیکن یہ "سب کچھ" واپس ہو جائے
اور آپ کے ذاتی فائدے کم کم ہونے لگیں
تب آپ کو سارے عیب دکھائی دینے لگتے ہیں
ہمقوموں میں
اور آپ وطن کے زوال کے طوفانوں کی آمد کے اعلان
بلند آوازمیں کرنے لگتے ہیں
اور لوگوں کو ہر چیز جلا کر
اس کی راکھ اڑانے پر اکسانے لگتے ہیں!
آپ جو اتنے بہت سے سال یہاں موجود رہے ہیں
آپنے کون سے تیر چلائے
کتنے سنگِ میل ابھارے
کتنی سچائی بوئی؟
اور کتنی اچھائی کو عام کیا؟
کہاں پہ آنکھ چرائی تھی اور کس سے حصّہ داری کی تھی؟

کتنے بادل تھے جن کی بوندوں پر
آپ نے پابندی عاید کر دی تھی؟
پھر مانگے کا پانی کن سے لے کر اپنی نہروں میں ڈلوایا تھا
کتنی خرابی جڑوں تلک جاتے ہوئے دیکھی؟
لیکن آپ بلند مچانوں سے نیچے نہیں اُترے
آپنے اک کھیتی بھی تو پروان نہیں چڑھنے دی!
لیکن آپ نے جو کچھ بو رکھا ہے، وہ اب کاٹنا ہوگا

ٹھیک ہے، اپنے حصّے کے دُکھ کانٹوں کی ہر چبھن کو
سہنے کی ہمّت
ہم آخر حاصل کر ہی لیں گے
اے اس عہد کے مخلص، پُر امّید جوانو!
آؤ، ہم سب مل کر
اپنے بکھرے وجود کا ذرّہ ذرّہ چُن کر
اپنے آپ کو پھر تعمیر کریں
اس کھیتی کو سینچیں
جس میں ہر اک کے لیے اِک جیسا سکھ اُگتا ہو!

شاہین مفتی

رابطوں کی دُنیا میں

رابطوں کی دُنیا میں
لفظ ہی وہ رستہ ہے
جس پہ لوگ چلتے ہیں
حرف اور معنی کی

ریشمی طنابوں پر
ہاتھ جب پھسلتے ہیں
ساتھ چھوٹ جاتا ہے
دُور جا نکلتے ہیں

اجنبی جزیروں کے
بے یقین لوگوں میں
عُمر بیت جاتی ہے
حرف اور معنی کے
رشتہ ہائے پیہم کا
کچھ سِرا نہیں ملتا
لوٹنا بھی چاہیں تو
راستہ نہیں ملتا

منصورہ احمد

بے انجام

سنو!
اس رات کی دھڑکن میں
کن مُنہ زور قدموں کی دھمک ہے؟
یہ دل کس جبر سے سہما ہُوا ہے؟
زمانوں سے زمانوں تک بچھی اس رات میں
ہم ہاتھ آنکھوں پر لپیٹے
کیوں مسلسل چل رہے ہیں؟
زمیں اپنے سوا نیزے پہ اوندھے منہ گری ہے
ہمارا ہر قدم کتنے نشیبوں میں لڑھکتا ہے!
یہ کیسی بے اَبد سی ہُوک ہے
جو رات کے پس منظروں میں گُونجتی ہے
کوئی گھُٹ گھُٹ کے جیسے بَین کرتا ہو!
زمیں کی لرزشیں اب سانس کی گردش کا
حصّہ ہیں
درونِ ذات اندیشے دھڑکتے ہیں
نجانے اِس گھڑی کتنی ہی آہن پوش سانسیں
جل بجھی ہوں گی
کئی ٹوٹے ہوئے انساں
کسی کے ساتھ جُڑنے کی تمنّا میں
ہمیشہ سے کہیں بڑھ کر ادھورے ہو گئے ہوں گے

کبھی تم نے 'خبر نامے' میں
لمبی میز کے چاروں طرف بیٹھے خدا دیکھے؟
کبھی اُن کی نگاہوں میں جمی بیگانگی دیکھی؟
انھیں آسودگی یہ ہے
کہ ان کے فیصلوں سے
جن گھروں میں موت اُترے گی
وہ اُن کے گھر نہیں ہوں گے!
تمھیں معلوم ہے، یہ سرد آنکھیں تو ہمارے
مقبرے ہیں
ہم ان قبروں میں عمریں بھوگ دیتے ہیں
مگر اِک پل بھی زندہ رہ نہیں پاتے

اُدھر یہ میز کے چاروں طرف بیٹھے، فقط یہ سوچتے ہیں
کہ قبریں اور گہری کس طرح کھودیں
جو ذرّوں میں بچی کچھ زندگی
باقی گھروں میں رینگتی ہے
اُسے بھی چھین کر یہ کس طرح
اپنے گھروں میں قید کر ڈالیں
یہ سُورج باندھ سکتے ہیں تو سب کچھ باندھ سکتے ہیں
ہماری روشنی، صبحیں، ہوا، سب اُن کے قیدی ہیں
سویرے سے تہی یہ رات ہی آزاد پھرتی ہے
ہمیں کب تک نشیبوں میں لڑھکنا اور قبروں میں
پہنچنا ہے؟

چلو اِک بار ہی چیخیں
کہ اس پُر ہول سناٹے میں کوئی گونج تو اُبھرے
یہ ممکن ہے ہماری چیخ کی آواز
اُس دیوار کی پرلی طرف جکڑے ہُوئے سُورج کو
چھُو جائے
مگر یہ کیسے ممکن ہے ؟ ؟ ؟

نظمیں رستہ بھُول گئی ہیں

نظمیں رستہ بھُول گئی ہیں
جیسے چڑیا
بھُولے سے کمرے میں آئے
اور باہر کی راہ نہ پاکر
چونچ کو شیشوں سے ٹکرائے!

منصورہ احمد

تین مختصر نظمیں

(۱)

مرے مالک!
تجھے تو علم ہی ہو گا
جو بچپن سے بڑھاپے میں چلے جاتے ہیں
اُن سب کی جوانی کون جیتا ہے؟

(۲)

یہی سب کچھ تو ہونا تھا
بھنور بے بادباں کشتی میں طے ہونے لگے
تو ڈوبنا مقسوم ہوتا ہے

(۳)

یاد ہے اِک پورن ماشی میں
چاند ہمارے کتنے پاس اُتر آیا تھا
ہم سے کتنی باتیں کی تھیں
اپنے رتھ پر کتنی سیر کرائی تھی
پگھلی پگھلی کرنوں سے اِک محل سجا کر
ہم کو کتنے چاؤ سے اپنا مہمان بنایا تھا

اب بھی چاند مری دُنیا میں آجاتا ہے
حیراں حیراں آنکھوں سے تکتا رہتا ہے
اور جیسے کچھ کہتے کہتے رُک جاتا ہے

اگلی پورن ماشی پر تم ایسا کرنا
پَل دو پَل کو ہی آجانا
چاند کی انگلی تھام کے اپنے گھر سے جانا

اشرف جاوید

مری آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رہنے دے

مری آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رہنے دے
سُلگتے لمس کے ریشم سے آسودہ نظر کر دے
ذرا سا بے خبر کر دے
ہوا کے ہاتھ پر کس کا لہو تحریر ہے
سب جانتا ہوں میں
ہوا کس رُخ سے آئی ہے
مجھے معلوم ہے سب کچھ
گواہی مجھ کو دینا ہے
مگر سچ سے سبھی انکار کرتے ہیں
گواہی کون مانگے گا؟
شہادت کون چاہے گا؟
زرِ انصاف لمحوں کی ترازو میں پڑا ہے
ایک پلڑے میں پڑے اک نقرئی کاغذ پہ کس کا نام لکھا ہے
یہ پلڑا جھک گیا ہے — اور
مسلسل جھکتا جاتا ہے
فضا آلودہ ہے
بارود سے منظر دھواں سا ہے
گلی میں سر بُریدہ لاش پر اک گدھ کا قبضہ ہے
پسِ دیوار بستی پر بلا کا قحط اُترا ہے
سمندر سے پرے کچھ لوگ بستے ہیں
سمندر پر کڑا پہرہ ہے
ہونٹوں پر لہو جم سا گیا ہے
ماؤں کے سینوں کے برتن دودھ سے خالی
زباں تالو سے چمٹی ہے
کوئی بچہ بلکتا ہے نہ روتا ہے
مدد کو کون پہنچے گا!
بشارت کون لائے گا!
سرِ فرشِ زمیں زیتون کی اک شاخ بھی باقی نہیں شاید
ہوا کے پاس جتنے تیر تھے اس نے
ہر اک جانب سے لمحوں کی کماں پر کس لئے ہیں
فاختہ بے بس اکیلی ہے
مری آنکھوں میں بس اک رنگ باقی ہے
لہو کا رنگ باقی ہے
بصیرت زخم بن کر رہ گئی ہے
زخم کی اس آنچ پر ذہن و بدن کچھ اور پگھلایا نہیں جاتا
مری آنکھوں پہ اپنے ہاتھ رہنے دے
مجھے کچھ دیر اپنے ساتھ رہنے دے

اسلم طارق

ہمیں سُورج کا رستہ صاف رکھنا ہے

ہم اُس موسم کے قیدی ہیں
جسے اپنی طوالت کا یقیں ہے
اور ہمارے خواب فردِ جرم کی صورت ہمارے سامنے رکھے
گئے ہیں

اب گواہی کون دے گا
ہم نے ساری عمر سادہ کاغذوں پر خواب ہی لکھے
ہمیں سطروں کو پھیلانا نہیں آتا
جہاں پر دستخط کرنے تھے، ہم نے خواب لکھ ڈالے
سنو درویش!
یہ کارِ جہاں ہے
وہ جنھیں آگے نکلنا ہو انگوٹھے چھاپنے والی سیاہی
ساتھ رکھتے ہیں

چلو باتیں کریں موسم بدلنے کی
کہ ان پیڑوں کے مفلس ہاتھ اب دیکھے نہیں جاتے
یہ پت جھڑ قسمتوں کا لازمی ورثہ نہیں ہیں
چوٹیوں کے ساتھ لپٹی برف کہساروں کا حصّہ بن نہیں سکتی
کہ سُورج پر بہت سے قرض واجب ہیں

سنو درویش!
جنگل کا بسیرا
بیتی عمروں سے جُڑی باتیں
دُکھوں کی لذّتیں
برفوں کے موسم ہیں
چلو کاغذ پہ سُورج کی بہت سی صُورتیں تصویر کر ڈالیں

کہیں ایسا نہ ہو
برفیں پگھلنے تک سبھی ذہنوں سے سُورج کا سراپا محو ہو جائے

ہمیں سُورج کا رستہ صاف رکھنا ہے!

قائم نقوی

تذبذب

اگر سوچوں کی گرہیں کھل پڑیں
تو رات کی اندھی مُسافت جان جائیں ہم
طلُوعِ صبح کو ہر شب اُترنا ہے
کسی اندھے کنوئیں میں
اور پھر لاحاصلی کا اجر چکھنا ہے
یہ کیسا مرحلہ ہے
فیصلہ ہونے نہیں پاتا
مگر ہم ہیں
کہ اپنے حال کی بے چہرگی میں
مصلحت آمیز خانوں میں بٹے
اک دُوسرے سے خوف کھاتے ہیں
یہ باتیں اَن کہی رہتیں
بھرم ہم سب کا رہ جاتا
یہ کیسا مرحلہ ہے
فیصلہ ہونے نہیں پاتا

ایک جیسا موسم

اپنے کانوں پہ کیسے بھروسا کریں
اب بھی سر پر ہزاروں وہی مشکلیں
رُت بدلنے پہ موسم وہی ہے ابھی
آنکھ کھلتے ہی تعبیر تک کھو گئی
صبح ہوتے ہی تنہا ہوئے بھیڑ میں
ہر قدم پر تمنّا اذیّت بنی

داؤد رضوان

شہرِ حرص کے باسیوں کا اعلان نامہ

ہوا کی گود میں کھیلا ہوا بچپن
کسی آدرش کا بارِ گراں کیسے اُٹھائے گا
کہ سچائی کے لہجوں سے
مکمل طور پر عاری
اذانوں کی صداؤں میں
کوئی بھی کیفیت پنہاں نہیں ہوتی
سو نیکی کی توقع ہم سے مت رکھنا

ہمارے خواب نفرت میں گندھی نفرت سے ہی تشکیل پاتے ہیں
جہانِ تازہ کی تعمیر کیونکر ہم سے ممکن ہے ؟
کہ ہم اپنے تصور میں
سوالوں کی جو اک صورت سی رکھتے ہیں
انھیں اپنے جوابوں میں
کھنکتے نقرئی سکوں کی اک جھنکار کافی ہے
ہمیں کشکول سے حاصل کمائی پر
ہمارے پالنے والے
ہمارے مہرباں
بھولے نہیں ہوں گے
گدائی کی حفاظت میں گداگر
جان دینے سے
کسی کی جان لینے تک
کسی بھی مرحلے پر
چوکتے کب ہیں

چوتھی سمت

اُدھورے خواب، تشنہ خواہشیں، تعبیر کی حسرت
ہمارے وقت کی پیشانی پر لکھی ہوئی تحریر ایسی ہے
جسے پڑھ کر سفر پاؤں میں پہنا تھا

ہمیں لیکن خبر کب تھی
"تلاشِ رزق کے رستوں پہ اَن دیکھی بلاؤں کا تسلط ہے
ہماری واپسی مسدود کر دی جائے گی
— سو یوں ہُوا ہے اب
حیا کی اوڑھنی اوڑھے حسینائیں
ہماری منتظر، گریہ کناں
راہوں کو تکتی ہیں

نمودِ ذات کا اِک جاں گُسل سا مرحلہ بھی ہے
انا کے تازیانوں نے جسے
دشوار کر ڈالا

شکستِ ذات کی اس جنگ میں
پسپائی کی صورت بھلا کیا ہو
لڑائی سہ رُخی ہے اور
چوتھی سمت
اِک جنگل گھنا آباد ہے جو
خود فراموشی کے کانٹوں سے اَٹا ہے

اعجاز رضوی

ایسا کیوں ہے؟

مالک میرے!
بھاری پتھر ڈھونے والے
بھوکے پیاسے سونے والے
چپکے چپکے رونے والے
ڈرتے ڈرتے جینے والے
تیرے ہی بندے ہیں یا پھر اُن کا کوئی اور خدا ہے؟

مالک میرے!
ایسا کیوں ہے؟
اِک جنت کے وعدے پر تو
پل پل دوزخ میں رکھتا ہے
ایسا کیوں ہے؟
اِک روٹی کی خاطر بندہ
سب کچھ گروی رکھ دیتا ہے
اور اِک بندہ
سب کچھ گروی رکھ لیتا ہے
مالک میرے!
دھرتی پر تو نے بھیجا تھا
دھاتیں، پتھر، پیڑ، پرندے
تو نے میرے بعد بنائے
لیکن یہ سب مجھ سے آگے کیوں رہتے ہیں؟
مجھ پر بھاری کیوں پڑتے ہیں؟

مُساوات

یہ صحرا ہے
یہاں سب لوگ پیاسے ہیں
مگر کوئی بھی اپنی پیاس کو ظاہر نہیں کرتا
اچانک دھول کی چادر سے اِک چہرہ نکلتا ہے
تو پیاسے اس کی جانب یوں لپکتے ہیں
کہ جیسے آنے والا انکے قدموں میں ابھی دریا بچھا دے گا
ابھی صحرا کی تپتی ریت پر سبزہ اُگا دے گا
ابھی اپنی پٹاری سے کوئی شیشہ نکالے گا تو سب منظر
سمٹ کر اس کے شیشے میں سما جائینگے ایسے جس طرح
پیاسے کنویں کے گرد اکٹھے ہوں

مگر یہ کیا!
کہ جس کو دیکھ کر پیاسوں نے اپنی ٹوٹتی ڈھارس لہو
کی ڈور سے باندھی
وہ خود ازلوں کا پیاسا تھا

بشریٰ اعجاز

کسی کا عکس

دعائے بے ردا ہوں
اوڑھ لوں کیسے ہیں تاثیریں
جبیں اس آخری سجدے کی
اب تک منتظر ہے
جو فنا فی العشق کر دے
کائناتی دار پر لٹکا
مرا چہرہ مجھے واپس دلا دے
اور وہ آنکھیں جو
ابد کے پار جاتے راستوں پر
بھول آئی ہوں
مرے ہاتھوں پہ رکھ دے
جنھیں چھُو کر
میں بینائی کے سچّے لمس میں بھیگوں
اور اپنے آپ کو دیکھوں
مثالِ آئینہ خود میں
کسی کا عکس بن جاؤں۔!!

ایک مُسافر سے

تھکا سُورج
اُجڑتی شب کے پہلو میں
پناہیں ڈھونڈتا ہے
خیمۂ جاں میں
سفر لمحہ طنابیں کھولتا ہے
جدائی راستہ روکے کھڑی ہے
اُداسی ساحلوں پر
ریت کی صورت بچھی ہے
سفر آغاز ہونے میں
ابھی کچھ وقت باقی ہے
ابھی مت بادباں کھولو
ذرا آرام کر لو!!

منظر حسین اختر

میں کیسے آسماں دیکھوں

ہوا نے آسماں پر پھر دھنک کے سات رنگوں سے
تمہارا نام لکھا ہے
مگر اے آتشِ گل کی مہکتی لَو!
شراروں سے بھرے موسم
مژہ پر شبنمیں رُت ہے
میں کیسے آسماں دیکھوں!

ہتھیلی پر مُقدّر کی تماشہ گاہ میں تارے بھٹکتے ہیں
ہر اک آہٹ پہ جذبے جسم کے پندار خانے سے تمہیں آواز دیتے ہیں
صدا، لفظوں کا رستہ ہے
اُجالے، خواب ساحل کا
یہ ساحل پر رُکے پانی
یہ لفظوں میں چھپے معنی

یہ رمزوں میں، اشاروں میں تمہارا ذکر کرتے ہیں
تمہاری بات کرتے ہیں
مگر اے آتشِ گُل کی مہکتی لو!
شراروں سے بھرے موسم
مژہ پہ شبنمیں رُت ہے
تمہاری سمت کیا دیکھوں!
میں کیسے آسماں دیکھوں!

ناصر کریم

مجھے دریا یہ کہتا تھا

مجھے دریا یہ کہتا تھا
"تمھارے ہاتھ کتنے سخت ہیں، بے رحم لگتے ہو!"
انھیں پانی میں ڈالو میں انھیں نرمی سے سینچوں گا
تمھاری سوچ میں پھولوں کی آمیزش نہیں ہوتی
تمھارے خواب برگ و بار کی خوشبو سے عاری ہیں
تمھاری کھال کے نیچے کوئی جھوٹا جواری ہے
جو اپنی آخری بازی بھی سچ سے ہار بیٹھا ہے"

مجھے دریا یہ کہتا تھا
"فصیلیں اونچی کرنے پر بھی سورج جھانک لیتا ہے
کہ رستے بند کرنے سے ہوا کا رخ نہ بدلے گا
تم اپنی سر بریدہ خواہشیں مٹی میں دفنا دو
وگرنہ ان چٹانوں سے پھسل کر ڈوب جاؤ گے

مجھے دریا یہ کہتا تھا
"بغاوت کر دو
ورنہ آنے والے روند ڈالیں گے!"

مجھے تم سے محبّت ہے

مجھے اس شہرِ خوباں کی فضاؤں سے محبّت ہے
جہاں تم سانس لیتی ہو
جنھیں تم دیکھتی ہو
ان ہواؤں سے محبّت ہے
جو تم کو چھو کے آتی ہیں
تمھاری انگلیوں کی نرم آہٹ سے محبّت ہے
کہ جن سے ہولے ہولے تم مرا در کھٹکھٹاتی ہو
مجھے ان راستوں سے بھی محبّت ہے جہاں سے تم گزرتی ہو
کتابیں جن کو پڑھتی ہو
جو غزلیں گنگناتی ہو
جو باتیں سوچتی ہو
دوستوں میں بیٹھ کر جو بحث کرتی ہو
ادھورے خط، جنھیں ارسال کرنا بھول جاتی ہو
یا جس انداز سے میرے لیے چائے بناتی ہو
مجھے اس سے محبّت ہے
مجھے تم سے محبّت ہے

احمد ندیم قاسمی

بے بسی کے ایک لمحے کی نظم

صبح کی سیر پہ جاتے ہوئے مَیں آج کہاں آ نکلا!
جتنے کہسار ہیں، دھرتی میں دھنسے جاتے ہیں
جھیل کی سطح پہ پتھر کا گماں ہوتا ہے
ریت اُڑتی نظر آتی ہے گلستانوں میں
اور غنچہ جو چٹکتا ہے تو گندھک کا دُھواں چھوڑتا ہے
دستِ اشجار میں پتے نہیں، انگارے ہیں
جھاڑیاں دُور سے عفریت نما لگتی ہیں
گھاس پر اوس اُترتی ہے تو جل جاتی ہے
اور بے سمت ہوا
راہ گُم کردہ مسافر کی طرح چلتی ہے
جس طرف جاتا ہُوں، ٹوٹے ہوئے انسان نظر آتے ہیں
سر کہیں، ہاتھ کہیں، پاؤں کہیں
خاک پر چار طرف بکھری پڑی ہیں آنکھیں
ٹکٹکی باندھے جو صرف ایک طرف دیکھتی ہیں
جس طرف قصرِ مشیّت کی فلک بوس فصیلوں کے سوا
کچھ بھی نہیں!

تیگہ

سجاد حیدر

جب صبح سویرے ٹھمنڈ بس سروس کی پہلی گاڑی مردان سے چلی تو رحمت اُس میں بیٹھتے ہی اُونگھنے لگا۔ پھر جب ٹھنڈی ہوا کے پنکھیاں جھلنے لگی اور چلتی گاڑی نے جھولے دیئے تو وہ ساتھ بیٹھے اَول خان کے کندھے پر سر رکھ کر باقاعدہ سو گیا۔ اَول خان اپنی چادر کی بکل مارے ناک کی سیدھ دیکھ رہا تھا اور نہ جانے کن خیالوں میں گم تھا۔ یکایک اُسے سوئے ہوئے رحمت کے خراٹوں نے چونکا دیا۔ اس نے ادھر اُدھر دیکھا تو اُس کی دوسری طرف بیٹھا قرتی اور کوٹ پہنے ہوئے ٹھیکیدار قسم کا مسافر رحمت کی طرف دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ اَول خان نے اپنے ساتھی کی صفائی پیش کرتے ہوئے بتایا کہ وہ دونو حیدرآباد سندھ سے آ رہے ہیں اور دو دن سے سفر میں ہیں۔ اس لیے اس کا دوست تھک کر سو گیا ہے۔ بس جب مالاکنڈ رکی تو یکدم بریک لگنے کے دھچکے سے رحمت جاگ اُٹھا۔ مسافر اُترنے چڑھنے لگے۔ رحمت کو یہ دیکھ کر بڑی حیرت ہوئی کہ زیادہ تر مسافروں کی یہی کوشش ہوتی تھی کہ انہیں اُوپر چھت پر جگہ ملے۔ اُس نے اَول خان سے پوچھا کہ آخر بس کی چھت پر ایسا کیا آرام ملتا ہے کہ سب لوگ پہلے وہیں جگہ ڈھونڈتے ہیں؟ اَول خان نے اُسے بتایا کہ اُوپر ہوا خوب لگتی ہے اور پہاڑوں میں بسنے والے جو گرمی برداشت نہیں کر سکتے، وہاں بڑے خوش رہتے ہیں۔ پھر جب اڈے کے کچھ مزدور ڈول بھر بھر کر پانی چھت پر پہنچانے لگے تو اَول خان ہنسنے لگا۔ جب رحمت نے اُس سے ہنسنے کا سبب پوچھا تو اُس نے کہا "پتہ ہے یہ پانی اوپر پہنچانے والے کیا کہہ رہے ہیں؟ یہ اپنے ساتھیوں سے کہتے ہیں۔ جلدی کرو اُوپر باغ کے لیے پانی دو۔ یہ چھت پر بیٹھے مسافروں کو باغ کہتے ہیں۔" اس پر رحمت بھی ہنس پڑا اور کہنے لگا "ہاں بھائی اوپر بیٹھے بیچارے مسافر بھی تو بوٹے ہی ہیں نا۔ اگر پانی نہ ملا تو مرجھا جائیں گے۔"

بس مالاکنڈ سے چلی تو چکدرہ جا رکی۔ رحمت نے چکدرہ فورٹ دیکھ کر اَول خان سے کہا: "اس جگہ اتنا مضبوط قلعہ بنانے کی کیوں ضرورت پیش آئی؟ اس سے آگے افغانستان ہے کیا؟" اَول خان نے اُسے بتایا کہ افغانستان تو وہاں سے اتنا قریب نہیں۔ البتہ یہ قلعہ انگریزوں نے آزاد قبائل پر اپنی دھاک بٹھانے کے لیے بنوایا تھا۔ اسی قلعے سے آزاد علاقے پر لشکر کشی کے لیے فوجی دستے بھیجے جاتے تھے۔ پھر اس نے سڑک کی بائیں جانب دریائے پنج کوڑہ کے پار ایک پہاڑی کی طرف اشارہ کیا، جہاں ایک چٹان پر چونے سے سفید رنگ کیا گیا تھا۔ اَول خان نے رحمت کو بتایا "جب ابھی یہ قلعہ نہیں بنا تھا تو یہاں ایک فوجی چوکی ہوتی تھی، اور اس مورچے میں، جسے اب سفید رنگ کر کے نمایاں کیا گیا ہے، انگریزوں کا وزیرِاعظم چرچل سترہ دن تک سوات کے اخوند بابا کے لشکر سے لڑتا رہا ہے۔ اُس وقت وہ مردان میں گائیڈ رسالے کا لفٹیننٹ ہوتا تھا۔" رحمت کچھ دیر چرچل کے مورچے کو دیکھتا رہا۔ پھر چند قدم چل کر قلعے کے اور قریب جا کھڑا ہوا اور دیر تک اُس کی بلندیوں پر پاکستانی پرچم کو لہراتا ہوا دیکھتا رہا۔ جب اَول خان نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھ کر اُسے بس کی طرف واپس لے جانا چاہا تو رحمت نے اُسے ہاتھ کے اشارے سے روکتے ہوئے بھید بھرے لہجے میں پوچھا: "یہ قلعہ تو اپنی بنیادوں پر کھڑا ہے، مگر انگریزی فوج کہاں گئی؟ انگریزوں کا کمان افسر چرچل کہاں چلا گیا؟ انگریز کی اتنی مضبوط حکومت کو کیا ہوا؟ ان سب کا تو اب نام نشان بھی باقی نہیں، نہ اِس

قبضے میں، نہ اس زمین پر۔" اوّل خان چونکہ رحمت کے خانہ ساز فلسفے کو اپنے لیے علاقۂ ممنوعہ سمجھتا تھا، اس لیے چُپ رہا۔

بس کا اگلا پڑاؤ تیمر گرہ تھا۔ یہاں اوّل خان نے رحمت کو ایک کچے کوٹھے میں بٹھا کر کڑک چائے پلائی۔ چائے بنانے والے نے نہ جانے اُس میں کیا کیا مصالحے ڈالے تھے کہ رحمت نے ایک پیالی پی کر دوسری ابھی مانگا۔ اوّل خان نے اُسے بتایا کہ اس علاقے کے چائے فروشوں کی بنائی ہوئی گڈ وڈ چائے پورے فرنٹیر میں مشہور ہے۔ جب وہ چائے خانے سے نکلے تو اوّل خان رحمت کو ایک اُونچے ٹیلے پر لے گیا اور اُسے وہ جگہ دکھائی جہاں محکمۂ آثارِ قدیمہ والے پرانے کھنڈرات میں کھدائی کر رہے تھے۔ اُس نے رحمت کو بتایا کہ اس جگہ سے بدھوں کے زمانے کے بہت سے بُت نکلے ہیں۔ اوّل خان نے یہ بھی بتایا کہ اسی علاقے سے سکندرِ اعظم ہندوستان کو فتح کرنے کے لیے گزرا تھا اور منڈا کے نزدیک قبائلیوں سے اُس کی جنگ بھی ہوئی تھی۔ بعد میں ان قبائلیوں کی بہادری کو دیکھتے ہوئے سکندرِ اعظم نے اُن کی بڑی تعداد کو اپنی فوج میں شامل کر لیا۔ رحمت بڑے غور سے کھنڈرات کو دیکھتا رہا اور پھر بڑے جذبے سے وارث شاہ کا یہ بند پڑھنے لگا

ایہہ جگ مقام فنا دا اے بھاریت دی کندھ ایہہ جیؤنا اے
چھاؤں بدلاں دی عمر بندیاں دی، عزرائیل نے پاڑ نہ سیؤنا اے
اج کل جہان ہے ہنج میلہ، کسے بت نہ حکم تے تھیؤنا اے
وارث شاہ میاں انت خاک ہونا، لکھ آب حیات جے پیؤنا اے

دن کے دو بجے بس خار پہنچ گئی۔ یہی قصبہ اوّل خان اور رحمت کا آخری پڑاؤ تھا، کیونکہ اس سے آگے سڑک کا راستہ نہیں تھا اور باقی کا سفر انہیں پیدل ہی کرنا تھا۔ اوّل خان رحمت کو لے کر بازار کی طرف چل پڑا۔ ابھی تھوڑی ہی دُور گئے تھے کہ دو قبائلی بندوق بردار جوان اُن سے آن ملے۔ یہ دونو اوّل خان کے بھائی آدم خان کے بیٹے تھے۔ جان زیب اور ہاشم جان۔ اوّل خان اُن سے بغل گیر ہوا۔ اُن دونو نے بڑے احترام سے رحمت کے ساتھ مصافحہ کیا اور اُسے پخیر راغلے کاکا کہا۔ اوّل خان نے اُسے بتایا کہ وہ اُسے خوش آمدید کہہ رہے ہیں۔ رحمت نے ہنس کر جواب دیا: "وہ تو میں کچھ رہا ہوں، مگر یہ مجھے اس عمر میں کاکا کیوں کہہ رہے ہیں؟ کیا انہیں میری آدھی کالی آدھی چِٹی داڑھی نظر نہیں آتی؟" اوّل خان نے اُس کا کندھا تھپتھپاتے ہوئے کہا: "پروا نہ کرو یار۔ ہم لوگ اپنے چچا تایا کو کاکا ہی کہتے ہیں۔ تمہیں یاد ہے نا یہ دونو ایک دفعہ حیدرآباد بھی ہمارے پاس آئے تھے۔" رحمت نے پھر ایک بار دونو بھائیوں کو سر سے پَیر تک دیکھا اور اثبات میں سر ہلاتے ہوئے کہا: ہاں کوئی پانچ سال پہلے کی بات ہے۔ مگر اُس وقت تو یہ توت کی ٹہنیوں جیسے نازک سے چھوہرے تھے، اور اب یہ قد کر کے گبھرو جوان بن گئے ہیں۔ پھر اس نے دونو جوانوں کے کاندھوں پر تھپکی دی اور دعائیں دیں۔ بڑا بھائی جان زیب اپنے چچا سے اجازت لے کر بازار کی طرف چلا گیا اور ہاشم جان اوّل خان سے اپنی چچی اور چچا زاد بھائی گل زرین کی خیر خیریت پوچھنے لگا۔ اوّل خان نے اُسے بتایا کہ اس کے بیٹے گل زرین نے میٹرک کا امتحان پاس کر لیا ہے اور آج کل ڈرائیونگ ماسٹروں کا کورس مکمل کر رہا ہے۔ اُمید ہے کہ اُسے اسی مل میں ملازمت مل جائے گی، جس میں خود اوّل خان سیکیورٹی گارڈ کا کام کرتا ہے۔

تھوڑی ہی دیر میں جان زیب اپنے ساتھ دو اور اسلحہ بردار قبائلیوں کو لے آیا۔ اوّل خان اُن سے بڑی گرم جوشی سے ملا اور رحمت سے اُن کا تعارف کراتے ہوئے بتایا کہ یہ ہمارے قبیلے کے بڑے بہادر جوان۔ پائندہ خان اور ڈبر خان ہیں، جنہیں آدم خان لالا نے خاص طور پر اپنے مہمانوں کو حفاظت سے لانے کے لیے بھیجا ہے۔ رحمت نے اُن سے بڑے تپاک سے ہاتھ ملایا۔ پھر اُن دونو محافظوں نے آپس میں پشتو میں کوئی بات کی اور پائندہ خان نے اپنی پیٹی میں اڑسا ہوا ایک ریوالور رحمت کی طرف بڑھایا اور دو بار کہا: "طمنچہ طمنچہ!" رحمت نے اوّل خان کی طرف سوالیہ انداز میں دیکھا تو اُس نے کہا: "رکھ لو بھائی، پستول ہے تمہاری جان کی حفاظت کے لیے۔" یہ سنتے ہی رحمت نے

بیچ بازار دونو ہاتھوں سے اپنے کان پکڑ لیے اور اونچی آواز میں بولا: "دہائی خدا دی - میں نے ساری حیاتی بے ہتھیار کے گزاری ہے - میں مرتے دم تک اسلحے کو ہاتھ نہیں لگاؤں گا - میں اپنی بے حیثیت زندگی کے بچاؤ میں کسی دوسرے انسان کی قیمتی جان کبھی نہیں لوں گا"۔ بازار میں لوگ ایک کھرے سانولے رنگ کے دُبلے پتلے اُدھیڑ عمر اجنبی کو یوں واویلا کرتے ہوئے دیکھ کر رحمت کے گرد جمع ہونے لگے تو اول خان نے عافیت اسی میں سمجھی کہ اپنے امن پسند دوست کو ہاتھ سے کھینچتا ہوا بازار کے آخری سرے تک لے جائے - پھر یہ قافلہ پہاڑوں میں پیدل سفر پر روانہ ہو گیا - اول خان اور رحمت کا مختصر سا سامان اول خان کے بھتیجوں نے اُٹھا لیا - وہ دونو آموزدہ کار قبائلی آگے آگے چل رہے تھے اور اونچی آواز میں بول رہے تھے - شاید رحمت کا رویّہ اُن کے لیے اُلجھن پیدا کر رہا تھا - اول خان اور رحمت اُن کے پیچھے چل رہے تھے اور دونو بھائی Rear Guard کے طور پر عقب میں آ رہے تھے - راستے میں کسی نے کوئی غیر ضروری بات نہیں کی - کبھی کبھی آگے چلنے والے دونو قبائلی کسی پہاڑی کی چوٹی پر چڑھ کر اِدھر اُدھر دیکھتے اور پھر نیچے پگڈنڈی پر آ کر اُسی چُست رفتار سے آگے آگے چلنے لگ جاتے - یوں لگتا تھا جیسے کوئی فوجی دستہ "رِیکی" کرتا ہوا دشمن کے علاقے سے گزر رہا ہے - ایک دفعہ جب وہ دونو قبائلی ایک اونچے ٹیلے سے اردگرد کے علاقے کا جائزہ لے رہے تھے تو اول خان اور رحمت بھی اُس اُونچے مقام پر چڑھ گئے - وہاں سے اول خان نے رحمت کو اپنا گاؤں پنج شہی دکھایا، جو قریب ہی معلوم ہوتا تھا - مگر جب رحمت نے ٹیلے سے گاؤں کے رُخ اُترنا چاہا تو ایک محافظ قبائلی نے اُسے بازو سے پکڑ لیا اور ٹیلے کے عقب سے اُترنے کا اشارہ کیا - نیچے پگڈنڈی پر آ کر رحمت نے اول خان سے پوچھا کہ ٹیلے سے گاؤں کی طرف اُترنے کا راستہ بھی تھا اور گاؤں بھی سامنے نظر آ رہا تھا تو پھر ٹیلے کے پیچھے سے گھوم کر گاؤں کی طرف جانے میں بھلا کیا مصلحت ہے؟ اول خان نے اُسے بتایا کہ ٹیلے سے اُتر کر سیدھے گاؤں کی طرف جانے کے لیے دشمن قبیلے ماتوں زئی کی زمینوں سے گزرنا پڑتا ہے، جو خطرے سے خالی نہیں ہے۔

پنج شہی کی مسافت کچھ زیادہ نہیں تھی اور پہاڑی راستہ ہونے کے باوجود یہ مختصر قافلہ دو گھنٹے کے سفر کے بعد گاؤں کی حدود میں داخل ہو گیا - پنج شہی اچھا خاصا قصبہ تھا - دونو قبائلی محافظ گاؤں کے قریب آتے ہی غائب ہو گئے - اول خان نے رحمت کو بتایا کہ وہ گھر والوں کو مہمانوں کے آنے کی خبر کرنے گئے ہیں - خود مہمانوں کو حجرے میں لے جایا گیا، جو گاؤں سے باہر ایک کشادہ پتھروں کی بنی ہوئی عمارت تھی - اول خان کا بڑا بھائی آدم خان اُن کے انتظار میں بڑے دروازے کے پاس ایک بڑی مضبوط چارپائی پر بیٹھا تھا - اُس نے انہیں دیکھتے ہی پہلے رحمت سے معانقہ کیا اور پھر اپنے بھائی سے گلے ملا - جب اُس نے رحمت سے صاف ستھری اُردو میں اُس کا حال احوال پوچھا تو رحمت کو بڑی حیرت ہوئی، مگر آدم خان نے بتایا کہ وہ نیوی میں جمعدار کے رینک سے ریٹائر ہوا ہے اور سروس کے دوران اُس نے اردو اور رومن کورس پاس کیے تھے - پھر لوگ آنے شروع ہو گئے اور اِدھر اُدھر سے چارپائیاں گھسیٹ کر حلقہ سا بنا لیا گیا - جب ہر آنے والے گروہ نے بیٹھتے ہی دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے تو رحمت کو یاد آ گیا کہ وہ بھی تو اول خان کے ساتھ اس کی والدہ کی تعزیت ہی کے لیے آیا ہے، مگر گزشتہ دو دن کے سفر میں اول خان نے ایک بار بھی اپنی ماں کی بات نہیں کی تھی - اُس نے موقعہ پا کر آدم خان سے افسوس کا اظہار کیا، جس کے جواب میں اس نے صرف اتنا کہا: اللہ کی مرضی - اتنے میں اول خان اور آدم خان کا چچا زاد بھائی بازور خان، اُس کا جوان بیٹا دلاور خان اور بہت سے ہتھیار بند قبائلی مہمان آ گئے - سب نے پہلے رحمت اور اول خان سے اور پھر باقی لوگوں سے باری باری ہاتھ ملائے - اس کے بعد جہاں انہیں جگہ ملی وہیں بیٹھ گئے - آخر میں اجتماعی دعا ہوئی - دعا کے بعد سبھی ایک ساتھ بولنے لگے - یوں معلوم ہوتا تھا کہ کوئی بہت اہم معاملہ ہے، جس پر بڑی عمر کے لوگ پریشان تھے اور جوانوں میں جوش پایا جاتا تھا - رحمت نے اُس وقت تو پوچھنا مناسب نہ سمجھا، لیکن جب باہر کے لوگ چلے گئے اور اول خان، آدم خان، اُس کے دونو بیٹے اور بازور خان حجرے کے ایک کمرے میں بیٹھ کر قہوہ پینے لگے تو اُس نے مسئلے کی نوعیت دریافت کی - آدم خان نے اُسے بتایا: "ہمارے قبیلے کا کئی نسلوں کا پرانا جھگڑا اب پھر تازہ ہو گیا ہے - ہمارے بزرگوں کے زمانے میں باجوڑ کے علاقے کی چراگاہیں

کھلی ہوتی تھیں۔ سارے قبائل ان مشترکہ چراگاہوں میں اپنے مویشی چراتے تھے۔ پھر جب مویشی زیادہ ہوگئے اور چراگاہیں کم پڑ گئیں تو جھگڑے شروع ہوگئے۔ ہمارے قبائل تند خو تھے، اس لیے بجائے زمینیں بانٹنے کے انہوں نے اپنے اپنے لشکر تیار کئے اور مخالف قبائل پر حملہ کر کے زمینوں پر قبضہ کرنا شروع کر دیا۔ یوں قبائل کے درمیان دشمنیوں اور جنگ جدال کا سلسلہ شروع ہوگیا۔ یہ قتل و غارت اب نسل در نسل چل رہی ہے اور ہر قبیلہ دوسرے قبیلے سے بدلہ لینے کے لیے اپنی اگلی نسل کو اسی خونی روایت پر چلا رہا ہے۔ ہمارے اور ماموں زئی قبیلے کے درمیان بھی سات پشتوں سے خون خرابہ ہو رہا ہے۔ میری والدہ کی وفات پر پرانی دشمنی کے باوجود ماموں زئی قبیلے کا ملک شاہ سوار خان افسوس کرنے میرے حجرے میں آیا تو میں نے شکر کیا کہ اکا دکا جوان اس دشمنی کی آگ میں جلا کر راکھ کرنے کے بعد ہماری اگلی نسل بدلے کی بھٹی میں خاک سیاہ ہونے سے بچ جائے گی۔ مگر ہمارے ہی قبیلے کے کچھ نااندیش جوانوں نے جوش میں آکر واپس جاتے ہوئے ملک شاہ سوار خان اور اس کے ساتھیوں کو راستے میں گھیر لیا۔ پورے آٹھ گھنٹے تک دونو طرف سے مورچہ بندی رہی اور فائرنگ سے اُن کے دو جوان زخمی ہوئے اور ہمارا بھی ایک جوان زخمی ہوا۔ بعد میں معلوم ہوا کہ اُن کے دو زخمیوں میں سے ایک مر گیا ہے۔"

"اب کیا صورتِ حال ہے لالہ؟" اوّل خان نے اپنے بڑے بھائی سے پوچھا۔

"خدا کا شکر ہے کہ ہمارے علاقے میں حاجی صالح بابا جیسے بزرگ موجود ہیں" آدم خان نے بتایا۔ "میں نے حاجی صاحب کی خدمت میں آدمی بھیجا اور اُن کو مدد کے لیے پکارا۔ وہ خود اس عمر میں گھوڑے پر سوار ہو کر رات کے وقت اس بربیابان میں آئے اور قرآن شریف ہاتھ میں لے کر فساد کرنے والوں کو خدا کے غضب سے ڈرایا۔ پھر اپنے ہاتھوں سے انہوں نے دونو فریقوں کے درمیان ایک اونچی جگہ پر تیگہ رکھ کر عارضی جنگ بندی کا اعلان کیا۔ وہ رات اُنہوں نے اِس حجرے میں گزاری اور ہمیں وعظ نصیحت کرتے رہے۔ صبح رخصت ہوتے ہوتے انہوں نے مجھ سے کہا کہ والدہ کی وفات کے بعد پہلی جمعرات کو میں اُن کے حکم سے جرگہ بلاؤں۔ یہ پچھلے پیر کی بات ہے۔"

"تو پھر پرسوں جرگہ بیٹھے گا؟" اوّل خان نے پوچھا "سب کو اطلاع کر دی ہے؟"

"ہاں" آدم خان نے جواب دیا۔

"یہ تیگہ کیا ہوتا ہے بھائی آدم خان؟" رحمت نے پوچھا۔

"تم ایسے نہیں سمجھو گے۔ میں تمہیں کل صبح خود لے جا کر تیگہ دکھاؤں گا، رحمت خان۔"

"میں کوئی خان نہیں ہوں بھائی، میں تو معمولی موچی ہوں — لوگوں کی جوتیاں گانٹھنے والا رحمت موچی" رحمت نے آدم خان کو ٹوکا۔

"اسے موچی کہلانے کا بڑا شوق ہے لالہ۔ ہر ایک کے سامنے اپنے آپ کو موچی کہتا رہتا ہے" اوّل خان نے بھی اپنے دل کی بھڑاس نکالی۔

"تو کیا یہاں آکر خان بن جاؤں؟" رحمت نے جواب دیا "موچی کے گھر پیدا ہوا ہوں۔ میرے باپ دادا موچی کا کام کرتے تھے۔ میں خود جوتے گانٹھتا ہوں۔ اپنے اصلے کو کیسے بھول جاؤں؟"

"مگر بھائی رحمت، موچی کوئی ذات تو نہیں ہے۔ یہ تو ایک پیشہ ہے، جیسے کاشتکاری، دکانداری" آدم خان نے بڑی حلیمی سے سمجھایا۔

"یہ اِن لوگوں کو سمجھاؤ نا بھائی آدم خان، جو اسے شرم کی بات سمجھتے ہیں۔ میں تو اسے بُرا نہیں سمجھتا" رحمت نے نرمی سے جواب دیا۔

"اور میں تجھے چھوٹا سمجھتا ہوں رحمت؟ میں تو تمہیں اپنے سے بڑا، بہت بڑا سمجھتا ہوں، میرے یار" اوّل خان جذبے سے

مغلوب ہو کر بولا۔

آدم خان نے رحمت سے پوچھا: "اچھا یہ بتاؤ، تم دونو کی دوستی کیسے ہوئی؟"

رحمت نے بتایا: "بھائی آدم خان، میں پنجاب میں دریائے چناب کے کنارے ایک گاؤں ٹھٹھہ نصر اللہ کا رہنے والا ہوں۔ آج سے کوئی تیس برس پہلے کی بات ہے۔ میری نئی نئی شادی ہوئی تھی۔ میں اپنی بیوی کے ساتھ ایک جھونپڑی میں دریا کے ساحل پر رہا کرتا تھا۔ میرے ماں باپ اپنے پرانے گھر میں گاؤں کے اندر رہتے تھے، جو ہم سے کچھ فاصلے پر تھا۔ شادی کے ایک سال بعد اللہ نے ہمیں ایک پھول سی بچی دی۔ بچی کی ماں کو اللہ نے بڑی اچھی شکل دی تھی، اس لیے بچی بھی خوبصورت تھی۔ پہلے تو میں اپنی جھونپڑی کے باہر ہی ایک اڈہ بنا کر گاؤں والوں کی جوتیاں مرمت کیا کرتا، مگر پھر ہمارے گاؤں سے تین میل دُور وزیر آباد شہر کا ایک بیوپاری مجھے اپنے ساتھ لے گیا اور میں اس کے کارخانے میں جوتے بنانے لگا۔ میں دن بھر کارخانے میں کام کرتا اور شام ہونے سے پہلے گھر آجاتا۔ پھر کرنا خدا کا کیا ہوا کہ ہمارے علاقے میں نوح کا طوفان آگیا۔ اتنی بارش ہوئی، اتنی بارش ہوئی کہ ہر طرف سیلاب آگیا۔ اُنہی چھاجوں برستی بارش میں ایک رات مجھے کارخانے کے شیڈ ہی میں رُکنا پڑا۔ جب صبح بارش کچھ رُکی تو میں پانی پھلانگتا اپنے گھر کی طرف بھاگا۔ وہاں جا کر دیکھا تو میری جھونپڑی کا کہیں نشان تک نہیں تھا اور جہاں کبھی گاؤں ہوا کرتا تھا، اُس جگہ دریا ٹھاٹھیں مار رہا تھا۔ میں غم سے دیوانہ ہو گیا۔ کئی مہینوں تک دریا کے کنارے کنارے اسی دیوانگی میں گھومتا رہا۔ آخر دریا کے پار آبادکاری کے ایک دفتر میں اپنے گاؤں کے کچھ لوگوں سے پتہ چلا کہ اُس طوفانی رات کو میرا باپ جب میری بیوی اور بچی کو لینے جھونپڑی میں آیا تو اُس نیک بخت نے اُس کے ساتھ جانے سے انکار کر دیا۔ اسی کھینچا تانی میں اتنا وقت گزر گیا کہ پانی نے میرے باپ، میری بیوی اور بچی کو چاروں طرف سے گھیر لیا اور وہ سب وہیں ڈوب گئے۔ اُدھر گاؤں میں میرے دونو چھوٹے بھائی اور ماں بھی اپنے ہی مکان کے ملبے کے نیچے دب کر مر گئے۔ جب مجھے پتہ چلا کہ میرا سارا خاندان ہی دریا بُرد ہو گیا ہے تو میرا دل زندگی سے اُچاٹ ہو گیا اور میں گاؤں گاؤں شہر شہر گھومتا رہا۔ جہاں جوگ لگتی کچھ کام کر لیتا اور کھا کما لیتا۔ اس طرح میں پورے چھ سال میں سندھ کے شہر حیدر آباد جا پہنچا۔ وہاں سندھ دریا کے کنارے ایک جھگی ڈال لی اور بیڑی کے مسافروں کی جوتیاں مرمت کرنے لگا۔ ایک شام اپنی جھگی کے باہر بیٹھا ٹھہرے ہوئے دریا کے شیشے میں پانی کے اندر اُترتے ہوئے سورج کا جمال دیکھ رہا تھا کہ ایک ایسی درد بھری آواز کانوں میں پڑی، جس سے میرا سینہ پھٹ گیا اور میں اپنے اندر کے دُکھ سے بے حال ہو کر دھاڑیں مار مار کے رونے لگا۔ مجھ سے کچھ فاصلے پر دریا کے بند پر بیٹھا اوّل خان لمبی ہیک میں کوئی جدائی کا نغمہ گا رہا تھا اور مجھے یوں لگ رہا تھا جیسے کوئی ڈار سے بچھڑی کونج کُرلا رہی ہے۔ اس کے گانے کے بول میری سمجھ سے باہر تھے لیکن اس کی آواز کا سوز میرے دل میں بَرما پھیر رہا تھا۔ مجھے یوں بے اختیار ہو کر روتے دیکھا تو یہ چُپ ہو گیا اور میرے پاس آ بیٹھا۔ اپنے اپنے ٹھکانوں سے دُور دو پردیسی، اپنے پیاروں سے بچھڑے ہوئے دو تنہا انسان، ان دونو کو تو قریب آنا ہی تھا۔ ان کو تو دوست بننا ہی تھا، خواہ ایک خان ہو اور دوسرا موچی۔" یہ کہہ کر رحمت خاموش ہو گیا۔

اُسی وقت آدم خان کے دونو بیٹے، جو نہ جانے کس وقت بڑوں کی مجلس سے چُپ چاپ اُٹھ کر چلے گئے تھے، بڑے بڑے طشت اُٹھائے کھانا لے کر آگئے اور سب نے نیچے فرش پر بیٹھ کر کھانا کھانا شروع کر دیا۔ رحمت نے آدم خان کے بیٹوں سے کہا: آجاؤ بھتیجو! کھانا بہت ہے، تم بھی ہمارے ساتھ کھا لو۔ مگر آدم خان نے اُسے سمجھایا کہ یہ قبائل کے دستور کے خلاف ہے۔ میزبان کے گھر کے مرد مہمان کو کھانا کھلاتے ہیں، اُس کے ساتھ بیٹھ کر کھاتے نہیں۔ البتہ اُس جیسے بڑے بوڑھے ساتھ بیٹھ جاتے ہیں، لیکن میزبان کے جوان بیٹے کبھی برابر بیٹھ کر کھانا نہیں کھا سکتے۔

رات کو رحمت سے رخصت ہوتے ہوئے آدم خان نے اُسے بتایا کہ رات جس کمرے میں وہ سوئے گا، اُس کے باہر دالان میں جان زیب کی چارپائی بچھی ہے۔ اگر کوئی ضرورت ہو تو وہ اُسے آواز دے کر جگا لے۔ رحمت نے کہا: "میں رات کو گہری نیند سوتا ہوں، آپ کیوں بچے کو تکلیف میں ڈالتے ہیں۔" آدم خان نے جواب دیا: "ہم لوگوں کے جوان غیر شادی شدہ بیٹے گھر میں نہیں سوتے، ان کا ٹھکانہ حجرہ ہی ہوتا ہے۔

اچھا ہے آپ اکیلے بھی نہیں ہوں گے اور حفاظت بھی رہے گی۔ آخر دشمن داری کا معاملہ ہے۔" اس پر رحمت نے چوٹ کی: "اوّل خان تو کہہ رہا تھا کہ پٹھان مہمان کو گولی کا نشانہ نہیں بناتے۔" آدم خان نے جواب دیا: "ہماری پختو تو یہی ہے، مگر ہمارا یہی ضابطۂ اخلاق ہمیں یہ بھی سکھاتا ہے کہ اپنی جان سے زیادہ مہمان کی حفاظت کرو۔ اچھا اب آپ کو خدا کی امان میں چھوڑتا ہوں۔"

فجر کی نماز رحمت نے جان زیب اور ہاشم جان کے ساتھ گاؤں کی مسجد میں پڑھی۔ وہیں آدم خان اور اوّل خان بھی مل گئے۔ نماز کے بعد تمام نمازیوں نے رحمت کے ساتھ ہاتھ ملائے اور اُسے خوش آمدید کہا۔ مسجد سے باہر نکلے تو اوّل خان نے رحمت کو چھیڑتے ہوئے کہا کہ وہ بھی لوگوں کی خیر سگالی کے جذبات کا جواب پشتو میں دیا کرے۔ اس پر رحمت نے آدم خان کو بتایا کہ وہ ستڑے ماشے (شالا تم کبھی نہ تھکو) کے جواب میں خوار ماشے (شالا تم کبھی خوار نہ ہو) اور پہ مخہ دے خہ (شالا تمہارے آگے اچھائی آئے) کے جواب میں خدائے دے اوبخہ (خدا تمہاری بخشش کرے) کہہ سکتا ہے۔ اس پر سب ہنسنے لگے۔

حجرے میں آکر آدم خان کے بیٹے تو ناشتہ لینے گھر چلے گئے اور اوّل خان نے دو چارپائیاں گھسیٹ کر آمنے سامنے دالان میں بچھا دیں۔ ایک چارپائی پر آدم خان بیٹھ گیا اور دوسری پر اوّل خان اور رحمت بیٹھ گئے۔ آدم خان کو رات کا قصہ یاد آگیا اور اس نے اپنے بھائی کو چھیڑتے ہوئے کہا: "اوّل خانا، تم حیدرآباد جاکر اتنے دلگیر ہوگئے تھے کہ سین (دریا) پر جاکر سندرے (گانے) گاتے تھے اور اس عاجز کو رُلاتے تھے؟" اوّل خان نے جواب دیا: "لالہ وہ کوئی اور سین نہیں، ہمارا اپنا اباسین ہے، جسے سندھ کے لوگ دریائے سندھ کہتے ہیں۔ اپنا دریا پنج کوڑہ پہلے چکدرے کے پاس دریائے سوات سے مل جاتا ہے اور پھر دریائے کابل میں مل کر اباسین میں جا ملتا ہے۔ اس طرح میں اپنے دریا پنج کوڑہ کے پانی کے کنارے جا بیٹھتا تھا۔" آدم خان نے مسکرا کر کہا: "ہاں ایسی جگہ تو وطن بہت یاد آتا ہے۔" اوّل خان نے دھیمے لہجے میں کہا: "لالہ پردیس میں انسان جب اکیلا ہوتا ہے تو اگر اُسے سڑک کے کنارے پتھر بھی پڑا مل جائے تو اسے اپنے گاؤں کے قریب سے گزرنے والے پہاڑی نالے رود کے پتھر یاد آجاتے ہیں۔ میں سارا دن اپنے کوارٹر میں اکیلا پڑا رہتا تھا، میری رات کی چوکیداری کی ڈیوٹی ہوتی تھی۔ جب دل اُداس ہوتا تو اباسین کے کنارے جا بیٹھتا۔ میں اپنے ملک سے گزر کر آنے والے اس دریا کو اپنا آشنا سمجھتا تھا اور اُسے وہ گانے سناتا تھا، جو وہ اٹک سے گزرتے ہوئے سنتا ہے۔" آدم خان نے اُس سے پوچھا کہ وہ کون سا سندرہ گایا کرتا تھا۔ اوّل خان نے جواب دیا: "اور تو مجھے یاد نہیں۔ اُن دنوں میں خوشحال خان بابا کا ایک شعر بار بار پڑھتا تھا، جو اُس نے ہندوستان کے قلعہ رنتھمبور میں قید کی حالت میں وطن سے دوری کے دُکھ سے بے قرار ہوکر لکھا تھا

پختنے جونے ذلفے باد تہ نیسی   چہ شمالئے بوئیں راوڑی اے رنتھمبور تہ

(ترجمہ: پختون دوشیزاؤ! اپنی (مشک بار) زلفیں ہوا میں کھول دو، تاکہ بادِ شمال اُن کی خوشبو قلعہ رنتھمبور تک لے آئے)۔

آدم خان: "کتنا دکھ بھرا ہے اس کلام میں۔"

اوّل خان: "میں بھی اُن دنوں بہت دکھی تھا۔ وطن چھوڑے مجھے صرف ایک سال ہوا تھا۔ دشمنوں نے یہاں ہمارے لئے جینا عذاب کیا ہوا تھا۔ آدم خان لالہ تو درگئی میں اپنی ڈیوٹی پر تھا اور والدہ بھی وہیں اس کے پاس تھیں۔ یہاں میں اپنے چچازاد بھائی بازور خان کے ساتھ رہتا تھا۔ دشمنوں نے جب ہمارے چچا کو بھی ہلاک کر دیا تو میں بھی یہاں سے نکل گیا، اور پھر جب سات سال بعد حالات درست ہوئے تو میں گھر واپس آیا۔ والدہ نے میری واپسی پر سب سے پہلا کام یہ کیا کہ میری شادی کر دی۔ اتنے برسوں کے خون خرابے کے بعد، جس میں کئی قیمتی جانیں ضائع ہوئیں، علاقے کے معتبر، مشر اور ملک مل کر بیٹھے اور دونو طرف سے ہلاک ہونے والوں کا حساب ہوا تو عارضی صلح کی صورت پیدا ہوئی اور تیگہ رکھا گیا۔ یہ تیگہ خدا خبر کتنی بار رکھا گیا ہے اور اُٹھایا گیا ہے۔"

رحمت نے بے چین ہو کر پوچھا: "میں نے کل بھی آپ سے تیگہ کے بارے میں پوچھا تھا تو آپ نے صرف یہی کہا کہ تم کو لے جا کر دکھائیں گے۔ آج مجھے دکھائیں نا۔"

آدم خان نے رحمت کا ہاتھ تھام کر کہا: "تھوڑا صبر کرو میرے بھائی! ابھی ناشتہ کر لیں، پھر چلتے ہیں۔"

اتنے میں دونو بھائی ناشتہ لے آئے اور تینوں بڑے ناشتہ کرنے لگے۔ ناشتہ ختم ہوتے ہی آدم خان نے کہا: "چلو آؤ رحمت بھائی کو تیگا دکھا لائیں، اس سے پہلے کہ کوئی مہمان آ جائے۔"

جب وہ گاؤں سے قبیلے کی جانب دو فرلانگ کے قریب گئے تو آدم خان ایک چھوٹی سی پہاڑی کے دامن میں جا کھڑا ہوا۔ اس کے پاؤں کے پاس ایک بڑا سا سیاہ رنگ کا تکونا پتھر تھا۔ آدم خان نے اسے ہاتھ سے چھُوا اور رحمت کو بتایا: "یہ ہے تیگہ۔ دیکھنے میں تو یہ پتھر کا ایک ٹکڑا ہے، لیکن قدر و قیمت میں یہ سونے سے بھاری ہے۔ جب دو قبائل کے درمیان کسی بات پر جھگڑا ہو جائے اور جنگ کی نوبت آ جائے تو آس پاس کے علاقے کے ملک، خوانین، پیرزادے اور سفید ریش ان دونو برسرِ پیکار فریقین کے مابین آ کر کچھ عرصے کے لیے عارضی ٹرز بندی کرا دیتے ہیں اور اس کا اعلان یوں کیا جاتا ہے کہ پرانے رواج کے مطابق اُن دونو قبائل کے علاقوں کے درمیان ایک جگہ پر ایسا وزنی پتھر رکھ دیا جاتا ہے۔ پھر جب تک ان میں سے کوئی فریق اس پتھر کو اپنی جگہ سے اٹھا کر پھینک نہ دے، عارضی صلح برقرار رہتی ہے۔ اسی عرصے میں قبائل کا جرگہ دائمی صلح کے لیے کوشش کرتا رہتا ہے۔ اگر ایک فریق کی ضد کی وجہ سے جرگے کے فیصلے پر عمل درآمد نہ ہو سکے تو لڑائی دوبارہ شروع ہو جاتی ہے۔ لیکن عام طور پر اس خوف سے کہ اگر جرگے کا فیصلہ نہ مانا گیا تو تمام قبائل کی دشمنی مول لینی پڑے گی، کوئی بھی جرگے کے عارضی صلح کے فیصلے یا جھگڑا ختم کرنے کے لیے آخری فیصلے کے خلاف جانے کی جرأت نہیں کرتا۔"

رحمت یہ ساری بات بڑے غور سے سنتا رہا اور جب آدم خان اپنی بات کہہ چکا تو اس نے اپنی تشویش ظاہر کی: "آدم خان بھائی، اگر کوئی شرپسند اس پتھر کو خفیہ طریقے سے اُٹھائے جائے، پھر تو لڑائی دوبارہ شروع ہو سکتی ہے؟"

آدم خان نے کہا: "ہاں ہو تو سکتی ہے، لیکن ہمارے قبائل اپنے دستور کا بہت احترام کرتے ہیں اور کوئی بھی یہ حرکت کر کے تمام قبائل کے غیض و غضب کو دعوت نہیں دے گا۔ جب کسی وجہ سے کوئی فیصلہ نہیں ہو سکتا تو تیگہ چوری چوری نہیں، سب کے سامنے اُٹھایا جاتا ہے۔"

رحمت پھر بھی مطمئن نہیں ہوا اور کہنے لگا: "بہر حال ایسا واقعہ ہو تو سکتا ہے۔ اس لئے اس تیگے کی سخت حفاظت کرنی چاہیئے۔"

اول خان نے کہا: "یہ گاؤں سے اتنا قریب ہے کہ اسے کوئی خطرہ نہیں۔"

رحمت اُس وقت تو خاموش رہا، لیکن واپس آ کر اُس نے دن میں کئی بار اوّل خان سے اپنی اس پریشانی کا ذکر کیا کہ تیگا یوں بے حفاظت نہیں پڑا رہنا چاہیئے، اور دو بار وہ جان زیب اور ہاشم جان کو باری باری اپنے ساتھ لے کر تیگا دیکھنے گیا۔

رحمت وہ سارا دن بُجھا بُجھا رہا، جیسے کسی گہری سوچ میں ڈوبا ہوا ہو۔ رات کا کھانا کھا کر وہ جلد سو گیا، مگر جب دونو بڑے بھائی گھر چلے گئے تو وہ آہستہ سے اُٹھا اور کمرے سے باہر آ گیا۔ دالان میں جان زیب سویا ہوا تھا۔ آہٹ سے وہ جاگ اُٹھا اور رحمت کو دیکھ کر اپنی ٹوٹی پھوٹی اُردو میں پوچھنے لگا: "کاکا کدھر؟" رحمت نے پیٹ پر ہاتھ رکھ کر سمجھایا کہ اُسے باہر جانے کی حاجت ہو رہی ہے، اور تیزی سے حجرے کا بڑا دروازہ کھول کر گاؤں سے قبیلے کی جانب روانہ ہو گیا۔ جان زیب بھی اُس سے کچھ فاصلے پر اپنی رائفل اُٹھائے چلتا رہا۔ تھوڑی ہی دور جا کر ستاروں کی روشنی میں رحمت کو دو آدمی نظر آئے، جو تیگے کے پاس کھڑے تھے۔ جب اُنہوں نے رحمت کو دیکھا تو وہ تیگے پر ایک چادر ڈالنے لگے اور پھر اُسے اُٹھانے کے لیے جھکے۔ رحمت نے شور مچا دیا: "او خدا کے بندو! یہ ظلم نہ کرو۔ خدا کی مخلوق کا قتلِ عام نہ کرو۔ تمہیں اللہ کا

واسطہ، یہ اس کا نشان نہ چھوڑو۔" اتنے میں جان زیب بھی قریب آگیا اور اس نے فائر کھول دیا۔ پتھر کے قریب کھڑا آدمی زخمی ہو کر گر پڑا، لیکن اس کے ساتھی نے فرار ہونے سے پہلے رحمت کو اپنی گولی کا نشانہ بنایا اور وہ جہاں کھڑا تھا وہیں گر گیا۔

گاؤں کے لوگ گولیوں کی آواز سن کر جائے واردات پر پہنچ گئے۔ کچھ نوجوانوں نے زخمی دشمن کو ہلاک کر دینے کا ارادہ ظاہر کیا، لیکن رحمت نے اُن کے سامنے ہاتھ جوڑ کر اُس کی جان کی بھیک مانگی اور پھر آدم خان سے وعدہ لیا کہ وہ اس نوجوان کی جان کی حفاظت کرے گا۔ وہ نوجوان بے ہوش تھا، مگر گولیاں اُسے صرف ٹانگوں میں لگی تھیں۔ دونوں زخمیوں کو چارپائی پر ڈال کر حجرے میں لایا گیا۔ رحمت کو گولی پیٹ میں لگی تھی اور اُس کی حالت اچھی نہیں تھی، البتہ وہ ہوش میں تھا۔ اس نے آدم خان کو تاکید کی کہ جلد سے جلد مامون زئی سردار ملک شاہ سوار خان کو بلوایا جائے، کیونکہ مرنے سے پہلے وہ اس سے ایک معاہدہ کرنا چاہتا ہے۔

رحمت نے رات بے چینی میں گزاری۔ وہ ساری رات جاگتا رہا۔ اُس نے ضد کر کے زخمی نوجوان کی چارپائی بھی اپنے کمرے میں ڈلوائی اور خود اُس کی ابتدائی طبی امداد کی نگرانی کرتا رہا۔ صبح سویرے جرگے کے لیے علاقے کے ملک، مَشر اور رہنما آنے شروع ہو گئے۔ جب رحمت کو پتہ چلا کہ حاجی صاحب بابا اور ملک شاہ سوار خان آگئے ہیں تو اس نے اوّل خان سے، جو ساری رات اُس کے سرہانے بیٹھا رہا تھا، کہا کہ وہ اُن دونوں بزرگوں اور بھائی آدم خان کو اس کے پاس لے کر آئے۔ گاؤں کے باہر پرانے چیڑ کے درختوں کے نیچے لوگ جرگہ شروع ہونے کے انتظار میں بیٹھے تھے۔ اوّل خان وہاں گیا اور حاجی صاحب سے اپنے زخمی دوست کی خواہش بیان کی۔ انہوں نے ملک شاہ سوار خان کو بھی ساتھ چلنے پر آمادہ کر لیا۔ بازور خان اور آدم خان بھی جب ان بزرگوں کے ساتھ گاؤں کی طرف روانہ ہوئے تو کچھ جوشیلے مامون زئی جوانوں نے اپنے سردار کی حفاظت کے لیے اُس کے ہمراہ جانے کا ارادہ ظاہر کیا، مگر حاجی صاحب نے اپنا ہاتھ کھڑا کر کے سب کو روک دیا اور کہا: "شاہ سوار خان کی جان کی حفاظت میرا اللہ کرے گا اور میں کروں گا۔ ہم ایک پختون کے گھر ایک شریف مہمان کی عیادت کے لیے جا رہے ہیں، کوئی جھگڑا کرنے نہیں جا رہے۔ جھگڑے کا فیصلہ آپ کے سامنے ہوگا۔ آپ سب اپنی اپنی جگہ پر بیٹھ جائیں۔" سب لوگ جہاں کھڑے تھے وہیں بیٹھ گئے۔ جب کسی کو رہبر مان لیا تو اس کا ہر حکم ماننا فرض ہو گیا۔ یہ سبق ہر قبائلی بچے کو ماں کے دودھ کے ساتھ ملتا ہے۔ یہی پختو ہے۔ یہی وہ ضابطہ ہے جس سے اُن کی آزاد اور تند و تیز طبیعت پہاڑی ندی کی طرح پتھریلے کناروں کی حد میں رہتی ہے۔

جب یہ بزرگ رحمت کے کمرے میں داخل ہوئے تو اُس نے باری باری ملک شاہ سوار خان اور حاجی صاحب کو ماتھے پر ہاتھ رکھ کر سلام کیا اور اُٹھنے کی کوشش کی، مگر حاجی صاحب نے اُس کا ہاتھ تھام کر اُسے لٹا دیا اور بڑی شفقت سے اُس کے سر پر ہاتھ پھیرتے ہوئے کہا: "میرے عزیز! تم نے اپنی جان کی پروا نہ کرتے ہوئے جس بہادری سے ہماری روایت کی پاسداری کی ہے، اُس کے لیے دونوں قبائل تمہارے مشکور ہیں۔" رحمت نے مسکرا کر پوچھا: "حاجی صاحب، آپ میرے اس کام پر خوش ہیں؟" حاجی صاحب نے کہا: "ہم سب آپ کے اس کارنامے پر بہت خوش ہیں۔" رحمت نے پھر پوچھا: "تو پھر مجھے آپ انعام نہیں دیں گے؟" حاجی صاحب نے جواب دیا: "کیوں نہیں۔ تم بتاؤ میرے عزیز، تمہیں کیا انعام چاہیے؟" رحمت نے کہا: "ان دونوں قبیلوں کے درمیان ہمیشہ کے لیے صلح کرا دیں۔" حاجی صاحب نے کہا: "میں اسی کام کے لیے تو یہاں آیا ہوں۔ تم میری مدد کرو۔ اللہ تعالیٰ دلوں کے غبار دھو ڈالنے پر قادر ہے۔"

اب رحمت نے ملک شاہ سوار کی طرف ہاتھ پھیلا کر کہا: "ملک صاحب، آپ کا بدلہ تو پورا ہو گیا۔ اس دفعہ اُتمان خیل قبیلے کا ایک آدمی مارا گیا۔" ملک شاہ سوار خان نے حیران ہو کر پوچھا: "اُتمان خیلوں کا آدمی؟" رحمت نے مسکرا کر جواب دیا: "ملک صاحب میں اوّل خان کا مہمان ہوں اور وہ مجھے اپنے بھائی کی طرح جانتا ہے۔ میں اب بچ نہیں سکتا، لیکن میں مامون زئی قبیلے کو اپنا خون معاف کرتا ہوں۔ حاجی صاحب، آپ میرے گواہ ہیں۔ میں نے اپنا خون معاف کیا، لیکن خون بہا لوں گا۔" ملک شاہ سوار بولا: "جب خون بہا لینا ہے

تو خون معاف کیسے ہوا؟" رحمت نے جواب دیا: "میرا خون بہا روپے پیسے کی صورت میں نہیں۔ آپ، ملک صاحب، اور آپ بھائی آدم خان میرے سر پر ہاتھ رکھ کر قسم کھائیں کہ میرے بعد ان دونوں قبیلوں میں کبھی خون خرابہ نہیں ہوگا اور دائمی صلح رہے گی۔"

آدم خان نے کہا: "بھائی رحمت خدا تمہیں شفا دے گا۔ ڈاکٹر بھی تھوڑی دیر میں آنے ہی والا ہوگا۔" رحمت نے بے چین ہو کر جواب دیا: "اتنی اچھی موت مجھ سے نہ چھینو میرے بھائی! قسم کھاؤ اور پھر میرے لیے دعا کرو۔" آدم خان نے اُس کی حالت دیکھتے ہوئے اُس کے سر پر ہاتھ رکھ دیا۔ پھر ملک شاہ سوار خان نے بھی اپنا ہاتھ آدم خان کے ہاتھ پر رکھ دیا۔ رحمت نے آنکھیں بند کر لیں۔ حاجی صاحب نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے۔ سب نے دعا کے لیے ہاتھ اُٹھائے ہوئے تھے کہ رحمت نے دم دے دیا۔

جب دسویں دن اوّل خان اپنے گھر حیدر آباد واپس آیا تو رات پڑ چکی تھی، مگر اُس کے کوارٹر میں بالکل اندھیرا تھا۔ اُس کی دستک پر جب اُس کے بیٹے گل زریں نے دروازہ کھولا تو اُس نے اُسے گلے لگاتے ہوئے ہاتھ کا سامان اس کے حوالے کیا اور پوچھا: "گھر میں اندھیرا کیوں کیا ہوا ہے؟" گل زریں نے کہا: "امی کہتی تھی مجھے روشنی اچھی نہیں لگتی، ابھی لائٹ نہ جلاؤ۔" اوّل خان نے برآمدے کا بلب جلاتے ہوئے کہا: "کم عقل کو معلوم نہیں کہ روشنی ہی سے زندگی ہے۔" اور وہیں پڑی ہوئی ایک چارپائی پر بیٹھ گیا۔ اوّل خان کی بیوی نے باہر آ کر کہا: "صرف بجلی کی بتیاں جلا لینے سے روشنی نہیں ہو جاتی اوّل خان۔ جو زندگی کی روشنیاں بجھ گئی ہیں، وہ تو پھر روشن نہیں ہو سکتیں۔" اوّل خان نے شیر بینے کی طرف نظر بھر کر دیکھا اور کہا: "ایک دیئے میں تو تیل ہی اتنا تھا۔ بجھ گیا۔ لیکن دوسرا چراغ بجھا نہیں، وہ اس وقت پورے باجوڑ کو روشن کر رہا ہے۔"

گل زریں اپنے باپ کے پاس پائینتی کی طرف بیٹھ گیا اور بولا: "بابا تم نے مالاکنڈ سے ٹیلیفون پر جب بات کی تو لائن پر بڑا شور تھا۔ تم نے کہا تھا رحمت چاچا گولی لگنے سے مرا ہے۔ کیا وہ بھی اُتمان خیلوں کی طرف سے دشمنوں کے ساتھ جنگ کر رہا تھا؟" اوّل خان نے بتایا: "رحمت بھلا کب کسی سے جنگ کرتا تھا۔ وہ تورات کے وقت اُس جگہ چلا گیا جہاں کچھ دن پہلے ریگہ رکھ کر ڈز بندی کی گئی تھی۔ وہاں مامون زئیوں کے دو جوان ریگہ اُٹھا رہے تھے۔ رحمت نے اُنہیں روکنا چاہا تو انہوں نے اُس پر فائر کر دیا۔ رحمت کے پاس تو کوئی اسلحہ بھی نہیں تھا۔" شیر بینے نے کہا: "کتنے افسوس کی بات ہے، ایک تو رات کو چھپ کر ریگہ اُٹھانا کہ جنگ پھر شروع ہو جائے اور پھر بے ہتھیار مہمان کی جان پر حملہ۔" اوّل خان نے گل زریں کو بتایا: "تمہارے رحمت چاچا نے مرنے سے پہلے بہت بڑا کام کیا۔ اُس نے پہلے تو مامون زئیوں کو اپنا خون معاف کیا اور پھر ہمارے مذہبی پیشوا حاجی صاحب کے سامنے مامون زئی ملک نے قسم لی کہ اُس کا قبیلہ آئندہ کبھی اُتمان خیلوں پر گولی نہیں چلائے گا۔ اِسی طرح اُس نے آدم خان لالہ سے بھی قسم لی کہ اُتمان خیل اب کبھی مامون زئیوں کو گولی کا نشانہ نہیں بنائیں گے۔ یوں سات پشتوں کی دشمنی کے بعد ان دو قبیلوں میں دائمی صلح ہو گئی۔"

گل زریں نے کہا: "بابا دو دن پہلے مجھے سیٹھ صاحب کے بنگلے پر سیکرٹری صاحب نے بلایا تھا۔ اُنہوں نے مجھ سے ڈیزائن ڈیپارٹمنٹ میں آرٹسٹ کی نوکری کے لیے درخواست لکھوائی۔ کہہ رہے تھے نبیلہ بی بی نے سیٹھ صاحب کو سفارش کی ہے۔"

شیر بینے نے ہنس کر کہا: "اُن کی لاڈلی بیٹی ہے۔ سیٹھ صاحب اس کی سفارش کیسے ٹال سکتے ہیں۔"

اوّل خان نے طنز کیا: "عورتوں کی سفارش پر نوکری حاصل کرنا کوئی مردوں کا کام ہے؟"

گل زریں نے چڑ کر کہا: "یہ آپ لوگ کیا باتیں لے بیٹھے۔ میں تو یہ بتانا چاہتا تھا کہ سیکرٹری صاحب کے کمرے میں مجھے ایک اخبار ملا، جس میں رحمت چاچا کے زخمی ہونے کی خبر چھپی ہے۔ میں وہ اخبار اُن سے مانگ کر لے آیا ہوں۔"

اول خان نے اس سے کہا کہ وہ اخبار لا کر اُسے وہ خبر سنائے۔ پھر شیر ینے سے کہنے لگا: "رحمت ہمیشہ اپنے آپ کو معمولی موچی کہا کرتا تھا۔ بھلا کوئی معمولی موچی اتنا بڑا کام کر سکتا ہے؟"

شیرینے نے جواب دیا: "رحمت بھائی تو موچی کے پردے میں کوئی بہت بڑا ازرگ تھا!"

گل زرین اخبار لے آیا اور خبر پڑھنے لگا ——

مالاکنڈ (خصوصی نمائندہ) جمعرات کی شب ایک مسلح تصادم میں رحمت نامی ایک مسافر شدید زخمی ہوا۔ اس جھڑپ میں ایک قبائلی کے زخمی ہونے کی خبر بھی ملی ہے۔

اول خان نے کہا: "بس اتنی سی خبر؟ دکھاؤ مجھے، کہاں لکھی ہے؟ یہ تین سطریں؟" اس نے جوش میں آ کر کہا: "میرے دوست نے اپنی جان کی قربانی دے کر دو دشمن قبائل کی سات پشتوں کی پرانی دشمنی کو دائمی صلح میں بدل دیا اور آج وہ پورے باجوڑ کے علاقے میں شہید رحمت شاہ بابا کہلاتا ہے۔ اُس کے مزار پر سات مختلف قبائل نے اپنے اپنے جھنڈے لگائے ہوئے ہیں اور اس کی قبر کے سرہانے وہی تیگہ نصب ہے، جس پر اس کے خون کے چھینٹے پڑے ہیں۔ میرا دوست، جو چھوٹے آدمی کی زندگی کے دن کاٹتا رہا، بہت بڑے آدمی کی موت مرا ہے۔ اتنے بڑے آدمی کی موت پر اخبار میں صرف تین سطریں؟ اتنی عظیم موت کی خبر صرف تین سطروں میں؟"

پھر اول خان، جو بالکل ان پڑھ ہے، اور ایک ہاتھ کی انگلیوں سے آگے گن بھی نہیں سکتا، دیر تک اخبار جھولی میں رکھے اُسے بڑے غور سے دیکھتا رہا۔

ایسٹر للی

نشاط فاطمہ

وہ جب آخری بار کشمیر سے آ رہی تھیں تو انہوں نے اپنے ہاتھوں سے اس کی قبر کی صفائی کی تھی اور سرخ و سفید ایسٹر للی کے پھولوں سے اسے ڈھانپ دیا تھا اور اپنے پرانے ملازم غلام نبی سے وعدہ لیا تھا کہ وہ اس کی صفائی کرتا رہے گا اور ان پھولوں کے موسم میں اسی طرح پھول ڈالے گا۔ یہاں پہنچ کر وہ ہر مہینے اسے کچھ پیسے بھیج دیا کرتی تھیں۔

کلارہ پارکر کو ایسٹر للی کے سرخ و سفید پھول بہت پسند تھے۔ کسی بھی ایسے شخص کی قبر پر یہ پھول ڈال کر، جو زندگی میں انہیں عزیز رہا ہو، ان کو ایک گونہ طمانیت کا احساس ہوتا تھا۔ ان کو اس بات کا بھی یقین تھا کہ اس شخص کو سکون اور مسرت حاصل ہوتی تھی۔ اگر راست بات پوچھی جاتی تو وہ ہرگز ایسی نہیں تھیں جیسی اب نظر آتی تھیں — محض ایک سنکی دیوانی بڑھیا — جو اکثر اپنے آپ سے باتیں کرنے لگتی تھی۔ مگر اب دیکھنے والے ان کی اسی حالت کے شاہد تھے، اور لوگ ظاہری کیفیت ہی کو دیکھ کر رائے قائم کرتے ہیں۔ انسان از خود کچھ نہیں ہوتا، وقت اور حالات اسے بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ زندگی کا آغاز کہاں سے ہوتا ہے اور کہاں تمام ہو جاتا ہے، کلارہ کی ماں ڈورتھی پارکر نے کبھی ہندوستان آنا نہ چاہا تھا جبکہ برٹش ایمپائر عروج پر تھی اور بالکل معمولی لوگ انگلستان سے آکر زر و جواہر اپنی جھولیوں میں بھر رہے تھے۔ ڈورتھی کو ایسی کوئی خواہش نہ تھی۔ کلارہ کے والد جون پارکر کو حکومت کی طرف سے کشمیر کا نظم و نسق سنبھالنے کے لئے بھیجا جا رہا تھا لیکن ضروری نہیں تھا کہ وہ بھی اپنے شوہر کے ساتھ لد پھند کر جاتیں۔ مگر اس کا کیا علاج کہ کلارہ نے صاف صاف کہہ دیا تھا "ممی اگر آپ جانا نہیں چاہتیں تو کوئی بات نہیں، میں پاپا کے ساتھ ضرور جاؤں گی!"

حد ہو گئی تھی۔ یہ سن کر ڈورتھی بہت پریشان ہو گئی تھیں۔ ایک دن انہوں نے بیٹی کو تفصیل سے وہاں کی صورت حال سے آگاہ کیا جو ان کے خیال میں بہت خطرناک تھی۔ پہلی بات یہ گوش گزار کی کہ انڈیا سانپوں کا دیس تھا۔ دوسری خوفناک بات یہ تھی کہ وہ جادوگر لوگ تھے۔ اس سلسلے سے انہوں نے بیٹی کو اپنی خالہ کا ایک چشم دید واقعہ سنایا۔ "میری خالہ اور خالو کچھ عرصہ کلکتہ مقیم رہے۔ میں تو یہ کہوں گی کہ اس واقعے کے بعد ہی وہ واپس انگلستان آگئی تھیں!" رنج اور غصے سے ان کا چہرہ سرخ ہو گیا تھا۔ وہ بہت دیر خاموش بیٹھی رہی تھیں۔

"آپ کوئی قصہ سنا رہی تھیں" کلارہ نے انہیں یاد دلوایا۔

"ہاں ایک جوگی نے کسی میم کو دیکھا اور مر مٹا!" پھر انہوں نے جوگی کی وضاحت کی۔ "ویسے وہ مونیکا روبرٹ جانے والی نہ تھی۔ ایک دن جوگی فقیر بن کر اس کے بنگلے پر آیا اور کہنے لگا" مجھے کچھ نہیں چاہیئے۔ صرف اپنے دو بال دے دو۔ اسے کیا خبر تھی۔ اس نے اسی وقت بال توڑ کر اس کے حوالے کئے۔ جوگی نے بالوں پر عمل کیا۔ تیسری رات جو کافی اندھیری تھی، مونیکا نے جوتی پہنی اور نکلتی چلی گئی۔ بل روبرٹ غریب نے اسے کہاں کہاں نہ تلاش کیا۔ ایک گھنے جنگل میں جوگی کی کٹیا میں بیٹھی تھی مگر اس نے بل کو پہچاننے تک سے انکار کر دیا۔ بل نے اسے لانے کے لئے لاکھ جتن کئے مگر وہ واپس جانے پر راضی نہیں ہوئی اس لئے کہ وہ سحر زدہ تھی!" یہ بھیانک قصہ سنا کر انہوں نے اس امید سے

بیٹی کی طرف دیکھا کہ اب تو وہ دہشت سے کانپ رہی ہوگی مگر اس پر کوئی اثر نہ ہوا بلکہ یہ سارا واقعہ اسے بہت رومینٹک اور دلچسپ معلوم ہوا۔ یوں ڈوروتھی کو بہ دقت اس کی وجہ سے آنا پڑا۔

وہ بہت سہمی ہوئی تھیں۔ جون کو چند مہینے دہلی قیام کرنا تھا۔ وہاں اُن دنوں شدید گرمی پڑ رہی تھی۔ وہ گرمی سے نڈھال تھیں۔ کیڑے مکوڑے دیکھ کر ان کے رونگٹے کھڑے ہوجاتے۔ گرد کی وجہ سے مارے کراہت کے، ہر وقت ناک پر رومال رکھے رہتیں۔ کلارہ نے اسی سال ڈاکٹری کا امتحان پاس کیا تھا۔ ڈوروتھی نے اسے بہت سمجھایا تھا کہ وہ وہیں انگلستان میں رُک کر کسی صاف ستھرے ہسپتال میں کام کرے۔ مگر اس نے ایک نہ سُنی۔ "ممی میں نے سنا ہے وہاں ڈاکٹروں کی بہت کمی ہے۔ وہ بہت دکھی لوگ ہیں۔ میں ان کا علاج کروں گی۔ کیا یسوع چارہ گر نہ تھا؟ کیا اس نے اندھوں اور کوڑھیوں کو شفا نہیں بخشی تھی؟ اگر میں ایسے لوگوں کا سہارا بنوں گی تو مجھے یقین ہے کہ وہ مجھ سے خوش ہوکر اپنی برکتیں نازل فرمائے گا!"

ماں کو اس نے لاجواب کر دیا تھا اور وہ جل بھُن کر خاموش ہوگئی تھی۔ دہلی پہنچ اس کی آنکھوں میں انڈیا کے لیے صرف اور صرف توصیف تھی۔ اور جب انسان کسی شے کو پسند کرتا ہے تو اس کی برائیاں بھی خوبیاں نظر آتی ہیں۔ گرد، گندگی، کیڑے مکوڑے، غربت، یہ باتیں کلارہ کے لئے کوئی معنی نہیں رکھتی تھیں۔ اور کشمیر پہنچ کر تو اس نے اعلان کر دیا "انڈیا جیسا ملک روئے زمین پر نہیں!"

یہ اس وقت کی باتیں تھیں جب آتش جوان تھا۔ وہ سارے قصے زندگی کے سمندر کی چند موجیں تھیں جو اب قصۂ پارینہ بن چکی تھیں۔ اب صورتِ حال قطعی مختلف تھی یہاں سیالکوٹ میں مولی مورس نے اپنی کوٹھی میں آزادی سے دو چار سال قبل لاوارث بوڑھی (اپنی ہم قوم) خواتین کے لئے "اولڈ ہوم" کھول لیا تھا۔ اور اس نیک کام کا سلسلہ اس وقت سے شروع ہوا تھا جب ان کے شوہر داغِ مفارقت دے گئے تھے۔ باسٹھ سال کی عمر میں صبح کے اخبار کا مطالعہ کرتے ہوئے یک لخت ختم ہوگئے تھے۔ دونوں بیٹے آسٹریلیا جا بسے تھے۔ پہلے بھی وہ ایک مہربان خاتون تھیں مگر اب کچھ زیادہ ہی رقیق القلب ہوگئی تھیں۔ یہ سب وقت اور حالات کے معجزے تھے۔ مولی مورس نے اپنی حیاتِ مستعار کو ان ضعیف العمر بے سہارا عورتوں کے لئے وقف کر دیا تھا۔ ایک دن انہوں نے اپنے دل کی آواز بھی سنی تھی جس پر انہیں کچھ دن بعد سے یسوع کی آواز کا گمان ہوا تھا اور اب یہ شک یقین میں بدل گیا تھا۔ وہ اکثر تیج تہواروں پر، کرسمس اور ایسٹر پر ان بڑھیوں کو باہم امن اور ایمانداری سے رہنے کی تلقین کیا کرتی تھیں کیونکہ وہ آپس میں لڑتی بھڑتی اور ایک دوسرے کی چیزیں چرا لیا کرتی تھیں۔ اسی درمیان میں وہ اپنی مثال دیتیں "اب تم لوگ مجھ ہی کو دیکھو۔ یسوع نے آواز دی "مولی مورس! اُٹھ اور سچی خدمت گزار بھیڑ بن۔ ان سارے دکھی لوگوں کی خدمت کر،" مگر افسوس کہ کسی کے دل پر کوئی اثر نہ ہوتا۔ یہ 'ہوم' اٹھارہ بے سہارا خواتین پر مشتمل تھا۔ جن میں سے تین بیبیاں خود کفیل تھیں۔ کلارہ، وکٹوریا اور ڈارسی۔ ان کو چھوڑ کر پندرہ کی کفالت 'ہوم' کے ذمے تھی۔ اب سلسلہ یہ تھا۔ مولی کو بینک سے ان کی جمع شدہ رقم کا منافع وصول ہوتا۔ اس کا ایک خطیر حصہ ان خواتین پر خرچ کرتیں۔ اس کے علاوہ کچھ خدا ترس، خوشحال روایتی انگریز بہ وقتِ رخصت یہ وعدہ کر گئے تھے کہ وہاں انگلستان سے وہ ماہ بہ ماہ ایک مناسب رقم 'ہوم' کے لئے بھیج کر ان کے ساتھ کارِ خیر میں شامل ہوجائیں گے۔ رقم کے ساتھ مولی کے نام ان سب حضرات کے چیدہ چیدہ خطوط بھی ہوا کرتے تھے جن میں ہر ایک تفصیل سے اپنے امراض، ہائی بلڈ پریشر، گاؤٹ اور آرتھرائیٹس کا تذکرہ تحریر کرتا۔ اس کے علاوہ ہم وطنوں کی سرد مہری، بڑھتی ہوئی مہنگائی اور درجۂ حرارت کا موسمِ سرما میں نقطۂ انجماد پر پہنچنے کا دکھڑا ضرور ہوتا اور بخصوصیت سے 'انڈیا' سے ترکِ تعلق کے شدید قلق کا اظہار ہوتا۔

کلارہ پارکر بھی اپنی عمر کے آخری ایام میں اس "بوڑھے خانے" میں داخل ہوگئی تھیں۔ اپنی جوانی میں وہ ایک اچھی فرض شناس اور رحمدل ڈاکٹر مانی خیال کی جاتی تھیں۔ اب ان کا یہ احوال تھا کہ اپنے متعلق من گھڑت قصے سنایا کرتی تھیں۔ ان کا کہنا تھا کہ ان کے تین بچے تھے جو

امریکہ، کینیڈا اور انگلستان میں جا بسے تھے، جبکہ ان کے اولاد ہی نہیں تھی۔ "ہوم" کے معائنہ کو آئے ہوئے اصحاب ان کے منہ در منہ تمسخر سے مسکرایا کرتے۔ لیکن مولی موریس سے جب بھی انہوں نے یہ کہانیاں دہرائیں، بلکہ سناتی ہی رہتی تھیں، انہوں نے کبھی اپنے چہرے کی کسی شکن سے بھی یہ ظاہر نہ ہونے دیا کہ کلارہ Make believe کی دنیا میں رہنے لگی تھیں۔ وہ سب ان کے مفروضے تھے اور کچھ بھی نہیں۔ مبادا ان کا دلِ ناتواں چُور چُور ہو جائے۔

یہ تینوں خواتین مولی، وکٹوریا اور روزا ہیوم، کلارہ کو عرصہ دراز سے جانتی تھیں۔ جب وہ کشمیر کے اسپتال میں کام کرتی تھیں تب وہاں ان کے ساتھ ایک ڈاکٹر فردوس شاہین بھی کام کرتا تھا۔ وہ خوش مزاج، خوبرو نوجوان ان کی والدہ کو کانٹے کی طرح کھٹکتا رہتا تھا۔ ان کی نیندیں حرام تھیں اور دن رات اس بات کی فکر لگی رہتی کہ کہیں ان کی بیٹی اس سے بیاہ نہ رچا لے، حالانکہ وہ اپنی والدہ کو اس بارے میں متعدد بار سمجھا چکی تھیں کہ "ایسی کوئی بات نہیں ہے وہ ایک اچھا انسان ہے اس لئے میں اسے قدر کی نگاہ سے دیکھتی ہوں۔ دوئم میرا کولیگ ہے، ہر وقت کے ساتھ کی وجہ سے ہنسنا بولنا پڑتا ہے" مگر ڈورتھی کب ماننے والی تھیں۔ ویسے بھی حفظِ ماتقدم کے طور پر اس سے خائف ہونا بھی حق بجانب سمجھتی تھیں۔ یوں کہ ان کی خالہ نے انہیں یہاں آنے سے پہلے ہی پکا کیا ہوا تھا۔ وہ بس ہر وقت پریشان رہتیں۔ اسپتال میں اکثر کچھ نہ کچھ ہوتا رہتا۔ وہ دیر سے آتی اور ان کو چکرایا ہوا دیکھ کر کہتی "ممی آپ کے وہم کا میرے پاس علاج نہیں" —— وہ سُن کر چپ رہتیں مگر ہر وقت اس کے لئے کسی معقول رشتے کی تلاش میں رہتیں۔

زیادہ تر امیدوار شادی شدہ یا فضول تھے۔ خود لڑکی ریاست کی پارٹیوں میں جانا پسند نہیں کرتی تھی۔ کام کا بہانہ کر کے عین وقت پر یہ کہہ کر اسپتال چل دیتی کہ "میری مریضہ گل شبّو کے یہاں بچہ ہونے والا ہے اور وہ بہت کمزور ہے۔ شاید اسے خون کی ضرورت پڑ جائے"۔ کلبوں سے اسے نفرت تھی جبکہ وہیں اسے معزز، برسرِ روزگار اعلیٰ حکام کے ہونہار سپوت مل سکتے تھے، مگر وہ ایسی جگہوں اور ایسے لوگوں سے روابط رکھنے سے گریز کرتی تھی۔ ڈورتھی اس کا ذمہ دار فردوس شاہین کو ٹھہراتیں۔ وہ غصے سے کانپ کر کہتیں "وہ کم بخت ڈاکٹر"!

"ممی اسے الزام مت دیں"! وہ فوراً کہتی۔

مگر ڈورتھی پارکر اس بات سے قطعی لاعلم تھیں کہ وہ ہنس مکھ نوجوان ڈاکٹر کسی قیمت پر بھی ان کی بیٹی سے شادی کرنے پر رضامند نہ ہوتا۔ ان کے خواب و خیال میں بھی نہ تھا کہ محکوم قبیلے کا کوئی فرد حکمراں ٹولے کی خوبصورت اعلیٰ تعلیم یافتہ لڑکی کو رد کر سکتا تھا مگر مسئلہ یہ تھا کہ وہ کشمیری ڈاکٹر اپنے پیشے کے علاوہ بھی بہت مصروف تھا۔ وہ زیرِ زمین (Under ground) ہو کر آزادی کی جد و جہد میں بھرپور حصہ لے رہا تھا۔ اب اس کے پاس وقت اور دماغ کہاں تھا کہ وہ ایک میم صاحب کا تعاقب کرتا اور وہ بھی اس شخص کی بیٹی کا جو نہ صرف ریاستِ کشمیر کا بلکہ وہاں اپنی حکومت کا بھی دستِ راست تھا اور جس کے پاس حریت پسندوں کی رپورٹیں محفوظ رہا کرتی تھیں۔ جون پارکر کو ڈاکٹر کی بھی ہر بات کا پورا علم تھا اور وہ بھی یہ نہیں چاہتے تھے کہ کلارہ ڈاکٹر کے ساتھ دیکھی جائے یا زیادہ 'involve' ہو۔ کلارہ اور فردوس شاہین علیحدہ علیحدہ پٹریوں پر سیدھے سیدھے اپنی دنیاؤں میں مصروف اور مگن چلے جا رہے تھے۔ مگر ماں کی مشکوک نگاہوں اور طرح طرح کے سوالات سے کلارہ زچ ہو گئی تھی۔ ایک دن اس نے ماں کو نوید دی کہ اگر وہ کوئی لڑکا اس کے لئے منتخب کرے گی تو وہ اس سے شادی کر لے گی۔ گرمی تھی اور وہاں ایک ہوتق سے چہرے کا فوجی آیا ہوا تھا۔ اس طرح اس کی شادی وہیں بکرے سے ہوئی۔ کلارہ نے ٹھنڈی سانس بھری تھی اور اپنی دوست وکٹوریا (وہ بھی اب اس بوڑھے خانے میں پڑی تھیں) سے کہا تھا "میری شادی بھی کوئی شادی تھی۔ شادی کے چند دن بعد وہ محاذ پر روانہ ہو گیا، گرفتار ہوا اور بہ حالتِ اسیری دم توڑ گیا۔ سب سے بڑھ کر مجھے اس کی صورت سے چڑ تھی۔ اوپر سے نہایت احمق اور بد ذوق بھی تھا"۔ وہ یہ کہتے ہوئے نہایت اداس اور سراسیمہ تھیں۔

ووین کی موت کے بعد کلارہ نے دوبارہ اپنے نام کے ساتھ پارکر لگانا شروع کر دیا تھا دوسرا کام انہوں نے یہ کیا کہ بیاہ کی انگوٹھی فروخت کر کے پیسے اپنی مریضہ گل شبو کو اس کے نوزائیدہ بچے کے لئے دے دیئے تھے۔ انہوں نے کہا تھا "گل شبو تم نے سونا ضائع ہونے سے بچا لیا"۔ وہ بیچاری کچھ نہیں سمجھ سکی تھی۔ بات یہ تھی کہ ان کا اصل پروگرام یہ انگوٹھی ڈل جھیل میں غرق کرنے کا تھا۔

اس "ہوم" کی ایک اور خاتون روزا ہیوم بھی انہیں اس وقت سے جانتی تھیں جب وہ خود کرنل ہارڈی اور مہاراجہ پونچھ کے بچوں کی گورنس تھیں اور ان کے ہمراہ کشمیر آیا کرتی تھیں۔ وہ ایک سابق فوجی کی اہلیہ تھیں۔ سارجنٹ ہیوم ڈیوٹی پہ مارا گیا تھا۔ اس بات کا روزا کو بہت فخر تھا۔ کلارہ سے کچھ شروع ہی سے روزا تھوڑی سی پرخاش رکھتی تھیں۔ اپنے مقابلے میں ان کے "سوشل اسٹیٹس" سے حسد کرتی تھیں اور انہیں احساس کمتری لاحق تھا لیکن یہاں 'ہوم' میں روزا کی اُن سے نوک جھونک کلارہ سے برابری کا احساس دلا کر ان کو طمانیت اور آسودگی سے مالا مال کر دیتی تھی۔ کلارا بھی اُن سے allergic تھیں۔ کچھ دنوں سے ان کی بھول بڑھ گئی تھیں۔ ایک دن چائے کا ڈبہ کمرے ہی میں رکھ کر کہیں بھول گئیں کہنے لگیں "میں اس روزا کے قدموں کی چاپ پہچانتی ہوں یہ اُڑا لے گئی ہے"۔

مسز ڈیغنی نے ہاں میں ہاں ملائی۔ وہ بہت غریب تھیں۔ کلارہ ان کا بہت خیال رکھتی تھیں۔ انہوں نے یہ بات زور سے کہی تھی۔ روزا دائیں طرف اُن کے پڑوس میں رہتی تھیں۔ بس قیامت آگئی۔ "آناً فاناً" میں ایک طوفانی لڑائی کا آغاز ہوا۔ روزا نے ہمیشہ کی طرح پے در پے عامیانہ اور گھٹیا حملے کیے۔ "تمہارا تو دماغ چل گیا ہے۔ جب ہی تم نے فرضی اولاد گھڑ رکھی ہے"۔

ڈارسی تھر تھر کانپتی مولی کو بلا کر لائیں۔ تب جا کر جنگ بندی ہوئی مگر ایک قصہ نہیں تھا جو نپٹ جاتا۔ کلارہ کا چھوٹا سا خوبصورت کھلونے جیسا کتا روزا کے طوطے کو چھیڑ دیتا۔ پیچھے گولہ باری ہونے لگتی۔ روزا کلارہ کے بے حد شریر کتے برینڈی کو سڑی گالیاں دیتیں۔

"خدا کے غضب سے ڈرو۔ جانور کی ذات معصوم ہے۔ اس پر الزام تراشی مت کرو" کلارہ اپنے بے حد spoilt کتے کو گود میں اٹھا کر کمرے میں چلی جاتیں۔

لیکن روزا بڑبڑاتی رہتیں وہ کسی سے دبنے والی اسامی نہیں تھیں۔ مرحوم سارجنٹ ہیوم کہا کرتا تھا کہ "اگر روزا کو محاذ پر بھیج دیا جائے تو نازی مورچے چھوڑ کر بھاگ جائیں گے"۔ چنانچہ روزا نے بھڑک کر کہا "تمہاری اطلاع کو میں تم سے زیادہ خدا سے ڈرتی ہوں ہر اتوار کو ضرور گرجے جاتی ہوں جبکہ تم اتوار کے اتوار علالت کا بہانہ کر کے پڑ جاتی ہو"۔

کلارہ نے مزید ان کی بکواس کا جواب دینا مناسب نہیں سمجھا۔ وہ ایک امن پسند خاتون تھیں۔ ویسے بھی وہ ماضی میں رہتی تھیں۔ ان کے نزدیک مستقبل خدا کی بزنس تھا اور حال وقت کا جبر۔ بس ایک ماضی ان کا اپنا تھا۔ ایک بار انہوں نے وکٹوریا سے کہا تھا "اگر ہم مستقبل پر قدرت رکھتے تو میری شادی ووین جیسے چیتر قناتی سے نہ ہوتی مگر ممی کے چہرے کی دہشت میرے اعصاب ختم کئے دے رہی تھی۔ ان کی خالہ نے اس دیس سے انہیں بہت دہشت زدہ کر دیا تھا"۔

روزا ابھی تک شور مچا رہی تھیں۔ یہ لڑائیاں گرمیوں میں زیادہ بڑھ جاتی تھیں۔ ہر سال گرمی دانوں میں لدی روزا مولی کو طعنے دیتیں "آپ ہمیں کسی ٹھنڈے ہل اسٹیشن پر کیوں نہیں لے جاتیں"۔ یہ سن کر وہ بے بسی سے ان کی طرف دیکھتیں یوں کہ نجانے کتنی بار مولی ان کو 'ہوم' کی آمدنی اور خرچ کے متعلق وضاحت سے بتا چکی تھیں اور یہ الّلے تلّلے ان کی دسترس میں نہ تھے۔ عیاشیاں ان کے مقدر کا حصہ نہ تھیں۔

کلارہ کے جب تک دم میں دم رہا وہ کشمیر جاتی رہیں مگر اب تو دم ہی واجبی سا رہ گیا تھا۔ وہاں سے آ کر وہ اکثر اپنی تصاویر خواتین کو دکھلایا کرتیں۔ لیکن خصوصیت سے ان کی وہ تصویر جس میں وہ گدھے پر بیٹھی ہوتیں اور گدھے کا مالک پیچھے کھڑا ہوتا۔ اس کے متعلق روزا

کہتی تھیں "یہی ایک تصویر بار بار دکھا دیتی ہے۔ ارے مجھ سے پوچھو میں اس کے سب رازوں سے واقف ہوں۔" خواتین کوئی جواب نہ دیتیں۔ انہیں بخوبی معلوم تھا کہ روزا اجھاڑ کا کانٹا تھیں۔ ان سے کچھ کہنا سننا فضول ہے۔ لیکن وکٹوریا جو ہری بھری بکائن کی چھاؤں تلے مونڈھا ڈالے بیٹھی کتاب پڑھ رہی ہوتی تھیں کھٹ سے کتاب بند کر کے کہتیں "ہنہ! ۔ لو اور سنو کسی کو کیا پڑی ہے جو اس سے کلارہ غریب کے کچے چٹھے پوچھے۔"

آئرش نژاد وکٹوریا شاعر خاتون تھیں اور ان کے پسندیدہ شاعر لارڈ بائرن تھے لیکن ان کے مرحوم شوہر کا کہنا تھا کہ "لارڈ بائرن کی شاعری سے زیادہ وکی، لارڈ موصوف کے حسن پر ریجھی ہوئی ہیں۔" خیر وکٹوریا کو ویسے بھی ساری دنیا سے نفرت تھی۔ وہ دن رات لوگوں کی کمینگیوں، گھٹیاپن، بدذوقیوں اور اتراہٹوں پر اپنا خالص آئرش خون جلاتی رہتیں۔ مدت سے نظمیں بھی نہیں کہتی تھیں اس لئے خون اور کھولتا رہتا تھا۔ یہاں آمد بالکل ختم ہو گئی تھی کئی بار الفاظ کو گھیر گھار کر لاتیں مگر وہ شریر بچوں کی طرح ذہن سے نکل بھاگتے۔ پہلے کی بات ہے ابھی پاکستان وجود میں نہیں آیا تھا کہ وہ ایک منحوس پیشین گوئی کیا کرتیں۔ "کچھ دن نہیں جاتے کہ ایمپائر کی عمارت زمین بوس ہو جائے گی۔"

روزا یہ سن کر خم ٹھونک کر لڑتیں۔ وہ ایک وطن پرست خاتون تھیں اور تاج، شاہی خاندان، ایمپائر سب سے وفادار تھیں۔ ان کے سارجنٹ میاں نے وطن اور ایمپائر کی خاطر جان دے دی تھی۔

مگر کلارہ ان کی بات کی تائید کرتیں۔ "درست ہے۔ میرا بھی یہی اندازہ ہے۔ اس کی ایک وجہ بحیثیت حاکم قوم ہمارا پندار بہت بڑھ گیا ہے۔ آزادی طلب کرنے والوں کے ساتھ ظلم اور ناانصافی برتی گئی ہے جبکہ آزادی حاصل کرنے کا مطالبہ ہر انسان کا پیدائشی حق ہے۔"

روزا یہ گفتگو سن کر غصے سے پاگل ہو جاتیں "تمہارا کیا ہے تم تو اپنے باپ کو جو ایک معزز اور فرض شناس افسر تھے اپنی ایک نیم دیوانی حرکت کی وجہ سے ملازمت سے برطرف کروائے دے رہی تھیں۔ ہو سکتا ہے وہ گرفتار ہو جاتے اور یہ سب تم اس ڈاکٹر کی وجہ سے کر رہی تھیں۔ اس وقت بھی تم ایسی باتیں کر رہی ہو وہ اس بائی ڈاکٹر کی وجہ ہے۔"

کلارہ ان کی طرف بھنا کر دیکھتیں اور صرف کہتیں "شٹ اپ۔" پھر کمرے میں گھس کر دروازہ بند کر لیتیں۔

روزا کی بداخلاقی اور زبان درازی کے باوجود جب وہ اپنی سوکھی ہوئی پنڈلیاں کھر کھر کھجاتیں اور چہرہ فق ہو رہا ہوتا تو وہ سمجھ جاتیں کہ ان کے مزاج کی برہمی میں ان کے ایگزیمے کو بھی دخل تھا۔ ان دنوں وہ زیادہ تکلیف دے رہا ہوتا۔ اور اپنی سقیم مالی حالت کی وجہ سے دوا نہیں خرید سکتی تھیں۔ وہ ان کے کمرے کے دروازے پر آہستہ سے ہاتھ مارتیں۔ کھلے ہوئے دروازے میں سے ہاتھ بڑھا کر قریب ہی میز پر پیسے رکھ کر مدھم سی آواز میں کہتیں "آئی سے روزا۔ تم کل ہی ڈاکٹر کو دکھا کر دوا لے آؤ۔"

سچ بات یہ ہے کہ وہ اپنے اور ان کے درمیان کی رنجش کو بالائے طاق رکھ کر نہایت خلوص سے پیش آتیں اور یہ مشورہ دیتیں۔ ساتھ ہی وہ خود کو کسی سینٹ سمان محسوس کر کے ہلکی پھلکی سی ہو جاتیں۔

لیکن کتا بریڈی اپنی کرنی سے باز نہ آتا۔ وہ طوطے پر جھپٹتا۔ طوطا چیخیں مارتا اور اس کی ناک کی پھنگی پر اتنی زور سے چونچ مارتا کہ بریڈی پیں پیں کرنے لگتا۔ کوئی اور وقت ہوتا تو دونوں خواتین ایک دوسرے کا منہ نوچنے لگتیں۔ مگر کلارہ اس لئے کچھ نہ کہتیں کہ مبادا روزا خیال کریں کہ احسان کر کے اکڑ رہی ہے۔ اور روزا یوں طرح دے جاتیں کہ وہ واقعی ممنون ہوتیں کہ اس مہربانی کی ان کو اشد ضرورت تھی۔ بلکہ روزا اپنے بدرنگ ٹین کے ڈبے میں سے سیلا ہوا بسکٹ بھی بریڈی کو پیش کرتیں مگر وہ ارسٹوکریٹک خو بو رکھتا تھا۔ ایک نگاہِ غلط انداز ڈال کر رہ جاتا اور اس کو شرفِ قبولیت نہ بخشتا۔

کلارہ اپنے کمرے میں آکر روزا کے متعلق سوچنے لگیں۔ ان کو واقعی ان پر رحم آ رہا تھا۔ انہیں یاد آیا کئی سال قبل آخری بار جب وہ کشمیر آئی تھیں، اس وقت کتنی تر و تازہ، ہشاش بشاش اور صحت مند ہوا کرتی تھیں اور اب سوکھ کر کیسی قاق ہو گئی تھیں۔ اور بوجہ ایگزما ان کی پنڈلیاں دیکھی نہیں جاتی تھیں۔ سرینگر اور گلمرگ میں بے پروائی سے خریداری کرنے والی یہ عورت اس وقت پائی پائی کو محتاج ہے۔ تب انہیں قوموں کے عروج و زوال کی عبرت ناک داستانوں کا خیال آیا" اور کسے کہتے ہیں زمین بوس ہونا۔ یہ بچاری بیکار بگڑتی ہے۔ اسے کیا معلوم کہ ایمپائر کی فلک بوس عمارت کب کی زمیں بوس ہو چکی ہے، اس لئے کہ لالچ اور تکبر بنیادوں میں دیمک کی طرح داخل ہو کر انہیں چاٹ کر کھوکھلا کر دیتے ہیں۔" وہ بہت اداس اور مضطرب تھیں جیسے اپنی قوم کی اس زمین پر ناانصافیوں کی فصل بونے کے عوض وہ سب تاوان ادا کر رہی ہوں "خداوندا! انسان بے رحم ہوتا ہے یا وقت؟" انہوں نے سرگوشی میں اپنے خدا سے پوچھا۔

مدت بعد اپنے پرانے سوٹ کیس میں سے ایک بوسیدہ البم نکالی۔ اس میں پورا ایک عہد اور ان کا ماضی بند تھا۔ اور اس کے پہلے ہی صفحے پر فردوس شاہین موجود تھا۔ "روزا جتنے کیا کیا بکا کرتی ہیں" ان کی نیلگوں آنکھیں نمناک ہوئیں۔ انہوں نے وکٹوریا سے کہا جو ان کے لئے اپنے سائڈ روم میں رکھے ہوئے مٹی کے تیل کے اوون میں پنیر کے توس بنا کر لائی تھیں "مگر روزا جاہل گھٹیا اور نیم دیوانی ہے" وکٹوریا نے اپنے مخصوص تیخ لہجے میں اظہار خیال کیا۔

"کون کیا ہے اور کیا نہیں ہے، نظر کیا آتا ہے اور ہوتا کیا ہے، وقت اور حالات کسی شخص کو بناتے اور بگاڑتے ہیں۔ از خود کوئی کچھ نہیں ہوتا۔" کلارہ نے رنجیدگی سے کہا اور کچھ دیر سرنگوں بیٹھی رہیں۔ کافی کی پیالی انہوں نے وکٹوریا کو تھمائی اور ایک بار پھر سے گویا ہوئیں۔ "میرے متعلق کچھ غلط فہمیاں ہیں۔ خاص کر روزا کو۔ یہ سچ ہے کہ میں نے اپنے والد کا ایک خفیہ فائل اٹھایا تھا۔ جس میں ان حریت پسندوں کی رپورٹیں تھیں جو اس وقت زیر زمیں آزادی کی تحریکوں میں ملوث تھے۔ تم سمجھ سکتی ہو وہی بات ہے، ہمارے ہاں آئرش ریپبلکنز کو جیسے حکومت باغی اور غنڈے کہتی ہے۔ اس فائل میں سرفہرست فردوس شاہین کا نام تھا۔ باقی اس کے چار ساتھیوں کی رپورٹیں تھیں۔ پاپا سے میری اس مسئلے پر ایک بار بحث ہوئی تھی۔ میں نے ان سے کہا تھا، بیرونی حکمرانوں سے آزادی حاصل کرنا اور ریاست کے ظلم و ستم سے خود کو یعنی اپنی قوم کو چھٹکارا دلوانا میرے نزدیک کوئی برا کام نہیں۔ میں نے یہ بھی کہا تھا ان سے کہ ذرا اپنے کو اس جگہ رکھیئے۔ اگر انگلستان پر جرمن کا تسلط قائم ہو جاتا اور ہٹلر حکومت کرنے لگتا ......" اسی وقت پاپا نے کہا "بس بس اس سے آگے کچھ نہ کہنا۔" چنانچہ وہ سمجھ گئے تھے کہ فائل، میں نے ہی غائب کیا ہے۔ میرے اسپتال جانے کے بعد انہوں نے ممی سے میرے کمرے کی تلاشی لینے کو کہا اور فائل انہیں کپڑوں کی الماری کی دراز میں مل گیا۔ لیکن اس کا یہ ہرگز مطلب نہ تھا کہ مجھے اپنے باپ سے محبت نہیں تھی یا میں خدانخواستہ ان کا زوال چاہتی تھی۔ مجھے پاپا سے شدید محبت تھی مگر میں فردوس شاہین اور اس کے ساتھیوں کی بھی مدد کرنا چاہتی تھی۔"

وکٹوریا بہت غور سے سن رہی تھیں۔ مارے حیرت کے وہ اچھل پڑی تھیں۔ پہلا وقت ہوتا تو وہ اس سارے واقعہ کو کسی اچھی سی نظم میں منتقل کر لیتیں۔ پھر انہوں نے بہت چپکے سے دل کے نہاں خانوں میں سوچا کہ روزا یکسر غلط نہ تھی۔ کہیں نہ کہیں صداقت ضرور تھی۔ وہ بات دوسری ہے کہ اوّل اس کے کہنے کا انداز نازیبا ہے۔ دوسرے اب اس ذکر کی ضرورت بھی کیا ہے۔ کلارہ کے والدین کو فوت ہوئے بھی نجانے کتنے سال بیت گئے۔ محض دکھ ہی پہنچانا ہوا نا۔ ان کے اندر کا شاعر دل کسی کے دل دکھانے کے خیال سے بہت پریشان ہوا۔

کلارا نے بات جاری رکھی: "پھر تمہیں معلوم ہے کیا ہوا؟" کلارہ کی آنکھوں سے ٹپ ٹپ آنسو گر رہے تھے۔ "فردوس شاہین سولی پر چڑھ گیا۔ مگر اس کے ساتھی بچ گئے کیونکہ وہ جیل جانے سے پہلے ہی فرار ہو گئے تھے۔"

البم کے دوسرے صفحے پر وکٹوریا نے دیکھا ایک تنہا قبر کی تصویر تھی جس کے نیچے تحریر تھا "وہ مر کر بھی زندہ رہا" کلارہ بولتے

بولتے یک لخت خاموش ہوگئی تھیں ان کے کانوں میں کوئی زور زور سے کوئی انقلابی گیت گا رہا تھا۔
دونوں نے خاموشی میں کافی ختم کی۔ " معلوم نہیں موسم گل پر ایسٹر للی کے پھول کوئی اس کی قبر پر ڈالتا بھی ہوگا " کلارہ کی آواز دور سے آتی ہوئی سنائی دی۔
وکٹوریا کہنا چاہتی تھیں کہ شہیدوں کو کسی شے کی حاجت نہیں ہوتی مگر وہ کہہ نہیں سکیں —
" اور میں روزا سے اس بات کی کس طرح وضاحت کروں جو میں خود نہیں جانتی کہ میرے جذبات فردوس شاہین کے بارے میں کیا ہیں۔ ہمدردی، عزت یا بقول روزا کے محبت۔ بے شک ایک بات میں یقین سے کہہ سکتی ہوں کہ میں اس کی قدر دان بہت تھی اور اب بھی ہوں۔ جدوجہد کا وہ دور انتہائی تکلیف دہ تھا اور اسے جھیلنا آسان نہیں تھا۔ مگر وقت گزر جانے کے بعد سنانے اور سننے والے کے لئے محض ایک کہانی رہ جاتی ہے " کلارہ نے ٹھنڈی سانس بھری۔
" لارڈ بائرن نے اس بارے میں خوب کہا تھا ... مگر کیا کہا تھا، وکٹوریا کو یاد نہیں آیا اس لئے وہ بتا نہیں سکیں۔ صرف ڈبڈبائی آنکھیں جھپکتی رہیں — وہ جانے کے لئے کھڑی ہوئیں " کل تم گرجا چلو گی؟ " وکٹوریا نے دریافت کیا۔
" نہیں ممی کی مذہب میں شدت پسندی کی وجہ سے میں ری ایکشنری ہوگئی ہوں۔ البتہ کمرے میں بائیبل، نیا اور پرانا عہد نامہ ضرور پڑھ لیتی ہوں۔ بائیبل ہر لحاظ سے ایک بہترین کتاب ہے "
ایسٹر عنقریب آنے والا تھا۔ کچھ دنوں سے روزا بالکل خاموش ہوگئی تھیں جیسے انہیں معلوم تھا۔ وہ برآمدے میں مونڈھے پر بیٹھ کر شام ڈھلے نیلگوں آسمان کو تکا کرتیں۔ صبح انہوں نے دیکھی ہی نہیں۔
کلارہ کو ان کے چلے جانے کا بڑا صدمہ تھا۔ وہ ان کی ساری نوک جھوک بھول گئی تھیں۔ ان کے بغیر بہت سناٹا محسوس کر رہی تھیں۔ روزا کا کمرہ بھائیں بھائیں کر رہا تھا۔ کلارا طوطے کا پنجرہ اس کی دیکھ بھال کی خاطر اپنے پاس لے آئی تھیں۔
لیکن روزا کیا رخصت ہوئیں، جیسے کسی نے 'باب الموت' کا قفل توڑ دیا ہو۔ یکے بعد دیگرے تین بڑھیاں اور ختم ہوگئیں — " ہوم " پر ویرانی سی آگئی۔ ہر بڑھیا اپنی جگہ خوفزدہ اور خاموش تھی۔ در و دیوار پر ڈھنڈار پنا برس رہا تھا۔ مولی مورس کے دفتر کی میز پر گلدان میں لگے ایسٹر للی کے پھول دیکھ کر یک لخت وہ بہت بے چین ہوگئیں۔ یہ ایسٹر بھی سوگوار سا نزدیک آرہا تھا۔ اب کے اس کے قدموں کی چاپ دلوں پر عجیب سی دستک دے رہی تھی۔ موسم بدل رہا تھا۔ وکٹوریا فلو میں مبتلا تھیں۔ ڈاری آرتھرائٹس سے نڈھال تھیں۔ " ایسا لگتا ہے میم صاحب اب کی ایسٹر پر ہم دونوں ہی گرجا جائیں گے۔ سب کوئی بیمار ہیں اور کلارہ میم صاحب تو ویسے بھی کون سا گرجا جاتی ہے " نینسی آیا نے مولی مورس سے کہا۔
تین چار دن بعد ایسٹر تھا۔ اور ایسٹر کی رات سرخ و سفید للیز کھل رہی تھیں۔ " میں اسے مصلوب ہوتے دیکھتی ہوں۔ وہ جو انسانیت کا چارہ گر تھا۔ اس کے ہاتھوں اور پیروں میں میخیں ٹھونکی جا رہی ہیں۔ مگر نینسی! میں یہ بھی دیکھ رہی ہوں کہ یسوع کے دھڑ پر بار بار فردوس شاہین کا سر لگ جاتا ہے "
" کلارہ میم صاحب تم نیند کی دوائی کھا کر سو جاؤ " آیا نے جز بز ہو کر مشورہ دیا کیونکہ اسے گرجا جانا اور ایسٹر کی تیاری کرنا تھی۔
" نہیں آج رات میں جاگنا چاہتی ہوں۔ یہ اس کے درد کی رات ہے جو دوسروں کے دکھ دور کرتا تھا۔ میں کیسے سو سکتی ہوں "
انہوں نے بھاری آواز میں کہا۔
" گڈ نائٹ میم صاحب " آیا نے باہر نکل کر پُر مسرت آواز میں کہا — یوں کہ اس کی جان تو چھوٹی۔

"نینسی۔ پچھلے مہینے مجھے قاسم ملی ــــ ہاں ہاں وہی گدھے والا ــــ اس کا خط ملا تھا کہ غلام نبی مرگیا ہے۔ اب بتاؤ شاہین کی قبر پر ایسٹر لیلیز کون ڈالے گا۔ مگر کوئی بات نہیں میں خود جاؤں گی۔"

وہ بہت مضطرب تھیں انہیں محسوس ہوا کمرے میں کوئی تھا۔ پھر انہوں نے دوبارہ کسی کو انقلابی نغمہ گاتے سنا ــــ
"گانے والے کی آواز کتنی خوبصورت ہے۔ یہ مجھے نہیں یاد میں نے پہلے کسی کو گاتے سنا ہے مگر جیسے یہ الفاظ میں سن چکی ہوں۔ ان کا مطلب جانتی ہوں" وہ تڑپ کر اٹھیں۔ انہوں نے دروازہ کھٹکھٹایا "وکٹوریا، مجھے اشارہ مل چکا ہے۔ ایسٹر للی کا موسم آگیا ہے۔ میں اس کی قبر پر پھول ڈالنے جا رہی ہوں۔ مولی سے کہہ دینا۔"

وہ تیز و تند ہوا کے جھونکے کی طرح نکلتی چلی گئیں۔

وکٹوریا محوِ خرام تھیں پچھلے دنوں سے ان کا فلو بہتر تھا۔

اور جب وہ کفناتی جا رہی تھیں تو مولی مورس نے دیکھا ان کی مٹھی میں سفید و سرخ دونوں قسم کے ایسٹر لیلیز دبے تھے۔ باہر گیا ریوں اور گملوں میں سرخ و سفید پھول گم صم سے کھل رہے تھے۔ تب مولی مورس کو خیال آیا۔ کلارہ کہا کرتی تھیں۔ سفید ایسٹر للی کے پھول یسوع کے کفن کی سفیدی کو Symbolise کرتے ہیں اور سرخ پھول اس کے شہید خون کی سرخی کو۔

کلارہ کی میز پر پرانا عہد نامہ کھلا رکھا تھا جیسے پڑھتے پڑھتے کہیں چلی گئی ہوں :

"اسی سبب سے روتی ہوں
اور میری آنکھوں سے اشک رواں ہیں کیوں کہ جو تسلی دینے والا میری جان
کو تسکین دے وہ مجھ سے دور ہے"

(پرانا عہد نامہ)

مولی نے عہد نامہ بند کیا۔ کتاب میں سے مدت پہلے کا مرجھایا ہوا سوکھا ہوا ایسٹر للی کا ایک پھول فرش پر گر پڑا جو کتاب میں شاید بطور نشانی رکھا تھا۔

پُرسے کا موسم

نجم الحسن رضوی

ہم سب لوگ اس گھر میں پُرسہ دینے گئے تھے۔ اگرچہ وہاں کوئی مرا نہیں تھا۔ تمام لوگ صحیح سلامت تھے —— زندہ اور باتیں کرتے ہوئے، مگر پھر بھی بہت کچھ بدلا ہوا لگ رہا تھا۔ ایک عجیب سی سوگواری فضا میں کافور کی بُو کی طرح پھیلی ہوئی تھی۔ اصل میں رات وہاں ڈاکہ پڑ گیا تھا —— اور وہی ہوا تھا جو آج کل ہوتا ہے۔ وہ آئے، انہوں نے دیکھا اور انہوں نے فتح کر لیا۔ گھر کی کوئی قیمتی چیز ایسی نہ تھی جو انہیں نہ پسند آئی ہو —— ٹی وی، وی سی آر، بہت سی نقد رقم، زیورات اور پرائز بونڈز۔ وہ سب کچھ سمیٹ کر اطمینان سے چلتے بنے۔

دوسرے دن دوپہر تک یہ اطلاع محلے بھر میں پھیل چکی تھی۔ یہ پروفیسر صاحب کا گھر تھا اور سب لوگ ان کی عزت کرتے تھے۔ میں خود ان کا پڑوسی تھا۔ وہ میرے ہم مذاق بھی تھے۔ میں سالوں سے وطن سے باہر تھا مگر سال دو سال میں جب بھی گھر واپس لوٹتا، پھر سے ساری رشتے داریاں اور دوستیاں تازہ ہو جاتیں۔ اتفاق سے اُن دنوں بھی میں وہاں موجود تھا اور اس وقت پُرسہ دینے والوں میں بھی شامل تھا۔

پروفیسر صاحب کا ڈرائنگ روم تقریباً بھرا ہوا تھا —— کچھ اُن کے شاگرد تھے، کچھ رشتے دار اور کچھ قریبی دوست ——

"پولیس کو تو اطلاع دے دی گئی ہے نا؟" کسی نے پوچھا۔

"جی ہاں۔" پروفیسر صاحب نے جواب دیا۔ "مگر اس سے کیا ہوتا ہے۔"

کسی نے کہا۔ "پولیس کو اطلاع دینے کی ضرورت نہیں تھی، اسے پہلے ہی سے سب کچھ پتہ ہوتا ہے۔"

کوئی کچھ نہیں بولا، بس کچھ لوگ مسکرا دیئے۔

میں نے کہا —— "اب راتیں بھی کتنی تاریک ہو گئی ہیں۔ اس بار تو مجھے لگا جیسے شہر کے سر پر سے آسمان کی چادر اُتار لی گئی ہے۔ دن میں فضا میں مٹیالا غبار تنا رہتا ہے اور رات میں اوپر سے تاریکی برستی نظر آتی ہے جیسے زمین کسی خلائی بلیک ہول میں داخل ہو چکی ہے۔"

سب لوگ چُپ رہے۔

"بھلا وہ پہلے کی تاروں بھری روشن راتیں کیا ہوئیں؟" میں نے اپنے قریب بیٹھے ہوئے فرید صاحب کو مخاطب کیا۔ وہ پروفیسر صاحب کے دُور کے عزیز تھے اور کسٹم کے محکمے میں کوئی اعلیٰ افسر۔

فرید صاحب ہنس پڑے۔ "ڈاکو لوٹ لے گئے ہوں گے۔ آپ کو پتہ ہے بیروزگاری کے اس دَور میں بھی وہ کس قدر مصروف دکھائی دیتے ہیں۔"

میں نے کہا۔ "ہاں لگتا ہے صرف وہی برسرِ روزگار ہیں۔"
فرید صاحب سے میری بہت دنوں بعد ملاقات ہوئی تھی۔ وہ بڑے کام کے آدمی تھے۔ مجھے دیکھ کر پوچھا۔ "آپ کا سفر تو خیریت سے گزرا؟"
میں نے کہا — "کہاں صاحب، اب کی بار وطن لوٹا تو ایک دوست نے اپنا کچھ سامان بھی ساتھ کر دیا تھا جس پر غیر متوقع طور پر کچھ زیادہ ہی ڈیوٹی ادا کرنی پڑی۔"
وہ اس معنی خیز طور پر مسکرائے کہ ان کی مونچھ دونوں طرف سے سوالیہ نشان بن گئی۔ بولے۔ "آپ نے پاسپورٹ نہیں دکھایا ہوگا؟"
"جی نہیں۔" میں نے کہا۔ "میرا پاسپورٹ تو اُن کے ہاتھ میں تھا!"
فرید صاحب نے کہا "اور اس کے ساتھ؟"
میں نے کہا "کیا مطلب؟"
وہ ہنسے "جب آپ کو یہی پتہ نہیں کہ پاسپورٹ چیک کرانے کے بھی کچھ آداب ہوتے ہیں تو آپ کو تو زیادہ سے زیادہ ڈیوٹی ادا کرنی چاہیئے۔"
"وہ آداب کیا ہیں؟" میں نے سوال کیا۔
فرید صاحب تھوڑا سا جز بز ہوئے۔ پھر بولے "ڈیوٹی کم کرانی ہو تو پاسپورٹ کے ساتھ اپنا شناختی کارڈ پیش کیا جاتا ہے۔"
"شناختی کارڈ؟" میں سراپا سوال بنا ہوا تھا۔
ہنس کے بولے۔ "ہاں بھئی کرارے سرکاری کاغذ پر چھپا ہوا۔ سب سے اچھا تعارف نامہ وہی ہوتا ہے۔ اسی لئے تو کہتا ہوں شناختی کارڈ ہمیشہ ساتھ رکھا کیجئے۔ کبھی کوئی تکلیف نہیں ہوگی۔"
میں جھینپ سا گیا اور پھر بات بدلنے کو پوچھا۔ "آپ آج کل کہاں ہیں؟ وہیں رہ رہے ہیں گلشن گھر میں؟" اکانومی فلیٹوں کا یہ کمپلکس ایک قریبی علاقے میں واقع تھا۔
"کون، میں؟" فرید صاحب نے ایسے پوچھا جیسے انہیں یہ بات پسند نہیں آئی۔ بہت سے لوگ گھر، نوکری اور آمدنی کے بارے میں براہِ راست سوالات سے خفا ہو جاتے ہیں۔ میں کھسیا کے عشرت صاحب کو دیکھنے لگا جو شہر کے ترقیاتی ادارے میں کسی شعبے کے سربراہ تھے۔ عشرت صاحب اس وقت اپنے قریب بیٹھے ہوئے ایک ڈاکٹر صاحب سے اپنی صحت کے بارے میں مفت مشورے حاصل کر رہے تھے۔ "بعض دفعہ تو یوں لگتا ہے کہ سینے میں سانس کا تیر کہیں اٹک گیا ہے، نکالے نہیں نکلتا، یہ تیر نیم کش" — وہ بولے۔
ڈاکٹر نے پوچھا۔ "انجیوگرافی کرائیے۔ دل کی شریانوں کا پتہ چلے کس حالت میں ہیں۔"
عشرت صاحب ہنس پڑے اور ان کی قمیض کے آگے کے سب بٹن کھل گئے۔ "دل تو میرا بہت اچھی حالت میں ہے جناب، پہلے کی طرح ابھی تک بہت خوش خوراک ہوں اور اچھی شکلوں کو دیکھ کر خوش ہوتا ہوں۔ اندر ہی اندر رومانی گیتوں کے ریکارڈ بجنے لگتے ہیں۔" انہوں نے بٹن بند کئے۔

ڈاکٹر ہنسا۔ "پھر بھی انجیوگرافی ضروری ہے۔ دل کا معاملہ نازک ہوتا ہے۔ آپ کا وزن بھی ایک پرابلم ہے۔ اسے کم کیجئے۔ رہی روحانی طبیعت تو خیر وہ ایک نعمت ہے مگر پچاس پچپن سے زیادہ عمر ہو جائے تو آدمی کو محتاط رہنا چاہیے۔ خاص طور پر آپ جیسے دولت مندوں کو۔"

عشرت صاحب بولے۔ "میں اور دولت مند؟ یہ کیسے اندازہ لگا لیا آپ نے؟"

ڈاکٹر نے کہا۔ "سارے شہر کی زمینوں کے وارث ہو کے بھی آپ دولت مند شمار نہیں ہوں گے، تعجب ہے۔"

عشرت صاحب ہنسے "کہاں صاحب! صرف تین چار پلاٹ اور دو کوٹھیاں تو ہیں —— اچھا میں سمجھ گیا —— آپ کا خیال ہے کہ شاید ایئرپورٹ پر بننے والا عشرت پلازہ میرا ہے۔ نہیں جناب اس سے میرا کوئی تعلق نہیں —— اس میں تو میری بیوی آدھی حصے دار ہے —— اور اگر کسی نے یہ غلط اطلاع آپ تک پہنچائی ہے کہ سمندر کے کنارے جو کسینو بن رہا ہے اس میں بھی میری شراکت ہے تو بالکل غلط —— ہاں وہاں کار پارکنگ کا ٹھیکہ میرا ہے —— باقی اس سے میرا کوئی واسطہ نہیں۔ لے دے کے فرحت نگر میں بازارِ عشرت نامی جو شاپنگ مال بن رہا ہے اسے آپ چاہیں تو میرے گناہوں میں شامل کر لیں۔ اس میں بڑا شیئر میرا ہے —— لیکن یہ تو دیکھیے کتنی سرمایہ کاری میں نے کی ہے —— روزگار کے کتنے مواقع اس سے پیدا ہوں گے۔"

پروفیسر صاحب لمحے بھر کو کمرے میں آئے اور ملازم سے کہا کہ مہمانوں کے لیے چائے لائے۔ کچھ اخباری فوٹوگرافر تصویریں لینے آئے ہوئے تھے۔ انہوں نے کہا۔ "بھئی انہیں منع کرو کوئی تصویر نہیں چھپوانی ہے ہمیں۔"

"اچھا تو آپ ڈر رہے ہیں؟" کسی نے سوال کیا۔

"نہیں، ڈر تو نہیں رہا مگر احتیاط ضروری ہے۔" پروفیسر صاحب بولے۔ "ویسے بھی اب یہ سمجھ میں نہیں آتا کہ آدمی کس بات سے ڈرے اور کس سے نہ ڈرے —— اصل میں اب ڈر تو باقی نہیں رہا، ڈراؤنی چیزیں رہ گئی ہیں۔"

ڈاکٹر صاحب نے عشرت صاحب سے کہا۔ "اچھا تو ملازمت سے کب ریٹائر ہو رہے ہیں آپ؟"

"کیا؟" عشرت صاحب حیرت سے اچھل پڑے۔ ان کی قمیض کے بٹن پھر سے بغاوت پر اتر آئے۔ "ابھی تو تین سال کی توسیع ہوئی ہے صاحب —— دیکھیے نا، شہر میں کتنا کام باقی ہے ابھی —— بے شمار اسکیمیں، ہاؤسنگ سوسائٹیاں، کالونیاں بننے والی ہیں۔ ان سب میں میرا عمل دخل ہے —— پھر میرے بھی تو بہت سے منصوبے زیرِ تکمیل ہیں۔"

میں پھر فرید صاحب کی طرف متوجہ ہو گیا —— وہ کہنے لگے۔ "آپ کچھ پوچھ رہے تھے؟"

میں نے کہا۔ "آپ کی رہائش کے بارے میں پوچھ رہا تھا، پہلے تو آپ گلشن نگر میں رہتے تھے نا؟"

"گلشن نگر میں؟" وہ بولے۔ "نہیں بھائی وہ تو بہت پرانی بات کر رہے ہیں آپ۔ زمانۂ قبل مسیح کی —— اب تو کب سے میں ڈیفنس میں ہوں —— ایک بنگلہ بیٹے کو عین ساحلِ سمندر پر بنا کے دیا ہے۔ شادی کے بعد اس کی یہی خواہش تھی۔ کہتا ہے صبح سویرے اپنے بیڈ روم کے دریچوں سے سمندر کو دیکھتا ہوں تو لگتا ہے پھر ایک نئی دنیا کا سفر شروع ہونے کو ہے۔"

میں نے پوچھا۔ "آپ کے بیٹے کا کاروبار کیا ہے؟"

"کاروبار!" فرید صاحب بولے۔ "اپنا ہی کاروبار ہے —— امپورٹ ایکسپورٹ کا —— اصل میں تو میں بھی اپنے

لئے گراؤنڈ تیار کر رہا ہوں۔ آخر ایک دن مجھے بھی تو ریٹائر ہونا ہے۔"

پروفیسر صاحب کا ملازم لوگوں کو چائے کے کپ تھما گیا۔ اسی لمحے پروفیسر صاحب اندر آئے اور کہنے لگے۔" ایک تو میں ان اخبار والوں سے عاجز آگیا ہوں —— بار بار وہی سوالات۔"

جب وہ کمرے سے باہر گئے تو کسی نے کہا۔" ضرور ڈاکوؤں نے دھمکی دی ہوگی کہ اگر ہمارے بارے میں زبان کھولی یا چرچا کیا تو ——"

میں نے فرید صاحب سے پوچھا۔" آپ کی تعیناتی کہاں ہے؟ وہیں اپنے ہیڈ آفس میں؟"

"کیا؟" فرید صاحب کی مونچھیں پھر سوالیہ نشان بن گئیں اور بھنویں ایک دوسرے سے ٹکرانے لگیں۔" اچھا تو میں آپ کو ایسا ناکارہ نظر آتا ہوں۔ نہیں بھئی اب تو خدا کا شکر ہے کافی دن سے ائیر پورٹ پر ہی ہوں —— اور وہیں رہنا چاہتا ہوں —— ہیڈ آفس تو جیل ہے جیل ——"

میں نے عشرت صاحب کی طرف دیکھا تو وہ ڈاکٹر صاحب سے مخاطب تھے۔" آپ کہتے ہیں تو میں انجیوگرافی کرا لوں گا لیکن اگر بائی پاس کا معاملہ نکلا تو ——؟"

ڈاکٹر نے جواب دیا۔" تو اس میں گھبرانے کی کیا بات ہے، میں آپریشن کر دوں گا۔ ڈیڑھ دو لاکھ کا خرچ ہے مگر یہ پہلے سے بتا دوں کہ میں اپنی فیس میں کوئی رعایت نہیں کرتا۔"

عشرت صاحب بولے۔" پتہ ہے مجھے مگر بات پیسے کی نہیں، فرصت کی ہے!"

ڈاکٹر نے کہا۔" فرصت تو آپ کو نکالنی پڑے گی اگر زندہ رہنا ابھی تک آپ کو گھاٹے کا سودا نہ لگتا ہو۔"

عشرت صاحب ہنسے۔" جتنا چاہو طنز کرو دوست مگر تم سوچ نہیں سکتے کہ میرا لمحہ لمحہ کتنا قیمتی ہے اور میرے منصوبوں میں کتنا سرمایہ لگا ہوا ہے —— اور شاپنگ مال کا پروجیکٹ تو سمجھو میری زندگی کا سب سے اہم کام ہے —— تمہیں پتہ ہی نہیں کہ اس میں کتنے بڑے بڑے لوگوں کا مال لگا ہوا ہے —— اور میں نے وعدہ کیا ہے کہ تین مہینے کے اندر اندر اس کا افتتاح وزیر صاحب سے کراؤں گا —— سمجھ رہے ہو نا؟"

اسی وقت پروفیسر صاحب کمرے میں واپس آئے۔ انہوں نے سامنے بیٹھے ہوئے ایک نوجوان سے کہا۔" ارے تم کب آئے، مجھے تو پتہ چلا تھا کہ تم کہیں باہر دورے پر گئے ہوئے ہو؟"

اس نے ہنس کے کہا۔" دفتر میں یہی پتہ ہے سب کو، اصل میں مجھے کچھ ذاتی کام تھے، اس لئے ——"

پروفیسر صاحب نے حیرت سے پوچھا۔" اور اگر تمہارے باس کو پتہ چل گیا تو؟"

نوجوان بولا۔" کوئی بات نہیں۔ باس بھی تو اسی طرح دورے پر جاتا ہے!"

پروفیسر صاحب میری طرف آئے تو میں نے کہا۔" پولیس کو تو آپ نے واردات کی تفصیل بتائی ہوگی —— کل کتنے لوگ —— وہ کیسے اندر آئے —— پھر انہوں نے کیا کیا؟"

پروفیسر صاحب نے کہا۔" وہ کئی لوگ تھے اور ان سب کے ہاتھوں میں کلاشنکوف رائفلیں تھیں یا ٹی ٹی پستول —— پہلے انہوں نے سب کی مشکیں کس دیں، پھر اطمینان سے سارا سامان سمیٹا۔ اس کے بعد ڈائننگ ٹیبل پر بیٹھ کر ڈٹ کر ناشتہ کیا اور یہ کہہ کر رخصت ہو گئے کہ خبردار ایک گھنٹے سے پہلے کوئی باہر نہ نکلے۔"

میں نے کہا " انہیں آپ لوگ شناخت تو نہیں کر سکتے۔ یقیناً انہوں نے اپنے چہروں کو نقابوں سے چھپا رکھا ہوگا۔"
" نقاب ؟" پروفیسر صاحب بولے۔ نہیں تو ان میں سے تو کسی نے کوئی نقاب وقاب نہیں اوڑھ رکھا تھا۔ ایسا لگتا تھا جیسے انہیں کسی قسم کا کوئی ڈر یا پہچان لئے جانے کا خوف نہیں۔"
لمحے بھر کو خاموشی رہی۔ پھر کسی نے ٹھنڈی سانس بھر کے کہا " ہاں اب تو سب کچھ کھلے عام ہوتا ہے۔"
پروفیسر صاحب بولے۔" خیر جو ہوا سو ہوا ، بلکہ اچھا ہی ہوا ، کم از کم وہ دوبارہ تو نہیں آئیں گے۔ میں تو سمجھتا ہوں یہ تو جان کا صدقہ تھا جیسے دیا فرد ری تھا۔"
اک لمحے مجھے زور کی ابکائی آئی۔ میں نے ادھر ادھر دیکھا۔ سب کے سب باتوں میں مگن تھے۔ فرید صاحب بھی اور عشرت صاحب بھی ـــــ کسی کے چہرے پر کوئی تاثر نہ تھا لیکن مجھے لگا جیسے وہاں سب کے بیچ میں کوئی لاش دھری ہو جو کسی کو نظر نہ آرہی ہو۔ مجھے اپنے چاروں طرف کافور کی تیز بو پھیلتی ہوئی محسوس ہوئی۔

سانجھ

گلزار

لالہ جی کو یہ بات کُھل گئی کہ بڑھیا (لالائن) نے بال کٹوا دیئے۔ اور اُن سے پوچھا بھی نہیں۔

پچھلے مہینے اُن کی بہو مائیکے گئی تھی تو اپنی ساس کو ساتھ لے گئی تھی، دِلّی۔ کہ ٹرین میں گود کے بچّے کو سنبھالنے میں آسانی رہے گی۔

لالہ جی سے خود مایا دیوی نے پوچھا تھا "بہو کہہ رہی ہے دِلّی چلنے کے لیے۔ جاؤں؟"

"ہاں ہاں ضرور جاؤ۔ ٹرین کے دھکّم دھکّے میں بیچاری بہو کیسے سنبھالے گی بچّے کو؟"

اُن کی بہو، مِنی، کے پِتا ریٹائرڈ کرنل ہیں۔ مِنی کے دو بھائی بھی ملٹری میں بڑے عہدوں پر ہیں۔ کرنل صاحب کا پارٹیوں میں آنا جانا آج بھی اسی طرح جاری ہے۔ ظاہر ہے، اُن کی پتنی انہی کے اسٹائل میں رہتی ہیں۔ ماڈرن ہیں۔ اسٹائلش ہیں۔ انہوں نے بال کٹوا رکھے ہیں۔ اس بار مایا دیوی کے بھی کٹوا دیئے۔

دو ہفتے بعد، جب وہ واپس لوٹیں تو لالہ جی دیکھ کر دنگ رہ گئے "یہ بالوں کا کیا کیا تم نے؟"

"سمدھن نے کٹوا دیئے۔ اپنی طرح بنوا دیئے۔" یہ کہہ کر مایا ہنسیں ضرور، لیکن ایک سایہ جو گزرا، اُن کے پتی کی آنکھ سے، وہ اُس سے ڈر گئیں۔ اپنے شوہر کی نظر وہ پہچانتی تھیں۔ اڑتالیس برس کا ریاض تھا۔ کھسیانی سی بولیں۔ "پھر رکھ لوں گی۔ بڑھ جائیں گے۔"

لالہ جی چپ چاپ اندر چلے گئے اور بیٹھک میں جا کر بیٹھ گئے۔

رات کھانے کی میز پر بھی اُن کا موڈ بجھا بجھا ہی رہا۔ منوج نے پوچھا۔ مِنّی نے بھی۔ بس سر ہلا دیا۔ "کچھ نہیں"۔

مایا دیوی نے جب پوچھا —— "طبیعت تو ٹھیک ہے نا؟" تو جواب کچھ اور ہی دیا۔ "تمہارے بال تو بہت اچھے تھے۔ خوبصورت تھے۔ کٹوا کیوں دیئے؟" کوئی جواب نہ ملا تو بولے۔ "اور تم نے —— مجھ سے پوچھا بھی نہیں!"

منوج ہنستا ہوا کمرے میں داخل ہوا "بابوجی کو ابھی تک ماں کے بالوں کی فکر لگی ہے۔ بہتر بہتر کے ہو گئے لیکن مزاج سے عشق نہیں گیا ابھی!"

مِنّی، بڑی کی کنگھی کر رہی تھی ہنس کے پوچھا۔ "بابوجی کی کیا لو میرج ہوئی تھی؟"

"نہیں۔ ماں کی شادی تو میرے سامنے ہوئی۔ اُن کے ماں باپ نے کروائی تھی۔"

"مطلب؟ ——"

"دونوں نے گھر سے بھاگ کے کورٹ میں شادی کر لی تھی۔ چار پانچ سال بعد میں پیدا ہوا۔ میری پیدائش کے بعد دونوں کے ماں باپ نے معاف کر دیا اور صلح ہو گئی —— ماں مجھے لے کر پیرینٹس (والدین) کو ملنے گئی تو انہوں نے بابوجی کو گھر سے نکال دیا، یہ کہہ کے، کہ بچّو، جاؤ، اب برات لے کر آؤ، تب لڑکی دیں گے، تب دوبارہ شادی ہوئی اُن کی۔ مجھے یاد تو نہیں لیکن —— پتہ ہے۔

تصویر بھی ہے:۔

لالہ ہیم راج کو کھانے کے بعد سیر کی پرانی عادت تھی۔ کچھ دیر ٹہلنے کے لیے باہر چلے جاتے تھے۔ نکڑ سے ایک پان بنواتے۔ اپنی طرح کا۔ عمر کے ساتھ سپاری ضرور کم ہو گئی تھی۔ لیکن اس روز وہ پنواڑی کی دکان سے پہلے ہی لوٹ آئے۔ اتنی سی بات پتہ نہیں کیوں، بھنور کی طرح اُن کی سوچ میں اٹک گئی تھی —— سانجھ ہی تو ہے۔ اُسے حق کہہ لو۔ ادھیکار کہہ لو یا —— کوئی مناسب لفظ ملا نہیں۔ ایسے لگ رہا تھا، اُن کی کوئی بڑی قیمتی چیز چوری ہو گئی ہے۔

جب منوج پیدا ہوا تھا، تو پہلے پہل اُن کے ادھیکار پر سینہہ لگی تھی۔ مذاقاً بیوی سے کہا "ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے بھئی ہم خود ہی کپڑے نکال لیں گے۔ تم دیکھو اپنے بیٹے کو۔ آتے ہی ہمارا بستر الگ کروا دیا اِس چھٹنکی بھر کے لونڈے نے!"

"چھٹنکی بھر مت کہو۔ آٹھ پاؤنڈ کو جنا دیا ہے آپ کو۔"

"لیکن یہ تو بتا دو بنیان کہاں گیا؟ ہیڈ صاحب کے ہاں جانا ہے۔"

"نکٹائی تو ہرگز مت لگانا۔ بُری اُوت لگتی ہے آپ کے گلے میں۔ سکارف لگا کے چلے جاؤ۔"

پھر پنکی پیدا ہوئی تو کچھ اور کٹاؤ ہوا ان کے ادھیکاروں کا۔ کھانا نوکرانی کے ہاتھ کا ملنے لگا۔ لیکن دال کا بگھار، مایا خود لگاتی تھیں۔ کوئی اور لگائے تو اُنہیں فوراً پتہ چل جاتا تھا۔ مایا دیوی کو بڑا فخر تھا اِس بات پر۔ ایک بار دال میں سے، لمبا سا بال نکل آیا۔ لالہ جی نے نوکرانی کو نکال دیا۔ مایا سے بولے "تمہارا بال ہوتا تو میں جُوڑے ہی میں رکھ لیتا۔ لیکن میں اس نوکرانی کے بال برداشت نہیں کر سکتا۔ اُسے کہو، کام کرنا ہے تو سر منڈوا کے آئے۔"

"آئے ہائے۔ سہاگن، بیچاری۔ وہ کیوں سر منڈوا دے؟ کوئی ودھوا ہے؟"

"تو پھر کوئی نوکر رکھ لو۔"

تب سے نوکر ہی رہا گھر میں —— اب آ کے چولہا چوکا بہو نے سنبھالا تو ایک دن اُسے بھی کہہ دیا "کھانا بناتے ہوئے بال کھلے مت رکھا کرو بیٹی۔ آنکھ پر آتے ہیں۔"

منی نے کس کے جُوڑا بنا لیا۔ لیکن بات مایا کی نظر سے بچ نہ سکی۔ وہ جان گئی تھی کہ آج تک نوکرانی والی بات وہ بھولے نہیں۔ دو چار روز تو بات ہنسی مذاق میں ٹلتی رہی۔ ماں دل ہی دل میں اِترا بھی رہی تھیں کہ لالہ جی اس بڑھاپے میں بھی اپنا عشق جتا رہے ہیں۔ رُوٹھے سے رہتے ہیں۔ لیکن کچھ روز اور گزرے تو سب نے دیکھا کہ بابو جی نے ماں سے بات کرنا ہی چھوڑ دیا ہے۔ مایا بھی کچھ بے حال ہونے لگیں۔ بڑھاپے کی "رُوٹھائی"، انہیں جوانی سے بھی زیادہ جان لیوا لگنے لگی۔ کھانے کی میز پر سب ملتے، اور لالہ جی چپ چاپ کھانا کھا کر اٹھتے اور سیر کو نکل جاتے۔ سیر بھی کچھ چھوٹی ہونے لگی تھی۔ مایا نے پوچھا تو جواب دیا "اب جلدی تھک جاتا ہوں!"

ایک بے دلی سی رہنے لگی گھر میں۔ ساتھ ہی ایک دبا دبا سا تناؤ بھی شروع ہو گیا۔ کھانے کی میز پر بیٹھے ہوئے منوج نے کہا "بابو جی، آپ چشمے کا فریم بدل لیجیے۔ آج کل بڑے نئے نئے ڈیزائن ملتے ہیں ——"

"یہ ڈیزائن تمہاری ماں کا پاس کیا ہوا ہے بھئی۔"

"ماں کا؟" منی نے حیرت سے پوچھا۔

"ہاں اِنہیں گول فریم اچھا نہیں لگتا تھا۔ ہم نے چورس لے لیا۔ پھر کالے فریم پر اعتراض ہوا انہیں، تو ہم نے براؤن لے لیا!"

ایک روز کھانے پر بیٹھے تو چونک کر دیکھا مایا کی طرف۔ "آج بگھار تم نے لگایا ہے؟"

مایا کا جی بھر آیا۔ بہو نے پوچھا —— "آپ کو کیسے معلوم ہوا؟"

"ارے بیٹی، تمہاری ساس تمہے بگھار میں ہمیں اُن کے ہاتھوں کی خوشبو آجاتی ہے۔"

لیکن اُن کی خاموشی برقرار رہی۔ جب دبی دبی منوانی کا بھی اثر نہ ہوا تو ممی نے ایک دن صاف صاف معافی مانگ لی "مجھ سے غلطی ہوگئی بابو۔ میں اپنی ممی کو منع نہیں کر سکی۔ اور ممی بھی تو مان ہی گئیں!" وہ دونوں کو ممی کہتی تھی۔ اپنی ماں کو بھی، ساس کو بھی۔

منوج نے مناتے ہوئے کہا "کوئی بات نہیں بابوجی۔ بال ہیں۔ پھر بڑھ جائیں گے۔"

ایک دبی سی مسکراہٹ کے ساتھ بابوجی بولے "باتیں بڑی معمولی ہیں بیٹا۔ نہ ہونے سے کوئی دنیا اِدھر کی اُدھر نہیں ہو جاتی۔ لیکن زندہ رہنے کا رس بنا رہتا ہے۔ بس۔ ہم بوڑھے ہو گئے ہیں۔ ایک دوسرے سے بیگانے تو نہیں ہو گئے ——"

اگلے دن ہی بابوجی نے کہا "میں کچھ دن کے لیے پنکی کے پاس رہ آتا ہوں —— ذرا تبدیلی ہو جائے گی۔"

پنکی جبل پور میں بیاہی ہوئی تھی۔ معمولی سے پس و پیش کے بعد سب مان بھی گئے۔ منوج نے تو مذاق بھی کیا۔ "ٹھیک ہے۔ جب تک ماں کے بال بھی کچھ اور لمبے ہو جائیں گے۔"

ماں نے سمجھایا —— "بیٹی کے ہاں زیادہ دن مت رُک جانا۔ ٹھیک نہیں ہوتا —— جلدی لوٹنا۔"

دوسرے دن لالہ جی ٹرین سے روانہ ہو گئے۔

دو دن، چار دن، چھ دن، ہفتہ گزر گیا۔ لیکن لالہ جی جبل پور نہیں پہنچے۔ سب کو فکر ہو گئی۔ دوستوں، رشتہ داروں کے ہاں کھوج شروع ہوئی۔ خدا نہ کرے، کوئی حادثہ نہ ہو گیا ہو راستے میں۔ کچھ ہوتا بھی تو لالہ جی خبر کرتے۔ کوئی معقول وجہ اُن کے غائب ہونے کی سمجھ میں نہ آئی۔ بہت مایوس ہونے کے بعد پولیس کو اطلاع دی گئی اور اخباروں میں تصویر چھاپ دی گئی —— مگر سراغ ندارد! پریشانی اِس حد کو پہنچی کہ ممکن، ناممکن، ہر طرح کے خیالات ذہن سے گزرنے لگے ——

ڈھائی مہینے گزر گئے اور ایک دن اچانک ایک خط ملا۔ بدری ناتھ کے کسی آشرم سے۔ لالہ ہیم راج بہت بیمار تھے، ان کی حالت بہت نازک تھی اور آشرم کے کسی پنڈت نے ان کی ڈائری سے پتہ لے کر خط لکھ دیا تھا۔

سب لوگ فوراً بدری ناتھ پہنچ گئے —— بس ذرا سی دیر ہو گئی۔ اُسی صبح اُن کا دیہانت ہو گیا تھا۔

داڑھی بڑھی ہوئی تھی۔ بال بڑھ کے جٹائیں بن گئی تھیں۔ چٹائی پر پڑے ہوئے بالکل سنیاسی لگ رہے تھے۔

مایا دیوی نے چوڑیاں توڑ کے پھینک دیں۔ اور اُن کے کان کے پاس جا کر پوچھا "اب بتاؤ —— بال کٹوا دوں؟ اب تو منڈن کروانا ہوگا۔ ودھوا ہوں نا!"

اور اِس بار لالہ جی سے پوچھ کے، بڑھیا نے سر منڈوا دیا ——!

روپ بہروپ

سید مینوچہر

لوگوں کے آنے جانے کا سلسلہ تو خیر سہ پہر سے ہی شروع ہو جاتا مگر اصل رونق شام کے وقت ہی ہوتی جب کہنہ مشق شعرا اور ادیبوں سے لے کر تازہ وارد دِن چمن تک بلاتخصیص شب رات گئے تک بیٹھے رہتے۔ اس دوران شاہ صاحب کو چند گھنٹے لکھنے لکھانے کے لیے بھی چاہیے ہوتے جس پر تب ان کا انحصار تھا لیکن آنے جانے والوں کا نظم وضبط قابلِ داد تھا کہ وہ شاہ صاحب کی مصروفیت کے دوران کمرے میں پڑی ہوئی کتابیں دیکھتے رہتے یا ایک دوسرے سے آہستہ آواز میں بات چیت کر کے وقت گزار لیتے۔ اس قدر وسیع حلقۂ ارادت کا باعث مجھے کافی عرصہ مشاہدہ کے بعد سمجھ میں آیا کہ وہ ہر ایک سے اس کے ذہنی معیار کے مطابق بات کرتے۔ پطرس بخاری، صوفی تبسم، احمد ندیم قاسمی اور اسی قد وقامت کے شعرا اور ادیبوں کے علاوہ ایسے لوگ بھی ان کے پاس بیٹھنے والوں میں شامل ہوتے جنہوں نے اپنی زندگی میں سکول کا منہ تک نہ دیکھا تھا۔

انہی لوگوں میں ہمارا ایک نو عمر ملازم بھی شامل تھا جسے ہم ایبٹ آباد سے ساتھ لے کر آئے تھے اور اسے ملازم کی بجائے گھر کا فرد ہی سمجھتے تھے۔ موصوف کو انگریزی فلمیں دیکھ دیکھ کر امریکہ، برطانیہ، آسٹریلیا جانے کا بے حد شوق تھا۔ ان کے ساتھ بیٹھ کر آسٹریلیا جانے کے پروگرام بنتے، آسٹریلیا کا کرایہ کتنا ہے، کتنے لوگ جانے چاہئیں، ان کی کیا عمریں ہوں، کتنا سرمایہ چاہیے، کتنی زمین فارمنگ کے لئے مل جانے کی توقع ہے، زمین آباد کرنے کے لیے کیا کیا آلات کشاورزی درکار ہوں گے، کہاں سے ملیں گے، کونسی فصلیں کاشت ہوں گی؛ یہ سب تفصیلات طے ہوتیں۔ اسی اثنا میں شاہ صاحب کے کام کا وقت ہو جاتا اور باقی تفصیلات اگلی نشست کے لئے اٹھا دی جاتیں۔ اگلی نشست میں طے شدہ تفصیلات پر دوبارہ ایسی ہی سیر حاصل بحث ہوتی حتیٰ کہ کام کا وقت پھر ہو جاتا۔

کچھ کچھ اندازہ تو خیر مجھے تھا لیکن گزرتے وقت کے ساتھ مجھے اچھی طرح پتہ چل گیا کہ یہ شاہ صاحب کی ذہنی تفریح تھی جس کے ذریعے وہ تنقید و تحقیق کے مشکل اور دقیق کام سے عارضی طور پر فرار حاصل کرتے —— ایک طرح کی ذہنی پکنک —— آہستہ آہستہ یہ بھی پتہ چلا کہ وہ تقریباً دوسرے درجے کے جاسوسی ناولوں کے بے حد شوقین تھے۔ پیٹر چینی ریمنڈ شینڈلر اور اسی قبیل کے دوسرے درجے کے سراغرسانی کے افسانے اور ناول لکھنے والوں کو وہ بہت شوق سے پڑھتے۔ شروع میں تو مجھے کوئی خاص تجسس نہ ہوا کیونکہ میرے لئے سب کتابیں ایک جیسی ہی تھیں مگر جب مختلف کتابوں میں فرق کا احساس ہوا اور شاہ صاحب کے ذوق کے بارے میں آگاہی ہوئی تو ان کے اس طرح کے ناول پڑھنے پر حیرت ہوئی جو انہوں نے ایک دن یہ کہہ کر خود ہی دور کر دی کہ سراغرسانی اور جاسوسی کے ناول ذہنی تفریح کے لئے ہیں تاکہ دماغ ایک ہی طرح کی گتھیاں نہ سلجھاتا رہے۔

شاہ صاحب کے ملنے والوں میں ایک صاحب احمد حسن تھے جو کبھی شاہ صاحب کے شاگرد تھے اور اب کاروبار کرتے تھے۔ درمیانہ قد، خوش رو، صحت مند، ہنس مکھ۔ دوسرے تیسرے دن چکر ضرور لگاتے۔ ان کا ہمارے گھر کے قریب برتنوں کا

شو روم تھا۔ ساتھ ایک آدھ آٹے کی چکی لگا رکھی تھی۔ اس کاروبار سے انہیں معقول آمدنی تھی۔ موٹر سائیکل رکھی ہوئی تھی۔ اپنا مکان تھا۔ شاہ صاحب کے پاس بیٹھ کر کافی دیر باتیں کرتے رہتے۔ میں بھی پاس بیٹھا ہوتا۔ یہی پتہ چلتا کہ آپ بہت ہی ترقی کرنے کے خواہش مند ہیں۔ کاروبار کو وسعت دینا چاہتے ہیں۔ چکی کی جگہ فلور مل اور برتنوں کی دوکان کی جگہ سرامکس کا ایک کارخانہ لگانا چاہتے ہیں۔ اس زمانے میں فیکٹری لگانے کی سہولتیں ایسی نہیں تھیں جیسی اب ہیں کیونکہ اب تو قرضہ لے کر واپس کرنے کا رواج ہی نہیں ہے، تب اس زمانے میں شاید مستقبل کے ان سرمایہ داروں کی نیت معلوم کر کے یاروں نے یہ اڈا ہی اڑا دیا ہوا تھا یعنی نہ قرضہ دیں گے نہ یہ کھائیں گے۔ کاروباری حضرات سرمایہ کی فراہمی کے مسائل کو حل کرنے کے مختلف طریقے اختیار کرتے۔ کوئی اپنی زمین بیچتا، کوئی عزیز و اقارب سے قرض لیتا، کوئی بیوی کے زیور گروی رکھتا۔

سرمائے کی فراہمی کے مسئلے کو حل کرنے کے لیے احمد حسن نے ایک نرالی ترکیب سوچی۔ انہوں نے ایک امیر کبیر خاندان میں دوسری شادی رچالی۔ ان کے سسرال والے بہت خوشحال تھے اور شاید ایک آدھ فلور مل کے مالک بھی تھے جسے لگانے کا موصوف کو بہت شوق تھا۔ اس شادی نے احمد حسن کے کتنے مسائل حل کئے اور کتنے پیدا کئے، ان کے شمار کا وقت آنے والا تھا مگر قدرت کو کچھ اور منظور تھا۔

احمد حسن کی دوکان کے پاس ایک لائبریری تھی جس میں ایک آنہ روز پر کتابیں پڑھنے کے لیے ملتی تھیں۔ میں ایک آدھ دن چھوڑ کر وہاں جایا کرتا تھا اور اکثر احمد حسن کی دوکان پر بیٹھ جاتا۔ شاہ صاحب کے ناتے سے بڑی عزت کرتے اور سوڈا چائے وغیرہ پلائے بغیر نہ جانے دیتے۔ ان کی دوکان کے سامنے ایسی ہی ایک دوکان تھی جن سے ان کا جھگڑا چل رہا تھا، شاید زمین کا۔ مقدمہ عدالت میں تھا اور احمد حسن کو یقین تھا کہ مقدمہ ان کے حق میں فیصل ہوگا۔ مجھے یاد ہے کہ مقدمہ کے آخری دنوں میں شاید قرائن دیکھ کر سامنے والے کچھ کھسیانے کچھ غصہ میں رہتے۔ بہرحال چونکہ دوکانیں آمنے سامنے تھیں اس لئے "چھیڑ خوباں سے چلی جائے اسد" والا معاملہ چلتا رہتا تھا۔ ہم لوگ اس صورتِ حال سے محظوظ بھی ہوتے اور وہاں بیٹھے ہوئے یہ خوف بھی رہتا کہ ان کے جھگڑے میں ہم ملوث نہ ہو جائیں۔ یعنی میں اور میرے ایک آدھ دوست۔ جھگڑے میں ملوث ہونے کا سنہری موقع بہت جلد ہمارے ہاتھ سے نکل گیا کیونکہ مقدمہ احمد حسن کے حق میں ہو گیا اور سامنے والے اپنی دوکان چھوڑ کر چلے گئے۔ اب زمین کے لئے کچھ منصوبہ بندی کرنا باقی تھی۔

میں جب بھی احمد حسن کی دوکان پر گیا وہاں ایک طرف مخصوص نشست پر ایک صاحب کو بیٹھا پایا۔ دُبلے پتلے، کم رو، خاموش طبع، سانولے سے۔ ایک بار پوچھنے پر بتایا گیا کہ یہ احمد حسن کے چھوٹے بھائی ہیں۔ احمد حسن بولے "شاہ صاحب یہ ایسے ہی ہیں، بس اللہ لوک۔ دنیا داری سے دلچسپی نہیں ہے۔ نماز روزہ پر زور ہے۔ یہاں میرے پاس بیٹھے رہتے ہیں۔ والد صاحب مرحوم نے کہا تھا ان کا خیال رکھنا۔ اپنا خرچ پانی مجھ سے لے لیتے ہیں۔ چھوٹا موٹا کام کر دیتے ہیں۔ چل بھئی کاکا جی اُٹھ، چھوٹے شاہ جی کے لیے چائے بنا دے۔"

اس ملاقات کے بعد اکثر میں احمد حسن کے چھوٹے بھائی کو دیکھتا اور اس کے بارے میں رائے قائم کرنے کی کوشش کرتا لیکن چونکہ براہِ راست گفتگو تو کبھی ہوئی نہ تھی اس لئے کچھ اندازہ نہ تھا کہ آیا یہ فاترالعقل ہے یا ڈپریشن کا مریض ہے۔ کیا شادی شدہ ہے؟ اگر شادی شدہ ہے تو کیا اس کے بچے ہیں؟ انہیں کہاں سے کھلاتا ہے؟ کیا پڑھا لکھا ہے یا ان پڑھ اور کیا شروع سے ایسا ہے؟ ایک دن میں وہاں سے گزرا تو احمد حسن موجود نہ تھے اور ان کے بھائی اپنی نشست پر موجود۔ میں نے ازراہِ تجسس بات چھیڑی تو پتہ چلا کہ موصوف واقعی اللہ لوک ہے۔ بالکل سادہ، تعلیم بھی بہت کم، دنیا داری میں دلچسپی نہ ہونے کے برابر، ملاقات کو بہت غیر دلچسپ پا کر آخر میں نے جانے کی ٹھانی۔ چائے وغیرہ بھی نہ پی۔ شاید بیٹھتا بھی تو چائے کا کوئی بندوبست نہ ہوتا۔

میں آپ کو بتا چکا ہوں کہ مقدمہ کا فیصلہ احمد حسن کے حق میں ہو گیا تھا۔ اپنے نئے سسرالی رشتہ داروں کی وجہ سے کاروبار میں

ترقی کی امید بھی بندھ گئی تھی چنانچہ انہوں نے چند ہی دنوں میں اپنے مخالفوں سے زمین خالی کروالی اور پروگرام بنایا کہ اس پر فلور مل بنائیں گے۔ ان دنوں احمد حسن بہت خوش رہتے تھے، چہرے پر سرخی، چال میں اعتماد، گفتگو میں سرمایہ دارانہ وقار، موٹر سائیکل کی جگہ ایک چھوٹی سی کار۔ اپنی دوکان پر موجود بھی کم ہوتے، ایک بااعتماد ملازم ان کی جگہ گدی پر ہوتا اور کام چلاتا۔ غرض یہ کہ ایسا معلوم ہوتا تھا کہ قسمت ان کے حق میں بہت بڑا پلٹا کھانے والی ہے۔

سہ پہر ساڑھے چار بجے کا وقت ہوگا، ہم چائے پی رہے تھے کہ اچانک فون کی گھنٹی بجی۔ میں نے فون اٹھایا۔ احمد حسن کے ملازم کی گھبرائی ہوئی آواز آئی: "جناب شاہ صاحب کو بتا دیں کہ احمد حسن بابو کا قتل ہوگیا ہے، کوئی ایک گھنٹہ پہلے۔ پولیس آئی ہوئی ہے"۔ شاہ صاحب نے مجھے کہا چلو چل کے پتہ کرتے ہیں کہ کیا معاملہ ہے؟ ہوسکتا ہے یونہی کسی نے فون کر دیا ہو۔ جب شو روم پر پہنچے تو پتہ چلا کہ تفصیلات درست ہیں۔ یہ قتل زمین سے پیدا ہونے والی دشمنی کا شاخسانہ تھا۔ سامنے والوں کا جوان لڑکا تاک میں تھا۔ دوپہر کے وقت جونہی احمد حسن گھر سے نکلے اس نے ایک بڑی اینٹ اٹھا کر کار کی سکرین پر ماری۔ جونہی انہوں نے کار روکی دروازہ کھول کر باہر نکالا اور خنجروں کے پے در پے وار کرکے احمد حسن کو شدید زخمی کر دیا جو بعد میں زخموں کی تاب نہ لاکر چل بسے۔ ملزم قتل کے بعد کچھ دیر مفرور رہا۔ پھر پولیس کے سامنے پیش ہوگیا۔ اس کے بعد قتل کے مقدمے کا ناخوشگوار اور تکلیف دہ عمل شروع ہوا۔ وہی عدالتیں، پولیس، کچہری، وکلاء۔ اس دوران میں احمد حسن کے اہلِ خانہ سے کچھ ملاقاتیں ہوئیں پھر پتہ چلا کہ قاتل کو سزائے موت ہوگئی ہے جو کہ بعد میں عمر قید میں تبدیل ہوگئی کیونکہ مجرم بہت نوعمر تھا۔

اس اثناء میں ہم نے مکان بدل لیا اور کسی اور جگہ چلے گئے۔ کافی دیر اس پرانی جگہ پر آنا ہی نہ ہوسکا۔ ایک دن اتفاق سے اُدھر سے گزر ہوا تو سوچا کہ چلو ذرا دیکھوں کہ دوکان کا کیا حال ہے۔ چل رہی ہے کہ بند ہے۔ احمد حسن کا بھائی بے چارہ تو فاترالعقل تھا کاروبار تو ٹھپ ہوگیا ہوگا۔ افسوس کیسے کیسے خیالات تھے مرحوم کے اور کیا ہوگیا۔ میں ان خیالات میں ڈوبا ہوا دوکان کے سامنے پہنچ گیا۔

میری حیرت کی حد نہ رہی جب میں نے دیکھا کہ دوکان اس سے دوگنی اور شاندار بن چکی ہے۔ سامنے متنازعہ زمین پر ایک چھوٹی سی فلور مل بھی نظر آرہی ہے۔ گدی کی جگہ ایک باقاعدہ دفتر ہے اور دفتر میں ایک شاندار بابو بیٹھا ہے۔ جب غور سے دیکھا تو پتہ چلا کہ وہ تو احمد حسن کا چھوٹا بھائی تھا! وہی فاترالعقل، کم رو، دنیاداری سے نابلد شخص اس وقت نہایت خوش رو اور خوش مزاج آدمی کے روپ میں دکھائی دے رہا تھا۔ بے حد صحت مند۔ آنکھوں میں ذہانت کی چمک۔ میں نے مرعوب ہوکر سلام کیا تو اس مجھے اپنے ساتھ لپیٹا لیا اور بے حد گلہ کیا کہ میں اتنے عرصے تک کیوں نہیں آیا اور یہ کہ احمد حسن کے بعد مجھے چاہیئے تھا کہ میل جول رکھتا۔ موصوف کا نام محمد حسن تھا۔

تفصیلات معلوم کرنے پر پتہ چلا کہ احمد حسن کے قتل کے بعد اس نے اپنی بھاوج یعنی امیر کبیر خاندان والی سے شادی کرلی تھی اور سسرال والوں نے جو مراعات احمد حسن کے لئے مخصوص کر رکھی تھیں، سب اس کے لئے وقف کر دیں۔ انہیں کا یہ اعجاز تھا کہ دوکان نے ترقی کی اور مل چالو ہوگئی۔

ابھی میں اپنی حیرت پر قابو پا ہی رہا تھا کہ میری نظر معاً اس مخصوص نشست پر پڑی جس پر عرصہ دراز تک محمد حسن بیٹھا کرتا تھا۔ میں یہ دیکھ کر دم بخود رہ گیا کہ وہاں ویسا ہی دبلا پتلا کم رو، خاموش طبع، سانولی رنگت کا آدمی بیٹھا تھا۔ دنیا سے بے نیاز۔ میرے پوچھنے پر محمد حسن نے بتایا "یہ احمد حسن کا بڑا لڑکا ہے۔ ایسے ہی اللہ لوک۔ دنیاداری سے دلچسپی نہیں۔ نماز روزہ پر زور ہے۔ یہاں میرے پاس بیٹھا رہتا ہے۔ احمد حسن نے مرتے وقت کہا تھا کہ اس کا خیال رکھنا۔ اپنا خرچ پانی مجھ سے لے لیتا ہے۔ چھوٹا موٹا کام کر دیتا ہے۔ چلو کاکا، شاہ صاحب کے لئے چائے بنا، ابھی سی"۔

کاتک کا اُدھار

مرزا حامد بیگ

اُس کے آنے کا یوں تو کوئی وقت اور موسم مقرر نہ تھا لیکن گلابی جاڑوں میں اُس کا پہنچ جانا جیسے طے تھا۔ کاتک کا مہینہ چڑھتا اور فصلیں سیٹ لی جاتیں تو اُس کا انتظار جیسے شروع ہو جاتا اور پھر اچانک کسی روز وہ آنکلتا، بنا کسی پیشگی اطلاع کے، اور پوری آبادی اُسے گھیر لیتی۔ ایک ہجوم اکٹھا ہو جاتا اور وہ اپنا کام نمٹا کر پلٹ جاتا۔ موسم ایک کے بعد ایک گزرتے رہتے۔ دن، ہفتے اور مہینے قلانچیں بھرتے ہوئے دور نکل جاتے اور ان کے پیچھے دُھند گہری ہوتی چلی جاتی۔

پھر اچانک کسی روز، کوئی ایک اُس کا ذکر لے بیٹھتا۔ حویلیوں میں بڑی بوڑھیاں اور حجروں میں سال خوردہ سفید پوش بزرگ کہتے، کاتک کا مہینہ چڑھ گیا۔ بس اب وہ آنے والا ہوگا۔ پچھلے برس انہی دنوں میں وہ آیا تھا، پر جانے اس بار کیوں نہیں آیا۔

گزشتہ برس انہی دنوں میں کون آیا تھا؟ ہم آپس میں کھسر پھسر کرتے۔ لیکن کسے یاد رہتا تھا اُن دنوں برس کے برس آنے والے کا نین نقش۔

حجرے میں بڑے بوڑھے ہماری کھسر پھسر پر ڈانٹ پلاتے اور ہم چپ چاپ اپنی اپنی جگہوں پر سمٹ سکڑ جاتے۔ پھر اُس کا ذکر تا دیر ہوتا رہتا اور ہم اپنی اپنی جگہوں پر گٹھری بنے نیند کی پُرسکون وادیوں میں اتر جاتے۔

”بیٹا جاگ جاؤ۔ آج نہیں جانا کیا؟“

”جانا ہے، جانا ہے“

مونہہ اندھیرے جگانے والے کی آواز سُن کر جیسے جان ہی تو نکل جاتی۔ مری ہوئی آواز میں جی ہاں، جی ہاں کرتے، سلیپر پہن مسجد میں بنے گرم پانی کے حوض کا رُخ کرتے۔ اُس وقت گلی میں کنوئیں کی طرف نکل جانے والی گہرے گھونگھٹ کاڑھے ہوئے عورتوں کی قطاریں پیتل کی گڑویاں تھامے اشنان کے لیے گزر رہی ہوتیں اور مسجد میں نمازی وضو کرنے میں مصروف ہوتے۔

”چاچا — ہم بھی —“

”آہا! اسکولی بچے آگئے۔ آؤ بھئی آؤ تمہیں دور جانا ہے۔ تم پہلے مونہہ ہاتھ دھو لو“ وضو کرنے والوں کا جُھنڈ گرم پانی کی ٹونٹی پر ہمارے لیے جگہ بنا دیتا اور ہم لپک جھپک دو دو چھینٹے پانی کے مونہہ پر مار یہ جا وہ جا۔ لالٹین کی مدھم زرد روشنی میں ٹپ ٹپ پراٹھے تلنے کی آواز سنتے ہوئے اپنی اُدھ پکی تختیاں اور کتابوں کے گٹھڑ میں دن کا کھانا سمیٹتے، دو دو لقمے کھا کر پانی کا گھونٹ لیتے نکل کھڑے ہوتے۔

آج دیر ہوگئی —

یُوں لدے پھندے نکلتے اور گلیوں میں ہوکا دیتے جاتے۔

"او کیمے، او چندو، او فیکے کے بچے، ہے گوپال، جانا ہے کہ نئیں؟"
"چاچی سلام — بے جی پرنام — تایا جی نمستے"۔
"جیتے رہو — ماں کا کلیجہ ٹھنڈا رہے"۔
اُن دنوں جیسے سب جلدی میں تھے۔ ایسے میں کسے یاد رہتا کہ کون آنے والا تھا جو اس بار نہیں آیا۔
ہم ہلکے جاڑوں کی پُروا کو کُھلے سینے پر سہتے، ناک رُڑکتے، گلیوں اور کھلیانوں پر کنچے اور اخروٹ کھیل رہے ہوتے کہ اچانک کسی روز وہ آ نکلتا۔ سب کہتے، دیکھو وہ آ گیا۔ گاؤں کی گلیوں میں اس کی سُریلی آواز گونجتی:
"قرآن مجید، سپارے لے لو۔ گیتا، گرو گرنتھ لے لو۔ کانگ کے ادھار پر لے لو"۔
ہم سب کچھ چھوڑ چھاڑ کر اُدھر لپکتے۔ گرد مٹی سے اَٹے ہوئے اس کے سر کے سفید گچھے دار بال فراخ ماتھے پر جھول رہے ہوتے اور وہ اپنی لدی پھندی سائیکل کے ساتھ ہمارے سامنے ہوتا۔
"آپ آ گئے؟" ہم سب مل کر پوچھتے۔
اور جواب میں وہ اپنا جھکا ہوا سر اوپر اٹھاتا: "حاضر ہو گیا جی"۔
"اس بار کیوں دیر کر دی آپ نے؟ حویلی اور حجرے میں سب آپ کو یاد کر رہے تھے"۔
"بس آ گیا بچّہ۔ جیسے تیسے پہنچ ہی گیا"۔
"چھوڑیں جی۔ آج آ گئے اتنے دن بعد"۔
"ارے بھاگوان۔ آ جو گیا۔ خوش ہو جاؤ"۔
"نہیں آنا ہوتا تو نہ آیا کریں۔ انتظار کیوں کرواتے ہیں؟"
"اوم نشوائے — اوم نشوائے"۔
وہ ہمارے سامنے دونوں ہاتھ جوڑ کر مسکراتے ہوئے اپنی سائیکل وہیں روک دیتا۔ ہماری نظریں سائیکل کے کیرئیر پر بندھے بھاری گٹھڑ کا طواف کرتی رہتیں اور وہ آبادی کے مرکزی رہٹ میں گڑی ہوئی پتھر کی بھاری سل پر ٹک کر بیٹھ جاتا۔ پھر اس کے اردگرد گھیرا تنگ ہوتا چلا جاتا، ایک ادھم سا مچ جاتا۔
"اس میں کیا ہے چاچا؟"
"ارے، بھول گئے۔ جو کچھ پچھلے برس لایا تھا"۔ وہ اپنے گچھے دار سفید بالوں کو دونوں ہاتھوں کی کنگھی بنا کر پیچھے دھکیلتا۔
"پچھلے برس کیا لائے تھے چاچا؟ اسے کھولو نا"۔
"کھولتا ہوں۔ کھولتا ہوں۔ ذرا سانس تو لینے دو۔ بہت دُور سے آ رہا ہوں پینڈا کھوٹا کرتے ہوئے۔ دو گھونٹ پانی کے کون پلائے گا بھلا؟" وہ تھکی ہوئی مسکراہٹ کے ساتھ ہم سب کی طرف باری باری دیکھتا۔
"میں لاؤں گا"۔
"میں لاتا ہوں کٹورا بھر کے"۔
"اوم نشوائے"۔
ہم سب اپنے اپنے گھروں کی سمت دوڑ لگاتے۔ ایک دوسرے سے آگے نکلنے کا جتن کرتے ہوئے۔

"وہ آ گئے"!

"ہاں ہاں، سُن لی ہے اُس کی آواز —— ذرا آرام سے —— دیکھو گیر دیا نا سارا پانی —— دیکھو مٹی لگی ہے —— کٹورا دھو کرے جاؤ"!

پانی کے تو وہ محض دو گھونٹ ہی پیتا۔ درحقیقت اسے اپنا بھاری گٹھڑ کھولنے اور کتابیں ترتیب دینے کے لیے وقت درکار ہوتا تھا جو ہماری آپس کی بھاگ دوڑ کے سبب میسّر آ جاتا۔ ہم جب تک اپنے گھروں سے پلٹتے، وہ گلی میں گڑی ہوئی پتھر کی سِل پر اپنی دکان ترتیب دے چکا ہوتا۔ سفید براق چادر پر سنہری جلد والے قرآن مجید، منقش گیتا اور گرنتھ صاحب کی بھاری جلدیں سج چکی ہوتیں۔

"چاچا یہ اتنی ساری کتابیں؟"

"ہاں بیٹا —— لیکن دیکھو، ان کو چھوتے نہیں ہیں اشنان کیے بغیر، وضو کیے بغیر"!

"کیوں چاچا؟"

"پاک کلام ہے بیٹا —— پاک کلام"!

پھر جب تک کھانستے کھنکارتے ہوئے بڈھے اُدھر کا رُخ کرتے، وہ ہم سب میں مٹھیاں بھر بھر کر مُرمریاں اور بتاشے بانٹ چکا ہوتا۔

"السلام علیکم —— نمسکار —— پرنام"!

جھک جھک کر سب کو اپنے مٹھیے پر خوش آمدید کہتا ہوا بچھ بچھ جاتا۔ اس کے بعد جیسے ہمارا کام ختم ہو جاتا لیکن ہم رُکے رہتے۔ اُس کے گرد اگرد گھیرا تنگ کیے ہوئے۔ پھر کوئی ڈانٹ کر کہتا: "چلو بچہ لوگ، چلو۔ تمہارا کام ختم"۔ اور ہم لوگ مرمریاں اور بتاشے کھاتے ہوئے دائیں بائیں سٹک جاتے۔

محدب عدسوں والی عینکیں سنبھالے بڈھے ٹھڈے چھوٹے اور بڑے حروف کے بکھیڑے میں پڑ جاتے۔ بھیگی مسوں والے جوان وارث شاہ کی ہیر طلب کرتے۔ کوئی کہتا: "کبیر کے دوہے لانے کا وعدہ کیا تھا آپ نے؟"

"سب لایا ہوں بیٹا جی، سب لایا ہوں"!

"اور میں نے میرا بائی کے بھجن کہے تھے"!

"ارے بھاگوان —— یوں ہی ناراض کاہے کو ہوتے ہو۔ یہ الگ سے باندھ کر رکھا ہے آپ لوگوں کا مال"!

پھر کوئی بزرگ سب کو ڈانٹ پلاتا: "اک ذرا دم لو۔ ہٹ جاؤ پیچھے۔ پاک کلام کی بات ہو جائے پہلے"!

"جی بھائی میاں —— جی بہن جی ——"

یوں گزشتہ برس کاتک کے اُدھار پر لئے گئے سودے کے ہدیے نذرانے کا حساب جھٹ پٹ ہو جاتا۔ نئے لین دین کا معاملہ آئندہ کاتک پر چھوڑ دیا جاتا اور یوں بڈھے ٹھڈے سب سے پہلے فراغت پا جاتے۔

اب بات چلتی بھگت کبیر کے دوہوں، وارث شاہ کی ہیر اور میرا بائی کے گیتوں اور بھجنوں کی، اور یہ سب کچھ بھی آئندہ کاتک پر نمٹ جاتا۔ ہم ان بکھیڑوں سے دور کھلیانوں میں اپنا اپنا لٹو مقابلے میں چھوڑ کر ہاکڑوں بیٹھے اُن کی گھونکار سننے میں محو ہوتے اور یہ بھول جاتے کہ اسے معاملہ نمٹا کر پلٹ جانا ہے۔ جب شام کے سائے گہرے ہونے لگتے تو ہم جلدی جلدی آبادی کے سرے کا رُخ کرتے اور وہاں کچھ بھی نہ پاتے۔ یوں ایک بار پھر کاتک کا انتظار شروع ہو جاتا۔

مگھر، پوہ اور ماگھ کی سردیوں تک تو ہمیں یاد رہتا کہ کون آیا تھا لیکن پھاگن اور چیت میں بسنت کے ہنگامے تن من کا ہوش

بُھلا دیتے۔ بیساکھ سے اساڑھ تک کی چلچلاتی طویل دوپہروں میں چھٹیوں کا کام سمیٹتے ہوئے اُس کی کھلائی ہوئی یاد جیسے دلوں میں کروٹ لیتی پر کیا کچھ یاد رکھا جائے۔ ساون بھادوں میں مینہ کی جھڑی کچھ اس تواتر کے ساتھ لگتی کہ ذہن کی سلیٹ دُھل دُھلا کر صاف ہو جاتی۔ اسوج کے مہینے میں کوئی کہتا، اگلا مہینہ کاتک کا ہے۔ پاک کلام کا اُدھار، ہدیہ، نذرانہ تو ادا کرنا ہی کرنا ہے، وہ آئے تو یہ بوجھ سر سے اُترے۔ کاتک چڑھتا تو ہم سوچتے اگزشتہ برس کون آیا تھا؟ کسے یاد رہتا تھا اُن دنوں برس کے برس آنے والے کا نین نقش لیکن اس بار سب بزرگ کہہ رہے تھے کہ حالات کا کچھ ٹھیک نہیں۔ ملک کا بٹوارہ ہونے والا ہے۔

اُن دنوں ہم نے گرمیوں کی چھٹیوں کا اسکول کا کام تقریباً سمیٹ لیا تھا اور ساون کی پہلی جھڑی لگی تھی۔ رات کا کھانا کھا کر کھڑاؤں پہنے ہوئے میں بھیگتا ہوا جب حجرے میں پہنچا ہوں تو معلوم ہوا کہ اسلحہ اکٹھا ہو رہا ہے۔ اُدھر بھی اور اِدھر بھی۔ کسی نے بتایا کہ اب اُدھر سے کسی مسلمان کا صحیح سلامت لوٹ آنا ممکن نہیں۔ ہماری بستی میں مسلمان آبادی زیادہ تھی اس لیے دیگر لوگ یہ خبر سُن کر کچھ سہم سے گئے۔ اس کے باوجود رات کو حجرے میں سبھی آتے تھے اور حسبِ معمول اکٹھے بیٹھ کر تازہ ترین خبروں پر تبصرہ بھی کرتے۔

مجھے وہ دن کبھی نہیں بھولے گا جب میں اپنے میاں جی کی چادر میں دنیا جہان سے بے پروا، اُن کی کمر میں بازو ڈالے، گٹھڑی بنا بیٹھا تھا اور میرے سامنے والی چارپائی پر میرا دوست بلونت اپنے باپو کی چادر میں سے منہ نکالے میری طرف دیکھ دیکھ کر مسکرا رہا تھا۔ تب یکایک اس کا باپو کسی بات پر بہت مغموم ہو کر اُٹھ کھڑا ہوا تھا اور اس نے بھرے ہوئے حجرے سے پوچھا تھا:

"یارو، مجھے بتاؤ کہ اب ہم کیا کریں۔ یہ زمین اگر ہم پر تنگ ہونا ہی ہے تب بھی بتا دو اور اگر تم لوگ اجازت دو تو میں آخری آدمی ہوں گا جو اس بستی کو چھوڑ کر جائے گا۔ لیکن میں واہگورو جی کا واسطہ دے کر کہتا ہوں کہ اس حجرے میں ایسی باتیں نہ کرو ہمارے بچوں کے سامنے۔ تمہارے رب کا واسطہ، نہ کرو ایسے ——"

یہ سُن کر سب چُپ چاپ بیٹھے رہے۔ کسی نے کچھ بھی نہیں کہا۔ پھر انہوں نے بلونت کے کندھے پر ہاتھ رکھا اور بولے: "آؤ بیٹا چلیں۔ ان کو فیصلہ کرنے میں وقت لگے گا۔" اور واقعتاً میں نے دیکھا کہ سب کو فیصلہ کرنے کے لیے بہت وقت درکار تھا۔ کوئی فیصلہ ہی نہیں کرتا تھا۔

اگلے روز بلونت نے مجھ سے پوچھا: "کیا فیصلہ کیا پنچایت نے؟"

میں کیا جواب دیتا۔ بس چُپ رہا۔ پھر میں نے چپکے چپکے الگ لے جا کر اپنے سارے یاروں سے پوچھا: "تم جا تو نہیں رہے نا؟" جواب میں گوپال، رگھبیر، چندو، سنتوکھ اور سامو سب چُپ تھے۔ میں حیران تھا کہ ہم جو اپنی کوئی بات بھی ایک دوسرے سے نہیں چھپاتے تھے، جانے اس سوال کے جواب میں کیوں چُپ سی لگ گئی تھی سب کو۔

ہر طرف سے بُری بُری خبریں ہی سُننے کو ملتی تھیں۔ کھیت، کھلیان، حجرہ جہاں جاؤ بٹوارے کا ہنگامہ ہی سنتے تھے۔

ایک شام، حجرے میں کسی بزرگ نے موضوع کو بدلنے کی خاطر صرف اتنا کہا:

"ساون تو پڑ گیا۔ رہ گئے بھادوں اور اسوج، بس کاتک کا مہینہ آیا کہ آیا ——" تب جوش سے بھرے ہوئے نوجوانوں نے جیسے یک زبان ہو کر اُس کی بات کاٹ دی: "اتنی جلدی کیا ہے چاچا —— اس وقت سوچنے کی اور بہت سی باتیں ہیں۔ پاک کلام کا اُدھار تو سونے کی مُہر ہے۔ جب آئے گا تو ادا کر دیں گے۔"

بس اتنا ہی سنا میں نے اور آنے والے کے دھندلے نقوش ذہن میں اُبھرنے لگے۔ پھر جیسے ہم سب دوستوں نے خیالوں ہی خیالوں میں اسے گھیر لیا آبادی کے سرحدے پر۔ وہ ہم سب میں مُرمریاں اور بتاشے، مٹھیاں بھر بھر کر بانٹنے لگا تھا کہ عین اُس وقت حجرے میں جانے

کسی بات پر دو بزرگوں میں جھک جھک شروع ہوگئی اور انہوں نے ہمیں حجرے سے اُٹھا دیا۔

اگلے دو چار روز ہی معلوم ہوا کہ بٹوارہ ہوگیا۔ پر کیسے؟ ہم نے ایک دوسرے سے پوچھا۔ کچھ سمجھ میں نہ آیا۔ پھر شہر سے خبر آئی کہ جہاں تہاں لوٹ مار اور چھرا بھونکنے کی وارداتیں ہونے لگی ہیں۔ بلونت، گوپال، چندو، سنتوکھ اور رامو اب گھر سے نہیں نکلتے تھے۔ میں خود ہی ان کے پاس جاتا، کیمے اور فیکے کو ساتھ لے کر۔

کسی نے شہر سے پلٹ کر بتایا کہ واگہ کے راستے اِدھر آنے والے مہاجرین کی اسپیشل لُوٹ لی گئی، بلموں اور کرپانوں سے مسلح بلوائیوں نے کاٹ کر رکھ دیا ساری ٹرین کو۔ جس روز حجرے میں یہ خبر سنی گئی، اسی شام پنچایت نے کر لیا فیصلہ۔ نمبردار نے گھروں میں آدمی بھیج کر حجرے میں سب مردوں کو بلا بھیجا۔ ہم سب اُن لوگوں کے آنے اور فیصلہ سننے کے منتظر بیٹھے تھے کہ کسی نے کہا: "بچّے لوگ چلو — تمہارا کام ختم۔" اور ہم لوگ حجرے سے اُٹھ آئے۔

جانے کیا فیصلہ کیا تھا پنچایت۔ یہ سوچتے سوچتے سو گیا۔ اس رات ساون ٹوٹ کر برسا تھا۔ رات کو زور سے بجلی چمکی تو میری آنکھ اچانک کُھل گئی۔ برابر کی چارپائی پر ماں نہیں تھی اور ڈیوڑھی میں سے عورتوں کے رونے کی گھٹی گھٹی آوازیں آ رہی تھیں۔ میں آنکھیں مَلتا ہوا اُٹھ بیٹھا۔ صحن میں کوئی نہیں تھا اور چھاجوں پانی برس رہا تھا۔

میں ننگے پاؤں بارش میں بھیگتا ہوا ڈیوڑھی تک گیا تو لالٹین کی زرد روشنی میں دیکھا کہ کونے میں دیوار کے ساتھ لگ کر بلونت اور گوپال کھڑے ہیں۔ اُس وقت بلونت کی ماتا جی ڈیوڑھی کے ٹھنڈے فرش پر آلتی پالتی مارے بیٹھی رو رہی تھیں اور گوپال کی بے جی، میری ماں سے گلے مل کر جیسے الوداع کہہ رہی تھیں۔ میں نے یہ سب دیکھا اور حیران کھڑا رہا۔ پھر میاں جی نے گلی میں سے آواز دی: "چلو بھئی چلو۔ دیر ہو رہی ہے۔"

یہ سن کر دونوں عورتوں نے روتے روتے مجھے گلے لگا کر پیار کیا اور باہر نکل گئیں۔ گوپال اور بلونت چپ چاپ ان کے پیچھے چلتے ہوئے مجھے ملنے کی خاطر لحظہ بھر کو رُکے۔ لیکن اسی لمحے باہر سے کسی نے گرج کر کہا: "چلو — چلتے کیوں نہیں؟" وہ دونوں چل پڑے اور میں وہیں کھڑے کا کھڑا رہ گیا۔ ماں نے جھک کر ڈیوڑھی سے باہر جھانکا اور دروازہ بھیڑ کر اندر سے کُنڈی لگا دی۔ میں ان کے ساتھ کمرے میں آگیا۔

"یہ لوگ کہاں جا رہے ہیں ماں؟" میں نے پوچھا۔ لیکن کوئی جواب نہ ملا۔

"میاں جی سے ایک بات کرنی ہے میں نے۔"

"کیا بات کرو گے؟" ماں کی آواز بیٹھی ہوئی تھی۔

"بس ایک بات ——"

ماں نے اپنا چہرہ تیزی سے دوسری طرف موڑ لیا۔

"تم کیوں جاگ گئے؟ سو جاؤ۔"

"گوپال اور بلونت لوگ اس بارش میں کہاں جائیں گے ماں؟"

"سب خیر ہوگی۔ تُو اب سو جا۔"

"لیکن ماں ——"

"بس کر اب۔ وہ سب لوگ جا رہے ہیں۔"

"سب کون؟"

"وہ سارے، جو اب اِدھر نہیں رہ سکتے۔ تیرے میاں جی اور بیس جوان بندوقوں کے ساتھ انہیں چھوڑنے جا رہے ہیں، حفاظت

کے ساتھ۔ حسن ابدال سے آگے جرنیلی سڑک چڑھا کر آئیں گے انہیں۔"

"اور اس سے آگے ماں؟"

ماں نے مجھے دونوں بازوؤں میں بھینچ کر اپنے ساتھ چارپائی پر لٹا لیا۔

"چُپ کر جا۔ بہت رات ہو گئی۔ خیر کی دُعا مانگ۔" ماں نے میرے اُوپر چادر ڈالتے ہوئے دوسری طرف کروٹ لے لی۔ میں نے گوپال اور بلونت کے لیے بہت دعائیں مانگیں۔ ساری رات جاگتا رہا۔ اس انتظار میں رہا کہ صبح ہو تو جاؤں اور دیکھوں کہ رگھبیر، چندو، سنتوکھ اور راموں لوگ بھی تو کہیں چلے نہیں گئے۔ ماں بھی شاید ساری رات جاگتی رہی لیکن وہ چپ تھی اور میرے کسی سوال کا جواب نہیں دیتی تھی۔ میری ہر بات پر بس ادھر سے اُدھر کروٹ لے لیتی۔ مسجد سے اذان کی آواز آئی تو میں اُٹھ کھڑا ہوا۔

"کیوں؟ کیوں اُٹھ بیٹھا اس وقت؟" ماں نے پوچھا۔

"میں مسجد جاؤں گا۔"

"اسکول تو بند ہے بیٹا۔"

"پر میں جاؤں گا مسجد۔"

وہ چُپ رہی اور میں میاں جی کی کھڑاؤں پہن کر باہر نکل آیا۔ اب بارش تھم چکی تھی اور ہر طرف کیچڑ بھرا تھا۔ میں نے دیکھا کہ راموں کے دروازے پر تالہ پڑا ہے۔ پھر میں سارے گاؤں میں گھوم گیا۔ سب دروازوں پر تالے نہیں تھے۔ سنتوکھ اور چندو لوگوں کے دروازوں پر باہر سے کنڈی چڑھی تھی البتہ رگھبیر کے گھر کا دروازہ کھُلا تھا۔ اُن کے صحن میں کھڑے شہتوت کے درخت ہلکی ہوا میں جھول رہے تھے اور گھر میں کوئی نہ تھا۔ برآمدے میں بچھے ہوئے دیوان پر رگھبیر کا آدھ کھلا بستہ رکھا تھا اور پُتی ہوئی تختی۔ گھر میں سب کچھ اسی طرح تھا، صرف مکین نہیں تھے۔

میں باہر نکل آیا اور مسجد کا رُخ کیا، تاکہ معلوم کروں کہ یہ سب لوگ آخر کہاں گئے ہوں گے۔ مسجد میں گرم پانی کے حوض پر معمول کا جمگھٹا تھا لیکن آج گلی میں وہ پہلے والی بات نہ تھی۔ نمازی وضو تو کر رہے تھے لیکن ان کے چہرے ایک ہی رات میں جیسے ماند پڑ گئے تھے۔ میں ہر ایک کا چہرہ پڑھنے کی کوشش کرتا رہا۔ کیا یہ خوش ہیں؟ کیا ان کو بھی رنج ہے ان لوگوں کے چلے جانے کا؟ پر کچھ سمجھ میں نہیں آیا۔

میں ایک طرف دیوار سے لگ کر کھڑا تھا۔ کسی نے کہا: "اسکولی بچے آ گئے۔ آؤ بھئی آؤ۔ تمہیں دُور جانا ہے ——"

"نہیں —— میں نے کہیں نہیں جانا۔ جنہیں دُور جانا تھا وہ تو چلے گئے۔" میں نے صرف اتنا کہا اور تیزی کے ساتھ پلٹ پڑا، بغیر مونہہ ہاتھ دھوئے، اپنے گھر کی طرف۔ راستے میں حجرہ پڑتا تھا، جہاں چند لوگوں کو میں نے آپس میں سر جوڑے کھُسر پھُسر کرتے دیکھا۔ ایک طرف چارپائی پر میاں جی اور نمبردار رشید خاں بیٹھے تھے۔ مجھے دیکھ کر میاں جی حیرانگی کے ساتھ اُٹھ کھڑے ہوئے۔

"بیٹا —— اسکول تو بند ہے۔ پھر تم سویرے سویرے ——"

"میاں جی —— وہ لوگ جرنیلی سڑک کو چڑھ گئے تھے؟"

"ہاں بیٹا۔ ہم انہیں اپنی حفاظت میں لے کر گئے تھے۔ میں خود ساتھ تھا، لیکن اللہ کی مرضی ——"

"کیا ہوا میاں جی؟" میرا دل جیسے بیٹھ سا گیا۔

"تم اب گھر جاؤ۔ ہمیں کچھ ضروری باتیں کرنا ہیں۔ میں آ رہا ہوں گھر کی طرف۔"

"لیکن میاں جی —— وہ ——"

"میں نے کہا نا ——— آ رہا ہوں میں ———"

میں نے گھر کی طرف جاتے جاتے باقی لوگوں کے چہروں کی طرف دیکھا۔ میں حیران رہ گیا کہ ان سب کے نین نقش کو رات کی طوفانی بارش نے جیسے دھو ڈالا تھا۔ اُن کی شباہتیں جیسے مٹ گئی تھیں۔ میں سخت حیران تھا کہ اتنے سارے لوگوں میں، میں نے اپنے باپ کو کیسے پہچان لیا۔ شاید اُن کے بھاری ڈیل ڈول کے سبب، یا شاید اس وقت دھندلکا تھا اور میں ٹھیک طرح دیکھ نہیں پا رہا تھا۔

میں گھر کی طرف مڑا تو میں نے دیکھا کہ گلی میں میرے آگے آگے بہت سی عورتیں چادریں لیے ہوئے تیزی کے ساتھ ہماری حویلی کی طرف جا رہی تھیں۔ یہ چادروں والیاں اس وقت نکلتی تو نہیں ہیں گھر سے، پھر یہ آج کیا ہوا انہیں۔ میں ان کے پیچھے پیچھے تیزی کے ساتھ چلتا ہوا اپنے گھر کے صحن تک آیا، جہاں چارپائیوں اور گیلے فرش پر جیسے سارے گاؤں کی عورتیں جمع ہو گئی تھیں۔

وہ سب چپ تھیں اور اس وقت صرف ان کی گود کے اکا دکا بچوں کے رونے کی آواز آ رہی تھی۔ درمیان کی چارپائی پر میری ماں سر نیوڑھائے بیٹھی تھی۔ میں نے اس کے قریب جا کر پوچھا: "کیا ہو گیا ماں؟"

"کچھ نہیں۔ تم اندر چلو"

"پر ہوا کیا ہے؟"

یہ سن کر مائی جیواں اٹھی اور اس نے مجھے اپنے گلے سے لگا لیا۔ پھر وہ زور سے رو دی۔ میں اس کے چہرے کی طرف دیکھتا تھا اور پوچھتا تھا۔ ہوا کیا ہے؟ بتاؤ ہوا کیا ہے؟ پر وہ کوئی جواب ہی نہیں دیتی تھی۔

مائی جیواں رو رہی تھی اور اسے دیکھ کر دیگر عورتوں نے اپنے اپنے چہرے چادروں سے ڈھانپ لیے تھے اور آگے کو جھک گئی تھیں۔ میں نے صرف ان کی سسکیاں ہی سنیں۔ مائی جیواں نے مجھے اسی طرح اپنے سینے کے ساتھ بھینچے رکھا۔ پھر بہت دیر بعد اس نے صرف اتنا کہا: "بیٹا، تیرے سارے دوست نسٹ گئے۔ ایک ہی رات میں!"

"کیسے نسٹ گئے؟ ہوا کیا ہے؟"

اب میں پورا زور لگا کر اس کی گرفت سے آزاد ہو گیا۔ میں سب کچھ سمجھ گیا تھا لیکن پھر بھی ان کی زبان سے تصدیق چاہتا تھا۔ پر کوئی بولتا ہی نہیں تھا۔ بس روئے جاتی تھیں، ساری کی ساری۔

ڈیوڑھی سے جب میاں جی نے کھنکار کر گلا صاف کرتے ہوئے صحن میں قدم رکھا تو میں آہستگی کے ساتھ سر جھکائے ہوئے، ان کے قریب سے ہو کر باہر نکل گیا۔ کھلیانوں کی طرف۔

ان لوگوں نے آخر کس دل کے ساتھ ایسا کیا؟ یہ لوگ تو وہ تھے جنہیں کاتک کا ہدیہ، نذرانہ سارا سال یاد رہتا تھا۔ میں سوچتا رہا اور اس ٹوہ میں رہا کہ اصل حقیقت جان لوں، لیکن ناکام رہا۔ پھر یہ وقت بے وقت کی بارشیں بھی تو ذہن کی سلیٹ کو دھوتی رہتی ہیں۔

اس اثنا میں ایک بار میاں جی کے ہمراہ شہر کا چکر لگا تو معلوم ہوا کہ اُدھر بھی اور اِدھر بھی، دونوں طرف امن کمیٹیاں بنائی جا رہی ہیں۔ کسی نے کہا، بس اب معاملہ ٹھنڈا پڑ گیا۔ لیکن آگ تھی کہ اندر ہی اندر سلگتی رہی۔ بھادوں اور اسوج کے مہینے اسی طرح گزر گئے۔

میں نے اب پانچویں پاس کر لی تھی اور میاں جی نے مجھے شہر کے اسکول میں داخل کروا دیا تھا۔ بچے کھچے دوستوں میں کیما اور فیکا تھے، جو گاؤں ہی میں رہ گئے۔ شہر میں کسی عزیز رشتہ دار کے نہ ہونے کے سبب مجھے بورڈنگ میں داخلہ لینا پڑا۔ بس اتوار کے اتوار چھٹی ملنے پر گاؤں کا چکر لگ جاتا۔

ہمارے اسکول کے قریب دفترِ بحالیات قائم کیا گیا تھا۔ جہاں سارا دن مہاجرین کی آمد و رفت رہتی۔ آدھی چھٹی میں ہم چند دوست

مل کر اس دفتر کے باہر کھڑے ہوئے مہاجرین کو قریب سے دیکھتے۔ یہ سب اُدھر سے آئے تھے۔ گاؤں جاتا تو میاں جی اور شہر میں ماسٹر صاحب کہتے، اب بڑی کلاس ہے میاں، سخت محنت کرنا ہوگی۔ چھوڑو سارے بیکار کے بکھیڑے ہیں، ادھر توجہ دو۔ شاید اسی لیے کاتک کا مہینہ گزر گیا، تب یاد آیا کہ گاؤں میں ہم سب دوستوں کو سال بھر کسی کے آنے کا انتظار رہا کرتا تھا۔ سوچا، اب کیا فائدہ، کوئی آئے یا نہ آئے۔ دوست تو سارے نمٹ گئے۔

ایک سنیچر کی شام کو گاؤں جانا ہوا تو کیسے اور فیکے نے بتایا کہ وہ جو آنے والا تھا، اس بار نہیں آیا۔

"کیا واقعی؟ کاتک کا مہینہ تو گزر گیا؟" میں نے حیران ہو کر پوچھا۔

"ہاں گزر گیا۔ حالات کا بھی تو کچھ ٹھیک نہیں۔" فیکے نے جواب دیا۔

شام کو حجرے میں بیٹھے تو کسی نے کہا: "ارے بھئی، کوئی معلوم تو کرو۔ کاتک گزر گیا اور ہم نے ہدیہ، نذرانہ جو کچھ بھی ہے لوٹانا تو ہے ہی۔ اب کے وہ آیا نہیں کہ حساب چکتا کرتے۔"

"کلام پاک کا اُدھار تو سونے کی مہر ہے۔ پر وہ لینے آئے بھی۔" دوسرا بولا۔

"لیکن کاتک تو گزر گیا۔ اب کیا کریں؟ کسے لوٹائیں پاک کلام کا قرض؟"

میاں جی بولے: "ابھی پچھلے برس ہی کہا تھا اس کم بخت کو کہ پاک کلام اٹھائے پھرتا ہے، ایک کلمہ ہی پڑھنا ہے نا۔ پڑھ کیوں نہیں لیتا۔ جواب میں ہنس کر کہنے لگا، میاں جی، پڑھتا تو ہوں۔"

"وہ ہم ہی سے تھا یا اُن میں سے؟" کسی نے پوچھا۔

یہ سُن کر سب کو چپ سی لگ گئی۔ پھر وہ سب تادیر تمباکو پیتے اور آپس میں اُلجھتے رہے۔

اب میں جب کبھی سنیچر کی شام کو گاؤں جاتا تو یہی سُنتا کہ اب کیا کریں؟ گزشتہ کاتک کے مقروض سخت مشکل میں تھے۔ سب ہاتھ مَل مَل کر کہتے: "کہاں ڈھونڈیں اُسے؟ کتنی مدت سے آیا کرتا تھا۔ سال ہا سال گزرے دیر یا سویر ہمیشہ کاتک میں پہنچ ہی جاتا تھا۔"

"ہم نے کبھی ٹھور ٹھکانہ ہی نہیں پوچھا اُس سے۔"

"کیوں نہ شہر سے پتا کیا جائے اُس کا۔" کسی نے مشورہ دیا۔

"ہاں یہ ہوئی نا دانشمندی کی بات۔ بالکل پتا کرو۔"

"لیکن کس شہر سے معلوم کریں؟"

"جانے آتا کہاں سے تھا۔"

"ارے بھئی، پہلے اپنے شہر سے تو پتا کر لیں۔"

"ہاں یہ ٹھیک ہے۔" میاں جی نے اس بات سے اتفاق کیا اور نمبر دار نے اگلے روز میرے ساتھ دو جوان کر دیے کہ شہر میں گھوم پھر کر معلوم کرو کہ کاتک کے اُدھار پر ہدیہ کرنے کو کون تھا جو سائیکل پر اپنا بھاری گٹھڑ اٹھائے اِن مضافات کی طرف نکلا کرتا تھا۔

اگلے روز صبح صبح ہم تینوں شہر جانے کے لیے گاؤں سے نکلے تو سب نے تاکید کی کہ پوری کوشش کرنا۔ بڑے شہروں کا چکر کون لگاتا پھرے گا۔ پھر جتنے بڑے شہر ہوں گے اتنا بڑا مسئلہ۔ کہاں ڈھونڈیں بھئی۔ معاملہ قریب ہی نمٹ جائے تو اچھا ہو۔

ہم تانگے پر بیٹھنے لگے تو میاں جی نے ہدایت کی: "بیٹا اچھی طرح، توجہ سے۔"

"جی میاں جی۔" میں نے اتنا کہا اور ہم لوگ آگے بڑھ آئے۔

شہر میں دو ہی بڑے کتب فروش تھے۔ ایک سے پتا چلا کہ وہ لوگ دینی کتابیں رکھتے ہی نہیں، صرف درسی کتب فروخت کرتے ہیں۔ دوسرے نے بتایا کہ وہ لوگ بیوپاری والوں کو مال دیتے ہی نہیں، اس لیے براہِ راست چھاپے والوں سے معلوم کریں۔ چھاپے والے بڑے شہروں میں تھے۔ پھر جتنے بڑے شہر اتنے بڑے مسئلے۔ کہاں ڈھونڈیں بستی۔ عجب مشکل تھی۔ رات گئے وہ دونوں جوان شہر سے ناکام پلٹ گئے اور میں بورڈنگ ہاؤس چلا آیا۔

ہفتہ بھر بعد گاؤں گیا تو معلوم ہوا کہ دور و نزدیک کے دیگر گاؤں والے بھی اس کی تلاش میں سرگرداں ہیں۔

"اب کریں کیا؟" رات کو حجرے میں سب نے سر جوڑے اور دیر تک مشورے ہوتے رہے۔ میں بھی ایک طرف کونے میں بیٹھا ساری باتیں سُنتا رہا۔ پر اب جانے کیوں مجھے ان کو اس طرح پریشان دیکھ کر ایک انجانی سی خوشی محسوس ہونے لگی تھی اور گاؤں والوں کا ایک ہی مسئلہ تھا کہ کسی طرح ڈھونڈو اُسے۔ البتہ ایک بات کا سب کو اطمینان تھا کہ کیبت اور گردوگرنتھ کے نذرانے ہمارے ذمہ نہیں۔ جن کے ذمہ تھے وہ تو نمٹ گئے۔

شہر میں اب میرا زیادہ وقت بورڈنگ ہاؤس کے نئے دوستوں کے ساتھ گزرنے لگا۔ اسکول سے چھٹی ملتی تو کھانا کھا کر ہوم ورک کرتے اور شام کو اندرونِ شہر کی طرف اکٹھے گھومنے نکل جاتے۔

ان دنوں ہر جگہ مہاجرین کے آنے اور جائیداد کے جھوٹے سچے کلیموں کی باتیں ہوتیں۔ دفترِ بحالیات کے اہلکاروں کی دھاندلیوں اور من مانیوں کا ذکر چھڑا رہتا اور چونکہ بحالیات والے ہمارے اسکول کے سامنے ہی تھے، اس لیے ہمارے اسکول ماسٹر بھی آپس میں سارا دن یہی معاملات زیرِ بحث لاتے۔

اُدھر گاؤں والے ہدیے اور نذرانے کے بوجھ تلے دوہرے ہو چلے تھے کہ اچانک ایک دن یہ معاملہ بھی نمٹ گیا۔

ہم چند دوست آدھی چھٹی میں اسکول کے گیٹ پر خوانچہ فروشوں کے گرد گھیرا ڈالے کھڑے تھے کہ لوگوں کا ایک ہجوم دفترِ بحالیات سے نکلا۔ آگے آگے پولیس کے اہلکار اور محکمہ بحالیات کے افسرِ اعلیٰ تھے۔

لوگوں کی باتیں سُنیں تو معلوم ہوا کہ اندرونِ شہر سے کسی شخص کی درخواست پر انتظامیہ نے کارروائی کی ہے۔ دفتر کے اندر کیا کارروائی ہوئی، اس کا ہمیں کچھ پتا نہ تھا لیکن اب جو کچھ ہونے والا تھا، وہ جاننے کے لیے ہم سب لڑکے اُس ہجوم کے ساتھ ساتھ چل پڑے۔ ہجوم کا رُخ اندرونِ شہر کی جانب تھا۔

لوگوں کے ساتھ چلتے اور باتیں سنتے ہوئے صرف یہی معلوم ہوا کہ شہر کے ایک مقامی آدمی نے بحالیات والوں کے ساتھ مل بھگت کرکے ایک ایسا مکان الاٹ کروا لیا، جس کا مالک اپنا گھر چھوڑ کر نہیں گیا تھا۔

"گھر چھوڑ کر نہیں گیا تو اس وقت کہاں ہے؟"

"میں نے خود اُسے دیکھا ہے جی۔ وہ نہیں، وہ پوا پتا تھا اور نہیں گیا۔"

"گھر چھوڑ کر کیسے نہیں گیا؟"

"بچ کیسے گیا؟"

"اللہ جانے صاحب۔"

بحالیات والوں کا کہنا تھا کہ انہوں نے خالی مکانوں کو خود اپنی نگرانی میں تالے لگوائے ہیں، تالوں کو کپڑے میں سی کر مُہر لگائی ہے اپنی۔ پر اب تو ہجوم چل پڑا تھا، اور اس کا رُخ اندرونِ شہر کی جانب تھا۔ ہم سب بھی چلتے گئے، چلتے گئے۔ پھر سب لوگ اندرونِ شہر کے

ایک مکان کے سامنے جا رُکے۔ گھر کے صدر دروازے پر کپڑے میں لپٹا ہُوا سیل بند تالہ جھول رہا تھا۔

"دیکھیں صاحب —— برابر سیل بند تالہ لگا ہے۔" مکان کے نئے الاٹی نے دروازے کی طرف اُنگلی سے اشارہ کیا۔

"جی بالکل —— کسی کو شک ہے تو دیکھ کر تسلّی کر سکتا ہے۔" بحالیات کے اعلیٰ افسر نے ہجوم کی طرف دیکھ کر کہا۔

"پھر —— ؟"

"پھر واپس چلیں۔ خواہ مخواہ ہمارا وقت برباد کیا۔ ہم کتنے کیس نمٹا لیتے اتنے وقت میں۔" افسرِ اعلیٰ نے پولیس کے اہلکاروں کی تائید چاہی۔

"نہیں صاحب۔ تالہ کُھلے گا اور اسے کھولنے میں کوئی حرج نہیں، لوگ دیکھنا چاہتے ہیں۔" پولیس کے اہلکار نے تالے کو چھُو کر دیکھتے ہوئے کہا۔

"کھلوا لیجیے صاحب۔" افسرِ اعلیٰ نے کہا: "کھول دو بھائی۔ کھول دو۔"

سیل تڑوا کر تالہ کھلوا دیا گیا اور سب لوگ صحن کے اندر داخل ہو گئے۔ صحن میں کچھ بھی نہیں تھا۔ مکمل ویرانی۔ زندگی کے آثار کُلی طور پر مفقود تھے۔ سامنے کے دو بڑے کمروں میں سامان تو موجود تھا لیکن کسی ذی نفس کی موجودگی اپنا پتا نہیں دیتی تھی۔ باورچی خانے میں بھی آگ جلے ایک مدت ہو چلی تھی۔ گرد نے ہر چیز کو ڈھانپ رکھا تھا۔

"دیکھ لیجیے، سب آپ کے سامنے ہے۔ یہاں کون ہو سکتا ہے؟" محکمہ بحالیات کا افسرِ اعلیٰ کہنے لگا۔

"واقعی صاحب" پولیس کے کارندے نے اس کی تائید کی۔

"واپس چلیں جی۔" مکان کا نیا الاٹی بولا۔

"درخواستیں بھجوانا آسان کام ہے اور ثبوت پیش کرنا مشکل کام۔" بحالیات کے افسرِ اعلیٰ نے سارے ہجوم کو جیسے پسپا کر دیا۔

"واقعی صاحب آپ سچے ہیں۔ لیکن ہمیں اُوپر سے حکم ملا تھا۔" پولیس آفیسر نے جیسے معذرت کرتے ہوئے کہا۔

"ٹھیک ہے۔ ٹھیک ہے۔" افسرِ اعلیٰ کی اکڑی ہوئی گردن دو ایک بار اوپر تنی ہوئی۔ سامنے کے سرکردہ لوگ انہی پیروں پر پلٹنے لگے۔

"لیکن یہ کوٹھڑی؟" کسی نے اشارہ کیا۔

"یہ اسٹور ہے بھئی —— دیکھ نہیں رہے۔" نئے الاٹی نے ڈانٹ کر کہا۔

"ہاں ہاں، صاحب ٹھیک کہتے ہیں۔" پولیس کے کارندے نے تن کر کہا۔

"چلو بھائی راستہ دو ——" افسرِ اعلیٰ لوگوں کے بیچ میں سے راستہ بنانے کے لیے مُڑا۔ پولیس کے کارندے اس کے پیچھے ہو لیے۔

ہجوم میں سے ایک آواز آئی: "وہ کوٹھڑی ضرور کُھلے گی۔"

"ہاں ہاں، وہ کوٹھڑی بھی کھولو۔"

"ارے کیا رکھا ہے صاحب اس کوٹھڑی میں۔ ہم دفتر والے خواہ مخواہ بدنام ہیں۔" افسرِ اعلیٰ نے باہر نکلنے کے لیے اپنے سامنے کھڑے ہوئے میرے ایک ہم جماعت لڑکے کو دھکا دیا۔

"ہٹو، راستہ دو۔"

"نہیں —— وہ کوٹھڑی کُھلے گی۔" اسکولی بچوں کے ساتھ چند جوان سامنے آ گئے۔ "کوٹھڑی کیوں نہیں کھولتے؟" کوئی پکارا۔

ایک شخص نے کوٹھڑی کے بند دروازے کو ہاتھ سے چھو کر دیکھا۔

"کوٹھڑی کا دروازہ اندر سے بند ہے۔" وہ پکارا۔
ہجوم میں سے ایک نوجوان نے چیخ کر کہا: "نامرد — خود کیوں نہیں کھول لیتے آگے بڑھ کر کوٹھڑی کا دروازہ —"
"ہاں ہاں خود کھولیں گے۔" اب سارا ہجوم جیسے دروازے پر ٹوٹ پڑا۔
جب دروازہ کھلا تو ہم نے دیکھا کہ کوٹھڑی کے اندر ایک تخت پوش بچھا ہے اور سفید براق چادر پر گاؤ تکیے کا سہارا لیے ہوئے ایک ہڈیوں کا ڈھانچہ آلتی پالتی مارے ہوئے اپنی پوری آنکھیں کھول کر ہماری طرف دیکھ رہا ہے۔
ہجوم کا تو جیسے سانس رک گیا۔ سب ہکا بکا اپنی اپنی جگہ پر حیران کھڑے اس کئی ماہ کے بھوکے پیاسے وجود کو دیکھ رہے تھے۔
کسی نے کہا: "زندہ ہے۔"
"ہاں ہاں، دیکھ تو اسی طرف رہا ہے۔"
"پر اٹھتا کیوں نہیں، کچھ بولتا کیوں نہیں؟"
"شاید سہم گیا ہے بیچارہ، اتنے سارے لوگوں کو اکٹھا دیکھ کر —"
سب آپس میں سرگوشیاں کر رہے تھے۔
پھر پولیس کے ایک اہلکار نے کوٹھڑی کے اندر جاکر اس کے شانے پر ہاتھ رکھا تو اس کی گردن ہولے ہولے ایک جانب کو ڈھلک گئی۔
"نہیں، مر گیا۔"
"کیا واقعی مر گیا؟"
سب نے اندر جاکر دیکھا کہ اس بڑے تخت پوش پر اس ہڈیوں کے ڈھانچے کے اردگرد سفید براق چادر پر سنہری جلدوں والے قرآن مجید، منقش گیتا اور گرنتھ صاحب کی بھاری جلدیں بچی تھیں اور سامنے والی قطار میں بھگت کبیر، میرا بائی اور وارث شاہ، جیسے ڈھال بنے کھڑے تھے۔
کہاں گئے ہو کاہک پر ادھار اٹھانے والے؟ کوئی سامنے آؤ نا۔
میں نے لوگوں کے ٹھاٹھیں مارتے ہوئے سمندر پر نگاہ کی۔
کوئی آؤ نا۔ آتے کیوں نہیں؟
اس کے ایک جانب ڈھلکے ہوئے سر کے سفید لچھے دار بال، فراخ ماتھے پر جھول رہے تھے اور اس کی کھلی ہوئی آنکھیں دیکھ کر یوں محسوس ہوتا تھا جیسے ابھی اپنا جھکا ہوا سر اٹھائے گا اور ہاتھ جوڑ کر کہے گا — اوم نمشوائے — اوم نمشوائے۔
ہم تادیر رکے رہے، اس کے گرداگرد، گھیرا تنگ کیے ہوئے۔ پھر کسی نے جیسے ڈانٹ کر کہا: "چلو، بچے لوگ، چلو۔ تمہارا کام ختم ہوگیا۔"

منجمد

فرحت پروین

کرسٹل کے انتہائی نازک اور خوبصورت گلدان میں گلاب کی تازہ کلی سجاتے ہوئے میرے ذہن میں ہمیشہ اُس خاتون کا سراپا ابھرتا ہے جسے میں نے کبھی نہیں دیکھا۔ جس کا میں نام تک نہیں جانتی لیکن جو میری یادوں کا ایک حصہ ہے۔ گلدان کو میں نے کرسٹل کے لیمپ کے ساتھ رکھ دیا ہے جس کا شیڈ گلابی ہے۔ کرسٹل کا یہ فریم جس میں کبھی اس کی تصویر ہوگی، لیمپ کے ساتھ رکھا ہے۔ یہ چیزیں، جو کبھی اس کی ملکیت تھیں، مجھے یقین ہے ان چیزوں کو وہ بھی اسی ترتیب سے رکھتی ہوگی۔ میرے گھر کے اس کونے میں وہ محفوظ ہے جس کا نام شیرین، سمنتھا، نسیم یا سینڈرا یا کچھ ایسا ہی ہوگا کیونکہ وہ پرس جو میں نے اس گلدان، لیمپ اور فریم کے ساتھ اُس سیل سے خریدا تھا، اُس پر پتیں کا S اچپکا ہوا ہے سو اپنی آسانی کے لیے میں نے اس کا نام سارہ رکھ لیا ہے۔

یہ مئی کے آخری دن تھے۔ موسم بہت خوشگوار تھا۔ شفاف نیلا آسمان ساکن سمندر کی طرح معلوم ہو رہا تھا۔ درختوں اور گھاس کے سبز رنگ میں اتنی تازگی تھی کہ آنکھوں میں اترتا معلوم تھا۔ پھولوں کے نکھرے ہوئے اور بے حد شوخ رنگ بالکل نقلی معلوم ہو رہے تھے۔ فطرت کی کھلکھلاہٹ دھوپ بن کر چاروں طرف بکھر گئی تھی۔ طویل سردیوں سے اکتائے ہوئے لوگ چیونٹیوں کی طرح بلوں سے نکل آئے تھے ننھے مُنے بچے رنگین سائیکلوں پر رنگ برنگے ہڑ بینے اڑے پھر رہے تھے اور اُن کی مائیں مختصر ترین لباسوں میں موسم کی گرمی کا لطف لیتے ہوئے فضا کو مزید گرما رہی تھیں۔ ہر طرف بڑی چہل پہل تھی۔

تعطیلات گرما کا آغاز ہو چکا تھا۔ بچے چھٹیوں کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے دیر تک سوتے رہتے۔ میں اور میرا شوہر پیدل سیر کے لیے نکلے۔ ان دنوں معمر خواتین ایک اور شغل نکال لیتی ہیں۔ گھر کا فالتو سامان گیراج میں رکھ کر سیل لگا دیتی ہیں تین چار پڑوسی خواتین مل کر گپ شپ بھی لگاتی رہتی ہیں اور بیکار سامان سے نجات کے ساتھ ساتھ کچھ پیسے بھی ہاتھ آ جاتے ہیں۔ جگہ جگہ گیراج سیل لگی ہوئی تھی۔ ہم ہر سیل میں جھانکتے چھوٹی موٹی خریداری کرتے چلے جا رہے تھے کہ ایک جگہ بہت سی کاریں دکھائی دیں۔ لوگوں کی آمد و رفت اور گہما گہمی بھی کچھ زیادہ تھی۔ ہم بھی اُس گلی میں مڑ گئے۔ وہ گیراج سیل نہیں، فرنیچر، برتن اور گھر کے ساز و سامان سے لے کر کپڑے اور کتابیں تک سیل پر تھیں۔ سامان قیمتی اور خوبصورت ہونے کے علاوہ خاتون خانہ کے اعلیٰ ذوق کی نشاندہی کر رہا تھا۔

"کیا یہ لوگ کہیں اور منتقل ہو رہے ہیں؟" میں نے سیل کی منتظم سے پوچھا۔

"نہیں۔ خاتونِ خانہ کا انتقال ہو گیا ہے۔" اس نے جواب دیا۔ میرا دل ایک دم بجھ گیا۔ زندگی کی بے ثباتی مجسم ہو کر

چاروں طرف بکھری پڑی تھی۔ اُس کے کپڑے، جوتے، انتہائی نفیس و نازک زیورات اور ذاتی چیزیں کھلے خزانے نیلامِ عام کے لئے پڑی تھیں۔ مجھے عجیب سا احساس ہو رہا تھا کسی چیز کو چھونا چاہتی تو یوں لگتا جیسے میں کسی کی ذاتیات میں دخل اندازی کی مرتکب ہو رہی ہوں۔ اُس روز مجھ سے کچھ نہ خریدا گیا۔ میں سیڑھیاں اتر کر نچلی منزل کی طرف جا رہی تھی کہ منک کوٹ پہنے ایک لڑکی میرے سامنے آگئی۔ "کیا یہ بہت خوبصورت نہیں ہے؟" اُس نے مجھ سے کہا۔

"یقیناً۔ اور خصوصاً مئی جون کی گرمی میں تو اور بھی خوبصورت لگ رہا ہے۔" ہم دونوں کا مشترکہ قہقہہ فضا میں بلند ہوا مگر درمیان ہی میں کہیں دم توڑ گیا۔

"خرید لو۔ بہت سستا ہے۔" اُس نے سنجیدہ ہوتے ہوئے کہا۔

"ضرور خرید لیتی لیکن شاید تم نے مجھے غور سے دیکھا نہیں۔" اور ہم دونوں صرف مسکرا کر رہ گئے۔

"خاتونِ خانہ کا ذوق بہت اچھا تھا۔ تم نے یہ پارٹی ڈریس دیکھا ہے؟" اُس نے سامنے لٹکے ہوئے ڈریس کی طرف اشارہ کیا۔

"ہاں" میں نے کھوئے کھوئے لہجے میں کہا۔

"تم اسے جانتی تھیں؟" اُس نے میری اداسی کو دیکھتے ہوئے پوچھا۔

"نہیں۔ میں تو اس لباس کو دیکھ کر اُس کی عمر اور قد و قامت کا اندازہ لگا رہی تھی۔" اور میں نے پلٹ کر اُس لڑکی کی طرف دیکھا جس نے منک کوٹ پہنا ہوا تھا اور جو بالکل اُس کے سائز کا تھا۔ لڑکی نے گھبرا کر کوٹ اتارا اور ہینگر پر لٹکا دیا۔ میں نے نکلتے نکلتے بیتل کے "ایس" والا وہ پرس خرید لیا جو صرف دو ڈالر میں بک رہا تھا۔

کام کاج سے فارغ ہو کر میں آج کی خریداری کو دیکھنے لگی۔ باقی چیزوں کو ٹھکانے سے رکھ کر میں نے پرس کھولا۔ اس کی ایک جیب میں چند بال پنیں، دوسری جیب میں چند سکے اور ایک بہت اندرونی جیب میں الگ الگ تہہ شدہ چند اوراق تھے۔ میں نے باری باری انھیں کھول کر پڑھا۔ ان اوراق کی مختصر تحریروں میں خود کلامی کا سا انداز تھا لیکن ایک ایک لفظ جیسے دکھ کی اتھاہ گہرائیوں میں ڈوبا ہوا تھا۔ ان اوراق نے مجھے جکڑ لیا۔ میں نے انھیں بار بار پڑھا اور میں ان کے اسرار کی گہرائی میں ڈوبتی چلی گئی۔ رات دیر تک میں ان تحریروں کی کڑیاں ملانے کی کوشش کرتی رہی اور میرے ذہن میں اس کا تصوراتی سراپا گھومتا رہا۔ بڑی بڑی نیلی آنکھوں اور سونے کی رنگت جیسے چمکتے ہوئے بالوں والی وہ لڑکی جو DISPLAY کے لئے منک کوٹ پہنے ہوئے تھی، اُس کے چہرے میں تھوڑی سی تبدیلی کر کے میں نے سارہ کا سراپا مکمل کر لیا۔ اُس لڑکی کا چہرہ بہت شاداب تھا اور آنکھیں جیسے مسکرا رہی تھیں اور میری سارہ تو اتنی اداس اتنی دکھی تھی۔ کیوں دکھی تھی؟ یہی تو میں جاننا چاہتی تھی۔ اُس کے گھر اُس کے ساز و سامان سے عیاں تھا کہ اُس کا دکھ مادی نہیں تھا۔ اُس کی روح کو کیا روگ تھا؟ یہی میں جاننا چاہتی تھی۔

صبح میں اکیلی ہی ٹہلنے نکل گئی اور اُس وقت چونکی جب میں نے خود کو اُس دروازے پر پایا۔ ابھی سیل کی منتظمین دروازہ کھول رہی تھیں۔ مجھے دیکھ کر مسکرائیں۔ "کیا حال ہے۔ EARLY BIRD آج پچیس فیصد رعایت ہے اور چاہے بکے چاہے رہے، سیل ایک بجے بند ہو جائے گی۔"

آج میرے محسوسات کل سے مختلف تھے۔ زندگی بہت پُرکشش ہے اور یہ سارا نظام، یہ سارے سلسلے زندہ رہنے ہی کی تو کوششیں ہیں۔ شاید اس کی کشش کا راز یہی ہے کہ اسے دوام نہیں۔ اس کے ختم ہو جانے، اس کے چھن جانے کا ڈر ہی تو اس سے

چھٹے رہنے، اسے قائم رکھنے پر اُکساتا ہے، اُس روز میں نے یہ لیمپ، گلدان اور فوٹو فریم خریدا۔ فریم جو خالی تھا لیکن جس میں کبھی سارہ کی تصویر رہی ہو گی۔ یہ کتابیں خریدنا چاہتی تھی کیونکہ آج وہ مفت کے بھاؤ تھیں۔ ایک ڈالر میں دو کتابیں۔ میں پیدل تھی اس لیے سوچا کہ گاڑی لاکر بہت سی کتابیں خرید کر لے جاؤں گی۔

گھر آئی تو سب جاگ چکے تھے۔ اُن کو ناشتہ وغیرہ دینے اور چھوٹے موٹے کاموں کو نبٹانے میں وقت کا احساس ہی نہ رہا۔ جب میں نے جانے کا ارادہ کیا تو دو بج چکے تھے۔

شام کو میں ٹہلتی ہوئی پھر اُدھر جا نکلی۔ گھر بند تھا۔ سیل کے بورڈ ہٹائے جا چکے تھے۔ صبح کی رونق اور گہما گہمی کے بعد وہ جگہ کچھ زیادہ ہی ویران لگ رہی تھی۔ میں پلٹنے لگی تو میری نظر فٹ پاتھ پر پڑی۔ کتابوں سے بھرا کارٹن کوڑے کے طور پر رکھا ہوا تھا۔ مجھے اس ناقدری پر دکھ ہوا۔ ہر چیز خرید لی گئی تھی مگر اس انمول خزانے کے لیے کسی کے دل اور گھر میں جگہ نہ تھی۔ میں نے دو تین کتابیں اٹھائیں۔ اتنے میں سامنے کا دروازہ کھلا اور میں شرمندہ سی ہو کر جلدی جلدی سے گھر کی طرف لپکی تاکہ گاڑی لاکر یہ سب کتابیں لے جاؤں۔ اور اس گنجِ گراں مایہ کو اس کی صحیح قدر و منزلت عطا کروں۔ میں فوراً گاڑی لے کر لوٹی۔ جیسے ہی میں گلی میں داخل ہوئی کاؤنٹی کے ٹرک نے مجھے کراس کیا۔ کوڑا اٹھ چکا تھا۔ جگہ خالی پڑی تھی۔ میں بوجھل دل لیے لوٹ آئی۔

سونے سے پہلے میں اپنے معمول کے مطالعے کے لیے بیٹھی تو نئی کتابوں کو دیکھنے لگی اور میرے تجسس کو منزل مل گئی۔ اُن کتابوں میں ایک ڈائری بھی تھی جس میں کچھ بے ترتیب یادداشتیں جن جنہیں میں نے بار بار پڑھا اور آخرکار میں وہ ٹوٹا سا پزل مکمل کرنے میں کامیاب ہو گئی جس کے کئی ٹکڑے اب بھی غائب ہیں مگر پھر بھی تصویر بڑی حد تک واضح ہے۔

میں سارہ کے دکھ سے واقف ہو گئی۔ اُس کا دکھ میرے دل میں اتر گیا۔ اُس کے آنسو میری آنکھوں میں امڈ آئے۔ بھری جوانی میں زندگی کی سب آسائشوں کو چھوڑ کر وہ اپنی بے چین روح لیے اِس دنیا سے چلی گئی۔ سمجھ میں نہیں آتا اُس کی کہانی کہاں سے شروع کروں۔ اُس کی کہانی اس معاشرے کے ہر چھٹے فرد کی کہانی ہے لیکن ہر کہانی کا انجام مختلف ہوتا ہے۔ سارہ حساس تھی۔ اس کی پشیمانیاں، اُس کے پچھتاوے اُسے نگل گئے۔ میں اُس کی بے ترتیب تحریروں کے آئینے ہی میں اُس کی زندگی کی جھلکیاں دکھاؤں گی۔

آج مجھے اپنے ڈیڈی یاد آرہے ہیں۔ میں ان کی صورت کو ذہن میں لانے کی کوشش کر رہی ہوں۔ دراصل میں نے ڈیڈی کو بھلانے کی شعوری کوشش کی تھی۔ وہ بھیانک منظر میری یادداشت سے چپک کر رہ گیا تھا جب اچانک دھماکے سے میری آنکھ کھل گئی تھی۔ ڈیڈی کے سر اور آنکھوں میں سے خون نکل رہا تھا۔ میں نے ڈر کر آنکھیں بند کرلیں۔ میری چیخ تک میرے حلق میں گھٹ کر رہ گئی تھی۔ ڈیڈی نے خودکشی کرلی تھی۔ مجھے یاد ہے ایک بار مجھے پیار کرتے ہوئے وہ رو پڑے تھے۔ "میں بہت اکیلا ہوں میری بچی۔ بالکل تنہا۔ اور میں نے اپنی ہتھیلیوں سے اُن کے آنسو پونچھتے ہوئے کہا تھا۔ "آپ جھوٹ کیوں بولتے ہیں؟ میں تو آپ کے پاس ہوں۔" اور وہ مجھے لپٹاتے ہوئے آنسوؤں میں مسکرا دیے تھے۔

میں بہت چھوٹی تھی مگر مجھے یاد ہے کہ میں ممی کو پاپا کا قاتل سمجھتی تھی کیونکہ وہ ہر وقت ہی پاپا سے لڑتی رہتی تھیں اور انھیں گھر سے چلے جانے کو کہتی تھیں۔ اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وہ خود کو تنہا کیوں محسوس کرتے تھے۔ وہ ممی سے پیار کرتے تھے اور ممی کی بے رخی سے دل شکستہ ہو کر انھوں نے گھر تو کیا دنیا ہی چھوڑ دی۔

مجھے جب بھی اپنے پیارے ڈیڈی یاد آتے تو وہ لہولہان چہرہ اور خون اگلتی آنکھیں میرے ذہن کے پردے پر ابھرتیں اور میں وحشت زدہ ہو جاتی، اور پھر آہستہ آہستہ میں نے پاپا کو بھلا دیا۔

میں بھی کتنی بدنصیب ہوں پاپا کہ مجھے اپنوں کی شکلیں تک یاد نہیں۔ آپ کی شکل، اور میری اپنی بیٹی کی شکل۔ کیونکہ میں نے اُسے دیکھا ہی نہیں تھا۔ کیسی ہو گی میری بیٹی؟ کیا نام ہو گا اُس کا؟ کیا کرتی ہو گی وہ؟ کہاں ہو گی؟

میں تو ممی کو سنگدل اور بے وفا سمجھتی تھی۔ انھوں نے تو پھر مجھے پال دیا۔ چودہ سال کی عمر میں میں نے خود گھر چھوڑا۔ یقیناً وہ مجھے اٹھارہ سال تک بھی برداشت کر لیتیں میں جب تک ممی کے ساتھ رہی میں نے دل ہی دل میں ممی سے نفرت کی۔ میں انھیں پاپا کا قاتل سمجھتی تھی۔ اپنا مجرم سمجھتی تھی کیونکہ وہ مجھے وہ توجہ نہیں دیتی تھیں جس کا میں خود کو حقدار سمجھتی تھی۔ اس لئے جب میں نے گھر چھوڑا تو مجھے کوئی افسوس نہیں ہوا۔ میں نے ممی کو بتانا بھی ضروری نہ سمجھا اور نہ کبھی پچھتائی۔ میں نے ممی سے کوئی رابطہ بھی نہ رکھا۔ میرا خیال تھا انھیں میری کوئی ضرورت نہیں اور وہ تو خوش ہوں گی کہ اُن کی جان چھوٹی۔ ممکن ہے ایسا ہی ہو۔ مگر مجھے زندگی میں پہلی بار یہ خیال آ رہا ہے کہ اس میں میرے رویے کا بھی بہت کچھ دخل رہا ہو گا۔ میں ممی کے ساتھ کافی گستاخی سے پیش آتی تھی اور ہر اُس بات کا اُلٹ کرتی تھی، جو ممی مجھے کرنے کو کہتی تھیں۔ اور اس طرح میرے اور ممی کے درمیان فاصلہ بڑھتا گیا۔ میں نے گھر سے باہر دوستوں کو اپنی دنیا بنا لیا۔ جاش میرا سب سے عزیز دوست تھا۔ وہ میری جوانی کا سب سے پہلا خوشہ چیں تھا اور پھر چودہ سال کی عمر میں میں ماں بننے والی تھی۔ ممی کو جب علم ہوا تو انھوں نے مجھے ڈانٹنے ڈپٹنے کے بعد اس جھنجھٹ سے چھٹکارا دلانے کی سوچی مگر میں نے انکار کر دیا۔ میں نے انھیں بتایا کہ جاش اور میں شادی کر لیں گے۔ وہ بالکل فکر نہ کریں، ہم خود سنبھال لیں گے۔

جاش بہت کمینہ نکلا۔ اُس نے صاف کہہ دیا کہ وہ میرا ساتھ نہیں دے سکے گا کیونکہ اُس کے والدین اس کی اجازت نہیں دیں گے اور وہ اپنے امیر والدین کو چھوڑ کر میرے ساتھ مصیبتوں بھری زندگی گزارنے کو تیار نہیں۔ بہتر ہے میں اپنی ممی کا کہنا مان لوں ہم ویسے بھی کم عمر تھے اور قانوناً والدین کی مرضی کے پابند۔ لیکن تب تک دیر ہو چکی تھی اور مجھے اپنے بچے کو جنم دینا ہی تھا۔ میں نے سکول چھوڑ دیا۔ اب تو کوئی بھی ایسا نہ تھا جس سے میں دل کا حال کہہ سکتی۔ ممی نے میری بچی کے لئے خریداری کر لی تھی۔ ممی اُن دنوں مجھ پر کافی مہربان تھیں۔ ایک دن انھوں نے مجھے بتایا کہ "میں بھی چودہ سال کی تھی جب تم پیدا ہوئیں۔ کاش میں یہ غلطی نہ کرتی۔ اس کی سزا ساری عمر بھگتنی پڑتی ہے۔" اور میں نے اُن کی بات سمجھنے کے بجائے یہ مطلب نکالا کہ وہ مجھے سزا سمجھتی ہیں۔

اب میری سمجھ میں آتا ہے کہ وہ سزا کس بات کو کہہ رہی تھیں۔ ممی اور پاپا دونوں ہی کم عمر تھے۔ شاید کلاس فیلو ہوں گے۔ دونوں کی تعلیم ادھوری تھی۔ دونوں کے لئے اپنے کمانے کھانے کے ساتھ ساتھ میری پرورش بہت مشکل تھی۔ پاپا بہت اچھے اور مخلص انسان تھے انھوں نے ممی کا ساتھ نہ چھوڑا لیکن غالباً مالی مشکلات جھگڑے کا باعث تھیں۔ ہم ایک بیڈ روم کے اپارٹمنٹ میں رہتے تھے۔ سامان بھی واجبی سا تھا۔ ممی تیز مزاج اور غصیلی تھیں۔ میرے بہت حساس پاپا نے دل شکستہ ہو کر دنیا چھوڑ دی اور ممی بڑی پامردی سے اپنی ذمہ داری نبھاتی رہیں۔ کاش میں اس وقت یہ سمجھ سکتی تو ممی کو ستانے کے چکر میں یہ نوبت نہ آتی۔ آج زندگی میں پہلی بار مجھے پچھتاوا ہو رہا ہے کہ میں نے اپنی ممی کو کتنا دکھ دیا۔ میں بات بات پر جھگڑتی تھی اور اُن کی ہر بات کا اُلٹ کرنا اپنا فرض سمجھتی تھی۔ ممی میری نفسیاتی الجھن کو نہیں سمجھتی تھیں اور میری گستاخی کی وجہ سے وہ بھی بہت اکھڑی اکھڑی سی رہتیں۔ کاش آج مجھے ممی کہیں مل جائیں تو میں معافی مانگ لوں اور انھیں بتاؤں ــــــ "ممی، آئی لو یو"۔ میں واقعی ممی کو سزا بن کر ملی تھی،

کاش بیٹی بنی ہوتی!

ممی کے آگے ہار ماننا مجھے منظور نہ تھا۔ میں نے انھیں نہیں بتایا کہ جاش میرا ساتھ دینے سے انکار کر چکا ہے اور یہ بچی تنہا میری ذمہ داری ہو گی۔ ممکن ہے بلکہ یقیناً ممی میری مدد کرتیں مگر ان دنوں تو ممی اور میرے درمیان باقاعدہ محاذ آرائی تھی اور میں پسپا ہو کر اپنی انا کی شکست نہیں دیکھ سکتی تھی۔ میں نے ممی کو کچھ بھی نہ بتانے کا فیصلہ کر لیا۔

جب نرس نے مجھے بتایا کہ میں نے ایک بہت خوبصورت بچی کو جنم دیا ہے تو میرے دل میں اسے دیکھنے تک کی خواہش پیدا نہ ہوئی۔ میرے ذہن میں صرف ایک سوال تھا۔ اب کیا ہو گا؟ خیریت پوچھنے کے لئے ممی کا فون آیا۔ انھوں نے بتایا کہ وہ شام کو آئیں گی اور شام سے پہلے میں ایک فیصلہ کر چکی تھی۔ میں نے چپکے سے کپڑے بدلے اور ہسپتال سے نکل گئی۔

میں خوش قسمت ہوں کہ مجھے لزی جیسی دوست ملی۔ نئے شہر، نئے سکول، نئے ماحول میں میں نے ماضی کی تمام گرد جھاڑ کر اپنی تعلیم مکمل کی۔ اچھی نوکری بھی مل گئی اور اچھے دوست بھی۔ اپنی بیٹی کو بھی میں نے ماضی کی گرد کی طرح ہی جھاڑ دیا تھا۔ وہ اُن دنوں مجھے بالکل یاد نہ آئی اور نہ ہی مجھے کوئی پچھتاوا تھا۔ اب میری زندگی میں ایک ٹھہراؤ آ گیا تھا۔ میں تعلیم یافتہ، مہذب، متین و حسین خاتون بن چکی تھی اور پھر میں نے اپنے خوش مزاج اور خوش شکل دوست کرس کے ساتھ رہنا شروع کر دیا۔ جلد ہی مجھے اندازہ ہو گیا کہ ہم اچھی گھریلو زندگی گزار سکتے ہیں اور ہم نے شادی کر لی۔

ہم دونوں ہی اچھا کما رہے تھے اور اپنے خوبصورت گھر کی تزئین و آرائش میں لگے ہوئے تھے۔ ایک دو سال تک سیر و تفریح کرنے اور گھر کی ہر چیز مکمل کرنے کے بعد فیملی شروع کرنے کا ارادہ تھا۔ مگر مجھے کیا معلوم تھا کہ مستقبل کے پاس میرے لئے صرف غم اور پچھتاوے ہوں گے اور پت جھڑ کی وہ حسین سہ پہر میری سوچوں کا — میری زندگی کا رُخ بدل دے گی۔

وہ ستمبر کی صبح تھی۔ آسمان کھلا اور صاف تھا۔ چمکیلی کرنیں زینہ بہ زینہ درختوں کی چوٹیوں سے اُتر رہی تھیں۔ درختوں نے رنگ بدل لئے تھے۔ اُن کے انوکھے اچھوتے رنگ دامنِ دل کو کھینچ رہے تھے۔ کرس گنگنا رہا تھا اور میں فطرت کے اس بے پناہ حسن کو دیکھ کر سوچ رہی تھی کہ سڑکوں کے کنارے یہ عالم ہے تو پارک میں تو اس کی شان ہی کچھ اور ہو گی کہ کرس بول اٹھا۔ "ہنی آج ایلگنی پارک نہ چلیں پت جھڑ دیکھنے؟"

"تم نے تو میرے دل کی بات کہہ دی۔" میں خوشی سے اچھل پڑی۔

"میں تو ہمیشہ ہی تمہارے دل کی بات کہتا ہوں۔" وہ شرارت سے ہنسا۔ "چھٹی پانچ بجے ہوتی ہے اور سورج تو آج کل نو بجے تک رہتا ہے۔"

"ہاں ٹھیک ہے۔" ہم نے طے کر لیا۔

میں پارک میں بینچ پر اکیلی بیٹھی تھی۔ درختوں پر رنگ ہی رنگ تھے۔ گلابی، نارنجی، پیلے، ہرے، کاسنی اور کئی ایسے رنگ جن کے لئے ابھی تک نام ایجاد نہیں ہوئے۔ زمین پر بھی رنگ ہی رنگ تھے۔ چھوٹے چھوٹے کاسنی اور پیلے خودرو پھول سبز رنگ میں مختلف قسم کے نمونے بنا رہے تھے۔ ہوا میں اڑتے ہوئے رنگین پتوں اور قوس قزح جیسے رنگین پروں والے پرندوں میں تمیز کرنا مشکل ہو رہا تھا۔ یوں لگتا تھا پتوں میں جان پڑ گئی ہے یا پتوں سے پرندے بنا لئے گئے ہیں۔ آسمان کے گہرے نیلے سمندر کے کناروں پر سفید بادل جھاگ کی طرح تیر رہے تھے۔ میں اکیلی تھی اور بہت افسردہ۔ مجھے لگا کہ ابھی جھاگ اڑاتی

لہریں اٹھیں گی اور یہ سارا منظر ڈوب جائے گا۔ سارے رنگ ڈوب جائیں گے اور زمین و آسمان ایک بیکراں سمندر میں تبدیل ہو جائیں گے۔ کچھ بھی نہیں رہے گا۔ نہ آسمان کو چھوتے ہوئے یہ مغرور صنوبر، نہ رنگ برنگی چڑیاں اور پکے دبکی بیٹھی ہوئی یہ جھاڑیاں، نہ شوخ رنگوں کے ملبوس زیب تن کئے یہ شاخیں، نہ لہرا لہرا کر اپنے حسن کی نمائش کرتے یہ گھنے درخت اور نہ درختوں کے ہم رنگ پرندے۔

میں کام سے فارغ ہو کر پانچ بجے اٹھی اور کرش کے کمرے میں گئی۔ وہاں کار کی چابی کے ساتھ صرف ایک لائن کا نوٹ تھا کہ میں گھر چلی جاؤں وہ دیر سے آئے گا۔ اسے تو یاد ہی نہیں رہا تھا کہ آج ہم نے پارک جانے کا پروگرام بنایا تھا ایسی بھی کیا ایمرجنسی تھی کہ میری ٹیبل پر آ کر بتا بھی نہیں سکتا تھا۔ مجھے بہت غصہ آیا۔ وہ کیا سمجھتا ہے کہ میں اس کے بغیر پارک نہیں جا سکتی؟ کیا مجھے اس کی آنکھوں سے نظارہ دیکھنا تھا؟ اس کے ذہن سے لطف لینا تھا؟ اور میں پارک چلی آئی۔ تب مجھے پتہ چلا کہ جب دل ایک ہو جاتے ہیں تو آنکھیں اور ذہن الگ الگ دیکھنے اور لطف لینے کی صلاحیت کھو بیٹھتے ہیں۔ ہوا ذرا تیزی سے چلنے لگی۔ پتے گرنے لگے اور مجھے لگا کہ یہ پرندے بھی پتوں کی طرح مرجھا کر گر جائیں گے۔ ایک ایک کر کے سارے رنگ زمین پر آ رہیں گے پھر یہ سب مرجھا کر اور مردہ ہو کر صرف ایک مٹیالی چادر میں تبدیل ہو جائیں گے اور جس پر چلنے سے ایسی آواز پیدا ہو گی جیسے کوئی مرتے ہوئے آخری ہچکیاں لیتا ہے۔ میں تو پت جھڑ کے خوبصورت رنگوں سے لطف اندوز ہونے آئی تھی مگر یہاں تو سارا منظر ہی بدل چکا تھا۔ صرف اس لئے کہ کرش ساتھ نہیں تھا۔ مجھے خود پر غصہ آنے لگا۔ اس طرح تو میں اور بھی اس کی اہمیت بڑھا رہی ہوں۔ وہ جسے میری کوئی پروا نہیں۔ میں نے ذہن سے ہر خیال کو جھٹک کر سیر کا لطف لینے کا ارادہ کیا۔ ابھی میں اٹھنے ہی لگی تھی کہ کسی نے پیچھے سے آ کر میری آنکھیں بند کر لیں۔ اچھا تو کرش کو یاد آ ہی گیا اور میرے پیچھے چلا آیا۔ میری آنکھیں بھیگ گئیں لیکن میں نے ہاتھوں کو چھوا تک نہیں۔ اچانک مجھے احساس ہوا کہ یہ کرش کے ہاتھ نہیں۔ یہ تو روئی کی طرح ملائم ہاتھ تھے۔ میں نے ان ریشمی ہاتھوں کو چھوا تو پیاری سی شوخ آواز آئی "ممی!" میں نے پلٹ کر دیکھا تو چودہ پندرہ برس کی الگ بھگ ایک لڑکی نے گھبرا کر جلدی سے معذرت کی۔ معافی چاہتی ہوں مجھ سے غلطی ہو گئی۔ میں سمجھی آپ میری ممی ہیں۔ میری ممی بالکل ایسے ہی کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ بالکل یہی۔ آپ نے بھی جے سی۔ پینی سٹور سے خریدا ہے نا یہ ڈریس۔ وہ دیکھیں میری ممی"۔ اور وہ بھاگ کھڑی ہوئی۔

وہ تو چلی گئی مگر میری نظریں اس کے ساتھ چپک کر رہ گئیں۔ وہ سامنے درخت کے نیچے اپنی ممی کے ساتھ پکنک باسکٹ کھولے سینڈوچ بنا رہی تھی۔ "ممی" وہ شیریں آواز میرے کانوں میں ٹھہر گئی تھی، میرے کانوں میں گونج رہی تھی اور مجھے وہ بچی یاد آ گئی جسے میں نے جنم دیا تھا لیکن دیکھا نہیں تھا۔ نام تک نہیں رکھا تھا۔ وہ بھی اتنی ہی عمر کی ہو گی۔ ایسی ہی لگتی ہو گی۔ پتہ نہیں کیسی ہو گی؟ کہاں ہو گی میری بیٹی؟ لڑکی نے بال کس کر پونی ٹیل باندھ رکھی تھی۔ گولڈن براؤن ریشم کے لچھے ہوا میں لہرا رہے تھے۔ چہرے کے ارد گرد پھیلے ہوئے چھوٹے چھوٹے بال اس کی معصومیت اضافہ کر رہے تھے۔ غیر معمولی لمبی اور بڑی بڑی سنہری شربتی آنکھیں ستاروں کی طرح چمک رہی تھیں۔ جاش کی آنکھیں بھی تو ایسی تھیں۔ میں انہی آنکھوں پر تو مرمٹی تھی۔ اچانک ایک خیال میرے ذہن میں ابھرا۔ کہیں یہی تو میری بیٹی نہیں۔ ہو سکتا ہے اس خاتون نے اسے ADOPT کر لیا ہو۔ اور پھر یہ خیال میرے ذہن میں پختہ ہونے لگا۔ مجھے اس لڑکی کی صورت میں جاش کی اپنی صورت دکھائی دینے لگی۔ مجھے مسلسل اپنی طرف گھورتا پا کر وہ لڑکی پریشان ہو گئی اس نے اپنی ماں سے کچھ کہا اور پھر دھیرے دھیرے چلتی ہوئی میرے پاس آئی "آپ مجھ سے ناراض ہیں میں نے بدتمیزی

کی میں خدا کی قسم کھاتی ہوں۔ میں نے جان بوجھ کر شرارت نہیں کی۔ مجھ سے غلطی ہو گئی تھی میں سمجھی تھی آپ میری ممی ہیں۔ اس نے بڑی معصومیت سے ایک ہی سانس میں پورا پیراگراف سبق کی طرح دہرا دیا۔

"نہیں پیاری لڑکی میں تم سے ناراض نہیں ہوں اور تم ٹھیک کہہ رہی ہو۔ میں تمہاری ممی ہی ہوں۔ تمہارا نام کیا ہے میری بچی؟

لڑکی کی آنکھوں سے خوف جھانکنے لگا۔ وہ مجھے جواب دیے بغیر لوٹ گئی۔ میں اٹھی تاکہ اس کی ماں سے گفتگو کروں۔ مگر مجھے اٹھتا دیکھ کر وہ تیزی سے اپنا سامان سمیٹ کر چل دیں۔ میں شرمندہ سی ہو گئی۔ وہ شاید مجھے پاگل سمجھی تھیں۔ میں بھی اٹھ کر اسی سمت چلی مگر وہ کہیں دکھائی نہ دیں۔ میں بجھے دل سے گھر لوٹ آئی۔ میرے آنے کے پانچ منٹ بعد کرس بھی لوٹ آیا لیکن مجھے تو یاد بھی نہ رہا تھا کہ میں اس سے ناراض ہوں۔

رات بھر لڑکی کی معصوم صورت اور اس کی پیاری آواز کی بازگشت میرے ذہن میں گونجتی رہی۔ کہاں ہو گی میری بچی؟ اگر وہ میرے پاس ہوتی تو میں اس کا کیا نام رکھتی؟ اگلے روز ویک اینڈ تھا۔ کرس سو رہا تھا مگر میں اٹھ گئی۔ کافی بنا کر ٹی۔ وی کھول لیا۔ ٹی۔ وی پر ٹاک شو لگا ہوا تھا۔ چار پانچ لڑکیاں سٹیج پر تھیں اور ایک آدمی ان سے سوال کر رہا تھا۔ میں غور سے دیکھنے لگی اور ان چہروں میں سے اپنی بیٹی کا چہرہ تراشنے لگی۔ ایک لڑکی جس نے اپنی عمر چودہ سال بتائی بتایا کہ وہ بے گھر ہے۔ اسے نہیں معلوم کہ اس کے ماں باپ کون ہیں، اور وہ کھانا کھانے اور سر چھپانے کے لئے جسم بیچتی ہے۔ حاضرین میں لعنت ملامت کا شور اٹھا۔ اتنی کم عمری اور یہ کرتوت، تمہیں تو سکول میں ہونا چاہیے۔ لڑکی جس کے چہرے پر ابھی بچپنے کا بھولپن تھا، اپنی لمبی لمبی خوبصورت آنکھیں جھپک کر بولی "میں سکول میں ہی ہوں، مگر مجھے سونے کے لئے ایک چھت اور کھانا چاہیے۔" اور اس کی آنکھیں بھر آئیں۔ ایک بچی کو صرف ایک چھت کے نیچے سونے کے لئے یہ کرنا پڑتا ہے! اس کے آنسو بتا رہے تھے کہ وہ یہ خوشی سے نہیں کر رہی۔ اس کی آزردگی دیکھتے ہوئے میزبان نے سوال بدلا "تم کس چیز کو سب سے زیادہ miss کرتی ہو؟" وہ منظر میں زندگی بھر نہیں بھول سکتی۔ میں نے زندگی میں پہلی بار کسی کو یوں روتے دیکھا تھا جیسے ہی میزبان نے سوال کیا، اس بچی کی آنکھوں کی پوری لمبائی میں سے جیسے آبشار ابل پڑا۔ اس نے بالکل ننھے بچوں کی طرح کہا "ممی" اور اس سے آگے وہ کچھ نہ بول سکی۔ ہال میں موجود ہر شخص آبدیدہ تھا۔ خود میزبان نے اپنے آنسو پونچھتے ہوئے پلٹ کر کہا۔ اس معصوم بچی کو اس عمر میں اتنے دکھ دینے کا ذمہ دار کون ہے؟ اور مجھے لگا کہ اس کی مخاطب میں ہوں۔ یہ تو میں نے سوچا ہی نہ تھا کہ ایسا بھی ہو سکتا ہے۔ ہو سکتا ہے یہی میری بچی ہو۔ یہ میری جیسی ناسمجھ سنگدل مائیں اپنے کئے کی سزا ان معصوم بچوں کو دیتی ہیں۔ میں ظالم ہوں سزا تو مجھے ملنی چاہیے۔ میں نے بہت تگ و دو کی مگر اس گھائل ہرنی کا کھوج نہ پا سکی۔ میں اسے چھت دے دیتی، ماں دے دیتی، ہو سکتا ہے وہی میری بیٹی ہو۔ اور نہیں بھی تو کوئی اور اسی طرح میری بیٹی کو پناہ دے دے گا؟ مگر میں کامیاب نہ ہو سکی۔ اتنے معصوم چہرے پر اتنا دکھ، اس طرح آبشار کی طرح ابلتے ہوئے آنسو کتنے اجنبی لگ رہے تھے۔ وہ آنکھیں مستقل میرے ذہن کے ساتھ چپک گئیں۔ وہ آبشار میرے دل پر گرتے رہے اور میرے احساس جرم میں اضافہ ہوتا گیا۔

میری اس مسلسل تلاش اور کیفیت سے کرس اکتانے لگا ہے۔ اس کا خیال ہے کہ مجھے کوئی دماغی روگ لگ گیا ہے۔ مجھے ماہر نفسیات سے علاج کرانا چاہیے جو مجھے ان باتوں کو بھلانے میں مدد دے گا۔ بھولنا کون چاہتا ہے کرس۔ میں اب تک بھولی رہی۔ میرا یہ جرم کیا کم ہے۔ میں وہ ہوں جس نے معصوم بچی کو بھٹکنے کے لئے چھوڑ دیا۔ بے گھر کر دیا جسے طوفان باد و باراں سے بچاؤ کے لئے ایک چھت کے نیچے سونے کے لئے طوائف بننے پر مجبور کیا۔ میں وہ ہوں جس نے اسے مجرموں کے گروہ میں پناہ لینے پر مجبور

کیا۔ کل میں پوری رات ایک لمحے کے لیے نہیں سوسکی۔ پتہ نہیں ٹی وی پر ایسے شو ہمیشہ سے آتے تھے یا اب ہی آنے لگے ہیں، یا پھر میری آنکھیں اب کھلی ہیں۔ کل پھر ایک ٹاک شو میں چودہ سے بیس سال تک کی لڑکیاں مدعو تھیں۔ جو مجرموں کے گروہ سے تعلق رکھتی تھیں۔ وہ گالی بکے بغیر بات نہیں کرتی تھیں۔ سوائے ایک کے سب نے بتایا کہ وہ اپنے ماں باپ کو نہیں جانتیں۔ گروہ ہی اُن کی فیملی ہے۔ کیونکہ وہ سب ایک دوسرے کا بہت خیال رکھتے ہیں۔ اب انھیں نہ اصلاح چاہیے اور نہ پناہ۔ انھوں نے بڑے دھڑلے سے بتایا کہ چوری، ڈاکہ سے لے کر قتل تک اُن کے نزدیک ایک جاب کی حیثیت رکھتا ہے اور وہ اپنی جاب سے بہت مخلص ہیں۔ ان لڑکیوں کے چہروں پر اتنی کرختگی اور خشونت تھی کہ میں ان میں سے اپنی بیٹی تلاش کرنے پر تیار نہ تھی۔ نہیں میری بیٹی یقیناً معصوم صورت ہوگی، پارک والی لڑکی کی طرح، اُس کمسن طوائف کی طرح۔ میں ذہنی طور پر یہ تسلیم کرنے کو تیار نہ تھی مگر بار بار جیسے کوئی نشتر چبھوتا تھا۔ ذرا بھی پتا تو کون سی تمہاری بیٹی ہے۔ تم کیوں نہیں مانتیں کہ تم نے معاشرے میں ایک مجرم کا اضافہ کیا ہے۔ ایک مجرم کا نہیں ایک پوری نسل بلکہ نسل در نسل کا۔ اگر تمہاری بیٹی طوائف اور مجرم ہے تم جو تعلیم یافتہ، خوشحال اور عزت دار ہو تو پھر ایک طوائف اور ایک مجرم کی اولاد کیا ہوگی۔ وہ جنھیں صرف ٹھوکریں اور نفرت ملی اُن کی اولاد تو ورثے میں یہی چیزیں لائے گی اور وہ دنیا میں جرم اور نفرت ہی بانٹیں گے اور پھر یہ سلسلہ تو بڑھتا اور پھیلتا چلا جائے گا۔ میں کرۂ ارض سے امن و سلامتی مٹانے اور پیار محبت ختم کرنے والوں میں سے ایک ہوں۔

کرس نے مجھ سے علیحدگی اختیار کرلی ہے۔ وہ میرے دکھ کو نہیں سمجھ سکا۔ وہ صرف سکھ کا ساتھی تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میں نے زندگی سے اپنے حصے کی خوشیاں وصول کرلی ہیں۔ میں معاشی طور پر خود کفیل ہوں۔ میں اپنی غلطیوں کی تلافی کرنا چاہتی ہوں۔ میں نے ایک راہ متعین کرلی ہے۔

میں کافی بنا کر کھڑکی کے سامنے جا کھڑی ہوئی۔ بارش رات بھر برسنے کے بعد تھم چکی تھی۔ دُھلی دُھلی ہر چیز بہت پیاری لگ رہی تھی۔ سدابہار درخت اور گھاس بہت نکھری۔ بہت خوبصورت لگ رہی تھی۔ کھڑکی کے سامنے والے بے برگ و بار درخت کی گیری براؤن شاخوں پر جیسے موتیوں کے ہار پروئے ہوئے تھے۔ مجھے بچپن میں پڑھی ہوئی پریوں کی کہانیاں یاد آگئیں۔ یہ موتیوں کا درخت ہے۔ اس سے آگے چاندی کا اور پھر سونے کا درخت ہوگا۔ لعل اور زمرد کے درخت کے گرد پریاں گھیرا ڈالے ناچ رہی ہوں گی۔ یہ موتیوں کے درخت آرام دہ گرم گھر کے اندر سے دیکھنے پر خوبصورت دکھائی دے رہے ہیں۔ اس سردی میں جہاں بارش کے قطرے برف بن کر جم گئے ہیں، میری پری کس دیو کے قبضے میں ہوگی؛ شبستانوں کو مہکانے والیوں کو لوگ دن کی روشنی میں پہچاننے سے بھی انکار کر دیتے ہیں۔ اور گلیوں میں گھومتی ہوئی ان لڑکیوں کی قسمت ہی کیا۔ اُس لڑکی نے بتایا تھا کہ اُس کے پاس اتنے پیسے نہیں کہ وہ اپارٹمنٹ لے کر رہ سکے۔ وہ دن بھر مالز میں بنچوں پر بیٹھ کر، گھوم پھر کر گزارہ کرتی ہے۔ جب وہ اٹھارہ سال کی ہو جائے گی تو کوئی کام ڈھونڈے گی۔ میرے دل میں چھری سی اتر گئی۔ کاش تم مجھے کہیں مل جائیں میری بے گھر بچی، تو میں تمہیں اپنے کلیجے سے لگا لیتی۔ اور اس کے آنسوؤں کے آبشار میری آنکھوں میں منتقل ہو گئے۔ سارا منظر دھندلا گیا اور میرا دل ڈوبنے لگا۔

صرف رونے اور افسوس کرنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ میری صحت بہت گر گئی ہے اس سے پہلے کہ میں اپنے گناہگار وجود سے اس دنیا کو پاک کردوں مجھے کچھ کرنا چاہیے۔ میری مالی حالت اس قابل ہے کہ میں تین چار بچوں کو اپنا لوں۔ اُن کو اتنا پیار اتنا تحفظ دوں کہ زندگی پر اُن کا اعتبار لوٹ آئے۔ وہ محبت کرنا سیکھ جائیں۔ اگلی نسلیں مجرم ہونے سے بچ جائیں۔ یہ کرۂ ارض جرم و نفرت کے

بجائے پیار محبت کا گہوارہ بن جائے۔ میں نے بہت وقت ضائع کیا ہے مجھے اب فوری طور پر اس پر عمل شروع کر دینا چاہیئے۔ ممکن ہے انہی میں کوئی میری بیٹی ہو۔ ہو سکتا ہے وہ شروع سے ہی محفوظ ہاتھوں میں ہو۔ مگر مجھے تو اپنے حصے کا حساب چکانا چاہیئے۔

میری نیند بہت کم ہو گئی ہے۔ رات بھر میں اپنا لائحہ عمل مرتب کرتی رہی ہوں۔ کل میں نے اپنی وصیت تیار کروائی ہے میں نے بے گھر بچوں کی امداد و تحفظ کے لیئے ایک ٹرسٹ قائم کیا ہے۔ وکیل سمجھ رہا تھا کہ میں ٹیکس بچانا چاہ رہی ہوں اُسے کیا معلوم کہ میں قرض چکا رہی ہوں۔ ننھے بچوں کو اپنانا مشکل نہیں لیکن نوجوان بے گھر لڑکے لڑکیوں کو ڈھونڈنا اور انھیں اعتماد میں لینا آسان کام نہیں۔

اس روز مجھے کچھ بچوں کو انٹرویو کرنا تھا۔ انجمن کے صدر نے مجھے نو بجے بلایا تھا۔ میں بہت دیر سے جاگ رہی تھی اور کروٹیں بدل بدل کر تھک چکی تھی۔ مجھے کافی کی طلب ہونے لگی۔ آج میرا ذہن کچھ پرسکون تھا۔ میں نے بستر چھوڑ دیا۔ کافی پیتے ہوئے میں سوچ رہی تھی کہ مجھے کیسا لباس پہننا چاہیے۔ سادہ معمولی سا تاکہ بچے رعب نہ کھائیں، اپنائیت محسوس کریں۔ میں نے چاروں طرف نگاہ دوڑائی جلد ہی یہ تنہائی ختم ہو جائے گی اور میرا گھر میرے بچوں کے شوخ قہقہوں سے آباد ہو جائے گا۔ بڑے عرصے بعد میرے ہونٹوں پر اطمینان بھری مسکراہٹ دوڑ گئی۔ میں نے آئینے میں خود پر نگاہ ڈالی اور مجھے احساس ہوا کہ میں ان دس مہینوں میں دس سال کا فاصلہ طے کر چکی ہوں یا پھر دس صدیوں کا، کیونکہ آئینے میں انتیس تیس برس کی خوبصورت اور چاق و چوبند عورت نہیں تھی کوئی برسوں کی مریض تھی بجھی بجھی آنکھوں کے نیچے گہرے حلقے تھے۔ رخساروں کی ہڈیاں ابھری ہوئی تھیں اور خشک روکھے بال چہرے کی ویرانی میں اضافہ کر رہے تھے مسلسل کرب اذیت اور بے خوابی نے مجھے کتنا بدل دیا تھا۔ میں نے کبھی غور ہی نہیں کیا تھا۔ کوئی بات نہیں۔ میرے بچے آجائیں گے تو میری صحت خود بخود سنبھل جائے گی۔ مجھے اتنے کام ہوا کریں گے کہ سوچنے کی فرصت ہی نہیں ملے گی۔ میں سکون کی ایک گہری سانس لے کر باہر کا موسم دیکھنے لگی۔ رات بھر کے طوفان باد و باراں کے بعد اب برف باری اگرچہ تھم چکی تھی لیکن آسمان اب بھی نہیں کھلا تھا۔ نہ سورج تھا نہ چاند۔ ایک مدھم سا اجالا چاروں طرف پھیلا ہوا تھا۔ سفید بے داغ برف کی ہموار تہہ جمی ہوئی تھی۔ بے برگ و بار درختوں کی شاخیں کپاس کے سے پھولوں سے لدی ہوئی تھیں۔ قدآور درختوں کی برف سے ڈھکی چوٹیاں آسمان کو چھو رہی تھیں۔ سارا منظر بڑا صاف اور پاکیزہ تھا۔ کوئی آواز کوئی آہٹ نہیں تھی۔ درختوں کی شاخیں تک ساکت تھیں۔ کوئی زندہ کوئی ذی روح نہیں تھا۔ ایسا لگ رہا تھا جیسے ابھی روحیں سفید سفید پرندوں کی طرح تیرتی ہوئی آئیں گی اور فضا کے سکوت کو توڑے بغیر خاموشی سے اس سفید، پاکیزہ ملائم چادر پر اتر جائیں گی اور تب درختوں سے نور کی کرنیں پھوٹیں گی اور کوئی آواز گونج کر اعلان کرے گی

——— آج کائنات کی تخلیق کا پہلا دن ہے!

تبھی دروازے کی گھنٹی بجی اور میں بری طرح چونک گئی۔ اتنی صبح کون ہو سکتا ہے! اے خالق، تیری کائنات میں کوئی فساد بپا کرنے والا آگیا، میں نے خوش دلی سے سوچا۔ دروازہ کھولا تو میں حیران رہ گئی۔ ایک لڑکی میرے سامنے تھی "کیا بات ہے؟" میں نے نرمی سے پوچھا۔

"آپ نے اپنی 'ڈرائیو وے' سے برف صاف کرانی ہے؟"

"نہیں میری بچی۔ میں نے سروس لگوائی ہوئی ہے۔ تھوڑی دیر میں وہ آجائے گا۔ اس منجمد کر دینے والی سردی میں تم اتنی صبح صبح کیوں نکل آئیں؟ ٹی۔ وی پر وارننگ تھی کہ صرف چھ سیکنڈ میں آدمی جم کر مر سکتا ہے۔ نمونیہ ہو جائے گا!"

"نہیں مرتی چھ سیکنڈ میں۔ میں ابھی تک زندہ ہوں۔ میں نے پوری رات باہر گزاری ہے!"

"کیا؟" ایک دم مجھے لگا جیسے میرا دل رک گیا ہے۔ میں نے خود پر قابو پانے کی کوشش کرتے ہوئے کہا "اندر آجاؤ۔" میں نے دیکھا اسے سانس لینے میں دقت ہو رہی تھی اور اُس کی سُرخ سُرخ آنکھیں بند ہوئی جا رہی تھیں۔ وہ دیوار کے سہارے کھڑی آنکھیں کھلی رکھنے کی کوشش کر رہی تھی۔ میں نے اُسے سہارا دے کر صوفے پر لٹا دیا۔ "تم بیمار ہو۔"

"نمونیہ ہو گیا ہوگا۔" لڑکی نے زہر خند سے کہا۔

میں نے ایمبولینس کے لیے فون کیا۔ اور جلدی سے لباس تبدیل کیا۔ پانچ منٹ میں ہی ایمبولینس پہنچ گئی اور ہم ہسپتال کو چل دیے۔ ایمرجنسی میں بچی کو بھیج کر کاغذات کی خانہ پری شروع ہو گئی۔ "کون ہے یہ؟" ڈاکٹر نے پوچھا۔ "میری بیٹی ہے۔" میں نے جواب دیا تو ڈاکٹر نے بے یقینی سے مجھے دیکھا کیونکہ جینفر کا لباس زبانِ حال سے اُس کی فلاکت کی داستان کہہ رہا تھا۔

جینفر کی حالت بہت نازک تھی۔ "تمہیں کچھ نہیں ہوگا میری بچی۔ تم ٹھیک ہو جاؤ گی تو میرے ساتھ رہنا میری بیٹی بن کر۔" میں نے اُس کا ہاتھ پکڑ کر کہا۔ میرے دل کا سارا درد میری آواز میں سمٹ آیا تھا۔ میں نے اُس کی جلتی ہوئی پیشانی کو چوما۔ اُس کی آنکھوں سے بھی بالکل آبشار ہی کی طرح آنسو اُبلے اور میرا دل پھٹنے لگا۔ کیوں اس طرح روتی ہیں یہ لڑکیاں کہ دل ٹکڑے ہو جاتا ہے۔ اتنا پانی کہاں سے آتا ہے ان آنکھوں میں۔ یہ آنسوؤں سے کیوں نہیں رُکتیں۔ ندیاں کیوں بہاتی ہیں۔ ندیاں بھی کہاں، آبشار اُبل پڑتے ہیں۔ میری حالت غیر ہونے لگی۔ میری پیشانی پر پسینہ پھوٹ نکلا اور درد کی تیز لہریں دل کو کاٹنے لگیں۔ میں نے کرسی کی پشت پر سر ٹیک کر آنکھیں بند کر لیں۔

پتہ نہیں کتنی دیر بعد کسی نے نرمی سے میرے کندھے پر ہاتھ رکھا۔ میں نے آنکھیں کھول دیں۔ یہ ڈاکٹر تھا۔ "یہاں بیٹھے رہنے سے کوئی فائدہ نہیں۔ آپ بھی آرام کریں۔ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں لگ رہی۔ انسان کے بس میں جو ہے سب کیا جا رہا ہے آپ اطمینان رکھیں۔"

لڑکی بخار کی غشی میں تھی۔ میں نے اس کے ہاتھ کو چومتے ہوئے کہا۔ "فکر نہ کرو میری بچی تم اب بہت جلد اپنی ماں کے پاس اپنے گھر لوٹ آؤ گی۔ بہت جلد۔"

میری اس خودکلامی پر ڈاکٹر نے میرا کندھا تسلی آمیز انداز میں تھپتھپایا۔ "آپ جب چاہیں فون کر سکتی ہیں۔ جب چاہیں آ سکتی ہیں۔ فکر نہ کریں۔"

اور میں مرے مرے قدموں سے لوٹ آئی۔ میں بہت کمزوری محسوس کر رہی تھی۔ مجھے بھی چیک اپ کرا لینا چاہیے تھا۔

فون کی گھنٹی بجی، یہ انجمن بہبودیٔ اطفال کی صدر کا فون تھا۔ "میڈیم، میں یاد دلانا چاہتی ہوں کہ اس وقت آپ کو میرے آفس میں ہونا چاہیے تھا۔"

"میں شرمندہ ہوں۔ کچھ ایمرجنسی ہو گئی تھی۔ ابھی پانچ منٹ میں حاضر ہوتی ہوں۔"

صبح والی خوش دلی رخصت ہو چکی تھی اور طبیعت بھی ٹھیک نہیں تھی۔ کیسے کیسے اندھیارے ہیں اس چند ھیا دینے والے اجالے میں جس کی چکاچوند میں ان پر نظر ہی نہیں پڑتی۔ اوجھل رہتے ہیں نگاہوں سے۔ میں نے گاڑی کی چابی اٹھائی ہی تھی کہ فون کی گھنٹی چیخ اٹھی۔ میں نے لپک کر ریسیور اٹھایا۔ میرا دل اس تیزی سے دھڑکنے لگا کہ اس کی آواز سنائی دینے لگی۔ دوسری طرف کوئی کہہ رہا تھا "آپ ہسپتال آجائیں۔"

"کیوں کیا بات ہے؟ میری بچی تو ٹھیک ہے نا؟"

"ہمیں افسوس ہے!" آواز نے جواب دیا اور فون بند ہو گیا۔

تو میں نے تمہیں مار دیا میری بچی۔ میں نے رونا چاہا۔ چیخنا چاہا۔ ہاں میں تمہاری قاتل ہوں بیٹی۔ وہ میں ہی ہوں جو خود گرم گھر میں آرام دہ بستر پر سوتی رہی اور تم منجمد کر دینے والی سردی میں خود کو جم کر مرنے سے بچانے کے لئے رات بھر چلتی رہیں۔ دوڑتی رہیں۔ وہ تمہارے زخمی پاؤں ــــ ٹانگوں کی پھٹی ہوئی نسیں ــــ جلتی ہوئی آنکھوں کے آبشار ــــ!

میرا دل پسلیاں توڑ کر باہر نکلنے لگا۔ مجھے مر جانا چاہیئے یہی میری سزا ہے۔ نہیں مجھے جینا ہے۔ مجھے جینا چاہیئے۔ میں اب اور کسی بچی کو طوالف بنتے نہیں دیکھنا چاہتی کسی اور بچی کو جم کر مرتے نہیں دیکھ سکتی میں نے ایمبولینس کے لئے فون کر دیا ہے۔ بس جیوں گی میرے بچو۔ تمہارے لیئے تمہاری ماں جیئے گی تمہیں پیار کرنا سکھائے گی۔ آئندہ دنیا کو جرم و نفرت سے بچانے کے لئے۔ میں نہیں مر سکتی میرے بچو! میں نہیں مر سکتی۔

ڈائری کے اس صفحے پر اس سیل سے پندرہ دن پہلے کی تاریخ تھی جس سے میں نے یہ گلدان، لیمپ اور فوٹو فریم اور پھر وہ پرس خریدا تھا جس پر پیتل کا ایس (S) چپکا ہوا ہے۔

سٹیریوٹائپ

محمد جمیل آفاقی

پہاڑ کی چوٹی پہ واقع وی آئی پی گیسٹ ہاؤس میں آج شام پھر کوئی قافلہ اُترا تھا۔ یہ لوگ کسی بین الاقوامی سیمینار کے مندوبین تھے۔ انھیں ملک کا سب سے بڑا ڈیم اور بجلی گھر دکھانے کے لئے یہاں لایا گیا تھا۔ اس طرح کے قافلے یہاں اترتے ہی رہتے تھے۔ مختلف محکموں کی کوسٹرز اور سٹاف کاریں سرخ ستونوں والے گیٹ سے داخل ہو کر پورچ کے سامنے رُکتیں۔ باوردی شوفر مستعدی سے دروازے کھولتے۔ خیر مقدمی کلمات کا تبادلہ ہوتا اور میزبان مہمانوں کو لے کر لاؤنج کی طرف چل پڑتے۔ کبھی کبھی کوئی منچلا مہمان تھکی ہوئی ٹانگیں کھولنے کے بہانے باہر ہی رک جاتا۔ عمارت کے وسیع لان میں گھوم پھر کر فضا کی تازگی اور ماحول کے حسن کا لطف لیتا۔ اُسے اپنی ملازمت کے دوران دیکھے ہوئے دوسرے ریسٹ ہاؤس یاد آتے اور اس عمارت کا اُن سے موازنہ کر کے اسے نمبر ون ٹھہراتا پھر اگر وہ کوئی حساس آدمی ہوتا تو اداسی کی لہر اُسے اپنی لپیٹ میں لے لیتی "تیسری دنیا کا ایک اور شوپیس" وہ سوچتا اور گھبرا کر لاؤنج کی طرف چل پڑتا جہاں اب خیر مقدمی کلمات سے آگے کی گفتگو چل رہی ہوتی تھی۔

ادھر گیسٹ ہاؤس کے چاق و چوبند اٹینڈنٹ کاروں کی ڈگیوں سے بدیسی وضع کے خوبصورت بیگ نکال کر انھیں کمروں میں پہنچانے چل دیتے۔ سامان کو سلیقے سے کمرے میں جما کر وہ آخری بار پلنگ کی چادروں، باتھ روم کے چمچماتے کموڈ اور بے داغ تولیے کا تنقیدی نظر سے جائزہ لیتے۔ کونوں کھدروں میں فریشنر کا آخری چھڑکاؤ مارتے اور پھر مہمانوں کے انتظار میں کوریڈور میں ٹک جاتے۔ یہ سلیقہ، یہ مستعدی اس گیسٹ ہاؤس کی پرانی روایت تھی۔

آج پھر مہمانوں کی آمد پر وہی پرانی خیر مقدمی ڈرل دہرائی گئی۔ آنے والے اب اپنے کمروں میں "سیٹل ان" ہو چکے تھے۔ کچن میں کئی کورسز پر مشتمل ڈنر تیار ہو رہا تھا۔ ڈائننگ روم میں رنگین شیشہ کے تلے بڑھیا کراکری اور کٹلری جگمگا رہی تھی۔

گیسٹ ہاؤس کے دریا کی جانب والے لان میں چائے کی میز سجائی گئی تھی۔ میز کی پتلی ٹانگیں آدھی سے زیادہ، لمبے میز پوش تلے چھپی ہوئی تھیں۔ باقی ماندہ حصے پر جنوری کی جاتی ہوئی دھوپ کی ایک ٹکڑی نظر آ رہی تھی

آہستہ آہستہ مہمان اپنے کمروں سے برآمد ہونا شروع ہوئے۔ ان کے جسموں پر ہلکے پھلکے گرم لباس اور چہروں پر گرم پانی اور تولیوں کے لمس سے پیدا ہونے والی تازگی اور نرماہٹ تھی۔ پچھلے کئی روز کی بیگار اور خشک مصروفیات کے بعد پہاڑوں کے دامن میں یہ شام جس کے عقب میں ایک تھکا دینے والا سفر اور سامنے ایک پُر آسائش کمرہ اور عمدہ کھانا تھا، بڑی پسندیدہ تھی۔ چائے کی پیالیاں لئے وہ لان کے مختلف حصوں میں بکھر گئے۔ ذرا دیر کو ماحول کے حسن کی باتیں ہوئیں۔ دریا پر اُچٹتی سی نظر ڈالی گئی۔ غروب آفتاب کے منظر کو سراہا گیا۔ پھر اس منظر کو پس منظر بنا کر انھوں نے اپنے پسندیدہ موضوعات پر گفتگو شروع کر دی۔ تیسری دنیا کے مسائل، اقدار کی پامالی، اداروں کا زوال وغیرہ۔ لان مانوس خیالات کی بھنبھناہٹ سے

گونج اٹھا۔ اس گفتگو کا کوئی آہنگ تھا نہ بہاؤ۔ پھر بھی وہ سب خوش تھے کہ وہ بہاؤ میں شامل ہیں کیونکہ اس طرح کے ہجوم میں الگ تھلگ رہنے کا الزام بڑا مہنگا پڑتا تھا۔ ان میں سے کچھ نے رسوں کے پل پر آپس کی بیگانگی کو عبور کیا، کچھ نے مناسب فاصلے سے ایک دوسرے کی ذہانت کی داد دی اور کچھ دوسروں کی خامیاں معلوم کر کے خوش ہوئے۔

میز کی ٹانگ سے لپٹا دھوپ کا ٹکڑا فیڈ ہوتا گیا۔ پہاڑوں کے پیچھے ابھرنے والی شفق نے دریا کے پانی کو لال کر دیا۔ پاور ہاؤس میں شفٹ بدلی اور سات بسوں میں بیٹھ کر روانہ ہوا۔

بڑھتی ہوئی خنکی اور گفتگو کے ماند پڑتے موڈ کا احساس کر کے وہ لوگ اپنے اپنے کمروں کی جانب چل دیئے۔ اپنے ذہنوں کی ٹوکریوں میں نئے نئے امیجز بھر کر۔

لان میں اب صرف ایک آدمی رہ گیا تھا۔ چھوٹے قد اور بھرے بھرے جسم کا یہ آدمی یا تو ۵۰ء کی دہائی کا کوئی بیوروکریٹ تھا جو پائپ پیتے ہیں، وسیع المطالعہ ہوتے ہیں اور شستہ انگریزی میں گفتگو کرتے ہیں اور جن کی "وٹ" اُس پرانی مرسیڈیز کی مانند ہوتی ہے جسے بہت احتیاط سے اور سنبھال کر برتا گیا ہو۔ یا پھر وہ کوئی پرائیویٹ بزنس اگزیکٹو تھا جو ان بیوروکریٹس پر ہنستے ہیں۔ ویسے اُس کے انداز میں وقار بھی تھا اور چستی بھی۔ لگتا تھا وہ اس عمر میں بھی اچھی تراش کے سوٹ پہنتا ہو گا، شوخ نکٹائیاں لگاتا ہو گا، دن میں کچھ وقت کمپیوٹر کے سامنے گزارتا ہو گا اور خواتین سے دوستی کا بھی شائق ہو گا۔

لان کی ریلنگ کو پکڑے وہ دریا پر نظریں جمائے کھڑا تھا اور سوچ رہا تھا —— یہاں کی شام اب بھی جنگل کی شام جیسی ہے حالانکہ اس کالونی اور گیسٹ ہاؤس کو تعمیر ہوئے عرصہ ہو چکا۔ دریا کی آنکھ میں بھی وہی پریمیٹو سادگی ہے جو گاؤں کے بڑے بوڑھوں میں ہوتی ہے جنہیں تم چاہے کتنی ہی دیر کے بعد ملو وہ تمہیں تمہارے بچپن کے نام ہی سے مخاطب کرتے ہیں۔ یہ احساس کیے بغیر کہ تمہارا بائیو ڈیٹا کتنا طویل اور امپریسو ہے اور تم کتنے اہم آدمی بن چکے ہو۔ سالہا سال یورپ میں قیام کے دوران اس نے کئی دریاؤں کو نظر جمائے دیکھا تھا، کبھی پل پر کھڑے ہو کر، کبھی سٹیمر پر بیٹھے ہوئے۔ مگر یا تو ان کے پانیوں میں جان نہیں تھی یا وہ اجنبیوں پر کھلتے نہیں تھے۔ ایک یہ دریا تھا جس کے کنارے اُس نے ملازمت کے اوائل میں چند ماہ گزارے تھے مگر اس کے انداز میں اب تک ایک بے باک شناسائی تھی۔ یہ میرا دریا ہے، اُس نے ریلنگ پر ذرا آگے جھک کر دریا کو دیکھا جو اپنے چوڑے پاٹ میں سست روی سے بہے جا رہا تھا۔ مگر دریا کو پوزیس نہیں کیا جا سکتا، اُس نے اداسی سے سوچا۔ بائی دی وے، میں یہاں کھڑا کس لئے ہوں، کیا عمرِ رفتہ کو آواز دینے؟ ایسا تو کوئی وعدہ میں نے اپنے آپ سے نہیں کیا تھا۔ حالانکہ مجھے معلوم تھا کہ اس جگہ کا وزٹ سیمینار کے پروگرام میں شامل ہے۔ مجھے تو ان لوگوں میں ہونا چاہیئے جو پچھلے چند روز کی رفاقت کے دوران میری شخصیت کے گرویدہ ہو چکے ہیں۔ دریا کی طرح بہتے رہنا میری مجبوری ہے۔

مگر ٹھنڈی ریلنگ پر دھرے اُس کے نرم ہاتھوں کو اُس کی بات ماننے میں تامل تھا۔ اس کے ذہن کی کیفیت جسم کے لیے تحریک نہیں بن پا رہی تھی —— اولڈ ایج؟

نجانے وہ کالونی اور سائٹ کہاں ہو گی، جہاں میں رہا کرتا تھا۔ اُس نے شام کے دھندلکے میں دوسرے کنارے پر دیکھنے کی کوشش کی۔ مگر ہر طرف دریا ہی دریا پھیلا ہوا تھا۔ دوسرے کنارے پر بھی۔ جب کوئی بستی دریا برد ہوتی ہے تو کیا سماں ہوتا ہو گا۔ اس نے جھرجھری لی۔ خصوصاً جب دریا رات کے وقت کسی بستی میں جا گھسے۔ اُس کالونی کو تو بڑے منظم طریقے سے دریا کے سپرد کیا گیا ہو گا۔ سارا قیمتی سامان نکال لینے کے بعد آہستہ آہستہ پانی چھوڑا گیا ہو گا اور وہ پہلے مقامات خاموشی سے ڈھے گئے ہوں گے۔ شاید انہیں پہلے ہی بلڈوزرو

سے گرا دیا گیا ہو۔

دریا کے بائیں کنارے پر واقع وہ کالونی دن بھر خموشی میں ڈوبی رہتی تھی۔ کبھی کبھار کوئی میم اپنے بچے کے ساتھ ایک مکان سے دوسرے میں جاتی نظر آتی یا کوئی تن آسان بیرہ گاربج پھینکنے کے بہانے ساتھ والے بیرے سے گپ لگاتا نظر آتا۔ اس کالونی میں ایک ہی جیسے مکانات کی بہت سی قطاریں تھیں جن کے باہر عام سے لان تھے اور ان کے باہر چھوٹی چھوٹی سڑکیں جن پر صبح شام شفٹ بدلنے کے اوقات کے علاوہ بھی کوئی کم ہی نظر آتا۔ ایک طرف ڈھلوان چھتوں والی کلب کی عمارت تھی اور اس کے ساتھ اسپتال اور ایس سیون۔ ایس سیون ایک ہاسٹل نما بلڈنگ کا نام تھا جو کمپنی کے دیسی ملازمین کے لئے بنائی گئی تھی۔ اس عمارت کی گراونڈ فلور پر میس تھا اور باقی رہائشی کمرے۔ ان عمارتوں کے علاوہ کالونی میں بہت سے خالی قطعات تھے جن میں شیشم کے درخت بے ترتیبی سے اُگے ہوئے تھے۔ وہاں کی عام خاموشی اور بھی گہری ہو جاتی تھی۔ ملازمت کے پہلے روز جب وہ سامان رکھنے یہاں آیا تو اُسے اپنے قصبے کے انٹرمیڈیٹ کالج کا خیال آیا جب وہ چھٹیوں کے لئے بند ہو — یہ خیال کچھ افسردگی آمیز تھا، اس لئے اُس نے اسے ذہن سے جھٹک دیا اور اپنے ساتھ آئے ایڈمن آفیسر کی باتیں سننے لگا "سر آپ کی رہائش اس بنگلے میں ہوگی۔ آپ واحد مقامی آدمی ہیں جنہیں یہاں اکاموڈیٹ کیا گیا ہے۔ باقی سب لوگ ایس، سیون میں ہیں۔ کھانے کے لئے البتہ آپ کو بھی فی الحال وہاں جانا پڑے گا۔ کیونکہ ہمارے پاس کوئی خانساماں اچھا کُک نہیں۔ چند روز تک ایک اچھا کُک آنے والا ہے۔ اگر آپ نے مناسب سمجھا تو وہ کچن شروع کرے گا۔ گاڑی آپ اپنے ہمسائے مسٹر اینڈریو واٹ کے ساتھ شیئر کریں گے۔ وہ بڑا انٹرسٹنگ آدمی ہے۔ آپ کو پسند آئے گا۔ اس کے علاوہ کوئی پرابلم ہو تو میں حاضر ہوں —" ایڈمن آفیسر نے جھجکتے ہوئے کہا۔ ابھی چند روز پہلے اُس نے ڈگری وصول کرنے کے لئے یونیورسٹی کے ایڈمن کلرک کی کھڑکی کے سامنے طویل انتظار کیا تھا۔ ان دونوں واقعات کا درمیانی فاصلہ خطِ مستقیم میں ماپنا بہت مشکل تھا۔

پھر وہ سائٹ کی طرف روانہ ہو گئے۔ وہ دریا پر بنے ہوئے پاور ہاؤس میں کچھ اضافی یونٹ بنائے جا رہے تھے۔ اس جگہ کو لوہے کی چادروں اور مٹی کا بند بنا کر دریا سے خالی کروایا گیا تھا۔ پہلے اسے ٹربائن کی تنصیب کے لئے مطلوبہ حد تک گہرا کیا گیا۔ اب اس میں کنکریٹ کا فرش اور دیواریں کھڑی کی جا رہی تھیں۔ کام دن رات جاری رہتا۔ دریا پر بنائے گئے عارضی ڈیم کے اوپر دو کمروں پر مشتمل ریذیڈینٹ سائٹ آفس تھا جہاں ڈرائنگ ٹیبلز اور کرسیوں وغیرہ کے علاوہ ایک کونے میں میز پر برقی کیتلی اور کافی کا ڈبہ پڑا تھا۔ اینڈریو واٹ سے اس کی ملاقات یہیں ہوئی۔ وہ لمبے قد اور اکھاڑیک جسم والا ہنس مکھ امریکی نوجوان تھا۔

"کافی پیو گے؟" اینڈریو نے ہاتھ ملاتے ہوئے پوچھا۔

"پتہ نہیں۔" وہ بے ساختہ تذبذب سے بولا۔

اور اینڈریو ہنس پڑا "تم بالکل انگریزوں جیسی گفتگو کرتے ہو۔ ہمارے ہاں مشہور ہے کہ اگر کسی انگریز سے کافی کا پوچھو تو وہ کندھے سکیڑ کر "شاید نہیں" کہے گا جس کا مطلب اقرار ہوتا ہے۔" وہ کافی ٹیبل کی طرف بڑھتا ہوا بولا۔ "ویسے میرے جیسی کافی اس قرب و جوار میں تو کوئی نہیں بناتا۔ یہ میں نے اپنی گرل فرینڈ سے سیکھی ہے۔"

گوروں کی نوکری سخت تو تھی مگر ان کے ساتھ کام کرنے کا مزہ بھی تھا۔ یہ ایک یاد رہ جانے کا تجربہ تھا۔ اتنا بڑا پراجیکٹ اُس کی نظروں کے سامنے تعمیر ہو رہا تھا۔ یہاں کام کی رفتار مہینوں یا ہفتوں کی بجائے گھنٹوں اور منٹوں میں ماپی جاتی تھی۔ سائٹ پر کام کرنے والی مشینیں جس جگہ پل پڑتیں ذرا دیر میں اُسے ٹرانسفارم کر کے رکھ دیتیں۔ صبح ڈیوٹی پر آمد کے وقت سائٹ کی حالت کچھ اور ہوتی۔ شام تک وہاں کئی نئے سٹرکچرز کا اضافہ ہو چکا ہوتا۔

فرصت کے اوقات میں وہ اینڈریو کی نظر بچا کر ایک خالی کنٹینر میں جا گھستا اور مقابلے کے امتحان کی تیاری کے لیے کتابیں پڑھتا۔ اس کا یہ راز ہمیشہ راز ہی رہا۔

کالونی کی شامیں شروع میں خاصی بوجھل تھیں۔ ایس ایبون میں لوگ انتہائی خاموشی اور انہماک سے کھانا کھاتے۔ میس پر کمرۂ امتحان کا گمان ہوتا اور بیرے نگرانوں کی مانند اعصاب پر سوار رہتے۔ آپس میں بھی لوگ بہت کم بات کرتے تھے۔ اس سے اس لیے بھی تکلف برتا جاتا تھا کہ وہ عہدے میں ان سب سے سینیئر تھا۔

ایک شام اس نے یونیورسٹی سے یاد کیے ہوئے دو تین چٹکلے سنا کر تکلف کی اس دیوار کو خود ہی توڑ ڈالا۔ اب وہ کھانے کے بعد دیر تک میس میں بیٹھنے لگے۔ گفتگو کی انگیٹھی بڑے اہتمام سے سلگائی جاتی اور لوگ قریب قریب سمٹ آتے۔ انگیٹھی کا ایندھن روزمرہ کے واقعات ہوتے جن پر حسبِ ضرورت غیبت کا تیل چھڑکا جاتا۔ کبھی کبھار جب اس سے تسلی نہ ہوتی تو ناس گوروں کے خلاف کتھارسس کا سرخ شعلہ بھڑکایا جاتا۔ گورا ان کے قریب ہوتے ہوئے بھی ایک پُراسرار مخلوق تھا۔ اونچی جگہ پر نصب سنگِ مرمر کے مجسمے کی مانند جس کی طرف تم دیکھے بغیر نہیں رہ سکتے، جس کی پُراسرار سنگی خوبصورتی ہر حال میں تمہاری زندگی پر حاوی ہوتی ہے۔ اس گفتگو کی اپنی دانشورانہ ٹون اور اپنا دکھ ہوتا تھا۔

ویسے ان باتوں کا گوروں کے ساتھ ان کے عمومی تعلقات پر کوئی اثر نہیں پڑتا تھا کیونکہ ذاتی طور پر کئی گورے بہت اچھے تھے۔ بلکہ ہر گورا کسی نہ کسی کا "اچھا آدمی" تھا۔ خود اس کی اینڈریو واٹ کے ساتھ خوب نبھتی تھی۔

یوں نوکری کا یہ اولین تجربہ اس کے لیے بہت خوشگوار تھا۔ اچھی تنخواہ، عمدہ کمپنی، قیمتی تجربہ اور رائیڈ دیگر وغیرہ سبھی کچھ یہاں تھا۔ سب سے بڑی بات کہ اشیاء پر انسان کے بھرپور کنٹرول کا احساس ہوتا تھا اور زندگی صاف سیدھے ٹریک کی دوڑ معلوم ہوتی ہے۔

مقابلے کے امتحان میں کامیابی کے بعد گوروں کی ملازمت چھوڑ کر وہ اعلیٰ سروس میں چلا گیا اور پھر وہاں سے ایک بین الاقوامی مالی ادارے کی آفر پر بیرون ملک روانہ ہوا۔ ریٹائرمنٹ کے بعد اس نے وہیں اپنی کنسلٹینسی فرم کھول لی اور آج تیس سال بعد وہ واپس آیا تھا ایک فربہ جسم اور سر کے اڑے ہوئے بالوں والے آدمی کے روپ میں۔

شام کا دھندلکا اب سرخ سے سرمئی ہو رہا تھا۔ پل پر بتیاں روشن ہو چکی تھیں اور سنتری ڈیوٹی تبدیل کر رہے تھے۔ اتنا وقت گزر جانے کے باوجود کوئی مجھے بلانے نہیں آیا، اس نے کلائی کی گھڑی پر وقت دیکھتے ہوئے تاسف سے سوچا۔ شاید وہ لوگ سوچ رہے ہوں کہ ہم نے اس بوڑھے کو ضرورت سے زیادہ اہمیت دے ڈالی ہے۔ آخر میں ان کے لیے ہوں کیا۔ ایک دھندلا کنٹیکٹ نجانے اس سیمینار کی نامزدگی اور سپانسرشپ کے لیے بے چاروں نے کیسے کیسے پاپڑ بیلے ہوں گے۔ اور اب روزانہ کتنی بار اپنے ڈیلی الاؤنس کی رقم کو مقامی کرنسی میں تبدیل کر کے اپنی شاپنگ لسٹ کی کانٹ چھانٹ کرتے ہوں گے۔ یہ سب اپنی اداسی کی کوٹھریوں میں قید رہنے والے سٹیریو ٹائپ ہیں ان سے کیا گلہ کرنا۔

دریا کے دوسرے کنارے پر ایک ہیولہ سا ابھرا۔ یہ کوئی عجیب وضع کی شے تھی۔ کوئی کرین۔ یا کسی سٹیمر کا ڈھانچہ۔ یا پھر کوئی آسیب؟ اس کے ذہن میں ایک پرانا واقعہ سرسرایا (اس واقعے کا ذکر اس نے آج تک کسی سے نہیں کیا تھا)۔

یہ واقعہ اس کنٹینر سے متعلق تھا جس میں بیٹھ کر وہ امتحان کی تیاری کیا کرتا تھا۔ یہ کنٹینر اس کی ہی نہیں اور بھی بہت سے لوگوں کی خفیہ ضروریات پوری کرتا تھا۔ کئی کام چور ورکر اپنے فورمین کی نظر بچا کر یہاں سستانے چلے آتے تھے۔ سردے سیکشن والے بارش میں یہاں پناہ لیتے تھے۔ قرب وجوار کے دیہات سے آنے والے مزدور جو گھر سے ڈانگری پہن کر نہیں آتے تھے اس کنٹینر کو بطور ڈریسنگ روم استعمال

کرتے تھے۔ چالیس واٹ کا ایک بلب ہمیشہ یہاں روشن رہتا جس کی مدھم روشنی میں اس کی دیواروں پر جمی گرد میں انگلیوں سے بنے نقش و نگار نظر آتے تھے۔ کہیں کہیں کوئی شعر یا نعرہ بھی لکھا ہوتا۔ نمعلوم کون اس کنٹینر کو یہاں رکھ کر بھول گیا تھا کیونکہ بظاہر سائٹ پر اس جگہ اس کی موجودگی کا کوئی مطلب نہیں تھا اور سیفٹی سیکشن والے کسی غیر ضروری شے کو ایک پل کے لیے بھی گوارا نہیں کرتے تھے بہرحال جب تک وہ یہاں پڑا تھا سب لوگ حتی الوسع اس سے مستفید ہو رہے تھے۔

ایک سہ پہر وہ اپنے کیبن سے نکل کر اس جگہ آیا جہاں کنکریٹ ہو رہی تھی۔ ابھی اُسے کچھ ہی دیر ہوئی تھی کہ موسلا دھار بارش شروع ہو گئی۔ اتفاقاً وہ رین کوٹ بھی نہیں لایا تھا۔ نزدیک ترین پناہ گاہ وہی کنٹینر تھا۔ وہ لپک کر اس کے اندر گھس گیا۔ آج پہلا موقع تھا کہ وہ بغیر کسی کتاب کے یہاں آیا تھا۔ وقت گزاری کے لئے وہ دیواروں پر لکھے شعر اور نعرے پڑھتا رہا۔ جلد ہی وہ اس شغل سے اکتا گیا۔ باہر بارش رُکنے کا نام ہی نہیں لے رہی تھی۔ کیا کیا جائے، اُس نے سوچا۔ دروازے سے سر نکال کر کیبن والوں کو اشارہ کروں کہ گاڑی بھیجیں، یا یوں ہی باہر نکل کر کیبن کی طرف دوڑ لگا دوں۔ دونوں میں سے کسی بھی تجویز پر عمل کرنے کو اس کا دل نہیں چاہ رہا تھا۔ اُسے جھنجھلاہٹ ہونے لگی۔ اوپر جا کر اس نے بہت سے ضروری کام کرنے تھے۔ خواہ مخواہ یہاں ٹریپ ہو گیا۔

بے بسی کے احساس کے تحت وہ کنٹینر میں ٹہلنے لگا۔ پھر لکڑی کے فرش پر اپنے بھاری جوتوں کی بھاری آواز سنتے سنتے وہ ایک عجیب احساس سے دوچار ہوا۔ نجانے اُس کے تھکے ہوئے اعصاب سکون چاہتے تھے یا وہ چالیس واٹ کے بلب کی روشنی تھی ہی پراسرار اُسے یوں لگا جیسے وہ اپنی روزمرہ کی عام سی خوشگوار زندگی گزارتے گزارتے اتفاقاً کسی اور دنیا میں چلا آیا ہو۔ جیسے یہ کنٹینر باہر چلتی درجنوں مشینوں اور ان پر کام کرتے سینکڑوں آدمیوں سے پرے اپنا ایک الگ وجود، ایک سناٹا رکھتا ہو۔ یہ سناٹا خاموشی کے اُس بے لطف وقفے سے بہت مختلف تھا جو گفتگو کے دوران اچانک در آتا ہے اور جسے انسان جلد سے جلد عبور کرنا چاہتا ہے۔ یہ سناٹا اپنے اندر ایک ازلی سمت رکھتا تھا جو اچانک ریسیور پر کیچ ہونے لگی تھی۔ لکڑی کے فرش پر اپنے بھاری جوتوں کی آواز سنتے سنتے وہ رکا اور اپنا ماتھا کنٹینر کی ٹھنڈی گرد آلود دیوار کے ساتھ جوڑ دیا۔ وہ سپردگی سے پہلے کے تذبذب سے دوچار تھا۔ باہر کی دنیا کا احساس اب بھی اُس کے ذہن میں موجود تھا۔ باہر وقت تھا اور اگلے لمحے میں میں خود کو اپنے من پسند روپ میں بر ہیچو ایٹ ( ) کرنے کا امکان۔ اور بہت سی اشیا، جنہیں پوزیس کیا جا سکتا تھا، اور یہاں ایک انوکھا بے نام بے سمت خلا تھا جس میں اندر اور باہر کی تخصیص نہ تھی جس میں شامل ہونے کے لئے اُسے کوئی حد عبور نہیں کرنی تھی کسی سے راستہ نہیں مانگنا تھا۔ اپنے ذہن اور جسم سے بھی نہیں۔ صرف اور صرف فیصلہ کرنا تھا۔

عین اُس لمحے دروازے پر دستک ہوئی اور اینڈریو نے اپنا سر اندر گھسایا۔ "آخر میں نے تمہاری ہائیڈ آؤٹ کا سراغ لگا ہی لیا۔" وہ کلکاری سی مارتے ہوئے بولا۔ "ویسے میڈیٹیشن سائٹ انجینیئرز کے لئے کوئی اتنی فٹ چیز نہیں۔ آؤ تمہیں کافی پلاؤں۔" وہ اُسے کھینچ کر ساتھ لے گیا۔

بارش کے بعد کھلتے ہوئے موسم میں کافی کا کپ واقعی بہت مزیدار تھا۔ مگر اگلے روز وہ کنٹینر سائٹ پر نہیں تھا۔ آخر سیفٹی سیکشن والوں کی نظر اُس پر پڑ گئی تھی اور وہ اُسے کرین سے اٹھا کر جنک یارڈ میں پھینکنے جا رہے تھے۔ کرین کے بوم کی بلندی پر لٹکا وہ عجیب بے بس اور مضحکہ خیز چیز لگ رہا تھا۔ سارا سائٹ اس پر ہنس رہا تھا۔ وہ بھی جن کی بہت سی ضروریات اس سے وابستہ رہی تھیں۔ دوسرے لوگوں کے ساتھ اُس نے بھی یہ منظر دیکھا مگر وہ ہنس نہ سکا۔ کیسے ہنستا جبکہ اُسے یوں لگ رہا تھا جیسے کرین کی بلندی پر کنٹینر نہیں وہ خود لٹکا ہوا بے بسی سے ہاتھ پاؤں چلا رہا ہو۔ شرمندگی اور کچھ کھو دینے کا احساس اُس کی پشت کے کسی دور افتادہ حصے پر رینگ رہا تھا۔ وہ

چپ چاپ اپنے کیبن میں جا کر کام میں مصروف ہو گیا۔ اس شام اینڈریو نے اسے کلب میں اپنے ساتھ ٹینس کھلائی اور کئی نئے لوگوں سے متعارف کرایا۔

شام کا دھندلکا کب کا رات کے گاڑھے اندھیرے میں بدل چکا تھا۔ ٹھنڈی ریلنگ پر دھرے اُس کے ہاتھ برف ہو گئے تھے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر ابھرتے والا ہیولا اب کہیں نظر نہیں آ رہا تھا لیکن اُس کی پشت کے کسی دور افتادہ حصے پر کوئی غیر انسانی شے رینگ رہی تھی۔

ایک بیرہ اُسے ڈھونڈتا ہوا وہاں آ نکلا۔

"صاب کھانے پر سب لوگ آپ کا انتظار کر رہے ہیں۔"

"ٹھیک... ہے۔" اُس نے مڑ کر دیکھے بغیر سر ہلایا — (اُسے یقین تھا یہ بیرہ ایڈورڈ یو واٹ کی مانند گورا چٹا اور ہنس مکھ ہو گا۔)

کیوں نہ میں واپس جانے سے انکار کر دوں اور خود کو سناٹے کے حوالے کر دوں۔ لامتناہی خلاء کا حصہ بن جاؤں جس میں اگلا لمحہ ہے نہ اپنی شخصیت کا بوجھ، نہ ہی یہ خوف کہ ڈائننگ روم میں اپنے زانوؤں پر بے داغ نیپکن بچھائے کن انکھیوں سے سوپ کے پیالوں کی طرف دیکھتے لوگ زیادہ دیر انتظار نہیں کریں گے۔

مگر یہ خیال اُس کے اندر ذرا سا بھی جوش یا اشتیاق پیدا نہ کر سکا۔ اتنا بھی نہیں کہ وہ ریلنگ پر تھوڑا سا آگے جھک کر دریا کو دیکھنے کی کوشش کرتا جو اندھیرے میں نری آواز بن کر رہ گیا تھا۔ اپنی اندرونی بے کسی پر وہ دہل کر رہ گیا۔ اب وہ تیس سال پہلے والا آئیڈیلسٹ نوجوان نہیں تھا اور یہ کوئی نیا انکشاف نہیں تھا مگر یہ احساس کہ اُس کے اندر اپنا آپ کسی سناٹے، کسی خلاء کو سونپ دینے کی خواہش تک مر چکی ہے، بڑا جان لیوا تھا۔ اپنی تمام تر ذہانت، تنوع اور ہمہ جہتی کے باوجود وہ بھی محض انا کے کھونٹے سے بندھا ہوا ایک سٹیریو ٹائپ تھا۔ جو ہمیشہ اس ادھیڑ بُن میں رہتا تھا کہ اگلے لمحے کی کھائی کو کیونکر عبور کیا جائے اور جس کی زندگی کے اہم ترین حقائق میں کسی شے کا حصول، کسی عمدہ کھانے کا انتظار یا کسی خوبصورت جملے پر ملنے والی داد کو اولیت حاصل تھی۔

دریا کی آواز میں کچھ ایسا کرب اُمڈ آیا تھا جیسے کوئی بوڑھا جاں کنی کے عالم میں ریت پر گھسٹ رہا ہو۔ پہاڑ سے سمندر تک اُس کا سارا سفر بڑی مجبوری معلوم ہوتا تھا۔

وہ کچھ دیر بے حس و حرکت کھڑا رہا۔ پھر سر جھکائے عمارت کی جانب واپس چل پڑا اور دروازے تک پہنچنے سے پہلے نہ صرف چہرے کے تاثرات درست کر لیے بلکہ یہ سوچ لیا کہ آج وہ کھانے کی میز پر لوگوں سے نیروبی کے باربی کیو اور برازیل کی خواتین کی صحت مندی کی باتیں کرے گا۔

تقدیر

خالد طور

بہار کا موسم مجھے ہمیشہ ایک ایسے شدید احساس سے یوں آشنا کرتا ہے، جیسے وہ نوزائیدہ ہو۔ ہر بار احساس کی شدت اُس بچے کی چیخ کی طرح محسوس ہوتی ہے جس نے اس دنیا کی آب و ہوا کو اپنے ننگے بدن پر محسوس کرتے ہی پہلا احتجاج کیا ہو۔ ہوا خشک ہو کر نم آلود، بچہ درجۂ حرارت کی تبدیلی کو محسوس کرتے ہوئے جب چیختا ہے تو اُس کی چیخ میں ایک احتجاج ضرور ہوتا ہے۔ یہ فیصلہ شاید کبھی نہ ہو سکے کہ وہ یہ احتجاج کس سے کرتا ہے اور کس کے خلاف کرتا ہے۔ کس نے اُسے اس دنیا میں لا پھینکا ہے۔ ماں باپ نے، کسی آسمانی قوت نے، موت اور زندگی کے سدا رواں چکر نے یا تقدیر نے —— ! یہ فیصلہ تو شاید بہار کا موسم بھی نہ کر سکے کہ خزاں کی خشک ہواؤں سے جھڑے ہوئے پتوں والے درخت کیوں ہرے ہو جاتے ہیں۔

برسوں پہلے، بہار کی چھٹیوں میں، جب میں شہر سے گاؤں پہنچا تو کھیتوں میں پھیلی پیلی پیلی سرسوں کی مہک نے مجھے کچھ زیادہ ہی دیہاتی بنا دیا۔ جنونی سی کیفیت طاری ہو گئی، کتنے ہی شعر کہہ ڈالے۔ ویسے تو ہر بار گاؤں سے دور رہنے کے بعد میں جب بھی گاؤں پہنچتا رہا ہوں، نہ صرف میرا لہجہ دیہاتی ہو جاتا ہے بلکہ میں اُس کھلنڈرے بچے کی طرح ہو جاتا ہوں جو گاؤں کی گلیوں میں صرف کُرتہ پہنے دوڑنے لگتا ہے۔

چھٹیاں بڑے مزے سے گزر رہی تھیں۔ دو چار ہی باقی رہ گئی تھیں کہ ایک سہ پہر کو گاؤں کے رمضان ملیار (کنویں پر سبزیاں اُگانے والے) کی بیوی پھتاں نے گاؤں کی گلیوں میں واویلا کیا۔ اُس نے چادر سر کے بجائے گلے میں پھندے کی طرح لٹکائی ہوئی تھی، اُس کے دونوں بازو آسمان کی طرف اُٹھے ہوئے تھے۔ نیم وا آنکھوں کے اوپر نیچے، چہرے کی شکنیں گہرے زخموں کے مُندمل نشانوں کی طرح نظر آ رہی تھیں وہ چیخ رہی تھی، چلا رہی تھی "ہال او مَیں تینڈا اگھہ نہ روے او ملکا۔ ہال او مینڈی نمانی دھی، ہال او میں لُٹی گئی، ہال او تینڈی ہیں . . . . ، ہال او تینڈے ہتھاں اِچ کیڑے پون، ہال او تینڈیاں جنگھاں کُتے کھاون او ملکا (ہائے تیرا کچھ نہ رہے او ملک، ہائے میری بے چاری بیٹی، ہائے لُٹ گئی، ہائے ہائے میرے تیری . . . . ، ہائے تیرے ہاتھوں میں کیڑے پڑیں، ہائے تیری ٹانگیں کُتے کھا جائیں او ملک")

کچھ دیر بعد سب گاؤں جان چکا تھا کہ گاؤں کے بڑے ملک بارس کے بیٹے ملک رئیس نے اپنے خاص ملازم کالو مصلی کی مدد سے رمضان ملیار کی بیٹی زینب کو سرسوں کے کھیت کے پاس دبوچا، منہ پر اُسی کی چنی باندھی اور سرسوں کے پھولوں میں گرا کر زنا بالجبر کیا تھا۔ ملک رئیس کالو مصلی کے ساتھ شکاری کتوں کی ہمراہی میں خرگوشوں کے شکار سے واپس آ رہا تھا کہ اُسے بے چاری خرگوشنی راستے میں مل گئی۔ زینب کی ایک سہیلی نے بتایا کہ کتے بھونکتے رہے لیکن کسی کو پتہ نہیں چلا کہ کھیت میں کیا ہو رہا ہے۔ بے چاری زینب "لٹی پٹی" گرتی پڑتی جب گھر پہنچی تو اُس نے ماں سے کچھ نہیں چھپایا تھا۔ مزاحمت کرنے پر اُس کے کپڑے پھٹ چکے تھے۔ خون آلود دھجیاں

لٹک رہی تھیں۔ اُس کے بازوؤں کے اطراف میں، اور گردن کے پیچھے، ناخنوں کے نشان جو گلابی لکیروں کی طرح اُبھرے ہوں گے، سیاہ ہو رہے تھے۔ وہ رو رو کر تقریباً اندھی ہو چکی تھی۔ پھر اس پر گہری خاموشی سی چھا گئی۔

رمضان ملیار کا پٹھا اُتر گیا۔ وہ گاؤں کی گلیوں میں جس کا بھی سامنا کرتا تھا، اُس کے ہونٹوں پہ خاموشی کی مہر لگ جاتی تھی، بس ہاتھوں کو اپنے سامنے پھیلا کر یوں اُوپر اُٹھاتا تھا جیسے اُسے اس بات پر حیرت ہے کہ اُس کے ساتھ یہ کیا ہو گیا ہے ۔ ۔ ۔ ۔ !

ملک بنارس گاؤں کا بڑا آدمی تھا، زمینوں جائیدادوں والا اور پھر بڑے خطرناک قسم کے مونچھیں بھی اُس نے پال رکھے تھے جو اُس کے شکاری کتوں اور بازوؤں کی طرح تیز نگاہوں سے گاؤں کے ہر شخص کو گھورتے رہتے تھے۔ کسی میں جرأت نہ تھی کہ ملک سے متعلق بات بھی کر سکے لیکن ماں آخر ماں ہوتی ہے، پھتاں نے گاؤں کی گلیوں میں ملک کو اتنی گالیاں دیں کہ صدیوں کی زبان بندی کا حساب برابر ہو گیا ۔ ۔ ۔ ۔ لیکن گالیوں سے کیا ہوتا ہے۔ رمضان کو جب مشورہ دیا گیا کہ وہ پولیس سٹیشن جا کر رپورٹ درج کرائے، گاؤں سے چودہ میل دُور ہی تو جانا ہے لیکن وہ ڈر گیا، جیسے جرم اسی نے کیا ہو۔ رمضان سے میں بھی ملا۔ وہ مکمل خاموش تھا۔

"دیکھو رمضان ۔ ۔ ۔ ۔" میں نے اُس کے کندھے پر ہاتھ رکھا "ظلم کو سہہ لینا بہت بڑا جرم ہوتا ہے۔ اگر تم پولیس میں رپورٹ درج نہیں کراؤ گے تو یہ ایک بہت بڑا جرم ہو گا۔"

رمضان نے پھٹی پھٹی آنکھوں سے مجھے دیکھا۔ پھر وہ، شاید پہلی بار آہستہ سے بولا "کچھ نہیں ہو گا ۔ ۔ ۔ ۔" رمضان کی آواز بے حد دھیمی اور اداس تھی "کچھ نہیں ہو گا، پولیس سارا الزام میری زینب پر لگائے گی۔ اُسے بدچلن کہے گی اور شاید پکڑ کر بھی لے جائے اور ۔ ۔ ۔ ۔ ملک کا کچھ نہیں بگڑے گا۔"

رمضان کے کندھے پر میرے ہاتھ کی گرفت مضبوط ہو گئی "اس کا مطلب ہے کہ تم ظلم سہہ جاؤ گے" میں نے جھنجھلا کر کہا۔

"پیر جی نے ۔ ۔ ۔ ۔" رمضان نے قدرے بلند آواز میں کہا "پیر جی نے کل سارے گاؤں والوں کو اپنے ڈیرے پر بلایا ہے، وہ نیاں (انصاف) کریں گے"

پیر توقیر شاہ کا خاندان نہ جانے کتنے برسوں سے گاؤں کا روحانی پیشوا چلا آ رہا ہے۔ مجھے تو وہ ہمیشہ روحانی کے ساتھ ساتھ جسمانی پیشوا بھی محسوس ہوتا ہے۔ گاؤں کی حکومت ملک بنارس کے پاس ہے اور ملک بنارس کی باگیں پیر توقیر کے ہاتھوں میں رہتی ہیں۔ گاؤں کے وسط میں پتھریلی اونچی سی جگہ پر پیر توقیر شاہ کا ڈیرہ ہے جس پر سیاہ جھنڈا لہراتا رہتا ہے۔ قدیم زمانے کے ساحروں کی طرح پیر توقیر شاہ نے اپنے خاندان کی روایات کو برقرار رکھا ہوا ہے۔ یہ انداز وراثت میں چلا آ رہا ہے۔ ڈیرے میں بند رہنا، بہت کم گاؤں میں نکلنا، مخصوص سیاہ خوشبودار لباس پہننا، گلے میں مخصوص مالائیں پہننا، چلنے کا خاص انداز، گول سیاہ داڑھی، پیچھے گردن پر لٹکے ہوئے تیل چپڑے سیاہ چھتے، تسبیح پھیرنے کا مخصوص انداز، خاندانی پُراسراریت مکمل طور پر پیر توقیر کے ڈیرے میں محفوظ تھی۔ لوگ پیر سے بہت ڈرتے تھے۔ مشہور تھا کہ پیر توقیر کے پاس بہت سے معمول (جن) ہیں۔ ویسے پیر نے جو ہٹے کٹے مسٹنڈے ملنگ پال رکھے تھے وہ کسی طرح بھی جنوں سے کم نہ تھے اور ڈیرے کی قدرے مدھم روشنی میں اپنے تخت پر بیٹھ کر پیر بھی بھوتوں کا بادشاہ نظر آیا کرتا تھا۔

پیر کے ملنگوں نے گاؤں میں گھر گھر جا کر، ہر گھر سے ایک فرد کو ڈیرے جانے کی دعوت دی۔ پیر کا انصاف سب گاؤں والوں کے سامنے ہونا قرار پایا۔ اگلی صبح میرے والد صاحب کو کسی کام سے کہیں جانا پڑ گیا۔ اُن کی نمائندگی مجھے کرنا تھی۔ میں پیر توقیر کے ڈیرے پہنچا۔ مدھم روشنی والے بڑے سے کمرے میں، جس میں کوئی کھڑکی نہ تھی، گاؤں کے سبھی دیہاتی موجود تھے۔ کم از کم ہر گھر سے ایک دیہاتی

کی نمائندگی ضرور تھی۔ ملک بنارس اور پیر توقیر شاہ کا انتظار ہو رہا تھا۔ پیر کے ملنگ کمرے میں اِدھر اُدھر پھر رہے تھے۔ کمرے میں پیر کے تخت کے سامنے، دریاں بچھی ہوئی تھیں۔ دیواروں کے ساتھ گندے گندے گاؤ تکیے ٹیکے ہوئے محسوس ہوتے تھے۔ سامنے تخت پوش پر سبز رنگ کا قالین بچھا ہوا تھا اور پیچھے دو سیاہ مخملیں گاؤ تکیے تھے۔ شاید دوسرا ملک بنارس کے لیے ہوگا۔ کمرا بھرا ہوا تھا اور دھیمی دھیمی باتوں سے کمرے میں دبا دبا شور سا محسوس ہو رہا تھا۔ کمرے کے ایک کونے میں رمضان ملیار بھی بیٹھا تھا، اُس کا پٹکا ابھی تک اُس کی گردن میں لٹکا ہوا تھا۔ چہرے پر شدید پریشانی اور غم کے آثار نمایاں تھے۔

ملک بنارس اپنے دو خطرناک کارندوں کے ساتھ آیا۔ کارندوں نے سٹین گنیں اُٹھا رکھی تھیں۔ خاموشی سی چھا گئی۔ سب تعظیماً اُٹھے۔ ملک بنارس سیدھا تخت پوش کی سمت گیا۔ کھسہ اُتارا اور گاؤ تکیے سے ٹیک لگا کر بیٹھ گیا۔ ایک کارندے نے ملک بنارس کے کھسے اُٹھا کر ایک سمت رکھ دیئے۔ ملک کے چہرے پر روایتی رعب تھا۔

"بھاؤں افسوس اے" ملک نے کہا "بہت افسوس ہے مجھے" اُس کی نگاہیں دیہاتیوں کے چہروں سے ہوتی ہوئی رمضان ملیار تک پہنچیں "بہت افسوس ہے مجھے رمضان۔ شرمندہ ہوں" ملک کا جملہ سُن کر گاؤں والوں نے اُسے یوں دیکھا جیسے آفرین کہہ رہے ہوں۔ رمضان کی نگاہیں جھکی ہوئی تھیں۔ اُس کے چہرے پر شکنیں گہری تھیں، بربادی کا بھرپور تاثر اُس کے پورے جسم پر پھیلا ہوا تھا۔ پھر خاموشی سی چھا گئی۔

ڈیرے کی فضا خاموشی میں کچھ زیادہ پُر اسرار ہو گئی۔ اگر بتیوں کی خوشبو اتنی تیز تھی کہ اُلجھن سی ہونے لگی۔ ہر چہرے پر اضطراب تھا لیکن ڈیرے کا رعب کچھ زیادہ ہی محسوس ہو رہا تھا۔ پیر توقیر شاہ دو ملنگوں کے ساتھ وارد ہوا۔ سب گاؤں والے اُٹھے، سر جھکے جھکے تھے، نظریں نیچی نیچی تھیں، مجھے سیدھا کھڑا دیکھ کر ایک ملنگ کی آنکھوں میں غصہ سا اُبھرا۔ پیر توقیر شاہ نے ملک بنارس سے ہاتھ ملایا۔ پیر کے ہاتھ میں سیاہ دانوں والی لمبی سی تسبیح تھی۔ پیر توقیر نے ایک لفظ کہے بغیر کھسے اُتارے اور تخت پوش پر چڑھ گیا۔ ایک ملنگ نے تیزی سے کھسے اُٹھائے اور یوں سینے سے لگا لئے جیسے گیتا کے پنے ہوں۔

پیر نے گاؤ تکیے سے ٹیک لگائی اور آنکھیں بند کر لیں۔ سب دیہاتی بیٹھ گئے۔ پیر توقیر کی اُنگلیاں تیزی سے تسبیح کے دانوں کو گھما رہی تھیں۔ آنکھیں بند تھیں لیکن مجھے بار بار یوں محسوس ہو رہا تھا جیسے وہ پلکوں کے اندر سے دیہاتیوں کو تاڑ رہا ہے۔ میرا خیال درست تھا۔ پیر توقیر پلکوں کو بھینچ کر کمرے میں موجود دیہاتیوں کے چہروں کو پڑھنے کی کوشش کر رہا تھا۔ اُس کی بھنچی ہوئی پلکوں میں سیاہ سی چمک لکیر کی صورت میں دائیں بائیں چلتی محسوس ہو رہی تھی۔ اس کے ہونٹ بھی ہلنا شروع ہو گئے۔ کچھ سنائی نہ دیتا تھا کہ وہ کیا پڑھ رہا ہے۔ وقفے وقفے سے اُس کی آواز بلند ہوتی، سر جھٹکے کھاتا، گردن پر بالوں کے چھتے ہلتے اور "وَھُوَ عَلٰی کُلِّ شَیءٍ قَدِیر" کے الفاظ سنائی دیتے تھے۔

دس منٹ گزر گئے۔ مجھے اُلجھن ہو رہی تھی کہ فیصلہ کرنا ہے تو جلد کیا جائے۔ ہم پیر جی کا جلال دیکھنے تو نہیں آئے۔ کچھ دیر بعد پیر توقیر نے آنکھیں کھولیں۔ کچھ کچھ وجد کی کیفیت طاری کرتے ہوئے، جھومتے ہوئے نیم بلند آواز میں تلاوت کی، پھر دیہاتیوں کی طرف دیکھا۔

"بھاؤں افسوس ہے" پیر توقیر شاہ نے بھی ملک بنارس ہی کی طرح افسوس کا اظہار کیا "بہت ہی افسوس ہے مجھے۔ یہ واقعہ بہت ہی دُکھ دینے والا ہے" وہ خاموش ہو گیا جیسے کچھ سوچ رہا ہو۔

"میرا خیال ہے" میں نے اُٹھ کر کہا اور سب دیہاتیوں کے چہرے جھٹکے سے میری جانب مُڑے۔ "میرا خیال ہے کہ اگر عدالت ہی لگانی ہے تو پھر ملک رئیس خان کو اور کالو قصائی کو یہاں بلانا چاہیے تھا، اصل مجرم وہ ہیں"

پیر توقیر شاہ نے میری طرف غور سے دیکھا "اگر عدالت لگانی ہے تو پھر کچہری میں جاؤ۔ یہ میرا ڈیرہ ہے۔ یہاں وکیل شکیل کی ضرورت نہیں ہے۔ یہاں میرے مولا کے کرم سے انصاف ہوگا۔ یہاں گواہ پیش نہیں ہوتے۔ میرے مولا کی رضا سے انصاف آپو آپ ہو جاتا ہے۔ صلح صفائی ہو جاتی ہے۔" پیر نے تسبیح والا ہاتھ اوپر اٹھایا۔

ملک بارس خان نے بھی میری طرف دیکھا "ملک رئیس بہت شرمندہ ہے۔ کالو کو میں نے اتنے ٹھڈے مارے ہیں کہ وہ ڈر کر کہیں بھاگ گیا ہے..... اور..... پھر..... اگر رئیس آئے گا تو پھر رمضان کی بیٹی کو بھی آنا پڑے گا" ملک نے دیہاتیوں کی جانب دیکھا۔

"ٹھیک ہے ٹھیک ہے" کئی آوازیں آئیں "انصاف کریں جی"

پیر توقیر شاہ نے ایک بار پھر آنکھیں بند کر لیں، تسبیح کو زور زور سے گھمانا شروع کر دیا پھر آنکھیں کھول کر دوبارہ تلاوت کی، اُس کی آنکھوں میں عجیب مکارانہ سی چمک تھی۔ "ہو گیا نیاں (انصاف)" پیر نے تیز لہجے میں کہا "کر دیا میرے مولا نے انصاف۔ دیکھ رمضان، اللہ ہر شے پر قادر ہے۔ انسان کی تقدیر میرے مولا نے ازل سے لکھی ہے۔ ہر انسان تقدیر کا پابند ہے۔ ایک پتا بھی کسی درخت کا، میرے مولا کی رضا کے بغیر نہیں ہل سکتا۔ اس دنیا میں جو کچھ بھی ہوتا ہے، میرے مولا کی رضا سے ہوتا ہے، کیا مصلحت ہے، کسی کو نہیں معلوم۔"

پیر نے دوبارا آنکھیں بند کر لیں اور زیرِ لب کچھ بڑبڑانا شروع کر دیا۔ پیر کی گفتگو سے انصاف کا جو پہلو اُبھر رہا تھا، مجھے اس کا بھیانک سایہ کمرے میں پھیلتا محسوس ہونے لگا۔ میرے اعصاب میں تناؤ سا آ گیا، پیر نے آنکھیں کھولیں۔

"اللہ صابروں کے ساتھ، ہر وہ جو صبر کرتا ہے، اللہ اُس کو صبر دیتا ہے اور اُس کا درجہ بڑھا دیتا ہے۔ انسان کم علم ہے، کم عقل ہے۔ اللہ کی رضا کو نہیں سمجھتا۔ اللہ اپنے نیک بندوں کا امتحان لیتا ہے۔ جو صبر کرتے ہیں، اللہ کی رضا میں خوش رہتے ہیں، اونچے درجات پاتے ہیں، مولا کی لکھی ہوئی تقدیر مصلحت سے خالی نہیں ہوتی۔" پیر نے دیہاتیوں کو دیکھ کر رمضان کی طرف اشارہ کیا "رمضان..... " پیر نے تسبیح والا ہاتھ اوپر اُٹھایا، اُسے جھٹکا دیا "رمضان اللہ کا نیک بندہ ہے۔ میں گواہی دیتا ہوں کہ رمضان شریف انسان ہے۔ اس کا خاندان شریف خاندان ہے۔ یہ مسکین ملیار، کسی کو دکھ نہیں دیتا۔ بس یہی ثبوت ہے اس کی شرافت کا اور میرے مولا کو اس کی یہی بات پسند بھی ہے۔ تجھے میرے مولا نے امتحان میں اس لئے ڈالا ہے کہ اللہ اپنے نیک بندوں کو امتحان میں ڈالتا ہے۔ یہ تقدیر تھی جو تیری دھی کے ساتھ "ورت" گئی۔ تیری دھی کی تقدیر میں، میرے مولا نے یہی لکھا تھا۔"

پیر لمحے بھر کے لیے رُکا۔ میں اُس کے انصاف کی تہہ کو پہنچ چکا تھا۔ غصے سے مجھے بدن میں تپش سی محسوس ہوئی، پیر نے رمضان کو مخاطب کیا۔ "رمضان، میرے مولا نے ملک رئیس کی تقدیر میں یہی لکھا تھا جو اُس نے کیا اور تیری دھی کی تقدیر بھی یہی تھی۔ اب بندہ مجبور، بے بس کیا کرے۔ یہ رپورٹیں، پولیس، تھانے، عدالتیں، قانون، سب بکواس ہے۔ قانون صرف ایک ہے اور وہ ہے مولا کی رضا کو ماننا اور بس۔ جو اللہ کے بندے ہیں وہ تقدیر کو مان لیتے ہیں۔ اُف نہیں کرتے۔ صبر کرتے ہیں اور اعلیٰ درجات پاتے ہیں۔ دنیا والے یہ بات نہیں سمجھتے کہ سب کچھ تو اللہ کے حکم سے ہوتا ہے، ہم کون ہیں مولا کے کاموں میں دخل دینے والے۔"

مجھ سے رہا نہ گیا۔ میں غصے کی شدت میں اُٹھا، کوشش کے باوجود کہ لہجے میں نرمی رہے، میرے لہجے میں غصہ موجود تھا۔ "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں!" میں نے پیر توقیر کو مخاطب کیا، دیہاتیوں نے ایک بار پھر سروں کو جھٹکے سے گھما کر مجھے دیکھا "یہ آپ کیا کہہ رہے ہیں؟ آپ تقدیر کو ظلم کی ڈھال کیوں بنا رہے ہیں؟ اس کا مطلب تو یہ ہوا کہ ظالم کو کھلی چھٹی ہے۔ وہ ظلم کرے، خوب کرے

اور، پھر کہہ دے کہ یہ تو مظلوم کی تقدیر تھی۔"

پیر توقیر شاہ نے تسبیح والا ہاتھ اوپر اُٹھایا "خاموش" اُس نے بلند آواز میں کہا، پھر دیہاتیوں کی طرف دیکھا "دیکھا کالجوں کی تعلیم کا اثر؟ ایمان ختم کر دیا ہے اس تعلیم نے۔ دیکھا اس کا بدتمیز لہجہ؟ کوئی لحاظ ہی نہیں ہے۔ بھونک رہا ہے۔ مولا کی تقدیر کا انکار کر رہا ہے۔"

ایک دیہاتی نے میرا بازو پکڑ کر مجھے بٹھانے کی کوشش کی لیکن میں غصے سے بے قابو ہو چکا تھا "پیر جی" میں نے بلند آواز میں کہا "کل اگر آپ کی بیٹی کے ساتھ یہ سب کچھ ہو گیا تو کیا اُسے بھی تقدیر کہیں گے آپ؟"

پیر توقیر شاہ نے پیچھے کی طرف جھٹکا کھایا، تسبیح زور سے گھومی اور کلائی پر بل کھا گئی "او بکواس نہ کر اوئے حرامی" پیر گرجا۔ دو ہٹے کٹے ملنگ تیزی سے میری طرف بڑھے۔ خطرے کا احساس ہوتے ہی میں پیچھے ہٹا۔ ملنگوں نے میری دونوں جانب آ کر مضبوطی سے میرے بازوؤں کو پکڑا۔ پیر کا اشارہ پا کر انہوں نے مجھے دروازے کی سمت دھکیلا اور پھر پوری طاقت سے مجھے دروازے سے باہر پھینکا۔ دہلیز سے اڑنگا کھا کر میں باہر پتھروں پر گرا۔ میرے دائیں کندھے کے نیچے شدید چوٹ آئی۔ یہ چیخ میرے ہونٹوں تک آ کر تھم گئی۔ دروازہ کھٹاک سے بند کر دیا گیا۔

میں غم و غصے کی شدت میں نہ جانے کب تک گاؤں کی گلیوں میں گھومتا رہا۔ پھر باہر سرسوں کے کھیتوں کی طرف نکل گیا۔ "میں اس مسلط شدہ تقدیر کا منکر ہوں" میرے خیالات کی رو بہار کی دھیمی ہوا کی طرح میرے ذہن میں رواں تھی "نہیں مانتا میں اس مسلط شدہ تقدیر کو۔ اگر عمل کے نتیجے کو تقدیر کہا جاتا تو مجھے اعتراض نہ ہوتا، لیکن کیا جرم کیا تھا زینب نے؟ کس جرم کی سزا دی گئی ہے اُسے؟ اگر کرموں کے پھل کو تقدیر مانا جائے تو پھر زینب کے کس کرم کا پھل اُسے ملا ہے۔ چلو میں مکافاتِ عمل کو تقدیر مان لیتا ہوں لیکن عمل کا تعین کون کرے گا؟ پر ..... پر ..... اس مسلط شدہ تقدیر کو میں نہیں مان سکتا، نہیں مان سکتا....."

پیلے پیلے سرسوں کے پھولوں سے اُٹھتی ہوئی مہک اور دھوپ میں چمکتے ہوئے تنکوں پر منعکس روشنی کے پھیلاؤ نے مجھے وسعت کا احساس دلایا۔ پیر کا تنگ و تاریک ڈیرہ مجھے بہت دُور محسوس ہوا۔ پھر ہوا کے دھیمے دھیمے جھونکوں میں اُڑتی ہوئی سرسوں کی بھینی بھینی مہک نے مجھے اداس کر دیا، بے حد اُداس .....!

شام سے کچھ پہلے، میں گھر کے صحن میں آرام کرسی پر تقریباً لیٹے ہوئے علم الانسانیات کی ایک کتاب پڑھ رہا تھا کہ والد صاحب گھبرائے ہوئے گھر میں داخل ہوئے۔ انہوں نے آہستہ سے مجھے پکارا۔ اُن کے چہرے پر اتنی سنجیدہ تشویش میں نے پہلے کبھی نہیں دیکھی تھی۔ "یوں کرو" انہوں نے دھیمے سے کہا "ابھی ہی کپڑے کتابیں رکھ لو، کل صبح پہلی بس سے شہر چلے جاؤ۔ شاید صبح چار بجے نکلتی ہے۔ ویسے بھی تمہاری چھٹیاں تو ختم ہونے ہی والی ہیں۔"

والدہ صاحبہ نے آگے بڑھ کر والد صاحب کو غور سے دیکھا، پھر مجھے دیکھا۔ پھر والدہ صاحبہ نے کہا "کیا بات ہے، کیا ہوا؟ —— خیر تو ہے؟"

"خیر ہی تو نہیں ہے" والد صاحب کی آواز بہت دھیمی ہو گئی "کل پیر کے ڈیرے پر، یہ کچھ بول پڑا ہے۔ پیر نے گاؤں میں اعلان کروایا ہے کہ یہ ..... تقدیر کا منکر ہے، کافر ہے اور واجب القتل ہے۔"

والدہ صاحبہ کا رنگ پیلا پڑ گیا۔ فوراً میرا سامان تیار کیا گیا۔ مجھے گھر کے ایک کمرے میں تقریباً بند کر دیا گیا۔ دوسری صبح مجھے والد صاحب نے چند دوستوں کے ساتھ، جن میں سے ایک کے پاس دونالی بندوق بھی تھی، بسوں کے اڈے پر پہنچایا۔ مجھے یوں محسوس

ہو رہا تھا جیسے میں نے کوئی جرم کیا ہے اور مجھے فرار کرایا جا رہا ہے۔

برس گزر گئے ہیں۔ ہم نے گاؤں چھوڑ دیا ہے۔ میں کب کا شہر میں بس چکا ہوں۔ والد والدہ دنیا چھوڑ چکے ہیں۔ مجھے گاؤں کی یاد بھی نہیں آتی، لیکن کبھی کبھی بہار کے ابتدائی جھونکوں میں، نہ جانے کیوں، میرے اندر شدید احساس، کسی نوزائیدہ بچے کی طرح چیخ اٹھتا ہے۔ کہا جاتا ہے کہ عوام کا شعور بیدار ہو چکا ہے۔ دعوے بھی بہت کئے جاتے ہیں کہ اب عوامی بیداری کا دور شروع ہو چکا ہے لیکن میں گاؤں کے حالات سے قطعی طور پر ناآشنا بھی نہیں ہوں۔

گاؤں میں پیر کی گدی سلامت ہے۔ پیر توقیر شاہ کا بیٹا، پیر صغیر شاہ گدی نشین ہے۔ ملک بنارس کا پوتا، ملک رئیس کا بیٹا ملک شیر خان، اب کالو مصلی کے بیٹے باز مصلی کے ساتھ خرگوشوں کا شکار کھیلتا ہے اور رمضان کی پوتی گگاں جوان ہو چکی ہے۔

نوزائیدہ بچے کی چیخ اب ایک ٹیس میں بدل جاتی ہے۔ میری روح بھی اس ٹیس کے سبب کو — ناموافق آب و ہوا کو محسوس کرنے لگتی ہے۔

آسیب زدہ

ارجمند شاہین

وہ اُسے خدا حافظ کہہ کر پلٹی تو گھر کا سناٹا سائیں سائیں کرتا اُس کے اندر اُتر گیا۔ بوجھل دل سے وہ میز پر سے برتن سمیٹنے لگی۔ چائے کا خالی کپ ابھی تک گرم تھا۔ وہ خالی کپ کو اپنے دونوں ہاتھوں کی ہتھیلیوں میں تھامے صوفے پر ٹک گئی۔ صوفے کی گرمی لمحہ بھر پہلے اس کے اٹھ کر جانے کی چغلی کھا رہی تھی۔ وہ سوچنے لگی۔ خوشی کی گھڑیاں لمحوں میں کیوں سمٹ جاتی ہیں اور لمحوں کا دکھ صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے۔ ابھی تو وہ اُسے بتانا چاہتی تھی کہ اس نے وہ تمام عرصہ، بغیر اس کے، کس طرح کانٹوں پر چل کر گزارا ہے۔ وہ اکیلی ہی زندگی کا بن باس کاٹتی رہی۔ وہ تو یہ بھی نہ پوچھ سکی اُس نے اتنے بہت سے سال اُس کے بغیر کیسے گزار دیئے۔ بے رحم وقت اُن کے درمیان حائل رہا۔ خود تو یہ کسی کا انتظار نہیں کرتا مگر اوروں کو کتنا انتظار کراتا ہے، اور اب ایسی جلدی میں ہے جیسے ٹرین نکلی جا رہی ہو۔ یوں لگ رہا تھا جیسے وقت کو پَر لگ گئے ہوں۔ اُس کا جی چاہا وہ چیخ چیخ کر روئے۔ وہ خوب سا رو لیتی تو دل کی تپش آنکھوں کے راستے بہہ جاتی۔ مگر آنسو تو اُس کے حلق میں اٹک کر رہ گئے تھے۔

وہ نڈھال سی صوفے پر نیم دراز ہو گئی۔ سامنے دیوار پر اُسی کی دی ہوئی پینٹنگ آویزاں تھی۔ ایک شرمیلی لڑکی، آنکھیں بند کیئے ہوئے۔ اور دائیں بائیں سے دو آنکھیں اُسے دیکھتے ہوئے۔ جیسے کوئی چور، چوری کرتا ہوا رنگے ہاتھوں پکڑا جائے اور انجام کے خوف سے کبوتر کی طرح آنکھیں بند کر لے۔ جیسے دنیا نے اُس کے پیار کی چوری پکڑ لی ہو۔ وہ دنیا کی نظروں میں آگئی ہو اور اقرار کے بوجھ سے اُس کی نظریں جھک گئی ہوں۔ اس کا بس نہیں چلتا تھا کہ آرٹ اینڈ کرافٹ کی ساری دوکان ہی اُس کے حوالے کر دیتا۔ ایک ایک چیز کے بارے میں نہایت تفصیل سے بتاتا رہا تھا۔ کس طرح یخ راتوں میں وہ اپنی نیندیں جلاتا رہا ہے۔ اسے کام کی دھن میں سردی گرمی کا احساس تک نہ رہتا۔ وہ بھوکا پیاسا ہی اپنے کام میں جُتا رہتا۔ وہ تو بس اتنی گنہگار تھی کہ اُس کی بنائی ہوئی چیزیں اُسے پسند تھیں۔ اُس کے خیالات۔ اُن کا اچھوتا پن اُسے پسند تھا۔ آرٹ کی دنیا میں وہ اُس کی زبردست شیدائی تھی اور اسی لیے نمائش دیکھنے چلی آئی تھی۔ وہ خود بھی فائن آرٹ میں کچھ شُدبُد رکھتی تھی۔ اور اس سے استفادہ کرنا چاہتی تھی۔ مگر جانے کیوں اُس نے صاف انکار کر دیا تھا۔ اُسے شاید ڈر تھا۔ نئے ہاتھوں میں جا کر کہیں اُس کی سوچ کی دھجیاں نہ بکھر جائیں۔ بات بھی سچ تھی۔ وہ ایک جدت طراز شخص تھا۔ وہ سمجھ گئی۔ پھر اُس نے اس کام میں اُس کی مدد لینے کا خیال ہی دل سے نکال پھینکا اور اپنی ہی کوشش میں خود ہی لگی رہتی۔

کبھی کبھار وہ اپنا کام دکھانے اس کے سٹوڈیو جا پہنچتی۔ اُسے کوئی چیز پسند آجاتی تو اُس کی تعریف کر دیتا ورنہ پرے کھسکا دیتا۔ وہ خوب جانتی تھی وہ اس کا دل رکھنے کے لیے ایسا کہہ دیا کرتا تھا۔ تصویروں کا تو صرف بہانہ تھا۔ اُسے اس کے ہاں بیٹھنا اچھا لگتا تھا۔ اور اب تو اُسے بھی اس کا انتظار رہنے لگا تھا۔ اکثر دونوں کا وقت ساتھ گزرتا۔ وہ گھنٹوں اِدھر اُدھر کی باتیں کرتے نہ تھکتے۔ جب وہ اُٹھنے کا ارادہ کرتی تو وہ عجیب سی بے بسی سے اُسے دیکھتا جیسے کہہ رہا ہو "مت جاؤ .... تھوڑی دیر رُک جاؤ۔" اور وہ اُس کی بات

سمجھ کر بیچ بیچ بیٹھ جاتی۔ عجیب بے نام سا رشتہ تھا دونوں کے درمیان۔

اس روز وہ خاموشی سے سگریٹ پیے جا رہا تھا۔ اُسے بھی کوئی بات نہیں سوجھ رہی تھی۔ وہ چُپ چاپ اُسے سگریٹ پیتے دیکھتی رہی اور دل ہی دل میں اس کی حالت پر کڑھتی رہی۔ وہ جانتی تھی، وہ اپنی مرضی کا مالک ہے۔ کسی کی پسند ناپسند اُس کا مسئلہ نہیں ہے۔ وقت کی رفتار رُک سی گئی تھی۔ کھڑکی پر جھولتی بوگن ویلا کی پھولوں سے لدی شاخ جیسے اپنے ہی بوجھ سے ہانپ گئی تھی۔ آسمان پر بادلوں کی ٹکڑیاں دھوپ چھاؤں کھیل رہی تھیں۔

اچانک وہ یہ کہتا ہوا تیزی سے اُٹھا "میں متوازی کناروں کا یہ فاصلہ مٹا دینا چاہتا ہوں" پھر اس کے ساتھ بیٹھ گیا۔ وہ اس کے اس اچانک رویے پر پریشان سی ہو گئی اور وہ اس کی بدحواسی کا لطف لیتا ہوا اُٹھ کھڑا ہوا۔ پھر وہ مسکراتا ہوا واپس اپنی جگہ پر جا بیٹھا۔ لمحہ بھر کو بارش میں بھیگی ہوا کا تازہ جھونکا اُسے چھو کر گزر گیا تھا۔ اس نے اُسے پوری طرح سنبھلنے بھی نہ دیا اور بولا "والدین کا بلاوا آیا ہے گاؤں سے۔۔۔۔ وہ میری شادی کرنا چاہتے ہیں۔" پھر اُس کی آنکھوں میں جھانکتے ہوئے بے حد سنجیدگی سے بولا۔ "جانتی ہو۔۔۔۔ اس لڑکی سے مجھے ازلی نفرت ہے۔۔۔۔" اس نے سگریٹ کو ایش ٹرے میں اس بیدردی سے مَل کر دیا جیسے اس لڑکی کا گلا ہی تو دبا ڈالے گا۔ وہ اُس کے بچپن کی مانگ تھی۔ "نجانے والدین، گُڈّے گُڑیا کا یہ کھیل جان بوجھ کر بھی کیوں کھیلتے ہیں؟"

وہ اسی سے پوچھ رہا تھا مگر وہ کیا بتاتی۔ اُسے تو چپ لگ گئی تھی۔ اس کی حالت ایسی تھی جیسے کسی نے انتہائی بلندی پر لے جا کر اُسے نیچے دھکیل دیا ہو۔ اور وہ لڑھکتی چلی جا رہی ہو۔ اور اُسے پتہ نہ چل رہا ہو کہ وہ کہاں جا کر رکے گی۔ صحیح سلامت بھی رہے گی یا پاش پاش ہو جائے گی۔

"میں جا رہا ہوں۔۔۔ والدین کی عدالت میں حاضر ہو کر اپیل دائر کرنے۔ میرے حق میں دعا کرنا۔" اس نے خود ہی سکوت توڑا۔ پھر اس کے سیاہ گھنیرے بالوں کو اپنی انگلیوں سے چھوتے ہوئے کہنے لگا۔ "اگر زندگی میں کہیں بھی چھاؤں نہ ملے اور دھوپ کی شدت جھلسا دے، تب بھی ان کی حفاظت کرنا۔۔۔۔ مجھے تم یونہی اچھی لگتی ہو۔ ان سیاہ بادلوں کے بیچ!"

پھر وہ تیزی سے اُٹھا اور اپنی چیزیں سمیٹنے لگا۔ "مت جاؤ۔۔۔۔ تھوڑی دیر رُک جاؤ"۔ اس کا سارا وجود سراپا التجا بن گیا۔ مگر وہ جا چکا تھا۔

کائنات کو سانپ سونگھ گیا تھا۔ صرف بارش کا شور سنائی دے رہا تھا۔

وہ جانتی تھی وہ اٹل ارادوں کا مالک تھا۔ اصولوں پر سودے بازی اُسے منظور نہیں تھی۔ وہ ٹوٹ سکتا تھا جھک نہیں سکتا تھا۔ وہ اس کی افتادِ طبع سے ہر وقت ڈری ڈری رہتی۔ کہیں کوئی بات اس کی طبیعت کے خلاف نہ ہو جائے۔ نجانے کونسی بات اس کا دل دکھا دے۔ پتہ نہیں کیا بات اُسے بُری لگ جائے۔ وہ نہیں چاہتی تھی اس کی کسی بات سے اس کے دل کو ٹھیس پہنچے۔ وہ ہونٹوں پر چُپ سجائے اس کی خوبصورت اور سجل سوچوں کو اپنے ذہن میں اتارتی رہتی۔ وہ چاہتا وہ بھی کچھ کہے۔ مگر اس نے تو چُپ رہنے کی قسم کھا لی تھی۔

وقت کی سوئی ایک خاص مقام پر آ کر ٹھہر گئی تھی۔ عجیب کشمکش میں دن گزر رہے تھے۔ پتہ نہیں کیا ہونے والا تھا۔ کہاں تو یہ حال تھا کہ چند دنوں کو بھی الگ ہوتے تو خطوں کے ڈھیر لگ جاتے اور کہاں ایک ماہ سے زیادہ ہونے کو آیا اور اس کی کوئی خیر خبر نہیں مل رہی تھی۔ انتظار کا سارا دکھ اس کی آنکھوں میں کھنچ آیا تھا۔ وہ چھوٹے چھوٹے قدم اٹھاتی برآمدے میں آ کر کھڑی ہو گئی۔ سیاہ بادلوں کے پرے کے پرے آسمان پر آ آ کر جمع ہو رہے تھے جیسے کوئی بہت بڑا مشن درپیش ہو۔ درخت ساکن کھڑے تھے۔ پتہ ہلنے کی

بھی آواز نہیں آتی تھی ۔ سارا ماحول "اٹینشن" کی صورت ایلرٹ کھڑا تھا ۔ تبھی اُس کی نظر سامنے سے آتے ہوئے ڈاکیے پر پڑی ۔ اُسے لگا جیسے اُسے اُسی کا انتظار ہو ۔ وہ ننگے پاؤں دوڑتی گیٹ پر پہنچ گئی ۔

وہ خط کھولتے ہوئے ڈر رہی تھی ۔ کہیں اُس کے چھوتے ہی ڈنگ نہ مار دے ۔ آخر دھڑکتے دل سے اس نے خط کھولا ۔ اور ادھ کھُلی آنکھوں سے سارا پڑھ ڈالا ۔ وہ ہار گیا تھا ۔ چاند کی شروع تاریخوں میں اُس کی شادی تھی ۔ وہ تو ایسا نہیں تھا ۔ وہ جس سے نفرت کرتا بس نفرت کرتا اور جسے چاہتا ٹوٹ کر چاہتا ۔ بارش بند ہو گئی تھی ۔ مگر اُس کے اندر جھکڑ چل رہے تھے ۔ آندھیاں اُسے اکھاڑ پھینکنے پر تُلی تھیں ۔ اس کا سارا وجود خشک پتّوں کی طرح حالات کی مٹھی میں چُرمرا کر رہ گیا تھا ۔

موسموں نے کتنی ہی کروٹیں بدلیں ۔ رُتیں آئیں اور گزر جاتیں ۔ اس کے گھر والے بھی اب تو تھک ہار کر خاموش ہو گئے تھے ۔ شادی کے نام پر تو اُسے بچھو ڈنک مار جاتے ۔ اُس نے بالوں میں چاندی بھرنے سے پہلے ہی کیمیٹ لی تھی ۔ اُس کی بات کا پاس تو رکھنا ہی تھا نا ۔ سیاہ بالوں میں وہ اب بھی جوان نظر آتی تھی ۔

شب و روز اُسی کی یاد میں گزر رہے تھے ۔ جب تنہائی زیادہ ستاتی وہ اُس کے خط لے کر بیٹھ جاتی ۔ وہ ان خطوں کی دنیا ہی میں بس گئی تھی ۔ یہ جہاں اُس کی یاد سے آباد تھا ۔ یہاں اُس کی آواز گونجا کرتی ، محبت برسا کرتی اور زندگی بانہیں پھیلائے اُس کی منتظر رہا کرتی ۔

ایک عرصے کے بعد آج اچانک ہی وہ آ گیا تھا ۔ اس نے اپنے خط ، اپنے جذبے واپس مانگ لئے تھے ۔ اس کا بس چلتا تو اپنی یادیں بھی واپس رکھوا لیتا ۔ کتنا بدل گیا تھا وہ ․ ․ ․ ․ ! وہ واقعی بہت بدل گیا تھا ۔ کمزور اور بوڑھا نظر آنے لگا تھا ۔ سگریٹ نوشی کی شدت سے اس کے ہونٹ اُودے پڑ گئے تھے ۔ ان پر پیپڑیاں جم گئی تھیں ۔ جیسے وہ جنم جنم کا پیاسا ہو ۔

جانے سے پہلے وہ اُس کے بالوں کو چھو کر بولا ۔ "تمہارا شکریہ ۔ تم نے میرا مان نہیں توڑا ۔"

اُس لمحے اس کی نگاہوں میں بے انتہا محبت اُتر آئی تھی ۔ وہ کہنا چاہتی تھی ۔ "تم تو دو متوازی کناروں کا فاصلہ مٹانے گئے تھے ۔ پھر یہ سب کیا ہو گیا ؟"

جیسے اس نے سُن لیا ہو ۔ دوسرے ہی لمحے اُس کی نگاہوں کی اجنبیت نے اُسے بُری طرح ہلا کر رکھ دیا ۔ اُسے اُس کی بیوی کا آسیب چاٹ گیا تھا ۔

پیارے اللہ میاں

پیروز بخت قاضی

ماسی ہاجراں کون تھی، کہاں سے آئی تھی، اس کا کوئی رشتہ دار زندہ بچا تھا، کسی کو کچھ معلوم نہ تھا۔ لیکن قصبہ کے سبھی لوگ جانتے تھے کہ وہ تقسیم کے بعد مہاجرین کو لانے والی ٹرین میں سوار ہو کر سانگلہ ہل پہنچی تھی۔ اس کا شوہر اور بچے، اس کے بہن اور بھائی، اس کے عزیز و اقارب سب فسادات میں شہید کر دیئے گئے تھے۔ بس وہ اکیلی زندہ سلامت لاش کی مانند اس شہر میں وارد ہوئی تھی۔ ہندوؤں کے چھوڑے ہوئے پکے مکانات میں غریب مہاجروں کے کئی کئی کنبے بسا دیئے گئے۔ اگر کسی کو نچلی منزل الاٹ ہوئی تو دوسرے خاندان کو بالائی منزل مل گئی۔ اگر کوئی خاندان دائیں طرف کے کمروں میں بسایا گیا تو دوسرا خاندان بائیں طرف کے کمروں میں آباد کیا گیا۔ کسی کو بیٹھک، کسی کو دالان، کسی کو دوکان۔ ماسی ہاجراں کو بھی ایک متروکہ مکان کا کمرہ مل گیا جہاں اس نے اپنی کھاٹ ڈال دی۔ وہ نہ اپنے پیاروں سے بچھڑنے کا غم ظاہر کرتی نہ عزیزوں کی شہادت پر آنسو بہاتی۔ نہ اپنے اچھے وقتوں کو یاد کر کے اتراتی اور نہ مشرقی پنجاب میں اپنی ثروت کی ڈینگیں مارتی۔ وہ بس اپنے اللہ میاں سے باتیں کرتی، گلے شکوے کرتی، اپنی ضرورتوں کا اظہار کرتی اور اسی سے سب کچھ مانگتی۔

اپنے کمرے میں کھاٹ پر پڑے پڑے اور اپنے ساتھ باتیں کرتے کرتے تھک جاتی تو دروازے کو کنڈی لگا کر اڑوس پڑوس میں نکل جاتی۔ شیخ صاحب کے ہاں جاتی تو سب چھوٹے بڑے اس کی خیریت دریافت کرتے۔ شیخ صاحب دوکان پر جانے سے قبل اپنی بیوی کو کہتے "شریفاں! ماسی ہاجراں کو ناشتہ کراؤ۔" ماسی ہاجراں چائے اور بند کا ناشتہ کرتی اور شریفاں اور اس کی بیٹی کو بتاتی کہ گزشتہ رات وہ کتنی دیر تک اللہ میاں سے باتیں کرتی رہی۔ "اللہ میاں ہے تو بہت اچھا لیکن اس کا پوری طرح خیال نہیں رکھتا۔ وہ اپنے کاموں میں اتنا مصروف ہو جاتا ہے کہ ماسی ہاجراں کی بھوک پیاس کا خیال ہی بھول جاتا ہے۔ وہ بھی کیا کرے۔ اسے اتنے سارے لوگوں کی دیکھ بھال جو کرنا ہوتی ہے۔ لیکن وہ اسے دل سے کبھی نہیں بھلاتا۔"

وہاں سے اٹھتی تو حکیم صاحب کے گھر پہنچ جاتی۔ حکیم صاحب گھر کی بیٹھک میں حکمت کا کاروبار کرتے تھے اور پچھلے کمروں میں ان کی رہائش تھی جہاں ان کے بیوی بچے رہتے۔ لڑکا بستہ بغل میں دبائے سکول چلا گیا ہوتا۔ حکیم صاحب کی بیوی مشین پر شلوار کی سلائی کر رہی ہوتی اور ان کی بیٹی برتن مانجھ رہی ہوتی۔ گلی میں پھیری والا آتا تو حکیم صاحب آلو اور میتھی خرید کر اندر دے جاتے۔

"حمیداں لاؤ میں میتھی صاف کر دوں۔" ماسی ہاجراں بولی۔

"ماسی تم کہاں دیدہ ریزی کرو گی۔ ثمینہ خود سبزی بنا لے گی" حمیداں نے جواب دیا۔

"لڑکی بیچاری کام کرتے کرتے تھک جائے گی۔ تم تو کپڑے سی رہی ہو۔ وہ برتن مانجھ رہی ہے۔ لاؤ بیٹا مجھے دو میں میتھی صاف کر دوں۔"

ثمینہ برتن چارپائی پر اوندھے رکھ کر اُٹھی اور پرات اور سبزی لے کر ماسی ہاجراں کے قریب بیٹھ گئی۔ دونوں مل کر میتھی صاف کرنے لگیں۔

"میں کہتی ہوں سوہنے اللہ میاں سب بندوں کی دیکھ بھال کرتے ہیں انہیں رزق دیتے ہیں، صحت عطا کرتے ہیں اور ان کی تمام ضرورتیں پوری کرتے ہیں۔ لیکن بندے اتنے کُٹ پٹ گئے ہیں کہ اللہ میاں کی مصروفیات بہت بڑھ گئی ہیں۔ ہاجراں بیچاری اکیلا جی ہے۔ اللہ میاں کو ہاجراں یاد ضرور ہوگی لیکن توجہ نہیں دے پاتے۔ اور جو ڈھیر سارے کام کرنا ہوتے ہیں اللہ میاں کو۔ بیٹی ثمینہ آج تو تم میرا خط لکھ ہی دو۔"

"ہاں ہاں ماسی ہاجراں لکھ دوں گی۔"

"اللہ تمہیں بھاگ لگائے۔ میں نے بشیر کو کہا کہ خط لکھ دو لیکن وہ بات ٹال گیا۔ شریفاں کے بیٹے عبدالکریم کی منت کی لیکن وہ ہاکی لے کر بھاگ گیا۔ رشید کو خط لکھنے کا کہا تو وہ ہنسنے لگا۔ بیٹی تم آج ضرور خط لکھ دو۔"

"ہاں ماسی، سبزی بنا کر لکھ دیتی ہوں۔"

اور پھر حمیداں نے آلو میتھی کی ہانڈی چولہے پر رکھ دی اور ثمینہ قلم اور کاغذ لے کر بیٹھ گئی۔ "لو ماسی میں قلم کاغذ لے آئی ہوں۔ تم بولتی جاؤ۔ میں لکھ دیتی ہوں۔"

ہاجراں بولی "پیارے اللہ میاں۔ السلام علیکم۔ میں بڑے دنوں سے تمہیں خط لکھوانا چاہتی ہوں لیکن کوئی لکھنے کے لیے تیار نہیں ہوا۔ آج ثمینہ بیٹی نے حامی بھری ہے تو میں خط لکھوا رہی ہوں۔ جب میں ترنتارن میں رہتی تھی تو سبھی پیارے میرے ساتھ ہوتے تھے۔ خالد کا ابا کسرتی جسم کا محنتی کسان تھا۔ تو نے ہمیں اپنی زمین دے رکھی تھی جس پر وہ ہل چلاتا اور فصل کاشت کرتا۔ فصل کٹتی تو بڑے اناج سے بھر جاتے جو سال بھر کے لیے کافی ہوتا۔ بلکہ فالتو اناج خالد کا ابا منڈی میں بیچ آتا۔ ہمارے کھیتوں میں ڈھیروں سبزیاں اگتیں جو منڈی میں اچھے بھاؤ بک جاتیں۔ شہر سے واپسی پر خالد کا ابا گھر کے تمام افراد کے لیے کپڑے اور جوتے خرید لاتا۔ ہمارا خالد بستہ بغل میں دبا کر صبح سویرے سکول جاتا۔ میں اسے چاٹی سے مکھن نکالنے سے پہلے گاڑھی لسی کا گلاس پلاتی۔ وہ شریفاں کے بیٹے عبدالکریم جتنا ہی تھا۔ میں گھر کے کام کاج کرتی، بھینس اور بیلوں کے لیے چارہ لاتی اور خالد کے ابا کو کھیتوں میں کھانا دے کر آتی۔ ہماری آمنہ بس ثمینہ کی طرح جوان تھی۔ جب وہ پیدا ہوئی تھی تب سے میں اس کے جہیز کے لیے زیور، کپڑے اور برتن خرید رہی تھی تاکہ جب اس کی رخصتی کا وقت آئے تو اس وقت پریشانی نہ ہو۔ اللہ میاں! یہ ساری دین تیری تھی۔ تو نے کبھی ہمارے اوپر برا وقت نہ آنے دیا تھا۔ شوہر، بیٹی، بیٹا، رزق، عزت، زمین، بیل، بھینس، گھر کا سامان سب کچھ دے رکھا تھا۔ تمہیں ان دنوں شاید زیادہ فرصت ہوتی تھی اس لئے ہمیں سب کچھ دے رکھا تھا۔ پاکستان کا اعلان ہوا تو ہم بہت خوش تھے کہ ہمیں آزادی ملے گی، مسلمانوں کو الگ ملک ملے گا۔ خلفائے راشدین کا دور پھر آجائے گا۔ سب مسلمان نیک، خوشحال اور اپنے ملک کے مالک ہوں گے۔ سب یہی کہتے تھے کہ ترنتارن پاکستان میں شامل ہوگا لیکن جب ملکوں کی حد بندی کی گئی تو ہمارا علاقہ بھارت میں شامل کر دیا گیا۔ ہندوؤں اور سکھوں نے مسلمانوں کا خون بہانا شروع کر دیا۔ ہم بھی اپنے دونوں بچوں کو لے کر پاکستان جانے والی ٹرین میں پہنچ گئے۔ مگر راستہ ہی میں گاڑی روک دی گئی اور سکھوں کے جتھوں نے حملہ کر دیا۔ خون سے لت پت لاشوں کے انبار لگ گئے۔ ہمارے ڈبے میں بھی سب کو شہید کر دیا گیا۔ خالد کہا کرتا تھا "اماں میں بڑا ہو کر افسر بنوں گا اور تمہیں اور ابا کو اتنی مشقت نہیں کرنے دوں گا۔" مگر خالد، اس کا ابا اور آمنہ بھی سکھوں کے ہاتھوں شہید ہو گئے۔ خالد کے ابا نے مرنے سے پہلے دو حملہ آوروں کا قصہ تمام کر دیا تھا۔ اللہ میاں یہ طاقت بھی تو نے ہی دی تھی۔ اور شہادت کا رتبہ بھی تو نے ہی عطا کیا تھا۔ ایک سکھ نے میری گردن پر بھی

وار کیا تھا۔ میں شہید تو نہ ہو سکی البتہ زخمی ہو کر بے ہوش ہو گئی تھی۔ گاڑی پاکستان پہنچی تو لاشوں میں سے چند زخمیوں کو نکالا گیا۔ ان میں میں بھی تھی۔ کیمپ میں میرا علاج اور مرہم پٹی کی گئی اور بعد ازاں کچھ لوگوں کے ہمراہ مجھے سانگلہ ہل بھیج دیا گیا۔ اللہ میاں! تو کتنا مہربان ہے کہ میرے زخم بھر دیئے اور رہنے کو کمرہ دے دیا۔ تو مجھے سوہنے پاکستان لے آیا۔ یہاں میرے جیسے کتنے ہی لوگ اجڑ کر آئے ہیں۔ تو سب کا رکھوالا ہے۔ تجھے سب کی فکر ہے۔ پر اللہ میاں! تھوڑی فرصت نکال کر میری طرف بھی دھیان دو۔ میرے تن کے کپڑوں پر کئی پیوند لگ چکے ہیں۔ میرے گھر کئی روز سے چولہا نہیں جلا۔ حکیم جی اور شیخ صاحب دونوں بڑے نیک پڑوسی ہیں جو میرا بڑا خیال رکھتے ہیں۔ مگر پیارے اللہ میاں! تمہیں بھی میرا کچھ خیال رکھنا چاہیئے نا۔ میرے پاس پھوٹی کوڑی نہیں۔ میں کس طرح اپنی ضرورتیں پوری کروں۔ پیارے اللہ میاں! مجھے جلدی منی آرڈر بھیجو تاکہ میں تن کے کپڑے لے سکوں اور چولہے میں آگ جلا سکوں۔ شریفاں کے بیٹے عبدالکریم کو قصص الانبیاء کی کتاب خرید کر دے سکوں تاکہ وہ تیرے پیغمبروں کے حالات سے واقف ہو جائے اور بڑا ہو کر تیرا فرمانبردار بندہ بنے۔ تاکہ میں ثمینہ کو چاندی کے بندے خرید کر دے سکوں اور جمعرات کو تیرے نام کی نیاز پکا کر مسجد میں بھیج سکوں۔ اللہ میاں منی آرڈر بھیجنے میں دیر مت کرنا۔

فقط

ماسی ہاجراں"

"ماسی خط تو مکمل ہو گیا۔" ثمینہ نے کہا۔

"لفافے پر پتہ بھی لکھ دو نا۔ میں لیٹر بکس میں ڈال دوں گی" ماسی ہاجراں نے اسے لفافہ دیتے ہوئے کہا۔

"ماسی اللہ میاں کو کس پتہ پر خط بھیجنا ہے؟"

"بھلا یہ بھی پوچھنے والی بات ہے۔ اللہ میاں کو کون نہیں جانتا۔ لکھو پیارے اللہ میاں، معرفت پوسٹ ماسٹر، ڈاکخانہ خاص، سانگلہ ہل۔"

خط لفافے میں بند کر کے ماسی ہاجراں نے اسے لیٹر بکس میں ڈال دیا اور جواب کا انتظار کرنے لگی۔

چند روز ہی گزرے تھے کہ ڈاکیا ماسی ہاجراں کا منی آرڈر لے کر آ گیا۔ کمرے کے دروازے پر رک کر ڈاکیئے نے آواز دی "ماسی ہاجراں، تمہارا منی آرڈر آیا ہے۔ یہاں انگوٹھا لگا کر روپے لے لو۔"

ماسی ہاجراں سامنے بچھی چارپائی پر پڑی تھی۔ اس نے ڈاکیئے کو نہ کوئی جواب دیا اور نہ ہی انگوٹھا لگانے کے لیے اٹھی۔ ڈاکیئے نے آگے بڑھ کر ماسی ہاجراں کو جھنجھوڑا لیکن اس کا جسم ٹھنڈا ہو چکا تھا۔ وہ اپنے پیارے اللہ میاں کے پاس پہنچ چکی تھی۔

سَمَر سامِر*

اسلم سراج الدین

اسلم سراج الدین کی یہ تحریر، جسے انہوں نے "سمر سامر" کا عنوان دیا ہے، فکشن کا ایک ایسا تجربہ ہے جس میں امکانات کی ایک سے زیادہ جہات کا احساس ہوتا ہے۔ تخلیقِ کائنات سے قبل کی صورتِ حال کو تخیل اور مطالعے کی مدد سے مصوّر کر دینا اور پھر اس پس منظر کو انسانی تاریخ کے حوالوں سے روشن کرتے چلے جانا کسی عام ذہن کی گرفت سے باہر کا معاملہ ہے۔

میں "نثری نظم" کا قائل نہیں ہوں کہ اس کی مقبولیت شاعری میں خوفناک انتشار کا سبب بن سکتی ہے مگر "سمر سامر" مجھے شاعری کے نہ صرف قریب نظر آئی بلکہ بیشتر مقامات پر وہ شاعری کی سرحد کو بھی عبور کرتی محسوس ہوئی۔

اس کے مفہوم کی تفہیم میں میری طرح قارئینِ "فنون" کو بھی یقیناً دقت محسوس ہوگی کہ اس میں وجود کو لا وجود کے ساتھ، ہونے کو نہ ہونے کے ساتھ، وقت کو لا وقت کے ساتھ اور آفرینش سے قبل کو آفرینش کے بعد کے ساتھ یوں باندھ دیا گیا ہے کہ ہم اس مرئی دنیا کے آئینے میں غیر مرئی دنیاؤں کو دیکھ بلکہ چھو سکتے ہیں۔

اسلم سراج الدین نے اس تحریر کو ہمہ گیر اور ہمہ جہت یوں بھی بنایا ہے کہ انگریزی، ہندی، سنسکرت، پنجابی، فارسی، عربی اور لاطینی وغیرہ زبانوں کے الفاظ کو اپنی اس اردو تحریر میں یوں رسان سے سمو دیا ہے کہ ایک نئی اردو صورت پذیر ہوتی معلوم ہوتی ہے۔ ساتھ ہی مصنف نے دنیا بھر کے اساطیری کرداروں کو بھی نئی محسوس زندگی دینے کی کوشش کی ہے۔ انہوں نے نئے کردار بھی تخلیق کیے ہیں اور یہ کردار ہیں خامشی، لاشئ، روشنی، فراموشی وغیرہ۔

"سمر سامر" میں جب ہوائیں دکھائی دینے لگتی ہیں اور برفوں کو تاپا جانے لگتا ہے اور آسمانوں کی کھال اترنے لگتی ہے اور سنائی دینے والی مہک سے تعارف ہوتا ہے تو پڑھنے والا عجیب وجدانی کیفیتوں میں سے گزرتا ہے۔ شاید اسلم سراج الدین کے صرف دو تین جملوں سے قارئین کو اردو کی اس تازہ، انوکھی اور امکانات بھری تحریر کے اسلوب کا اندازہ ہو سکے گا۔ مثلاً:

"کتنے جگ جو ابھی جنمے نہیں تھے، بیت گئے"

"قبل از وقت میں بعد از وقت کا نظارہ صرف لا وقت کی تقدیر ہے"

"ابتدا میں خاموشی تھی، انت بھی خاموشی ہے"

اور ہونے نہ ہونے کے اس کھیل میں جہاں جھٹپٹی شاموں میں اور شامیں صبحوں میں تحلیل ہوتی جا رہی ہیں، خود اسلم سراج الدین کے الفاظ میں ——— "کھیل کی کوئی کلائی متاثر نہیں ہوتی" ——— پورا ماحول "ہم کیا، کون اور کیوں ہیں" کے استفہامیے میں محصور ہے اور کوئی نقطہ اس استفہامیے کا جواب نہیں دے سکتا کہ مصنف کے قول کے مطابق "ہر نقطہ معنی کا اسقاط ہے"۔

"سمر سامر" کا ہر لفظ، ہر جملہ، ہر کردار اتنے بہت سے مفاہیم سے لدا پھندا ہے کہ متعلقہ مفہوم تک پہنچنے میں قاری کے دل و دماغ کو دلفریب آزمائشوں میں سے گزرنا پڑتا ہے۔ اور ایسا کیوں نہ ہو جبکہ اسلم سراج الدین کی تحریر دامنِ دل کو کھینچے رکھتی ہے۔ اس کا ایک ٹکڑا یوں ہے:

"جلدی جلدی ستاروں کی دھول میں آگئے
کچھ پھول اس نے سرہانے رکھے اور آسمان
کا ایک ٹکڑا اپنے اوپر کھینچ کر پہلو بدل لیا۔"

---

* داستان اور داستان سرا (عربی)

ایک طرح سے یہ حقیقت کو ڈھونڈنے نکلی ہوئی ایک تجسس، متلاشی قسم کی کہانی ہے کہ اس کا بنیادی کردار ہی کہانی ہے اور متلاشی و متجسس "لالہ" کی ہے جو لاجہت اور لاانتہا ہے اور جس نے کہانی کو ایک تمثیل خانہ موڑ دے کر اردو ادب میں اپنی نوعیت کی اولین تحریر اور مستقبل کو اپنے بازوؤں میں لیے ہوئے ادب پارہ بنا دیا۔

— ندیم

خامشی

ہم دونوں میں بڑا کون ہے، میں یا کہانی، یہ تو لالہ ہی بتا سکتے ہیں، پر لالہ کبھی بولیں بھی۔ وہ تو ایک ہی بار بولے تھے اور تب سے ہم بھگت رہے ہیں۔ ہمارا گھر اپنے آپ میں اتنا بڑا تھا کہ وہاں آسمان تھا نہ زمین۔ پھر بھی وہاں پہاڑ تھے اور دکھائی نہ دینے والے سوتوں سے گرتے آبشار۔ جہاں تک آنکھ دیکھ سکتی تھی (اور آنکھ کہاں تک نہ دیکھ سکتی تھی!) پھول کھلتے اور کسی پھول کا رنگ خود کو دہراتا نہیں تھا اور مہک ان پھولوں کی اتنی گھنی تھی کہ سنائی دیتی اور اپنے باطنی نظام کے واسطے سے ہر وقت نئے نئے نام روپ دھارن کیا کرتی —— اس مہک کے تنکوں سے بنے گھونسلوں میں ایسے سازندے خانہ آباد تھے جن کا اپنا کوئی مستقل ساز نہ تھا۔ کبھی ایسا ہوتا کہ پھولوں کو سیراب کرنے کے لیے ان دیکھے سرچشموں سے آتے پانی کو یہ سازندے راستے میں اچک لیتے اور ساز بنا لیتے اور اس سے پہلے کہ وہ آبی ساز ان کے ہاتھ سے بہہ نکلے وہ ایک سُر اس پر ایسا چھیڑ دیتے جو وہاں سے نکل کر قرنوں پر پھیل جاتا۔ افسوس بھٹکے ہوئے ان سُروں میں سے صرف سات بالآخر سماعت کی حدوں تک پہنچ پائے۔

ہمارے اس گھر کے کنارے سراب کے تھے۔ میں وہاں جھلمل جنگلے کے ساتھ پیٹھ ٹکائے حدِ نظر تک پھیلے نوری سالوں کے منجمد قطرہ ہائے خون میں گھورا کرتا۔ بوندوں کے ان مُردے میدانوں میں اپنی باری کی منتظر ناآفریدہ انواع کے کیمپ ہوتے، دُور دُور تک ہر طرف۔ اسرار کے مسافر ان دیکھی دنیاؤں سے آئے لڑکے بالے تو آتے ہی اپنے رَک سیک اتار پھینکتے اور فٹ بال یا بیس بال یا ...... کھیلنے لگتے جب تک کہ ان کی باری آتے۔ تارے انہیں ڈانٹتے اور غصے سے ان پر ٹوٹ پڑتے۔ پر نہیں، وہ شریر کسی کی نہ سنتے اور اودھم مچائے جاتے حتیٰ کہ کال آجاتی۔ تب وہ تیز تیز باتیں کرتے جلدی جلدی رَک سیک اٹھاتے کسی ستارے کی طرح شُوٹ کر جاتے۔ کامٹ روانہ ہو جاتی۔ کوئی آواز تک نہ آتی۔

کبھی کبھار ایک گیند ہمارے صحن میں گر کر دو ایک گدّے کھاتی اور پھولوں پر جا ٹکتی۔ پھولوں سے اسے نوچ کر میں سرپٹ ایک طرف بھاگ لیتا تا اسے کسی سُورج وغیرہ کو تھما آؤں کہ وہ اسے اپنے داغ دھبوں کی سلوٹوں میں چھپا لے۔ تبھی ایک بادل میرے پیروں کے بیچ گرجتا: 'گیند واپس پھینکو۔ فوراً' —— اور میں دیکھتا کہ میں اس گرج برسے بادل کی بنائی ہوئی دلدل میں پابستہ کھڑا ہوں۔ ایک بار تو میں اس گیند کو اور زور سے پیٹ کے ساتھ لگا لیتا اور پھر ان لڑکوں کو دیکھتا جو ہمارے جنگلے پر ٹھوڑیاں ٹکائے حسرت سے اپنی گیند کو تک رہے ہوتے، جبکہ ان کے پیچھے اونانی کتبہ (The grounds of immortal playing) سائیں سائیں کیا کرتے۔ ناچار میں گیند واپس اچھال دیتا۔ ہمارا جنگلہ شہابی ٹھوڑیوں سے خالی ہو جاتا اور کھیل کے میدان آوازوں سے بھر جاتے اور میں سوچنے لگتا، بادل کی گرج برس کا بھید کیا ہے۔ وہ کون ہے جو وقت بے وقت مجھے یہ کرو یہ نہ کرو کی پٹی پڑھایا کرتا ہے۔ کہیں یہ لالہ ہی نہ ہوں، میں سوچتا۔ لالہ جو کسی عقبی غرفے میں بیٹھے سارا وقت پتہ نہیں کیا جوڑ گھنٹہ کیا کرتے —— کبھی جب الجھن حد سے بڑھ جاتی تو ایک ایڑی پر گھوم کر میں لٹو ہو جاتا اور ڈانٹ کر سماؤں سے پوچھتا: 'کہاں ہیں؟ لالہ کہاں ہیں؟'

جواب ملتا: 'اندر ہیں!'

'اندر ہی سے وہ مجھے باہر کیسے دیکھ لیتے ہیں؟'
'یہ لالہ ہی سے پوچھو'
'لیکن پوچھوں کیسے؟'
'یہ 'کیسے' بھی لالہ ہی سے پوچھو'

کہنا مجھے یہ ہے کہ اپنے اسی گھر کے آنگن میں پہلے پہل میں نے کہانی کو دیکھا تھا۔ وہ میرے ساتھ جنمی تھی، پہلے کہ پیچھے۔ میں نہیں کہہ سکتا۔ اور کچھ اسی کارن میں اپنا اس سے سمبندھ بھی صاف صاف نہیں بتا سکتا۔

میں نے اُسے دیکھا، پہلی نظر، ایک نظر۔ اور اپنا سارا نور صرف کر بیٹھا۔ اپنے ایک آپ میں اتنے کئی تھی وہ۔ ایک بات جو بیان کو دُر دُر کرے۔ ایک زمانہ بہت نک چڑھا جو پوچھے: کیا زمانہ، کیسا زمانہ!۔ بگڑا بیکار اب نہ تب اور کیا اب اور کہاں کا تب۔ میں سوچوں میں کہاں ہوں؟

دن برس سال یُگ روشنی کی باڑ کے پیچھے جا جا کر ڈھیر ہوتے رہے۔ وہ نرم خُو کرنوں کی گٹھڑی بنی وُوں ہی پڑی رہی۔ سورج ستارے چاند اور پراکرتی کے ایسے پرکاش نمونے جن کا کوئی نام نہیں تھا، اگر ملتجی ہوتے کہ وہ اُن کی کرنیں سویکار کر لے۔ ایسے میں بھلا میں کیا کرتا۔ میں جو اس پر زہر کھا چکا تھا۔ سو یاس میں ڈوبا اُسے دیکھا کیا۔ صدیوں قرنوں ہمارے صحن میں پھولوں کے پاس اپنی کلیڈوسکوپک گٹھڑی سے وہ مجھے لبھاتی رجھاتی رہی۔ بھاؤ بتاتی رہی۔ ایک بات جو بیان کو دُر دُر کرے۔ ایک زمانہ بہت نک چڑھا بگڑا بیکار اَب نہ تب اور کیا اَب اور کہاں کا تب۔ 'میں کہاں ہوں!؟'

'نہیں اِسی زمکان سے پہلے کے اننت کال تسلسل میں جہاں کہ ہمیشہ سے تھے اور کہاں جاؤ گے، تم مجھے دیکھو کر.....'

کیا یہ کہانی تھی؟ مجھ سے مخاطب تھی؟ کیا بے تکلفی سے ڈانٹ رہی تھی۔ میرے خالی خشک کوزے میں جیسے امرت کی ایک بوند آگری اور میں جو اُسے جاننے کی آرزو میں سوکھ گیا تھا پھر سے ہریالا ہو گیا۔ کچھ دیر دُبدھا میں کھڑا اُسے دیکھتا رہا۔ پھر حوصلہ کر کے آگے بڑھا۔ یہ جھلمل اُس کا پہلو ہے، کہ پوشاک، کہ سر پہ کسی انجانے ڈر کی چھایا ڈول رہی ہے، کہ جیسے وہ گرے گی اور ٹوٹ رے گی اور کوئی انگ اُس کا ضرور بکھر رہے گا۔ اُدھر وہ پھول اُس پر مر مٹے اپنا آپ پیسے دے رہے تھے، غرق ہو کر ایک ہی بار اُس پر سے بہہ جانے کو۔ پھر اسی پر بس نہ کرتے۔ اپنی بے کلی سے تبخیر ہو، بادل بن جاتے اور ہچ ہچ تیرتے جاتے اُس کے پاس کہ اپنا باقیماندہ خیال بھی اسے بھینٹ کر آئیں.....
اور ایک بادل بمشکل ابھی اس کا پیرہن ہو پاتا کہ پیچھے سے ایک اور چلا آتا اور ایک اور..... یوں وہ بادل جو پھولوں کے رس سے زیادہ رقابت کے انتم ذرّوں سے بنے معلوم ہوتے تھے، اُسے کم ہی ڈھانپتے —— اور یہ بھی اُن ٹھگوں کی باہمی تفہیم تھی کہ کبھی کوئی بادل اُس پر پورا نہ پڑے۔ وہ ہر طرح سے میری دیکھی بھالی تھی پر کبھی مجھے اس کے کھلے ڈھکے کا خیال نہیں آیا تھا —— پھر اب کیوں؟ کیا میرے من میں بال تھا۔ وہ پورے بدن سے مسکائی جیسے پاس بلاتی ہو —— اور بڑی بیرتا سے آگے بڑھ کر میں نے اس کے پہلو کی کرنوں کو چھو لیا —— اور جیسے ان گنت تیغ ہائے تابدار میری مٹھی میں آ گئیں، ایک ہی بار گئی، ان گنت:

"آ گئے اپنی فطرت پر اور اتنی جلدی —— دور رہو۔" مٹھی جس میں اپنے زعم میں نے کرنوں کو بند کرنا چاہا تھا، لہو بہا رہی تھی، دھاروں دھار۔ درد سے بے حال ہو کر میں نے اُسے کھول دیا۔ کوئی تسمہ لگا رہا تھا نہ کوئی ہڈی بچی تھی۔ ہات کے اُس رکت چھیدے سے پانچ دھاروں میں لہو بہہ رہا تھا۔ پھولوں پر تو چھینٹے پڑ ہی رہے تھے، پڑ گیا ہو گا کوئی ایک چھینٹا اس پر بھی۔ بھڑک اُٹھی: سُنا نہیں۔ پرے رہو۔ کیوں میرے کپڑے ناس کر رہے ہو؟ —— کہتے ہی ہنس پڑی۔ ہنستی رہی۔ بات بات پر ہنستی رہی۔ بیچ

بیچ کوئی چُبھتی بات کہہ دیتی: 'آیا مزہ ہاتھ چالاکی کا' ——— پھر دانتوں اور زبان کے تال میل سے چٹ چٹ کرتی۔ گویا بہت مزے میں ہو۔ 'پتھر دل'۔ میں نے سوچا۔ جس پر وہ اور کھُل ہنسی: 'نہیں تمہاری کوئی بات بھی سچ نہیں ——— ادھر آؤ' ——— لہو میں تر بتر ہاتھ دوسرے ہاتھ سے تھامے میں ڈرتا ڈرتا آگے بڑھا۔ دو ایک پگ ابھی اس سے اُدھر ہی تھا کہ اُس نے کھینچ کر مجھے قریب کر لیا اور میرا لہو میں نہایا ہاتھ پکڑ کر ٹھیک اُسی جگہ اپنے پہلو پر لے گئی جہاں میں نے تیغ تیز کرن دھاروں کو مٹھی میں کرنا چاہا تھا۔ تب آنسوؤں کے پیچھے سے میں نے ایک عجیب جادو دیکھا۔ کرنیں میرے ہاتھ کو سینے لگیں۔ درزنوں کی طرح۔ پہلے خون صاف کیا۔ ہڈیاں بٹھائیں، بافتوں کو بخیہ کیا۔ ریشے جوڑنے کو تسمے لگائے اور جہاں ضروری تھا نئی کھال منڈھ دی اور یہ سارا کچھ ایک چھن میں۔ اَب میں پھر رو رہا تھا۔ اپنا وہی اچھا پرانا ہاتھ پھر پا لینے پر۔ کتنی ہی دیر اُسے اُلٹ پلٹ کر دوسرے ہاتھ سے دبا دبا کر دیکھتا رہا۔

'اب کبھی مجھے نہ چھونا!'

منہ بنا کر میں نے پھر سے ہات اُس کے پہلو کی اور بڑھایا ——— اور کھینچ لیا۔

'ڈرپوک'۔ اُس نے منہ چڑایا اور ہماری دوستی ہو گئی۔

وقت ابھی بنا نہیں تھا۔ بننے پڑا تھا سو کون بتائے کتنے یُگ بیت گئے۔ بیتے بھی یا نہیں۔ چلو سہولت کے لیے کہہ لیتے ہیں کہ بہت یُگ نکل گئے اور کہانی اپنے سونہلی اُطاقِ خواب میں پڑی سویا کی۔ کبھی میں بھی سو لیتا پر میرے سونے میں نیند نہ ہوتی۔ میرے خواب سے نیند اس نے کھُرچ لی تھی۔ اُس اسی بھی پڑی نے۔ جوں اس نے سب پا لیا ہو، اس کے پاس ہو سب، اب کوئی اچھا نہ ہو۔ یہ میری بد تماراتی شانت ہے جبھی تو مجھے گھاس نہیں ڈالتی۔ کوئی موہ لوبھ ہو، کرودھ کپٹ ہو۔ چھل ہو چل ہو جو اسے اشانت کرے۔ اس کی کرنوں کو کانٹے بنا دے، جس کارن کر اس کی شکتی چھن جائے جس سے اس کے کیمیں پہلوؤں پہ اور پیڑو پر کرنوں کا پہرہ رہتا ہے جو اس کی اور بڑھتے ہاتھ کو لہو میں نہلا دیتی ہیں۔ ہاں مجھے وشواس ہے، جو یہ شکتی اس سے جاتی رہے تو اس کے روپ کی سندرتا کا سہاؤنا پن کانٹے پر لگی اوس کی طرح جاتا رہے گا۔ تبھی ایک کرن چیونٹی بن آئی اور مجھے میرے خیالوں سے کاٹ گئی۔ یہ کہانی تھی جو میرے اُوٹ پٹوٹ وچاروں پر سخت خفا تھی: 'کتنی لگاوٹ سے تم مجھے دیکھتے ہو، پھر کیسے پریم کے کہان کہتے ہو اور پھر کیسی بُری بُری باتیں میرے بارے سوچتے ہو.....' سچی بات ہے میں گھٹ سا گیا تھا یوں رنگے پکڑے جانے پر۔ واقعی بہت خفت ہو رہی تھی:

'دیکھو میں یہاں کتنے مزے میں ہوں اور یہاں کیا، میں کہاں نہیں ہوں، کوئی سیما ہے میری! رشموں کے جل سے بھر اگھور گہرا ساگر، اس پر تیرتے پھول اور اوپر اڑتے جل کاگ..... ساگر بھی میں ہوں، کرن بھی میں، جل بھی میں، پھول اور جل کاگ بھی میں۔ اور کیوں کوئی مجھے اکیلی سمجھے۔ کرنیں میری سکھیاں اتنی ہیں کہ تم انہیں گن نہ سکو، ہاں میں سب کچھ ہوں، سب ہوں۔ میری ایک کرن سکھی اپنا رنگ اُچھال دے تو آکاش بن جائے اور ساگر بجز کرن کی خواہشِ غسل کے اور کیا ہے (یہ اور بات کہ مجھے آکاش کا مستقل سر پہ تنے رہنا پسند نہ ہو، اور ساگر؟ پڑے پڑے اس میں سڑاند کا سبب کون پالے!) نت دن میں موج کا جھولا جھولتی ہوں جس کی ایک ڈور ایک تارے نے، دوسری دوسرے تارے نے تھام رکھی ہے اور جھولے میں بیٹھی میں آفاق کی رفتار سے شرط بدھتی ہوں اور ایک ہی جھونٹے میں وہاں ہو آتی ہوں جہاں تک پھیلنے میں آفاق کی سانس پھول جائے۔ میں اپنی شکل میں بے شکل ہوں۔ میں چلتی ہوں اور اچل ہوں۔ میری داستانیں رُکی ہوئی ہیں۔ میرے چاروں سکھ اور چاروں دوار محفوظ ہیں۔ میرا کچھ بھی لپیٹ نہیں۔ میں سم بھاؤ ہوں اور یونہی رہنا چاہتی ہوں۔ اَدِ ناشی۔ لافانی۔ میرے حواس ابھی میرے ضبط میں ہیں اور اُن کی پریرنا میرے بھیتر ہے اور میرا من ایک شفاف بلور ہے جس میں

دیکھتی میں ان سب کے کرموں پر نظر رکھتی ہوں، ان کی گتی پر کرتی اور وکرتی پر پہرہ دیتی ہوں۔ یہ چوں نہیں کرتے۔ پر جو میں آپ واسنا وشئے کے پھیر میں پھنس گئی تو پریرنا کو کیا پڑی ہے میری باندی بنی رہنے کی۔ وہ تو سنگ سے گی چپکے سے اور بلور میرا انگ میلا ہوگا۔ تب میرے اور ان کرداروں اور ان کے کرتاروں کے بیچ پردہ پڑ جائے گا۔ میں ان پر نظر نہ رکھ سکوں گی کہ دے تو سیلی ہو چکی ہوگی۔ تب یہ کرتار اور کردار جو اصلاً میرے حواس، میری اندریاں ہیں کھل کھیلیں گے، ریتا اڑائیں گے اور ایک ہاہاکار مچ جائے گی۔ تب وشئے مجھے اپنے پروں پر اٹھائے پھر رہیں گے۔ کہیں بھی میری سیری نہ ہوگی۔ کام اندھا ہو کر ہر چھن نیا مصنف بھالوں گی، کوئی نیا نویلا اپنے کام کا جانو مصنف نظر آیا نہیں اور میں کام واسنا سے پاگل ہوتی نہیں۔ چھن چھن میں مصنفوں سے بھوگ کروں گی اور چھن چھن بھلے برے بچے جنوں گی۔ تم چاہتے ہو میں حواس کی اسیر ہو کر کاماؤں کے بھنور میں گھمن گھیریاں کھاتی پھروں۔ شبد شاعر قصہ گو، ان کے کردار —— میرے حواس۔ ابھی یہ مجھ میں یکسو ہیں جوں بیج میں پھل پھول اور ایندھن میں اگنی۔ انہیں ضبط میں رکھنے کے لیے ابھی مجھے کچھ کرنا نہیں پڑتا۔ اطاعت ان کی جبلت ہے۔ اگر کبھی ان میں غدر پڑ گیا جیسا کہ تم چاہتے ہو تو میری تو تکا بوٹی ہو جائے گی۔ سوم رس سنہرے بادل برف پربت پُن پاپ واسنت رُت پھولوں سے لدے گھنے وَن، وَرشا، اگنی وایو سنجوگ بجوگ کوئی اکھشر منہ سے نکالو اور مجھ میں اس کا چتر دیکھ لو۔ ہاں یہ سب میرے بھیتر ہیں۔ جب میں انہیں، ان کی شکتی کو اور سہن نہیں کر پاؤں گی تو یہ سب باہر نکل آئیں گے۔ تب تم دیکھنا سارے میں ہاہاکار مچ جائے گی پر ابھی میں شانت ہوں۔ سب میرے بھیتر ہے میں سب ہوں ...... اس نے ایک ٹھنڈا سانس لیا، اب تو شک کی گنجائش نہ رہی تھی کہ اس نے میری ساری سوچیں سن لی ہیں۔ ٹھنڈے سانس کے بیچ بولی: 'میرے پھوٹے بھاگ ہوئے ابھاگ' —— اور پھر جیسے کسی پاس کی سے دکھ سکھ کہتی ہو ایک کرن سے کہنے لگی: اری سنتی ہو، میرا یہ پریمی جو رت میرے کان میں اپنی پریم پوتھی ڈونڈی پر پیٹتا ہے مجھ سوں کیا وچارتا ہے' —— اور کرن جیسے کوئی چٹ پٹی بات سننے کے لئے مری جا رہی ہو چمک کر بولی: 'کیا؟' ——

'یہ چاہے ہے مجھے سوہ لاس کپٹ کرودھ فتنہ فریب، بھے راگ دویش اور ایسے ہی اور روگ لگ جائیں تا میرا سر پھٹا ہو جائے۔ کوئی اِت اُت مجھے ایسے لکھے کوئی دیلے، ایک مجھ پہ یہ کردار چھوڑ دے دُوجا دہ۔ میں ایک نہ رہوں جس میں سب ہے، میں سب میں بٹ جاؤں اور اپنی ایکتا کی تلاش میں ماری ماری پھرا کروں .... ایسا ہے یہ میرا پریمی' ——

'تو اری تُو اس کو بتا کیوں نہیں دیتی اندر کی بات! دکھا دے پیٹ سے کپڑا ہٹا کے، کچھ ٹھنڈ پڑے کالجے میں اس کے' وہ چپ ہو گئی۔ لیکن ایک روز اس نے پیٹ سے کپڑا ہٹا ہی دیا۔

اس کے بدن کی جھلمل میں ایک آئینہ تھا، ایسا عجیب کہ اس میں جھانکو تو صورت نہ دکھے۔ میں اپنی صورت کے ہونے نہ ہونے کے مخمصے میں پڑنے کو تھا کہ آئینے کے پانی کی تھاہ میں مجھے ایک شہر دکھائی دیا —— پانی کے ہاتھ میں پیالہ، ایک جزیرہ جو کھڑے کھڑے تھک کر بیٹھ گیا ہو۔ لیکن میں شہر کو کیا دیکھتا مجھے تو اپنی صورت کے جاتے رہنے کا ملال تھا:

'ڈرو نہیں، کہیں نہیں جاتی تمہاری صورت —— یہ شہر ہی تمہاری صورت اور صورتِ حال ہے' ——

یہ سن کر میری کچھ ڈھارس بندھی اور میں ایک ایسے سیاح کی طرح، جسے انجام کار اپنے اسباب کے محفوظ ہونے کی خبر ملے، سیاحی کی طرف متوجہ ہوا۔

شہر پانی کے آسمان میں ایک پتنگ کے عکس کی طرح ڈول رہا تھا۔ میرے من میں آئی کسی کانٹال ٹہنی پر اس شہر کو اُڑتا

لاؤں۔ اس پانی کے نگر نے مجھے اپنی سندرتا کا موہت کر لیا تھا۔ اپنا ایک گال کہانی کے پیٹ پر ٹکا کر میں اس میں ڈوب گیا۔ موم ایسی کسی چیز کی گلیوں کے دو رویہ بڑے بڑے سیپ اور گھونگھے کندھے سے کندھا پُشت سے پُشت ملائے کھڑے تھے۔ ان پر سامنے کی طرف دھوپ سے بچاؤ کے لیے پتوں کے بڑے بڑے سائبان تھے جن کے کہیں پیچھے سے مچھلیوں کی آنکھیں باہر کی طرف دیکھ رہی تھیں — روشندان — اور اس منظر کے عقب میں ایک جوالا مکھ سے شہابی دھواں اُٹھ رہا تھا، یہاں کے مکینوں کا چولہا —

'یہ موم کے قریبے، سیپ گھونگھوں کے مکانات، روزنوں میں جڑی مچھلیوں کی آنکھیں اور پس منظر کا لاتیو آتش فشاں — الگ الگ۔ یہ تمام میرے انگ ہیں جن پر ہر لحظہ آتش موم کا لیپ ہوا کرتا ہے' — کہانی کہہ رہی تھی — 'اور اپنے طور پر ہر رنگ ایک خشت ہے اور ہر خشت ایک پاؤں بھی ہے اور پائیدان بھی — آیا کچھ دماغ شریف میں کیسے اُسرتا ہے کتھا نگر، کہانی کا پوتر پُور؟' —

'نہیں — نہیں آیا دماغ میں کیسے اُسرتا ہے کتھا نگر، کتھا کار کے بغیر' —

'اوہ! کتھا کار سارے پڑے سو رہے ہیں — سیپوں کے امکان میں' —

'کیوں؟' —

'اس لیے کہ ابھی بہت سے معاملات طے ہونا باقی ہیں'

'مثلاً؟'

'اس مثلاً کے لیے مجھے کچھ رِسک لینا پڑے گا' —

'کیسا رِسک؟'

بلاؤں کو جگانا ہوگا، خیر کرتی ہوں یہ بھی تمہارے لیے' — ہاتھ سر کے پیچھے لے جا کر وہ انگلیوں میں ایک پھول لگا لائی جسے اس نے ناف پر رکھ لیا۔ جی نہیں! میں کر دیں پڑوس میں گال ٹکائے کتھا کے جہان ہائے رنگ نیرنگ میں ڈوبا تھا، پھول نے میرا نوٹس نہیں لیا۔ پہلے تو پنکھ پھیلا کے جگہ کے نئے پن کو محسوس کرتے ہوئے ایک پل ٹھہر اُڑ گیا۔ پھر پنکھ اُٹھا کے میرے اُوپر سے اُس نے کہانی کو دیکھا جیسے کسی امر میں آخری ہدایت لیتا ہو اور پھر جُوں کوئی سدھ دھیان میں اُترتا ہے وہ پھول شیشے کے پانی کی چمک میں اُتر گیا۔ اُس کے منطقی آہستہ رو اُتار میں ایک رچاؤ تھا اور بلا کی رسان۔ میں نے اُسے کتھا نگر کے پہلو سے مَس ہوتے پانی کے پاتال میں اُترتے دیکھا۔ پانی میں اندھیارا اتنا گھور تھا کہ مجھے بھے ہُوا کہ میں نے اُسے کھو دیا — مدد کے لیے میں نے کہانی کی طرف دیکھا — وہ کہنے لگی: 'دھیان پھول کے خیال پر رکھو۔ دھیان کی آنچ سے اندھیارے آپ ہی روشن ہو جائیں گے' — میں نے پھر آئینہ جل رُوپ میں نظریں گاڑ دیں۔ اُسے کا ایک چھن ہی گیا ہوگا کہ جیسے کسی نے گھور اندھیارے میں اُجیارے کی پڑیا اُلٹ دی۔ ساتھ ہی وہ پھول بھی دکھائی دیا، تھاہ کو ہاتھ لگا کے اب شہر کی دوسری طرف سے اوپر کو آتا ہوا۔ روشنی کے ایک بڑے جلوس کے آگے آگے۔ شہر میں دَم بدم جگار ہو رہی تھی۔ یہ کون بتاتا کہ جاگ کون رہے تھے — ہیولے، ابیتیں، اَن گھڑے پرو ٹو پلازم کے چلتے پھرتے مجسمے، شاید یہ بھی نہیں، کچھ بھی نہیں! — شاید میں بھی ان ایسا ہی ہوں، میں نے سوچا۔ ان میں سے ہوں، اِس شہر آب کی تہہ میں ہوں۔ ابھی جاگ رہا ہوں یا شاید جگا چاہتا ہوں اور آدھا جاگے آدھا سوئے سفنہ دیکھتا ہوں' یا اپنے آپ سے باہر بیٹھا اپنے آپ کو دیکھتا ہوں — تب میرے لیے اپنے اُس خیال کی پرکھ بہت کٹھن تھی سو اُسے جھٹک کر میں پھر سے سیپ اور گھونگھوں کے امکاں مکان کے آبی شہر کی جاگرت میں کھو گیا۔ جاگتے ہوئے وہ بھلے (سہولت کے لیے کہنا چاہیے) لوگ ہاتھ منہ

بھلا کیا دھوتے کہ وہ تو بیچ پانی کے نواس رکھتے تھے اور اپنے سرچشمۂ حیات سے کٹے کب تھے کہ پوجا پاٹھ کرتے۔ بس وہ جاگ رہے تھے اور نیچے وہاں اس جل گام کے مکانوں میں جاگرن کی مدھم کانوں کو بھلی لگنے والی بھنبھناہٹ بھر رہی تھی۔ ارے واہ! اس پھول نے تو ادھک کمال دکھایا۔ دیکھتے دیکھتے جاگن پوری ہو گئی۔ بہت کچھ صاف دکھنے لگا۔ ایک طرف اشارہ کرتے ہوئے کہانی کہنے لگی:

"دیکھو! اس جنگلی داڑھی کو دیکھو! جس ٹہنی پہ بیٹھا ہے اسی کے درپے ہے پہچان سکتے ہو!؟"

کیسے پہچانتا کہ ابھی قصے ادھورے تھے۔ بہت کچھ طے ہونا باقی تھا۔ ایک مثلاً یہی کہ کردار کون ہو گا اور کون کردار نگار۔ کہانی سے کچھ کہنے کے لیے تلاش ہی میں ڈوب کر میں نے جوالا مکھ کے دامن میں لگے اس بیکراں کیمپ پر نظر دوڑائی تو میں نے دیکھا کہ جھٹپٹے کے سیپیا نور میں وہ آدھی کہانیاں ادھورے کردار اور ممکن مصنف جوالا کی آگ پر پڑنا اگن کو ایک امید کے ساتھ تک رہے تھے، کہ ان کے باطن کی شکتی بڑھے اور جو انہیں ہونا ہو جلد ہو لیں۔ کچھ وہاں ایسے تھے جو اپنے شعوری انتخاب سے کچھ بننا چاہتے تھے میری آنکھوں کے بالکل نیچے مثلاً ایک جوان مرد ایک نابینا بوڑھے سے الجھ رہا تھا۔ بوڑھا کہہ رہا تھا کہ وہ اس جوان کو اپنا کردار بنائے گا اور جوان بضد تھا کہ اپنا مصنف وہ خود ہو گا — 'آخر کار' — کہانی بولی 'شاید نوجوان کا پلہ ہی بھاری رہے گا کہ وہ وقت کے ایک خاص عرصے میں زندہ حقیقت محسوس ہو گا جبکہ بوڑھا ایک متھ — ایکی لیز اور ہومر' — اسی طرح یہ آدمی جسے ابھی تم پہچان نہیں سکتے شیخ چلی کہلائے گا، ایک ELUSIVE کردار جسے ہزاروں لکھیں گے اور جو ان ہزاروں کو کھا جائے گا — ایک مصنف خور کردار ..... میرے پیٹ پر نصب خیمے میں ہو رہے زمانوں کے اس کھیل کو دیکھو۔ دیکھو کتنے لیکھک اپنے منہ زور کرداروں کے پیچھے بھاگتے ہانپ گئے ہیں اور دیکھو کتنے کردار ہیں جو مصنفین کی تلاش میں سرگرداں ہیں' — کہانی اپنی روانی میں بہے جا رہی تھی کہ میری نگاہ ایک میاں آدمی کی اور کھنچ گئی۔ جوان پُر وقار بزرگ، ساتھ میں ایک حسین بی بی جس میں ایک رتی زندگی کی زیادہ معلوم ہوتی تھی۔ وہ اس لاطرف خیمۂ ممکنات میں یہاں وہاں کردار قصہ اور قصہ گوؤں کے فضیحتے نمٹاتے پھرتے ادھر بھی آ نکلے جہاں وہ آگ موتتا نوجوان بوڑھے نابینا سے الجھ رہا تھا۔ وہی کردار اور مصنف کی باہمی آویزش۔ ان آدمی میاں اور ان کی بی بی نے ابھی موافقت کے ایک دو بول ہی کہے تھے کہ وہ نوجوان بھڑک اٹھا؛ 'تم دونوں بوڑھے تم! ..... آخر کیا حق پہنچتا ہے تمہیں مجھ سے اس سرپرستانہ لہجے میں بات کرنے کا!' — 'لو دیکھو! زمانہ ابھی بنا نہیں اور وہ اگلے پچھلے کی بات کر رہا ہے۔ بوڑھے بارڈ کو موقع مل گیا سنگنے کا' — وہ ایک طرف بڑھ گیا جہاں اس کے ٹھیلے کے سے دو اور بیٹھے تھے۔ کہانی بولی: ان میں سے کوئی ایک خورخے لوئیس بورخیس اور دوسرا ملٹن ہو گا — 'یونین آف دی بلائنڈ' — اور وہ میاں آدمی، باوا آدم، اور ساتھ میں ان کی بی بی تھیں — حوا۔ یہ پہلی بار نہیں کہ ان بے چاروں کی تھڑ منتری ہوتی ہے کوئی نہ کوئی انہیں ان کی آثار کے پکڑتا ہی رہتا ہے پر یہ بوڑھے لوگ ایسے سادہ اتنے نوبل ہیں کہ سب سہہ جاتے ہیں۔ کبھی فضول الجھیڑوں میں نہیں پڑتے۔ سب کو شانتی بنائے رکھنے کو کہتے ہیں۔ یہاں یہ سب سمجھتے ہیں کہ ان ہی دو کے آگے سے آئے ہیں یا آئیں گے یا کم از کم کہانی یہی بنے گی۔ مذاق بھی ان سے سبھی کر لیتے ہیں۔ کچھ تو ان کے اپنے ANTECEDENTS کے بارے میں سوال کر کر انہیں پریشان کرتے رہتے ہیں کہ ان کا لیکھک کون ہے وغیرہ۔ کبھی کبھی یہ سوال زیادہ ہی بے بھاؤ پڑتا ہے تو غریب بہت دکھی ہو جاتے ہیں اور گہرے شک کا شکار۔ کس نے انہیں لکھا۔ وہ پہلا جوڑا ہیں، کیا واقعی! یہ بھی تو ممکن ہے بیک وقت کئی ایک فرسٹ پیئرز کا ظہور ہو ..... ان کی کرداریت دھیرے دھیرے ان پر طاری ہوتی جاتی ہے اور وہ دکھ دنی مشکوک میں گہرے گہرے گرے جاتے ہیں۔

سے ایک ہے، اکال اور ایم ہے
اور جُوں پھول میں گندھ ہے
آنکھ میں بینائی، سورج میں جیوتی
اور جوں ٹہنی پر پتّے نکلتے ہیں توں سے کی ٹہنی پر نام اور رُوپ نکلتے ہیں۔ اور اشیا۔ جن کا کوئی نام رُوپ نہیں ہوتا سے کے بھیتر ہوتی ہیں سے ہوتی ہیں۔

ایک نام جو سمے کی ٹہنی پر پھوٹے گا۔ 'ابتدا' ___ ہے اسی لیے کہا جائے گا کہ ابتدا میں نقطہ تھا۔ اوّل تھا آخر ہوگا اوّل ہو کر آخر ہوتا رہے گا۔

اور نقطے سے بھی پہلے اکشر تھے۔ حروف۔ محض آوازیں، کچی ان گھڑ آوازیں جن کے بیچ کہانی رُوح بن کر پھرتی تھی۔ اسی لیے صوفیا کہیں گے: "یہ کائنات آوازوں کے زیرِ اثر ہے"۔ وہاں اُس گھاس پھونس کی کٹیا میں، زانو پر پارچہ رکھے کلک سے کچھ لکھتے ہوئے اُس بزرگ مرد کو دیکھتے ہو؟ دیکھو کیسے اُس کا وجود نیم تاریک کٹیا کو روشن کر رہا ہے۔ وہ پیر رومی ہے۔ وہ کہے گا: ہم نے تمام لحن بیچے اور سُر گردشِ آسمان سے سیکھے ہیں اور ہم انہیں طنبورے اور حلق سے ادا کرتے ہیں' ___ خوب! لیکن پُوری بات یہ ہے کہ پانی پتھر اور ان کے بیچ کی ساری چیزیں، سگری کائنات آوازیں ہیں ___ آواز سے بنی آواز۔ وقت ابھی چلنے نہیں لگا سو کائنات ایک سوئی ہوئی خاموش آواز ہے۔ کہانی ابھی شروع نہیں ہوئی۔ ایسم اکال جب یُگ ہوگا تو یہ شروع ہوگی۔ تب کائنات کی آواز سنائی دینے لگے گی۔ بات آگے بڑھتی رہے گی اور کائنات کی آواز وسیع ہوتی جائے گی اور جب یہ بات یہ کہانی کہی جا چکے گی تو آواز اپنے گھر کو لوٹ جائے گی اپنے اساسی قدیم کی طرف جہاں اُس کا عکس لاآواز ہے۔ جہاں خاموشی ایک بڑے عجیب ساز سے جھالوں کی صورت نکلا کرتی ہے جہاں اپنے خمیر میں سوئے پڑے حروف پر کہانی منڈھلایا کرتی ہے..... کہانی کے کسی حرف کو چھو لینے سے چیزیں بن جایا کریں گی۔ ایک چیز جو کریون بنے گی اُس کا نام ہوگا ___ آدمی۔ اور اس چیز آدمی کو آدمیت کا جتنا عرصہ ملے گا وہ اپنے اساسی قدیم میں مدغم ہونے کی جستجو میں رہے گا۔ وہ خیال گائے گا اور ایک بے قرار آواز کی صورت اپنے سینے سے نکل کر آسمانوں کی اور اٹھنے لگے گا ___ اپنے قدیم سے جا ملنے کے لیے ___

وہ چپ ہو گئی۔ کیا کہنا چاہیے، اُس کی آواز گُم ہو گئی کہ کھو گئی۔ الفاظ کا صحیح استعمال بھی تو نہیں آتا ابھی مجھے..... وہ ساکت ہو گئی ہے کہ سکوت بن گئی ہے۔ کیا وہ میرا دِہم ہے محض۔ دِہم کیا ہوتا ہے۔ میں محسوس کر سکتا ہوں اُسے اپنے اوپر منڈھلاتے ہوئے۔ واقعی!؟ کیا میں حرف ہوں، کسی ازلی آواز کا کوئی بھورا! لاوقت میں میرا یہ لاشے وقوع، یہ بے واقعہ صورتِ حال، کیا یہ میرا قدیم ہے! میرا اور اُس کا اساسی قدیم!؟ ___ ایک اونگھ مجھ پر آ گئی۔ میں نہیں جانتا اس اُونگھ میں کتنا ANTEANTITIME گزرا۔ اُونگھ چھٹی تو جیسے کچھ نہیں گزرا تھا بس کہیں ایک وقفہ ہوا تھا جیسے وقت اور جگہ آنکھ جھپک گئے ہوں۔ شاید یہ بھی نہیں۔ ٹھیک سے کیا معلوم۔ سر اٹھا کے میں نے اُسے دیکھا۔ اس کی آنکھیں مُندھی تھیں اور سنہرے بالوں نے آدھا چہرہ ڈھانپ رکھا تھا۔ ایک لٹ ہولے ہولے ہوا میں ہل رہی تھی۔ جی کیا اُسے دیکھتا رہوں اور اُسے دیکھنے کے سوا کچھ نہ کروں...... دیکھتے دیکھتے اس کے انگے پوروں میں ایک دلفریب اُدمات آ گیا۔ اُس نے آنکھیں کھولیں اور اُنہیں جھپک کر اور جھپک میں ڈپٹ کر چپ میں بولتی ہوئی کہنے لگی: "ارے او اُدگھائی! کیا اب ناش کر کے ہی دم لے گا! جانتے ہو جب تم مجھے یوں راگ لاگ سے دیکھتے ہو تو میرے سیّال سر میں طنبورے بجنے لگتے ہیں اور ایک انام سنتاپ سے میرا روم روم دُکھنے لگتا ہے اور مجھے بھے ہوتا ہے کہ تیرے کارن ہی میری اس راجدھانی کا جو سمے میں ہے سمے نہیں ہے سمے ہو جائے گا، کچھ نہ بچے گا ___ دھیان مجھ سے ہٹاؤ اور جس کاج لگے تھے لگو"___

میں گویا ایک بالک تھا، بگڑا، جسے توڑ پھوڑ سے ہٹائے رکھنے کو وہ کھیل تماشے سے لگنے کو کہہ رہی تھی وہ جانے بُجھے انجان بن رہی تھی یا جان ہی نہیں رہی تھی کہ میں تو وِمل اور خالص کہانی کا بان کھائے ہوئے تھا سو فقط اُس کے شہر کی سیر میں کیونکر لگا رہتا جس میں اس کے ٹکڑے تو تھے سمپورن سیر نہیں تھا۔ ویسے اُس کا کوئی مطلب ضرور تھا مجھے اس سیر میں لگائے رکھنے سے، پھر بھی جی میں آئی کر اُسے کہوں: کامنی! کیوں مجھے کتھا نگر کی سیر میں لگاتے ہو، تم کتھا ہو اور میں بھی تمہارا کوئی انگ ضرور ہوں ——— 'مجھ سے کتھا یوگ کرو' ——— لیکن اُس نے کوئی سُنی تھی میری بات سوچی مسوس کر رہ گیا بس۔

تو اب میں صرف اتنا کہوں گا کر موجود سے مفقود ہونے کے بیچ جتنی بھی چیزیں اور جاندار ہو سکتے ہیں اُن لاو قطرف خیمہ میں تقدیر پر اثر انداز ہونے کی کوشش میں تھے۔ واقعی ابھی اُنہیں نام روپ دینا ٹھیک نہیں کہ نام اور رُوپ تقدیر ہیں اور الف لیلیٰ و لیلیٰ کے مصنفین کی تقدیر گمنامی تھی سو میں نے دیکھا کہ وہ دُھند اور کُہر اوڑھے ایک طرف بیٹھے ہیں۔ خاموش جبکہ اُن کی کہانیاں پینے کو اُن سے لہو مانگ رہی تھیں، اور وہاں دانتے تھا اور بیترائس ...... دانتے جسے فلورنس دیس نکالا دے گا لیکن اس کے مرنے پر پچھتائے گا اور باقی زمانے اُس کی ہڈیوں کی بازیابی کے لیے درخواست گزاری کرتا رہے گا، اور قصہ گو ایسپ جو بے دلی سے اپنے آقا کا کچھ کام کر رہا تھا۔ بے دلی سے اس لئے کہ کسی کہانی کے تانے بانے میں اُلجھا تھا۔ اس کا آقا جلد ہی اُسے آزاد کر دے گا۔ ڈیلفی میں کچھ باثر لوگ اُس کی کہانیوں سے خفا اور خوفزدہ ہو جائیں گے۔ اُسے ایک پہاڑ کی چوٹی پر لے جا کر ختم کر دیں گے اور پھر اس کا مجسمہ یونان کے سات بڑوں کے ساتھ نصب کر دیں گے۔ اُسے کہانی بنا دیں گے۔

اچھا اُدھر اُس قاق کو دیکھتے ہو؟ تُف! کیا شان سے چل رہا ہے۔ جانتے ہو کیوں؟ زمانہ جب عرصہ کے میدانوں میں بہہ نکلے گا تو مصر نام کے ایک خوبصورت صفر پر سلطنتِ وسطیٰ کے پل میں پہلے پہل اس قاق کے ٹکڑوں پر ایک افسانہ لکھا جائے گا جسے یہ قاق اور اس کے ٹکڑے پہلا افسانہ خیال کر کے اینڈتے پھریں گے۔ دو بھائیوں کا قصہ کہ کیسے ایک بڑے بھائی کی بیوی چھوٹے پر دوش دھر کے گھر سے نکلوا دیتی ہے ...... دُھندلی دھوپ سے یہ افسانہ اب بھی اس پر لکھا ہے لیکن جلی اسے زمانہ کرے گا۔ اس کا مصنف بھی یہیں آس پاس ہوگا، ابھی دکھ نہیں رہا، شاید یہ وہ چھوٹا بھائی ہی ہو ——— کہانیاں یونہی بنا کریں گی لوگ ایک دوسرے سے ملتے دُکھ سُکھ کی باتیں یا دُکھ سے بچنے اور سُکھ پانے کی باتیں ایک دوسرے سے کہیں گے۔ کہت کہت بات کچھ کی کچھ ہو جائے گی، کوئی کسی سے کہے گا: 'ارے تتنے میرے کتنے یہ بات کہی ہے؟' ——— 'نہ! کا نوں' ——— لیکن اس کی کہانی نہیں مکرے گی۔ ہوتے ہوتے اس کے کوئی معنی ہی نہیں رہ جائیں گے کہ بات، کہانی کس نے کہاں کب کس سے کس کتنے کہی، پھر جب سب گزر لیں گے تو پیچھے بس کہانی قصہ بات رہ جائے گی۔ اَمِٹ اوناشی سچی اور شفاف جسے سب کہیں گے سب کتنے ———

ایک وقت تو ایسا آئے گا جب 'بات' کو اس کے بتانے والے سے بچانا ضروری ہو جائے گا یوں تنقید وجود میں آئے گی:

The art to save the tale from the teller.

یہ لارنس کہے گا اور یہ بھی کہ:

Trust the tale ever but never the teller for the teller is a damned liar

یاد رکھنا تمام کہانیاں سچ ہوتی ہیں اور صرف کہانیاں سچ ہوتی ہیں۔ کہانی سچ ہے اور یہ کہانی۔ جانتے ہو پتھر کیا ہے؟

پھول جس کا بیج ساقط ہو جائے۔ زمین و زماں جان و جہاں، جہان و جہانیاں، سب کہانیاں۔

اور انہیں دیکھتے ہو، ان دو کو؟۔ گرتے پڑتے اُٹھتے سفر کی دھول میں اَٹے، پاؤں میں خار تو سَر میں راہ کا غبار، لباس تار تار، سوکھے ہونٹ، کھانے کو کبھی روٹی مل گئی تو کبھی بوٹ۔ پالی کہانی یا کہانی کے معنی۔ کندھوں سے جھولے لٹکائے ہیں جن میں وہ کہانیاں جمع کرتے ہیں۔ کبھی سرِ راہ بیٹھ جاتے ہیں، تھک کر نہیں ایک دوسرے کے کانٹے بیننے کے لئے اور خوشی اُن کے پاس اتنی ہے کہ اُن کانٹوں سے بھی پھول پڑتی ہے جو وہ ایک دوسرے کے تلووں سے نکالتے ہیں —— کہانیاں سُننے کہنے اور جمع کرنے کی خوشی —— یہ GRIMM بھائی ہیں۔ وہ جنمیں گے تو اُن کی ماں ایک ایک کہانی اُن کے دل پر رکھ دے گی اور کان میں کہے گی: سُنو پُتّر! زمین و زماں قصّہ، جان و جہاں کہانی اور جہان و جہانیاں کہانیاں —— ہوں، ہاں ہنگارا —— اتنا قصہ ہے سارا' —— ان کے دل دھڑکتے رہیں گے اور دلوں پر رکھی کہانیاں کُھلتی رہیں گی —— وہ چلتے رہیں گے۔ زمین آسمان کی ہمسر عورتوں کے ہونٹوں کے پیچھے اپنے جھولے پھیلا کر وہ کہانیاں جمع کرتے جائیں گے۔ پہلے پہل ان کا کہنے والا کون رہا ہو گا، کون جانتے، جانے کر نہ جانے اور جو نہ جانے تو او جانے! ودّیا پیتھ پر چلتے بڑے وِدوان دُور کی لادیں گے کہ جی یوں ہوا وُوں ہوا کہ جی یہ کہانیاں تو سپن سُننے ہوتی ہیں، سُننے جو مر پڑے مرنے پڑے لوگ دیکھتے ہیں۔ سو ہی تو زیادہ ان میں کھانے پینے کی چیزوں، پیسے دھیلوں اور سب سے بڑھ کر طاقت —— جو غریبوں کے پاس نہیں ہوتیں، کا ذکر ہوتا ہے' اور پھر جب آدمی کسانی کرنے لگے گا تو کہانیاں بھی کسانی ہو جائیں گی۔ باتیں بتائی جا دیں گی کہ کھیت دھرتی کا جھومر ہیں اور عورت دیوی ہے جو تخم پالیتی ہے۔ گائے بھی دیوی ہے اور بیل دیوتا اور دیو وہ ہوتا ہے جو بہت کھاتا ہے۔ اتنا کہ غریبوں کے کھانے کو کچھ نہیں بچتا۔ سو جب جب دیو کی جان نکلے گی کہانی سُننے والے ایک ایسی راحت' تحفظ اور عافیت محسوس کریں گے جو انہیں اگلے روز کی مشقت کے لیے تیار کرے گی —— اور کبھی تو سچ مچ کہانی روٹی بن کر پیٹ میں اُتر جائے گی.... نیند کو ترسے ہوؤں کو وہ تھپک کر سُلا دے گی اور صدیوں سے سوتے ہوؤں کو آنکھیں مار جگانے آئے گی.... ایک جاگا ہوا آدمی دیکھو گے؟ —— وہ دیکھو، وہاں وہ اسپارتاکس ہے، لانبا چوڑا کالا بھجنگ.... گو وہ فاسٹ کے قلم پر سے اُترے گا وہ بے واسطہ سیرا رہے گا، تواریخ سے زیادہ فوک لور کا.... اور جس سے کھڑا وہ باتیں کر رہا ہے اس کا نام ٹام ہو گا، انکل ٹام.... وہ سخت مشکل میں ہے۔ پتا نہیں اُس کا کیا ہونے والا ہے۔ اکثر وہ ہیریٹ سے اُلجھتا رہتا ہے لیکن ابھی ہیریٹ بیچاری بھی کیا کرے اُسے خود کچھ پتہ نہیں، تاہم جب طوفان تھم لے گا تو لنگن پورا منہ کھول کے ہنستا ہوا اُسے کہے گا: اچھا یہ سارا کیا دھرا تمہارا ہے مُنّی بی بی!

جگار کے پہر اپنے دُکھ ہیں۔ جیوتی جاگرت، جاگرتی، سمجھ بوجھ، سچ ست، بُدھ، ودیا، غور، گیان، آگہی —— ہر ایک دکھ ہر ایک سُوئی۔ اپنا دُکھ اپنی سوئی اور اپنی سکت کہ کون کتنا سہن کر سکتا ہے۔ کانٹا دل میں کتنا کُھبے کہ یہ دھڑکتا بھی رہے۔ نہیں لیکن کیا، تم تو جاگرت پر اُدھار کھائے بیٹھے ہو کہ بس کسی طور اچھل کے چل پڑے....'

'ارے رے میں کیوں کھانے لگا اُدھار بھلا'، وہ چُپ ہو گئی تھی۔ اس کے گندم گُوں شہابی رنگ میں شام گُھل رہی تھی۔ دو ایک پھول پتیاں بھی اس کے رخساروں پر آ کے لگ گئی تھیں۔ نظر بظاہر آئینہ جل روپ پر، اُگل ہائے ابر کے گھنے ڈھیر پر نیم دراز اب وہ اپنے سامنے دیکھ رہی لالہ کے کوارٹر کے اس طرف کے —— کچھ بھی نہیں —— سے بھی پرے دیکھ رہی تھی ——

یہ اُس کی پرانی عادت تھی۔ انہونی کا ہونا خیال کر کے اُس کے ہونے کے خیال سے آپ ہی اُداس ہو جانا۔ پرنتو یہ اُس کی صاف زیادتی تھی کہ انہونی کے ہونے کا دوش میرے سر دھر رہی تھی۔ جانے یہ بات اُس کی بُدھی میں کیسے بیٹھ گئی تھی کہ سمے کا چلاؤ میرے کسی کرم کارن ہوگا: دوش دھرنا ہے تو اپنے اُوپر دھرو'۔ میں اُسے کہنا چاہتا تھا 'کسی چیز کا خیال ہی اُسے ممکن بنانے کے لئے کافی ہوتا ہے۔ یہ تم جو وقت بے وقت، وقت کو سوچتی رہتی ہو دیکھنا اسی سے سچ مچ وقت نہایا دھویا تمہارے سامنے آکھڑا ہوگا' ——— 'لو میں آگیا، چلتا ہوں ——' کہے گا اور چلنے لگے گا، تب روک لینا تم اُسے'——

'کس بل روک سکوں گی'—— میری ان کہی اس نے پھر سُن لی تھی ہمیشہ سُن لیتی تھی اور جبکہ آئینہ جل کی تھاہ کا شہر خواب میں چلا گیا تھا اور کہانیوں کی آتمائیں خواب کے اطراف کو روشن رکھنے کے لئے دہکتے انگار ہتھیلیوں پر لیے قریہ قریہ گھوم رہی تھیں۔ میں نے ذرا آگے کو ہو کے اس کے رخسار سے برگِ گل اپنی انگلی پر لے لیا کہ وہ کوئی اور بات کرے اور اُس کا دھیان بٹے لیکن اُسے تو دھیان میں مسافت بچھا کر مسافر ہونے کا شوق چڑھا تھا۔ دھیان اُس کا کیونکر بٹتا۔

'کیا اختیار میرا اگر دور دور تک سُوئیوں کے کھیت ہوں جن میں کوئی سُولوں کے دانے بکھیر گیا ہو ——— پتھر، پودے، مچھلیاں، درخت، مینڈک، پرندے، انسان، چاند، ستارے ان میدانوں میں سُوئیاں اور سُولیں چکھتے پھرتے ہیں۔ کوئی سُول حلق میں پھنس جائے گی تو اُن کی پتلیاں اُوپر چڑھ جایا کریں گی۔ اوپر جہاں سوئیوں اور سُولوں سے بُنا دام ہے۔ دانہ و دام سولی اور سوزنی' جبکہ یہاں سے نکل جانے کے لیے سُوئی کی نوک جتنی بھی جگہ نہیں ہے اور ہو بھی تو ——— کیا شرط ہے کہ جگہ زمانے سے بندھی نہ ہوگی! کیونکر نکل جانے دے گی۔ ہر سمت سوئیاں ہر سمت سُولیں، کوئی راستہ نہ راہ ——— یا ناکے ہیں یا چوکیاں جن پر ٹھک ٹھک کرتا چوکیدار لٹھ لیے کھڑا ہے'——— یہاں وہ چُپ میں چلی گئی۔ رہی چپ میں ہی جیسے جی ہی جی میں کچھ ٹھانتی ہو۔ 'پر میں بھی میں ہوں ——— کہانی کوئی ڈھیل نہیں اُس کی۔ آسانی سے تو چڑھنے کی نہیں چاک پر۔ کمہار نے جو کرنا ہے کرلے۔ وہ ایسا ہی بلوان ہو تو وقائع نگاروں سے یہ کیوں لکھوائے اپنے تئیں کہ نہ نہ مجھے بُرا نہ کہو۔ میں یہ ہوں میں وہ ہوں۔ اپنی میری بھی ایک تجلّی ہے، ذاتی دائمی ..... میں سرب درشی بھی ہوں اور سرد گشت بھی۔ میں چلتی ہوں اور اچل ہوں۔ میں ہی وہ ہوں جس نے قدیم ترین آواز سے بھی پہلے صریر الاقلام سُنی۔ میں مکرر کہتی ہوں کہ میں ——— کہانی ——— وقت میں نہیں ہوں سو وقت کا تریاق ہوں۔ میں وہ گھاؤ بھی بھر دوں گی جو وقت نہیں بھر سکے گا۔ تھکے ہارے دوسروں کے کندھے چڑھے مجھے سُن کر ارتھی سے کود دوڑتے آ، میرے زانو سے لگ کر ہنکارا بھرنے لگا کریں گے ——— ہوں، ہاں، ہوں۔ ہتیارے کے ہاتھ سے کہانی سُن کر ہتیار گر جایا کرے گا، ——— ہوں، آگے کیا ہوا پھر؟ ——— وہ پوچھے گا، اور شہر زاد کہے گی: 'باقی کل، کل کی رات'۔

—— 'کل؟' ——

—— 'کل ——"

یوں تو وہ پرے سارے ہی رس بھری تھی پھر بھی یہ مجھے معلوم نہ تھا کہ کرودھ اس میں آتنا ہے اور یہ بھی صاف نہیں تھا کہ یہ کرودھ ہی ہے کہ ہونی کا بھئے ہے یا ہونی کے ہو سکنے کا رنج ہے ——— خیر جو بھی تھا یہ گزر چکا تھا۔ اب وہ شانت تھی۔ ذرا سے اُس نے گہرا سانس لیا اور آگے نکل گئی: 'میں دکھنے کی پھوہار بن کر گروں گی اور جہاں جہاں کہیں جاؤں گی نیند آنکھوں کی سوئیاں چُننے آئے گی اور اطراف سریلے ہو جائیں گے اور راستے سجھائی دینے لگیں گے .....' وہ کہے گئی۔ 'پرنتو میں 'یہاں اور اب' ——— کو کبھی فراموش نہ کر پاؤں گی اور دیکھا جائے تو میرا سارا کہنا کہانا سُننا سُنانا اس 'اب اور یہاں' کی بازگوئی کے سوا کیا ہوگا اور شاید

اسی کارن میں اکثر یوں شروع ہوا کروں گی کہ،

ایک دفعہ کا ذکر ہے ....

وُنس اپان اے ٹائم

کہ بس ایک بار! جسٹ وُنس! وہی وہ زمانے جو کسی زمانے میں نہیں تھے'—

کرنیں اُس کے سر پر میں رہٹ گیر رہی تھیں اور اُداسی اُس کی آنکھوں سے بہہ رہی تھی۔ دراصل وہ جو —— ANTE میں حُسن کا ارفع ترین نمونہ تھی۔ POSTANTE کے خیال سے مغموم ہو رہی تھی جبکہ اُس کے پہلو سے نکلتے پھول سر اُٹھا کر اُسے پورے طور پر دیکھنے کی کوشش کر رہے تھے اور بادل کا ایک شریر ٹکڑا اُس کے سینے کی گولائیوں پر لرز رہا تھا۔ یونہی ایک بار اُس کی پلکیں اُٹھ گئیں تو کسی آسمان کا ایک ٹکڑا جو ایک جگہ ٹکے ٹکے اوبھ گیا تھا دو گھڑی بیٹھ لگا لینے کو اُس کی آنکھوں میں اُتر آیا۔ صرف میں جانتا تھا کہ اس کے بھیدوں بھرے حُسن کے جادو سے بے جان چیزیں بھی سانس لینے لگتی ہیں۔ وہ دیکھنے والے کو ایسے ہیجان کی ابتلا میں لے جاتی تھی جو شانت دودھ پر چھوٹے چھوٹے ڈلوں کی صورت تیرتا ہے۔ سو میں اُس سے اُس کے لئے ڈرتا تھا —— کہ کہیں اُس کے چوطرف لیٹا بے جان وقت اُسے دیکھ لے اور —— سانس لینے لگے —— اور —— اُسے پانے کی آرزو میں کمر کس لے، اچل پڑے جدھر منہ اُٹھے —— جی میں آئی کہ اُسے اُس آفت سے آگاہ کروں جو وہ اپنے لیے آپ اپنے اوپر لا سکتی ہے۔ اگر وہ حسین تھی تو اس میں اُس کا کیا قصور تھا بھلا۔

'کنتھا!

'پیاری!۔ سُنتی ہو!؟'۔

پر میری کب سُنی تھی اُس نے جو اَب سُنتی۔ وہ سو رہی تھی۔ یا سوتی بن گئی تھی —— یہاں میں اپنے مائل بہ گریہ دل کا کیا کروں۔ میرے اُطاق میں جگار سوئیوں پر بیٹھی ہے، کانتی! میں تو آنکھ بھر نہیں دیکھتا بھی نہیں کہ تمہارے سروپ میلین نہ ہوں۔ میری جاگرن کے لیے تمہارے مدھو مُکھ پر مُسکان کی لکیر ہے اور میری اشانتی کو تخول کرتے تمہارے پانو ایسے شانت آرام کی لشان میں ہیں جس کا سنیوگ میرے بھاگ سے نہیں رہا۔ سُکھ کا کوزہ بھر کے تم نے میرے اگرے رکھ دیا۔ میں نے ہونٹوں سے لگایا تو میرے سر پر میں نیل کھنڈ گیا۔ کنتھا روپ وتی کیوں؟ کیا کنتھا یوگ کی داسنا اپرادھ ہے؟۔ میرے درلاپ سے اَنت اَنشت ناچین ہیں —— بس ایک تم ہو جو امی جی لیٹی ہو۔

'سنتشٹ'——

یہ میرے اُس کے لگاؤ کی باتیں ہیں۔ لاگ میں مجھ پر کیا سلسلے گزرے ہوں گے سوچا جا سکتا ہے۔ سمے کی مہما کہیں وچار میں آسکتی ہے۔ سمے جو انشت ہے اس کے بننے بنانے میں کتنا سمے لگا ہو گا!۔ کون ایسا بدھیوان ہے جو یہ سوچنے کی سعی کرے اور ہوش سنبھالے رہے —— اور کنتھا واقعی ہوش میں نہ تھی۔ یہ سوچ کر کہ سمے کی بُنائی کو آخر پورن ہونا ہے اُس کے پران بے تال ہوئے جاتے تھے۔ تب کیا یہ سب یونہی رہے گا۔ پھن پھن جاتے ایسے کشن مجھے بہت اچھے لگتے اور میرا بھی جی چاہنے لگتا کہ سمے کی بُنائی کبھی پوری نہ ہو اور یہ سمے کی بھیہ میں یونہی ڈوبی رہے۔ بھلے مجھے سُکھ نہ دے، بھلے میں اسے سُکھ نہ دے سکوں پر میں اس دُکھدائی کو تسلی دے سکنے کے یوگیہ ہونے

کے جَل میں ڈوبا تو وہ سکوں اور تسلّی بھی بھلا ہیں اُس کو کیا دیتا تھا — یہی کرسمے کا بن کر رڑنے کے لیے تیار ہو جانا اتنا آسان تھوڑی ہے۔ یہ سارا کھڑاگ چلانے کے لیے جتنے سمے کی ضرورت ہو سکتی ہے اُس کے تیار ہونے میں بھی اتنا ہی سمے لگے گا نا! بلکہ کہیں زیادہ — اور دیکھو اُداس نہ ہوا کرو۔ شوک ہی تو وہ کھاجا ہے جسے کھا کر اِدناشی سمے چھن چھن میں بٹنے لگتا ہے اور یاد رکھو وقت لاوقت ہی رہے گا ہمیشہ، — ٹکڑے ٹکڑے ہو کر بھی، فرومایہ، گھور اندھیارے کا ایک شرر — کیوں سوچتی ہو تم اس بابت — آؤ مجھے ضیا بار کرو۔ میرے حواس تمہاری کرنوں کے انگس جگا گئے ہیں اور تمہیں پانے کی شدید خواہش سے میرے اعضا مفلوج ہیں۔

لاوقت پہ کیا وقت پڑے گا
جب وقت بنے گا
پانی، جو اُس کے آنسو ہوں گے
کہاں بہے گا
اور اس کے بہتے انسوں پر
کیوں بھلا کوئی نیر بہے گا
ایک غلیل کہ جس میں، کسے معلوم، غلّہ یا گگن
لگے گا

اور
چُٹکی بھر گردِ نجوم جو ابھی ستاروں کی ساخت میں صَرف نہیں ہوئی اور بس یہی —
ایک معمولی غلیل اور چُٹکی بھر گردِ نجوم — بس اتنا ہی سامان ہماری رُسوائی کے لیے درکار ہے اور
دیکھو! وہ کھنچی غلیل —

شانیے جہاں جہاں جا پڑیں گے آدمی اُگ آئیں گے۔
اُگے ہوئے آدمی کے چو طرف زمانہ پنپتا رہا۔ ایک زمانہ بادل بن گیا۔
اگن کے سائبان تلے ایک چھاؤں کچھ نرمی کی آئی تو آدمی نے اُوپر دیکھا اور بادل مینہ بن کر برسنے لگا۔ تب آدمی نے یاد کے تال کنارے کھڑے تاڑ کا ایک پتّہ توڑ کر منہ میں رکھا اور لوحِ ابر پر آب دھار قلم سے ایک فیبل لکھنے لگا۔ اتنے میں رعد آئی اور ابر سے بنی اُس کی لوح ریزہ ریزہ ہو گئی۔ آب دھار قلم شکست ہو گیا۔
آدمی آنکھیں میچ کر خیال کی کھوہ میں جا چھپا اور ایک دوسری فیبل لکھنے لگا۔ تھر تھر کانپتے ڈر کی فیبل:
'نہیں! ابھی مجھے تارتارس (TARTARUS) نہیں جانا۔ خود فراموشی کا پانی نہیں پینا۔ میرے ہاتھ خالی ہیں اور اُس بخیل مانجھی شارون کے لیے میرے پاس کچھ نہیں' — اتنے میں کھوہ کے دہانے پر پڑے ایک ادھورے خیال کو ہٹا کر خوشبو اندر چلی آئی اور آدمی کے قدم بن گئی۔ وہ چلتا ہوا دہانے تک آیا اور باہر دیکھنے لگا۔ وہاں گھنے جنگل اُگ آئے تھے اور خوشبوئیں ایسی تھیں کہ پتھروں، کیڑے مکوڑوں کے حسّاس آلات اور سانپوں کی کھالوں تک سے رِس رہی تھیں۔ اونچائی سے جھرنے اگر رہے

تھے ..... وہیں ایک جھرنے کے نیچے اُس نے واقعی اُسے نہاتے دیکھا تھا جسے وہ شب و روز اپنی دائمی یاد کے تال میں نہاتے دیکھتا تھا۔ وہ ایک زمردیں پتھر پر بیٹھ گیا اور درختوں سے پتے توڑ توڑ کر اُن ہی کے دودھ کی روشنائی سے ایک اور فیبل لکھنے لگا:

سُندرتا کے پھل اور
محبت کی اندوہ گینی کی فیبل اور
اُس اگنی کی فیبل
جس کے لیے
شیتل جل سوکھی لاکڑی ہوتے ہیں۔

جبکہ چوطرف سکوتِ بے نہایت سائیں سائیں کر رہا تھا — سیب اور سرس کے شگوفے اُس لیکھک کے اُوپر بے آواز گر رہے تھے اور وہ نہیں جانتا تھا کہ وہ گر رہے ہیں یا یہ کہ وہ سیب اور سرس کے شگوفے ہیں۔ کیسے جانتا کہ وقت کی چل پوں تو ابھی شروع نہیں ہوئی تھی اور نہ چیزوں کے کوئی نام تھے۔ تو وہ اُول جلول لیکھک کیا گھاس لکھتا تھا — سوچ سوچ کر اس کا اپنا تو بھُرتا بن ہی چکا تھا اب وہ خیال سوچ کر خیال لکھ رہا تھا — سو وہ تمام پتے جن پر وہ لکھ رہا تھا گو خالی تھے پھر بھی تحریر سے بھرے تھے۔ ارفع ترین تحریر، تمام زمانوں کے لئے نمونہ اور CHRONOS کے ورود کے بعد،

یُگوں کے انتم یُگ تک
ہر لیکھک
خیال کا وِچار کر کے
خیال لکھنا چاہے گا — اسی کی، یہاں لکھ رہے اس اُول جلول کی نقل میں اور جو نہیں لکھ پائے گا تو اُسے چُپ لگ جائے گی اور ننگا خیال جس کا زہر کوئی لفظ سہار نہیں سکا اندر ہی اندر اُسے کھاتا رہے گا، وہ گھُنتا رہے گا ....

خیال اپنے اسرار کی حفاظت کرتا ہے

کم ہی کوئی خیال کسی لفظ پر کھُلتا ہے اور جو کھُل ہی جائے تو لفظ خیال کو اپنی زنبیل میں رکھ کر زمانے سے پردہ کر جاتا ہے۔ اسرار اُسی میں بِس گھولتے رہتے ہیں اور لفظ اپنے خزانے کی غاری میں سویا رہتا ہے ..... زمانے گزر جائیں گے اور وہ سویا رہے گا۔ دربند۔ گھُوک۔ اب ہے کوئی شجاع جو دستک دے کر یا دستک دیئے بنا اُس پر ہاتھ ڈالے، ہوش بھی اُس کے ٹھکانے رہیں اور وہ بھید بھی اُڑا لائے۔

ش مپولین: ایک زبان گیانی۔ اُن بہت سوں میں سے ایک جنہیں نپولین مصر کو اندر باہر سے ایک وقت زیر کرنے کے لئے اپنے عساکر کے ساتھ لیتا آیا ہے۔

وہ سوئے ہوئے لفظوں کے تاریک جنگلوں میں سفر کرے گا جہاں پیڑوں کی جڑوں سے لپٹی بھُربھُری برف قدم قدم اس کے پاؤں پکڑتی ہے اور جب اطراف کو چبا رہے اندھیرے کی آواز سُن کر ہوائیں تک کانپنے لگتی ہیں تو اُس کے بدن کے روئیں ایک دوسرے سے لپٹ جاتے ہیں۔ لیکن وہ رُکتا نہیں بڑھتے جاتا ہے .... عُمروں .... زمانوں، کہ وہیں کہیں جنگل کے اندھیروں میں لفظ و معانی کے گیان کا پیڑ ہے اور اُسے پا لینے کی اُمید کا ذرّۂ نُور ہے کہ اُسے رُکنے نہیں دیتا، تھکنے نہیں دیتا۔

—— پھر اُسے ٹھوکر لگتی ہے اور منہ کے بل وہ ایک پتھر پر آگے جنگل میں جا پڑتا ہے : ROSETTA STONE ایک دوسرے میں گُتھے لفظوں کا شیتل بن اور پھر بن اندر بن اندر بنوں کا لامتناہی سلسلہ ...... یہ گیان کا پیڑ کس بن میں ہے ؟ وہ ذرّہ نور سے دریافت کرتا ہے ۔ یہیں ۔ بس یہیں کہیں اور وہ مسرت نا حیرت میں ڈوب جاتا ہے جب فی الاصل پتھر کے بھید اُس کی تیز چبھتی نظروں کے نیچے بے آرام ہو کر کسمسانے لگتے ہیں ۔ بہت زچ کیا تھا اس آدمی نے اُنہیں ۔ یہ پتھر کا بن آخر چھوڑنا ہی پڑے گا ۔ لیکن وہ بھلے کُھل جائیں ، آشکار ہو جائیں ، پر اسے نہیں چھوڑیں گے ، اس آدمی کو جو اُنہیں ننگا کرنے پر تُلا تھا ۔

—— سو وہ سارے ایک دوسرے میں گُتھے شبد اپنی دُموں کے چابک ہوا کو مارتے پھنکارتے ترکِ سکونت کرتے ہیں اور مُستقر زہریلی ریت کے گرد باد بن کر شامپولین کے رگ و ریشے میں رہنے چلے جاتے ہیں ۔ اور وہ اس بات سے بے خبر کہ خود بھید بن جانے کو ہے جنگل میں بڑھے جاتا ہے ...... CARTOUCE ... اچانک وہ روشنی میں نہا جاتا ہے اور اُس پر پہلے لفظ آشکار ہوتے ہیں : پتولمے ، قلوپطرہ —— اور جونہی وہ کہے گا ' I HAVE IT ' —— غش کھا کر گر پڑے گا ——

ہوا پر یا ہوا کے پتوں پر سوہ ، سوہ کی سرخوشی اور شوک کی کتھا لکھتے جنگلوں کے اسرار اُسے ڈھک لیں گے ۔ ایک انوکھا انوبھاو اُس کے من اور کایا پر سے گزرتا رہے گا جب تک کہ اُسے تیسری آنکھ نہ مل جائے ۔ تب ات سے اُت اور دکھنے اُگنے لگا اور کانتی ڈر اور دُکھ کے پاس آ کر کہے گی : مجھے برت کر تم اپنی ذات کے رستے مُڑوانا تو چاہتے ہو پر تنکا ایک نہیں توڑتے ۔ یارو ، ہل جُل کرو ۔ منہ کھولو ۔ منہ اچنگا بولو ۔ تب ہو گا مجھ سے سنیوگ ۔ یوں وہ کتھا سمپُورن ہونے کی راہ پکڑے گی جو اُس نے پتھروں کی اوٹ سے اُسے جھرنے کے نیچے نہاتے دیکھ کر شروع کی تھی ۔

میں اور کتھا ایسے دوست بن گئے تھے کہ کیا کہوں —— کن شبدوں میں ؟

اور یہ میں نے کیا کہا ، سمپُورن ! —— سُر ، راگ رس تھے تب ! ؟ ۔ کہنا چاہیے کہ ۔ ' نہیں ' ۔ اور ، ' تھے ' ، بھی ۔ ' نہیں ' یوں کہ —— کچھ —— تھا ہی نہیں تب —— پانی نہ ہوائیں آکاش نہ آوازیں نہ آگ ، نہ رنگ راگ اور راگی ، بانس کی پوری ابھی کہاں اُگی تھی کہ اوڈو سمپورن ہوتے ۔ اور ۔ ' تھے ' ۔ یوں ، کہ مطلق ۔ ' نہیں ' —— بھی کہیں ہوتی ہے !

سو یہ ساری چیزیں اور اِن سے سوا دوسری بہت سی چیزیں آسمان کے کئی رنگ ٹکڑوں میں لپٹی پڑی سو رہی تھیں ۔ ہونے کی کم از کم حالتِ خواب کے سپن گھونگھوں میں محوِ استراحت —— کہ گھونگھوں سے باہر غیر مختتم کا سفر درپیش تھا ۔

میں نے ابھی تک چیزیں صرف اسی ایک —— ہونے کی کم از کم حالت ، میں دیکھی تھیں ۔ ہونے سے پہلے جیسے تھک کا کوئی انگ ساکت —— کتھا —— ہو گیا ہو ۔ کانن کتھا نے انہیں مجھے یونہی دکھایا تھا ، اپنی ناف کے جوار میں ، وہ نور کر پھول سطحِ آب پر رکھ کے ۔ جیسے سوانگیے اور کھیل تماشوں والے چھکڑوں پر لدے اپنے تمام جھام کے ساتھ استیپ کے کُھلے میدان عبور کر کے ، کھیل دکھانے سے پہلے ، پڑے بے خبر سوتے ہوں —— سو میں کیسے کہوں کہ ہم کیسے دوست بن گئے تھے میں اور کتھا ۔ کن شبدوں ، کن چیزوں کی سہائتا لوں ۔ لے دے کے ایک آسمان ہے جو ایک سے دو نہیں ہوتا ۔ اپنے سے نکل ذرا فاصلے سے مُڑ کر جب میں ایک نظر اُدھر ڈالتا جہاں کانن کتھا پہلے پہل مجھ پر اُجاگر ہوئی تھی اور جدھر ہمارے لاگ لگاؤ کے بے کنار سلسلے پھیلے تھے تو وہاں سوائے آسمان کے کچھ نہ ہوتا ——

نہ میں نہ پھول نہ کہانی

صرف آسمان

کراں تا بہ کراں

خوف قطرہ قطرہ میرے اندر گرنے لگتا۔ 'میں' کیا ہُوا؟۔

کہاں گیا۔

اور کائن کستھا!؟

میرا کیا ہے۔ کھو جاؤں، بھلے اپنے تئیں نہ ملوں۔ لیکن کستھا!؟ زیادہ سہن نہ کر سکتا تو کستھا کی کھوج میں کسی بھی طرف چل پڑتا۔ بھاگے چلا جاتا ایک طرف۔ بھاگتے بھاگتے ہانپ جاتا۔ اطراف کھو جاتے۔ میں پھر بھی بھاگتا رہتا۔ ایک ایک پگ ساری سیماؤں میں رکھتا۔ مجنون۔ بے دَم، رونے کو ہوتا کہ ٹھوکر کھا کر یا کسی چیز سے اُلجھ کر گر پڑتا، سنبھلتا تو وہ لگاوٹ سے مجھے دیکھ رہی ہوتی اور اُس کے بالوں کا خیمہ میرے چہرے پر تنا ہوتا جو دیکھتے ہی دیکھتے یا تو آسمان ہو جاتا یا سارے آسمان بے تکلفی سے اُس میں گھسے چلے آتے۔ بے رنگ اندھیرا پھر چھانے لگتا، کچھ دکھائی نہ دیتا۔ کستھا نہ میرا اپنا آپ۔ پھر پتہ نہیں آکاش کچھ کہتا کہ کستھا بولنے لگتی: 'تھوڑی بہت مُسرت لے لو کہیں سے' —— یہ، کہیں سے، کی بھی خوب رہی۔ میں آسمان میں کُھلا آسمان ہوں، کیا مجھے ہنسنا چاہیئے اس بات پر .... تب تو کستھا باقاعدہ ڈانٹنے پر اُتر آتی: 'یہ تم باہر کیا کھوجتے پھرتے ہو بولائے ہوئے!'۔ آسمان کی آسمان کو سرزنش۔

بہجت

سُرُود

سرخوشی

انبساط، —— لاگ لگاؤ کے اُن سلسلوں کو جو میرے اور اُس کے بیچ تھے، میں کیا نام دوں! —— اُن کا وقوع کس سرائے یا عکس سرائے میں تھا! وہ جگہ تھی کوئی کہ جو زمان میں نقب لگانے چلی آئی تھی یا زمان تھا جس نے PRE-ONSLA-UGHT غیر رسمی جائزے کے لیے بے زماں جگہوں میں سکاؤٹ بھیجے تھے۔ جو بھی ہو یہ طے تھا کہ کستھا کا روگ اندیشے اب میرے اندر بھی سر سرانے لگے تھے اور عجب کیا!؟ یہ تو ہونا ہی تھا، کہ وہاں وہ تھی میں تھا، میں اُس میں وہ مجھ میں، ماسوا کون تھا! مجھے چاہیئے نہیں پھر بھی اپنے اندیشے برملا کہنا، —— کستھا اس سے اور جی چھوڑ دے گی۔

کہنا چاہیئے کہ مصیبت صرف اندیشہ ہے۔

یہ طول کھینچے ہوئے میرے جمود کی سکوت کوشی ہے کہ ثانیے یہاں آرام کرنے چلے آتے ہیں۔ اَب ثانیوں کی قرارگاہوں پر مقام اُگ آئیں گے اور تازہ دَم ہو کے زمانے جب ان قرارگاہوں سے کوچ کریں گے تو مقام ایک بار پھر وقت بن جائیں گے۔

گزرا ہوا۔

کھنڈر۔

جو کچھ یہاں ہے شاید کسی گزشتہ کے قیام و قرار کی یاد ہی ہے۔

اور —— میں؟

اُس یاد کی بازیافت کی سعی شاید یا سعی کی چھایا ـــ کیا معلوم۔ سوائے اس کے کہ کسی گھڑی مجھے یہاں سے گزر جانا ضرور ہے۔ گھڑی جو سمے کا پہلا پل ہوگی (یہ خود ترسی ہے کہ خوف فی الواقعہ شب خون مار چکا ہے!)۔ جب بس پرچ لے گی تو ایک دن اپالو تقدیر کو مدھرا پلائے گا کہ اس کے ایک جگری دوست کے سر سے موت ٹل جائے ـــ کیا پلاؤں میں بھی تقدیر کو مدھرا! ـــ کہ وقت بن ہی نہ پائے اور وقت ابھی بنا نہ ہونے سے ایسا کرنا کچھ مشکل بھی نہیں۔ لیکن ایسا کرنے سے تقدیر کیا میرے ہاتھوں میں کھیلنے لگے گی؟

وقت اور تقدیر میں کیا سمبندھ ہے!

اصل اور کہنا چاہیے کہ مصیبت صرف ایک ہے ـــ خدشہ، جو فی الاصل ایک وجود ہے یا وجود کا حصہ۔ کیا ہوگا اگر میں نے تقدیر کو مدہوش کر دیا اور وقت پھر بھی بن کے رہا۔ جو کچھ میں سوچتی رہی ہوں بُرا بھلا اُس کے بارے میں؛ کیا وہ بُھلا پائے گا ـــ کبھی!

وہ ضرور مجھے کڑے کشٹ دے گا ـــ کسی ہر سمت سے کُھلے بے در و دیوار بندی خانے میں ڈال کے بھول جائے گا اور مجھ سے لاتعلق، باہر بہتا رہے گا ـــ ایک خاموش قطعیت کے ساتھ۔

زیادہ میں اُس بننے پڑنے کے بن جانے سے ڈرتی ہوں یا اس بات سے کہ پورا بن ہو کر وہ میرے اس مقام سے گزر نہ جائے یوں کہ لکیر بھی پیٹ نہ سکوں کہ وہ لکیر بھی کہاں چھوڑتا ہے اور ہر جائی ایسا کہ جدھر سے گزر جاتا ہے پلٹ کے اُدھر نہیں جھانکتا۔ موجودات اُس کی یاد میں گڑ لایا کرتے ہیں اور اُس پر خاک اثر نہیں ہوتا ـــ میں پیچھے چھوڑ دی جاؤں گی یہیں ـــ

خیمے اُکھڑ چکے ہوں گے ـــ ساربان جا چکے ہوں گے ـــ صرف میں رہ جاؤں گی اُٹھتے دھوئیں کی نیلی لکیروں کے درمیان ـــ کسی فراموش کی ہوئی بات کا خواب یا کسی آئندہ کے لیے بازیافت کی سعی کے معروضی شکوک میں سے ایک تنک۔

اور مجھ سے بہت آگے جا کر سمے نے میری جانب کوئی مخراج العصر اچھال دیا ـــ تو!

میرے آس پڑوس سے تو گھڑیوں کے بچے کھچے ریزے تک ویکیوم میں چلے جائیں گے۔

ویسے نظارہ تو وہ ایسا ہوگا کہ کوئی دیکھے اور سُنے۔ لیکن وہاں سُننے دیکھنے کو ہوگا کون جب لااطراف کے کنارے کنارے وقت جھر جھر بہتا گزرے گا۔۔۔

میرا کیا ہے

میں سمے جل کی مچھیا نہیں ہوں، سہن کر سکتی ہوں۔ چنتا تو مجھے اپنے کُنبے کی ہے۔ چوکا چولہا جس کی حرارت تن کو عزیز ہے اور من کو نور۔ یہ سب چل پوں، یہ اودھم، یہ آفت جو یہاں جُتی ہے کردار کی کردار سے اَن بَن، لکھت کی لیکھک سے آویزش، کردار کی مصنّف سے پرخاش اور اِن سب کا مجھ سے لگاؤ لاگ ـــ کتنا کچھ ہے کہ سمے سوہیر کی ٹھوکر میں دھرا ہے۔

کیا اِن سب ـــ لکھت لکھنے والوں اور ـــ کو سر پر کھڑی اس آفت کا احساس ہے! میرا خیال ہے کہ نہیں۔ اسے محسوس کر سکنا اُن کے بناؤ میں ہی نہیں۔ سمے کو دل ہارے، اپنی پونجی ہاتھ میں لیے وہ تو جیسے لُٹنے کو تیار بیٹھے ہیں۔

کیا ہی اچھا ہوتا جو وہ میری خو پر ہوتے۔ سمے کو دیکھتے ایک جگہ رکھا ہوا ہلاکت خیز کشش سے پُر۔ ادمی نَس۔

دھمکی آمیز، چھوٹے جانے پر اکساتا۔ چھل کا بابا اوڑھے حسبِ ضرورت ڈھلنے پر تیار — کتنا اچھا ہوتا تب! — نکہت لکھنے والے کردار سب میرا ہی ایک انگ رہتے سدا ولیکن — مجھ میں اور ان میں فرق ہی کیا رہ جاتا تب۔

ارے! یہ تو میں نے سوچا ہی نہیں۔ اور یہی شاید میرا Dilemma ہے۔

جو میں صرف نکہت اور اُس کے متعلقات میں ہی ساری رہتی ہوں تو میں — 'میں' — نہیں رہتی۔ اور جو اپنے تئیں عزیز رکھتی ہوں تو مجھے اِن متعلقات سے اُوپر اُٹھنا پڑتا ہے اور یہ بھید میرے اندر ابھی خوابیدہ ہے کہ میں نکہت اور لکھنے والے سے کتنی بندھوں کہ وہ — 'وہ' — رہیں اور میں — 'میں' —

واقعی کیا میں نکہت اور لکھنے والے سے اُوپر کوئی چیز ہوں یا یہ محض خودستائی ہے!

کیا میں Megalomaniac ہوں!

یہاں میں ہی میں ہوں۔

کسی بھی خودساختہ جھیل میں جھانک کر یا اگر جھیل بنانے کو من نہ چاہے تو مندھی ہوئی ایک اُچٹتی نظر سے ہی اپنے سراپے کو دیکھ سکتی ہوں — سمپُورن۔

میں سمپُورن ہوں یہاں — سارے رنگ ایک انگ، ایک آسان پہچان میں گُندھے۔

اور جب وہ ہو گیا جو ہونے پڑا ہے تو میں تو اپنی صورت سے جاتی رہوں گی۔ کیسی مشکل آن پڑے گی۔

ساری دِشائیں یہاں سُکھ منڈپ میں کیسی شانت پڑی ہیں۔ نشنت، گہرے دھیان میں ڈوبی۔ کوئی سوال نہ جواب۔ کبھی کھیل کرنے کو جی کیا تو آپ ہی اپنے سے پوچھ لیا: میں کیسی ہوں؟۔ پھر ایک ہی نظر خود پر ڈالنے سے جواب بھی مل گیا اور بات ختم۔ کبھی زیادہ کیا تو اپنی ہی ہتھیلی میں جھیل بنا کر نوک پلک کو سنوار لیا۔ کسی اور سے لینا ایک نہ دینے دو۔

دُند تو تب مچے گا اور کیا Cacophony ہو گی جب سارے میں 'کب کہاں کیوں کیسے'۔ کے سنپولیے سراُٹھاتے پھریں گے۔ ناممکن الجواب سوالات اور ان ہی کے تال میل سے بنا سوالوں کا سوال: 'میں کون ہوں؟'۔ میرے اکثر کردار یہ سوال اُٹھائیں گے کہ 'میں کون ہوں؟'۔ ڈیلفی کا اپالو تو اپنے ماتھے پر کھدوالے گا: Know thyself —

ایک وقت تو ایسا آئے گا کہ جس کے پاس کہنے کو 'ک' سے کوّا نہ ہو گا چوک چوراہوں میں راہگیروں کے پیچھے بھاگتا پوچھ رہا ہو گا: میں کون ہوں؟۔

اِس سوال کی گرم بازاری آگے منطقی اثباتیے ہی ٹھنڈی کریں گے: 'یہ سوال ہی سرے سے غلط ہے' وہ کہیں گے۔ 'مسئلہ صرف Syntax کا ہے' — یوں کہ جیسے میں پوچھوں: میں کون ہوں؟۔ اور آگے سے کوئی پوچھ بیٹھے کہ یہ کون ہے جو پوچھتا ہے: 'میں کون ہوں'۔ اور میں کہوں: 'یہ میں ہوں'۔ چلیئے کَون کا قصہ تمام ہوا۔ یعنی، یہ ہو گئی تو کَون کا سوال ہی کیوں اُٹھنے لگا اور فرض کیجیے کسی نے یہ سوال اُٹھایا اور اُسے جواب مل بھی گیا تو کیا کون کا اصل کہیں نہایا دھویا بیٹھا ہے کہ جس سے جانچ پرکھ کے کہا جا سکے کہ واقعی کَون ملا ہے یا پتہ نہیں کون ملا ہے۔ سو جی یہ سوال: 'میں کون ہوں؟'۔ کیا ہوا؟۔ ٹھنڈا ٹھنڈا نان سینس۔

علم الابدان والے بھی منطقیوں سے پیچھے نہیں رہیں گے۔ وہ کہیں گے کہ ایسے سوالات سے اگر کچھ ظاہر ہوتا ہے تو یہ سوال اُٹھانے والے کی نااہلی ہے۔ کیوں نہیں وہ اپنی کھوپڑی کے دائیں بائیں کی صلح کرا دیتا۔ جس دن یہ ہو لیا ایسی چکاچوند ہو گی کہ

آنکھیں میچ کے چپ بیٹھ رہے گا جیسے سارے جواب مل گئے ہوں یا ٹکا سا جواب مل گیا ہو۔

پھر ایک آدمی آئے گا جو سوئی پڑی پتھر جگہ کو ایک جھٹکے سے اُٹھا بٹھال کے میاں زمان کے پلّے باندھ دے گا۔ جگہ کو اور جگہ کی سب جگہوں کو یہ بندھن کمال خوشں آئے گا۔ اس کے نواح زمزموں سے بھر جائیں گے۔ رقص کناں وہ زمانے کی باہنوں میں باہیں ڈالے اُڑی اُڑی پھرے گی۔ ایک الوپ Ballerina ۔ اپنے بننے سے بندھے رہنے کی ارچنا کی آتشِ مسلسل اُسے دیوانہ کیے رکھے گی۔ سوا اپنے اور سمے کے سنیوگ کے اُسے کوئی حال بھائے گا نہ کوئی اور حالت خوش آئے گی۔ گھمن گھیرے لیتی پُھولی پھیلتی وہ سمے کی بھجن بانی گاتی پھرے گی:

اب میں بھر پائی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ اب میں خالی خول خلا، سپیس، جگہ یا ڈھنڈار مکان نہیں رہی۔ اب کوئی مجھے بالاپن کے ان ناموں سے نہ پکارے۔ اور پکارے تو کیوں پکارے۔ میرے سُونے آنگن میں اب راٹھ راج آن براجے ہیں۔ سدا سے تھے۔ میں ہی انجان تھی۔ ابھاگن۔ مجھ کو ہی دھیان نہ ہوا اور اب بھی کاہے کو ہوتا۔ اگیانی ہی رہتی اور جانے کب تک ساری سیماؤں میا اندھیکار کی راجدھانی رہتی اگر ان بہاریتی کا گزر اِدھر سے نہ ہوتا۔ یہ تو اُن کی وِدیا کا چاندنا ہے جو سارے سنساروں میں چھا رہا ہے جس سے کہ ایک ایک ذرّہ صاف دکھنے لگا ہے اور میں اپنے آپ پر ظاہر ہوئی ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ کہ میں تو سوامی سے بندھی ہوں پریم اور دوسراتھ کی اَن کھُل گرہ میں۔ میں بنجر خالی مکان نہیں ہوں ۔ ۔ ۔ ۔ ماننے کو من نہ کرے تو میرے صاحب سے پُوچھ لو جن کا نام کہ میرے ناؤں سے جڑ گیا ہے سو کہنا ہے تو مجھے زمکان کہو Spacetime، Spacetimecontinuum، خالی مکان نہیں۔ اب نہیں ۔ ۔ ۔ ۔ کبھی نہیں ۔ ۔ ۔ ۔'

'ایک شے میرے قدموں میں رکھا دو۔ مستقل قدر کی جس سے کہ میں ٹھوکر کھاؤں، ٹکراؤں اور کوئی آواز سنوں ۔ ۔ ۔ ۔ کچھ سخت پن،' ـــــ سناٹا اتنا گہرا ہو جاتا کہ خاموشی بول اُٹھتی، بڑبڑانے لگتی۔

ـــــ 'اِس بڑبڑانے سے کیا ہو گا' ـــــ اس نے اپنے آپ کو سمجھایا اور بے چارگی کے شدید احساس سے اُس کی آنکھیں بھر آئیں۔ پھر تو وہ آنسوؤں سے رونے لگی۔ جب آنسوؤں کے سوتے خشک ہو گئے اور وہ اندر سے سُوکھ کر خالی ہو گئی تو وہ جھلّا گئی۔ تب لاشیٔ نے ایک دلچسپ منظر دیکھا ۔ ۔ ۔ کہ مجنون خاموشی جمے ہوئے سکوت پر ایڑیاں رگڑ رہی ہے (جبکہ وہ خوب جانتی تھی کہ اس سے سوائے جی جان کے زیاں کے اور کیا حاصل ہے) اور سکوت تھا کہ ٹس سے مس نہ ہوتا تھا۔ لاشیٔ یہ انتقد کو Weird منظر دیکھ کر مسکراتا ہوا باہر نکل گیا جہاں جمیع جہات میں اُس کے دلآویز خم مُرتعش تھے۔

'میں جانتی ہوں کہ یہ 'کچھ نہ ہونا' کی ایک کیفیت ہی ہے جو سارے میں مُرتعش ہے اور 'ہونا' وہ ارتعاش ہے جو مُرتعش نہیں۔ جانتی ہوں خوب جانتی ہوں لیکن میں یہ بھی جاننا چاہتی ہوں کہ 'کچھ نہیں' کی ایک باشندہ مجھ خاموشی کو پھر کیوں اشیاء کے جال میں اُلجھایا جائے ۔ ۔ ۔ ۔ اور وہ کون ہے جو مجھے چُھل دیتا ہے، کون ہے جس کی پلاننگ ڈیزائننگ کے ہر سُو چرچے ہیں اور پلاننگ بھی ایک دھوکا منڈی کی جس کی ممکنہ عمر انچاس ارب برس تک ہو سکتی ہے۔ اگر اُس کی اذیت پسند طبیعت بضد رہی اور اُس نے اپنے منصوبے کو بُل ڈوز کیا تو میں جنم لینے سے انکار کر دوں گی اور بہ زور کہوں گی کہ میری عمر انچاس ارب برس سے منہا کر دی جائے ۔ ۔ ۔ ۔ میں اُس وقت جنم لینے کو ترجیح دوں گی جب سب کچھ ویسا ہی ہو گا جیسا کہ نظر آئے گا' ـــــ ایک چُھل آئی اور خاموشی کو چونکا گئی اور اندر کی بھادناؤں کا زور تھا یا کیا تھا کہ تاحدِ نگاہ لاشیٔ کے پُر لوچ خم ڈول رہے تھے ـــــ 'کیا انہوں نے میری بات سُنی ہے' ـــــ

خامشی نے سوچا — 'اور یہ جو ہیں، یہ جو 'کچھ نہیں' ہے..... یہ کیا ہے۔ کیا یہ 'کچھ' ہے بھی کہ سرے سے ہے ہی نہیں!!..... جو بھی ہو مجھے پتہ لگانا ضرور ہے کہ میں ہی اس ابلہ فریبیت کا ہدف کیوں ہوں؟ ۔ میں اس پچھواڑے پہنچ کے رہوں گی جہاں میرے خلاف اس سازش کی نیو رکھی جا رہی ہے.....'

روشنی کی انگلی تھامے تھامے تم بڑھتے چلے جاتے۔ آگے اور آگے۔ کبھی، روشنی انگلی چھڑا کر آگے نکل جاتی تو وہ اس کی تلاش میں مارے مارے پھرتے۔ ڈوب کر گھنڈی بن جاتے پھر اچانک نمودار ہوتے اور گرتے پڑتے از سرِ نو روشنی کی تلاش میں سرگرداں ہو جاتے اچانک روشنی ان کے اپنے وجود کی تہوں اور سلوٹوں سے نمودار ہوتی اور جتنی وہ ہے پوری کی پوری ان کے سامنے آکھڑی ہوتی۔ وہ اس کے عریاں جمال کی تاب نہ لا سکتے اور کچھ اور خمیدہ ہو کر اندر کو سمٹنے لگتے۔ تب روشنی شرارت پر اتر آتی۔ کچھ مدھم ہو کر ایک ذرا جھینپ کر وہ انہیں آگے بڑھنے پر اکساتی اور جونہی وہ اس کی اور لپکتے، وہ اپنی پوری تابناکی پھر سے اوڑھ لیتی اور ہنستی ہوئی کسی نئے بُعد کو دریافت کرنے چل پڑتی..... تب تو تم رو ہی پڑتے..... ان کے ارضِ خمیدہ حُسن پر ایک حزن چھا جاتا اور ایک دھار انفس و آفاق سما و سمک اقوام تہذیبیں ایک بڑی قیمت میں گرنے لگتیں۔ پھر ایک کوندا لپکتا اور سارے میں ایک سپید اندھیارا چھانے لگتا اور جب یہ اندھیرا چھٹتا تو وہی وہ اٹھکھیلیاں کر رہی روشنی —

اور اس سے لپٹ چمٹ رہے وہی وہ خم ہوتے اور خاموشی ہوتی جو اپنی ناکردہ کاری پر ہولے ہولے کراہ رہی ہوتی۔

'میں اس مکر چاندنی کو مسترد کرتی ہوں۔ یہ ابلہ فریبیت میری نہیں ہے۔ کیوں ہو؟ کسی طرح کا فریب، چھل چھل یا سراب میرے نام کے آگے کیوں لکھا جائے۔ کوئی چھل خواہ کتنا ہی عظیم کیوں نہ ہو میں اس کا حصّہ بننے سے انکار کرتی ہوں۔ میں اپنی اور اپنی انواع کی پیدائش کے آگے روک بن کر کھڑی ہو جاؤں گی۔ اس سرکس کا آغاز ہی نہیں ہونے دوں گی جو قرنوں جاری جا رہے گا اور ایک پل نہ ٹھہرے گا۔ جو ہو گا نہیں ہو گا۔ ہونے میں نہیں ہو گا اور نہ ہونے ہی میں ہو گا۔ ہر صورت چھل، مضحک اور چھل۔ دھوکا فریب سے دغا کرتا ہوا چھل چھل کو نچھاڑ دیتا ہوا..... عرصہ افزا ہیں مجھے گوتے ریا سے نہیں کھیلنا جب تک کہ منصف اپنے کاغذات کی جانچ نہیں کرا لیتا۔ یہ نہیں کہ کھیل تماشے مجھے بھاتے نہیں۔ کسے نہیں بھائیں گے۔ لیکن یہ تو ہو کہ کھیل کھیل ہو کھلواڑ نہ ہو۔ کھنڈت نہ پڑے اس میں۔ کھلاڑی کھیل کے میدان، کھلونے کھدّو — کھانڈ کے یا کھارے پانیوں سے بنے نہ ہوں، اصلی ہوں، سخت، ٹھوک بجا کر پرکھی جا سکنے والی ٹھوس اشیاء۔ کیا یہ بہت زیادہ ہے جو میں مانگ رہی ہوں؟ ۔ نہیں، اور نہ ہی ایسا بے تکا — آخر کیوں میں ایک سلنڈر پر بیٹھی تیرہ سمتوں میں گھورتی کم لون زمانے گزار دوں.....'

یہاں لاشئ کے خم، خم کھا کے ایک Curvaceous وجود میں ڈھل کر اس کے سامنے آکھڑے ہوئے۔ مثالی آرکی ٹائپ حُسن کا وجودِ مثال۔ اُسے دیکھ کر خامشی پانی بن کر بہنے لگی۔ بہتے بہتے رونے لگی اور روتے روتے اپنے تئیں بہہ جانے سے بچانے لگی — وہ حسین ذرا پہلو بدل کر پوری توجہ خامشی پر مرکوز کر دیتا ہے۔

یہ محسوس کر کے کہ یہاں اس کے سامنے کوئی ہے جس سے وہ دل کی بات کہہ سکتی ہے، خاموشی یکجا و یکجان رہنے کی اپنی کوشش ترک کر دیتی ہے۔ وہ بات آغاز کرنے کا سوچ ہی رہی تھی کہ حسین نے پوچھا: 'تم کون ہو، کیا نام ہے تمہارا اور تم کیا چاہتی ہو؟'

'کیا کہوں میں کون ہوں اور میرا نام کیا ہو سکتا ہے بھلا — چلو تم مجھے خامشی کہہ لو' — اور یہ کہہ کے وہ واقعی خاموش ہو گئی۔ کیا کرتی۔ کیا کہتی کہ وہ کیا چاہتی ہے۔ کیسی آسان سی مشکل تھی۔ چپ چاپ وہ غارِ سکوت کو سنک گئی۔ وہاں اس نے ادھیک کٹھنائیاں جھیلیں۔ طرح طرح کے آسن جما کے ابھیاس کیا، پر کسی ڈور کا سرا ہاتھ نہ آیا، نہ ارتھ پراپت

ہوا۔ اور غارِ سکوت سے باہر لاشئی اپنے خم اوڑھے گھُوگ سویا گیا اور میٹھے سپنوں کی ایک مُسکان اُس کے آس پاس کھیلا کی۔ جانے تُو مجھے انجان کہ کسی غار میں کوئی نہو ہی، ناچیز میں ناچیز ڈال کے نہوئے ہاتھوں سے بلوتی ہے اور ماکھن کی آس رکھتی ہے اور ابھیاس کرتے کرتے خاموشی ایسی رزیل ہو گئی کہ اپنی آواز تک کھو بیٹھی۔ ڈور کا سرا تو خیر کیا پاتی۔ سکوت اُس کو اندر ہی اندر چاٹتا رہا۔ دیکھو کیا اندھیر ہے کہ میرا من مجھ سے ہی کہہ مکرنی کرتا ہے۔ اپنی ہی کہی بات کی تھاہ پانا چاہتی ہوں اور نہیں پا سکتی.... ایک پگ نہیں اٹھا سکتی ارتھ کی اور....؛

آسن توڑ ابھیاس چھوڑ جب آخر کار وہ غار سے نکل ہی آئی، خالی ہاتھ، تو اپنا آپ اُسے بہت ہولا لگ رہا تھا —— سو ذرا چڑھ کے بولی: اور تم کیا ہو کر پڑے اینڈتے ہو یا چک پھیریاں لیے جاتے ہو چھل کبھی چھلاوہ —— کیا نام ہے تمہارا؟"

"میں!

میں تو اَرُوپ ہوں کیا رُوپ دکھاؤں

انام ہوں کیا نام بتاؤں

الکھ

لاتعین

چلو تم سہولت کے لیے مجھے لاشئی کہہ لو، کم از کم از کم از"....

"بس بس رہنے دو اس کم از کمی کو، میں خوب واقف ہوں اس کمتری سے جو تم نے زیرِ جامۂ کبر کے اوپر اوڑھ رکھی ہے، جتنے کمتر ہو اُتنے عیار۔"

"اب عیاری پہ بھلا کیا بس ہے میرا۔ یہ تو میرے دو سانسوں کے درمیان کی کیفیت ہے۔ ایک تشویش جو نواح و اطراف میں اور لا اطراف میں پہلو بدلتی ہے اور کیوں بھولتی ہو کہ تمہارا اصل بھی میری تشویش کے پہلو، کہیں میری دو سانسوں کے بیچ ہے اور دیکھا جائے تو تمہاری ناچینی کا سبب تمہاری یہ فراموشی ہی ہے۔ تم ہی کیا جو بھی اپنے اصلے، اپنی ناچیزی کو چیزوں میں رکھ کر بھول جائے گا دُکھ بھوگے گا۔ سُکھ شوک، رنج راگ، روگ ارو گ، پُن پاپ سندر، بھیانک.... سب کی تہہ میں ناچیزی ہو گی اور سب سے اہم بات یہ کہ کسی نے ناچیزی کو کتنا آلودہ کیا ہے۔ درخت، دریا، آنسو، آکاش، آدمی، کوئل، کاگ، سانپ، ساگر، پربت، ستارے، ستاروں کا غبار، پہلی اور آخری سب چیزیں —— ناچیزی سے نمودار ہوں گی اور ہمیشہ ناچیزی کی اور اُمگتی رہیں گی۔ پھر ان چیزوں کی صورتیں ہوں گی: سُندر، بھیانک، گیان، اگیان، ودیا، اودیا، جنت، جہنم جو سب کی سب ناچیزی سے بندھی ہوں گی اور جسے تم عیاری سمجھتی ہو وہ تو ناچیزی کا ایک انگ، ایک بھاؤ، ایک ادا ہے، کہ کبھی تو چیزوں کو اپنی بڑائی کے زعم سے پھول کر کُپّا ہو جانے دینا، پھر ایک ذرا چھیڑ کر ناچین کر دینا یوں کہ وہ سوچنے لگیں: کیا واقعی وہ کچھ ہیں بھی! چیز ناچیز کا تال میل سنجوگ بجوگ ایک پل ساتھ، پھر برہا ورلاپ۔ ایک کا دوسرے کو چھو کے بھاگ لینا۔ پھر پاس نہ آ سکنا، پھر انہیں فراموش کر دینا اور گرے پڑے رہنے دینا اسی فراموشی میں۔ ایک پل کبھی ایک جگ، پھر اچانک اُنہیں جا چھو کرنا چیزی کا چرکا لگا دینا اور اُن کی بےبسی کا تماشا دیکھنا.... کہ اب باؤلی ہوئی وہ اپنی ناچیزی کی طرف رجوع کرتی ہیں اور ناچیزی ہے کہ دُر دُر کرتی اُنہیں پاس نہیں پھٹکنے دیتی —— "ہٹو جاؤ اپنی

چیزوں کے پاس" —— لاشئی رُک کر باہر دیکھنے لگا جہاں وہ اپنے آپ سے رَس رَچ رہا تھا اور اُس کے اپنے انگ رنگ ایک دوسرے کو داؤ پیچ میں اُلجھا رہے تھے۔ ہر ایک یکتا، اپنے رُوپ انگ کی چرچا کرتا، ہونے نہ ہونے کے بیچ اگن سوانگ بھرتا —— نظارہ بے حد دلچسپ تھا اور ادھر تو بازی زیادہ ہی گرم تھی جہاں کہ اُس کے خم ہائے چند سانگ کا پھریا اُٹھاتے بس بڑھے چلے جاتے تھے بہروپ پر بہروپ بھرتے۔ نرِ یقین سے ایک آدھ ہی کم ہوں گے جو سوانگ اُن کے لاشئی نے دیکھے اور حریف انگشت بدنداں حیرت کی مُورت —— اخیر لگنے لگا کہ بازی مات ہوئی کہ ہوئی —— یہی کوئی گھڑی تھی جب خامشی کے پہلو میں اپنی تھاؤں پر جمے بیٹھے لاشئی باہر نکلا اور چپکے سے اُن مات ماروں کو ایک داؤ بتا آیا۔ پھر کیا تھا دیکھتے ہی دیکھتے پانسہ پلٹ گیا۔ دوسرے کیمپ میں ہاہاکار مچ گئی۔ ایک ہجوم تماں، دھروہے، یہ کوئی کھیل ہے!' —— پکارتا اُس کے پیچھے لپکا۔ لیکن لاشئی تو چال چوپے بدلتا اپنے آپ تمک کو پھڑائی نہ دیتا مہارت سے Masquerade کرتا اپنی جگہ پہنچ بھی چکا تھا اور اب بڑے دھیرج بڑی رسان سے خامشی کو کہہ رہا تھا: 'دیکھو کیا مزے کا کھیل ہے۔ آپ لُطف و نشاط تملوں میں گدگدی کرتا ہے اور اُوپر سے سنسنی کے چھوٹے چھوٹے نوکدار قطروں کا مینہ سا پڑے جاتا ہے اور پردہ گرنے کا بھی کھٹکا نہیں ہے اور ایک تم ہو کہ اندر سے خوش نہ باہر سے راضی، اپنا آلا گاتی پھرتی ہو، تم ہی کہو کھیل میں کھنڈت کا کارن تم نہیں تو کون ہے!۔ تم جو کھیل نہیں کھیل کے پار دیکھنے کے آنکس سے ہنک رہی ہو۔ یہ توڑ چھوڑو۔ یہ کھیل یہ لیلا ہی سب کچھ ہے اور اس کے پار بھی یہی کچھ ہے۔ میری مانو تو میرے ایسی ہو جاؤ۔ آلار اسی۔ کھیل میں کھوئی کھیل میں بھیگی۔ یہ بے کنار رنگ منچ دیکھو جس پر بلواتی رنگ رس میں مشغول رہتے ہیں۔ کوئی اس کا پچھانہ آگا سب کچھ ایک سا رہتا ہے اور ایک سا نہیں بھی رہتا۔ کاسٹیوم کے چھلکے اُترتے رہتے ہیں نیچے سے نئے نکلتے رہتے ہیں۔ میک اپ ہوتا رہتا ہے پرانا اُترتا رہتا ہے۔ جی چاہے تو مزے سے اوندھے لیٹے کھیل دیکھتے رہو اور جو من میں لہر اُٹھے تو پاؤں اُٹھا کر رنگ منچ پر چڑھ جاؤ اور کھیل میں جو چاہے پارٹ کرنے لگو۔ کوئی اعتراض کرتا ہے نہ کھیل کی کوئی اکائی متاثر ہوتی ہے ..... بھلا ایک تم ہی کیوں اپنے من کو گانٹھ پر گانٹھ دیئے جاتی ہو اور رنگ میں بھنگ ڈالتی ہو.... میں کہتا ہوں آؤ چڑھ آؤ رنگ منچ پر .... لو یہ ہاتھ میرا' —— اُس چھیلا حُسن مثال کے ہاتھ کو نظر انداز کرنا آسان نہ تھا لیکن خامشی نے کر دیا اور چپکے سے اندر کے اطاق میں جا کر سو رہی۔ جاگی تو وہ چھیلا وہیں تھا، ہولے ہولے ہلارے لیتا اُس کے رسپانس کا منتظر —— وہ تو جیسے اُس کے پیچھے ہی پڑ گیا تھا —— خامشی چڑ گئی اور چیخ گئی: 'پتہ ہے، اتنے شانت تم ایسی چینک میں کیوں ہو!؟۔ اس لیے کہ تمہارے پاس اختیار ہے، تم پتھر ہو کے پانی کی طرح بہنے لگتے ہو ہوا ہو سکتے ہو اور ہواؤں کو دیکھ سکتے ہو اور آگ تمہارے سامنے اپنے جلے ان جلے یا آدھ جلے ذروں کو لے کر فریم ہو جاتی ہے —— غیر مُتعش ٹھنڈی، برف، اور تم برف تاپ سکتے ہو۔ سو تمہارے لیے بھلا کیا قضیہ ہے —— یہ قضیے کھٹناٹیاں تو میرے لیے ہیں" —— یہ سُن کر غیبن نے تبسم کیا، پھر توقف کیا اور جیسے

وہی وہ ہو سارے میں اُس کے سوا کوئی نہ ہو،

جیسے

کہنے کو کرنے کو کچھ نہ ہو ..... وہ ایک بانکی بے خیالی سے ادھر اُدھر دیکھنے لگا —— اتنے میں پروتوں کر فوتوں غبار کا ایک بادل قریب سے گزرا۔ جہاں تھا وہیں جمے جمے لپک کر حُسن مثال نے اُسے ٹھہرا لیا۔ دیکھتے ہی دیکھتے بادل کے چاروں کونے کہیں اُوپر جا بندھے یوں کہ بادل بوان بن گیا۔ وجود اُس پر جا لیٹا اور خامشی جو اپنے رہنما کیئے جانے پر پہلے ہی بس کا پھولا ہو

رہی تھی اس بیکار کی ایکٹیویٹی سے پھٹنے آ گئی ....

اور وہ —— حُسن شال اپنی اسی بانکی بے خیالی میں کہنی کے بل ایک ہاتھ پر سر ٹکائے بوان پر لیٹا تھا اور ایسی ہوائیں جنہیں وہ چاہتا تو دیکھ سکتا تھا ہولے ہولے بوان کو پُلار رہی تھیں —— خامشی کی حالت پر اس نے تبسم کیا اور بوان کے دُور جاتے جھونٹے کے بیچ دھیمے سے کہا: ہوں، ارادہ! اختیار! جو تمہیں گمان ہے کہ یہ میرے ہیں تو میں بھلا کیوں تکذیب کروں!"

—— اور یہ اس دھیمے پن کی دُھند ہی تھی کہ جس کا پردہ خامشی پر پڑ گیا اور وہ پار کے کڑوے سراب کو دیکھ نہ سکی۔ لیکن حیرانی کی بات تھی کہ اس کے اندر کی گرہیں اب آہستہ آہستہ کُھلنے لگی تھی۔ جھٹ وہ آگے کو ہوئی اور بولی: دیکھا مجھے پہلے ہی پتہ تھا کہ تمہاری پٹاری میں کیا ہے اب میں تم سے دل کی بات کہتی ہوں" —— اور وہ دیکھ نہ سکی کہ بوان میں دُور کے جھونٹے پر جاتے ہوئے وجود کے ہونٹوں پر مُسکان ہے اور، ایک نان کومٹل —— 'ہُوں'۔

"اب یہ تو ہو نہیں سکتا کہ میں جنم ہی نہ لُوں، اتنا دَم خَم نہیں مجھ میں۔ تم جو کہنا چاہو کہہ لو اسے —— اندھیر، اپنائے یا میری کم ہمتی کہ اپنے ہی جنم سے ہاری میں اس کے آگے روک نہیں بن سکتی، خیر جو ہے سو ہے۔ جنم لینا ہی پڑا تو لے مروں گی۔ تم کہو حالات کو ایک حد تک سُدھارنے کے لیے کیا تم سے کسی سہایتا کی اُمید کی جا سکتی ہے —— زیادہ نہیں بس میں چاہتی ہوں کہ رحم سے باہر مجھے تشکوک کے رحم و کرم پر نہ چھوڑ دیا جائے ...."

وجود پھر ایک لمبے جھونٹے پر چلا گیا تھا۔

کیا سُنی تھی اس نے خامشی کی بات!

دُور سے واپس آتے ہوئے وہ خامشی کے قریب آ تا گیا .... اور .... اور قریب .... اور نُزول ہی وہ خامشی کو بالکل چُھوتا اس کے چو طرف جھونکے بکھیرتا مخالف لبان پر نکل گیا۔ آخر کو بوان رُکا تو وہ اُنگلی کان سے چھوا کے گویا ہوا: کچھ مجھ سے کہا تم نے! —— اب وہ ساری بات نہ دھراتی تو کیا کرتی —— سُن کے وہ چھپیلا، غایت درجہ کی رعنا کے ساتھ، بولا:

"میں کیا کر سکتا ہوں بھلا!"

"بہت کچھ۔ اب جبکہ تمہیں انکار نہیں کہ تمہارے پاس اختیار ہے تم ٹھوس مادے کا مجھے صرف ایک ذرہ دے دو، سنتے ہو؟ —— ایک اور صرف ایک ذرّہ —— کم مایہ حقیر صرف ایک، پر نتو پکا، پرکھ پُورا، اَن چھڑ، اَبسٹ مادہ .... دیکھو میرے تو منہ میں پانی آ گیا ہے اس کے ذکر سے ہی۔ میں اُسے اپنے جنم کی تھاہ میں رکھ لُوں گی اور جب جب جنم مرتعش ہو گا یا سورج لپٹنے کو ہو گا یا آسمانوں کی کھال کھنچنے لگے گی، تم سمجھتے ہو نا میں کیا کہنا چاہ رہی ہوں۔ میرا مطلب ہے جب بھی جنم ہونے / نہ ہونے کے زلازل کی زد میں آئے گا میں تحقق کے اس ستارے پکّے پیشینٹ مادے کے ذرّے کو اپنی تھاہ سے اُٹھاؤں گی اور کسی بھی چھڑی کے سرے پر ٹکا کے، اپنے سحر کے امکان سے پُھول، جنم جنم کے بھربھرے پن کے روبرو کر دیا کروں گی .... ایک ذرا کپکپاہٹ اور زلازل تھم جایا کریں گے .... آسمان پھر سے کھال اوڑھ لیا کریں گے اور سورج! .... بس کچھ نہ پوچھو، تم جانتے ہی ہو ...."

"اُف کتنا بولتی ہو تم اور نام ہے خا ا ا موشی - اِتّی لمبی تقریر اور وہ بھی ایک ذرا سے ذرّے کے لیے۔ مانگا بھی تو کیا ایک ذرّہ .... اَن چھڑ (خاموشی کی نقل کرتے ہوئے) اَبسٹ، پرکھ پُورا، لے لینا ایک ذرّہ سچے حقیقی مادے کا۔ ایک چھوڑ دو لے لینا، ایک پاس رکھ لینا پیئرز اِن کیس کہ ایک اِدھر اُدھر کہیں رکھ کر بھول جاؤ ...."

اور اب وہ بے سُدھ سوتی تھی۔ اور خواب جو وہ کر نہ سکی تھی اور نیندیں جو لے نہ سکی تھی باہر اپنی باری کے منتظر دُھند کی طرح اُس کے گرد لپٹ رہے ایک بے عمل پانی کے سُوت کا جالا بن رہے تھے کہ جب تک وہ اُنہیں کر نہ لے جاگ نہ پاتے اور خامشی کو بھلا جاگنا کیوں تھا کہ بے وَس کرنے والے وہ بَیری وساوس نئے گھر بنانے کو اطراف کی تلاش میں جا چکے تھے اور اطراف ابھی ناآفریدہ تھیں سو وساوس بھی کدھر گئے ہوں گے۔ وہیں پڑے ہوں گے کہیں منہ چُھپائے، بے وَس۔

سو اُسے جگانے والا کون تھا وہاں کہ اب وہ ایک جداگانہ نوع تھی۔ سب سے الگ۔ ایک وہی تو تھی جس نے اطراف کی آفریدگی کے بعد کے جُگوں میں خود کو کانٹوں میں رِکھیلے جانے سے اور کنکروں پر گھسیٹے جانے سے محفوظ کر لیا تھا۔ اب تو جب ہونا ہو جنم کو ہولے کہ اب اُس نے بارانِ ریگ سے پناہ کے لیے سائبان تعمیر کر لیا تھا۔ اُس نے کتنی دور تک دیکھ لیا تھا ابھی جب کہ اطراف کا کہیں نام و نشان نہ تھا اور نہ وہ ٹیلا جس کے کنارے اُسے دو ایک جرعہ ہائے اوقات کے غرارے کرنے کو کہا جانا تھا دُور دُور تک دکھائی دیتی تھی۔

سو وہ پڑی سوتی تھی۔ اور اُس پر دھوپ تھی نہ چھاؤں نہ پارۂ ابر۔ رَین دن روز دیروز کچھ نہیں سو کوئی نہیں تھا جو اُس کی انوبھاؤ اَوستھا کا گیان کر سکتا۔ انوبھو جو صرف اور صرف اُسے پراپت ہوتا ہے جو اپنے بخت سے وہ ایک ذرّہ پالیتا ہے جو نہونے جنم کو خالص ونہونا، بنا کے اُس کی چال میں اعتبار کی اِٹھلاہٹ لے آتا ہے ذرّہ خامشی کی تھاہ میں تھا اور وہ اتھاہ نکھ میں تھی ———

ایک پارچہ، کوئی متانا تھا جس کا نہ بانا جانے کہاں سے دھوپ چھاؤں کے ہاتھ آگیا اور ابھی وہ دونوں سوچ ہی رہی تھیں کہ اس کا کیا کریں کہ انہوں نے خامشی کو دیکھا بے سُدھ پڑے سوتے۔ نکالے انہوں نے رگِ جاں سے تار اور خوب جی لگا کے اُس پارچے پر بُنت کاری کرنے لگیں۔ آنند جیوتی کا چھلکا وہی پارچہ اوڑھے جس میں دھوپ چھاؤں تمام ہو چکی تھیں اب خامشی بے سُدھ سوتی تھی جیسے کبھی جاگنا ہی نہیں ہے۔ لیکن جاگی ———

اور جاگی تو مُدرائیں جنہیں بحر و بر کے تمام زمانوں کے رقص کا حصہ ہونا تھا اُس کے اعضا کی انتہاؤں سے بہہ رہی تھیں سو اُس نے ناآفریدہ۔ زمانے کے فرش پر ایڑی ماری اور گیت گانے لگی:

ہمیشہ رہنے والی خوشی کا گیت
آئندہ کے یقین کا گیت
انفس و آفاق کے اعتبار کا گیت

اور

کونیاتی حُسن کا گیت

ناآفریدہ ——— زمانوں کے فلور پر ہو رہا یہ رقص ہوتے ہوتے سارے اوقات و ازمنہ پر مرتسم ہو جائے گا۔ ہر جیل ہر جگہ رقاصائیں رقاص اس کی ارفع طرفگی کو چھو لینے کی کوشش کریں گے اور ہاتھ پاؤں توڑ لیں گے۔ آوازیں یہ کہہ کر پاؤں میں بندھنے سے انکار کر دیں گی کہ ایسے رقص کے لیے گرہ میں مال ہونا چاہیئے:

لافانی مادے کا کم از کم ایک ذرّہ۔
سیال سرخوشی میں رقصاں

خامشی

جسے اُس کے جنوں آمیز دولابی تحرک نے ستون سے باندھ کر بہہ جانے سے بچا لیا تھا

پھیلا حُسن مثال نے بھی اپنا بوان روک لیا تھا اُسے دلچسپی سے دیکھنے یا شاید اُس کا تماشہ کرنے کے لیئے۔

ایک پاؤں کا اگلا حصہ دوسرے پر ٹھہرا کے وہ جھک کر ولمیت سے ذرّت پر آگئی اور جب اُس کی آواز، اپنے سراپا ستون سے لپٹ رہی تھی تو اس نے رقص کے ایک انوپ انگ میں ہتھیلی کو آئینہ کر لیا۔ اب وہ خیالِ بقا کو بھنوروں سے بتا رہی تھی۔ حسن مثال کھو سا گیا۔ کتنے جُگ جو ابھی جنمے نہیں تھے بیت گئے۔ گیت گاتی خامشی رقصاں رہی۔ پھیلا اُس میں کھویا رہا۔ آخر خود کو جھٹک کے اُٹھا بوان سے اُترا اور دبے پاؤں آ کر ضدِ مادہ کا ایک ذرہ پسِ آئینہ رکھ گیا۔ اور ایک دلدوز چیخ کی گونج سارے میں پھیلنے لگی۔ خامشی کا رقص تھمنے لگا اور اس کے ہونٹوں پر مرتے ہوئے گیت کا رنگ، نیلا پڑنے لگا۔ ابھی اس گیت کا اندوہ ریچ سے نکلے گا اور اپنی نیلاہٹ قرنوں پار کے زمانوں اور جگہوں میں کھنڈا آئے گا:

اپنے لوگوں اور اپنی جگہوں سے بچھڑ جانے کی نیلاہٹ
توہین اور تذلیل کی نیلاہٹ
ابلہ فریبیت اور چھل دیئے جانے کی نیلاہٹ۔
یہی گیت ہے کہ جس کی ابدی یاد میں مرتے ہوئے زمانے اور جگہیں —— بچے سمندر اور آسمان ——
جامنی ہو جایا کریں گے اور نیلے گیت گایا کریں گے:
'آہستہ رو گٹار
کالے موٹے کاہل ڈرمر کے ہاتھ میں ڈولتی سٹکس
اور سا کسو فون کا ایک بلاسٹ
پھر خامشی کا ایک طویل وقفہ'

جیسے اُس کے قدم ریچ کی برودت کے انتہائی منطقہ میں جا پڑے ہوں ہوائیں جو اُس کے رقص کی ساجھی ہونے کے لیے اُس کے پاؤں آ پڑی تھیں اُس کے اندوہ سے سُن ہو گئیں اور برف کے گرتے بن گئیں۔

اور وہ

جسے رقص میں قیام کے لیئے یا رقص کا کوئی انگ بتانے کے لیے پاؤں کی چھوٹی انگلی کا ذرا سا ناخن درکار تھا اب کیا رقص قائم کرتی کیا انگ بتاتی کہ اس کے پاؤں تو برف بن چکے تھے۔

جب اُس سے کھڑے نہ رہا گیا تو وہ ڈھیر کی طرح بیٹھ گئی اور اپنے پیروں کو دیکھنے لگی 'کیا یہ وہی تھے، جنہیں وہ اُڑائے پھرتی تھی؟' اور خود وہ اب اُن کے اوپر ضدِ مادہ کا ایک ذرہ تھی —— حقیر فرومایہ —— جو پسِ آئینہ رکھا گیا۔

اب اس کی شریانیں رُندھنے لگتی ہیں۔ نیلاہٹ کو مگر پیچھے نہیں دھکیلا جا سکتا جو ایک آخری رش کے ساتھ شریانوں کو درہم کرتی آنکھوں میں جا اٹکتی ہے —— اٹکے رہتی ہے وہیں ایک عرصہ۔ پھر قطرہ قطرہ اُس کے برف کے پیروں پر گرنے لگتی ہے —— دو بے وجود آنکھوں سے دو برف کے پیروں پر ٹپکتی نیلاہٹ جبکہ اُس کے اندر (وہ ان پتلے جالوں کبھی محسوس کر سکتی تھی کہ) کوئی اُسے ہوش میں لانے کو یا شاید سُلانے کو کچھ کہہ رہا ہے سُنا رہا ہے یا ..... آنکھ کھلنے پر اس نے اپنا سر جس کے زانو پر

پایا وہ اپنا تعارف کراتے ہوئے کہنے لگی:

'میں کتھا ہوں اور تم، میں جانتی ہوں خاموشی ہو۔ خاموشی جو اپنی فطرت پر قانع نہ رہ سکی۔ سو اس حال کو پہنچی۔ واہ! کیا کام کیا تم نے بھی کہ اپنے آپ پر عَلَم اُٹھا اپنا ہی قلعہ ڈھانے چل پڑیں .....'، خامشی نے کچھ کہنا چاہا کہہ نہ سکی۔ اُٹھنا چاہا اُٹھ نہ سکی سو پڑے پڑے گھلتی رہی اور گھلتے گھلتے اُس کا نیلا رنگ سیاہ پڑنے لگا اور انجام اُس کا یہ ہوا کہ فقط ایک ذرہ رہ گئی، سیاہ، جسے کتھا نے ہاتھ بڑھا کر پور پر لے لیا اور کاجل کی طرح ذرا سا اس آنکھ میں اور باقی اُس آنکھ میں رکھ لیا۔

خامشی اَب دو ہنگاروں کے بیچ ملے گی۔

اور جب جب کتھا گریہ کرے گی اور کاجل اس کی آنکھ سے بہے گا تو خامشی بادل بن کر اُٹھے گی اور سارے پر برس جائے گی۔ پھر ہر طرف سناٹا چھا جائے گا اور ہر چیز کو چُپ لگ جائے گی اور جب کتھا ہنسے گی تو خامشی مضحک پانی بن کر اس کی پلکوں پر آ رکے گی اور صوتی تتلیاں ہر طرف اُڑتی دکھائی دیں گی۔

اور موسیقی کے تمام آلات خاموشی کو گھر ہوں گے۔ سازندہ در ساز کھٹکھٹائے گا تو خامشی پوچھے گی: 'اَب کیا! کیا ہے اَب! بس مجھے اس کالے کونے کی کھاٹ پر پڑا رہنے دو۔ اَب یہ خراشی کھٹ کھٹ چہ معنی!!'۔

سازندہ دُھن کا پکا اگر جیوں چُپ درشتی کو دان کیئے ہے تو وہ پردۂ ساز کی اس بات پر نہ جائے گا۔ دستک دیئے جائے گا ..... اور یہ ایک اور دستک اور ساز سُر میں ہوا اور خامشی کو جیسے کوئی نافہ دے گیا اور یہ نکلی وہ محو و شخو پرم ہنس، —— پردۂ ساز توڑتی یہ پہنچی تاروں پر، اور لگی چوکڑیاں بھرنے اور تار بھی بودے ایسے دُبّو کہ اس پھول وتی تک کو سہار نہیں سکتے —— دہرے ہوئے جاتے ہیں اس کے پیروں تلے اور وہ تاروں کے بیچ کبھی باہر تلے اُوپر گرتی پڑتی اپنے جذب کی گھائل گھلتی گھلتی معدوم ہونے لگتی ہے کہ تاروں کا پل دو پل اُس کے جنوں کی مہمانی نہ کر سکنا ایک اور گھاؤ ہے —— سو وہ تاروں سے اُٹھ جاتی ہے۔

اب خاموشی

بے تال سُر زمزمہ ترانہ اور خیال کی بڑھت میں دکھائی دے گی۔

اور ہر آواز خاموشی کی اوتار بن کر آئے گی اور اطراف و اکناف میں چُپ کا پرچار کرے گی کہ ابتدا میں خاموشی تھی، انت بھی خاموشی ہے۔ سو اس بیچ دم سادھے رہو اور آواز کو کم کیئے رکھو کہ ہر وجود، خاموشی کا موجودات پر احتجاج ہے۔ بظاہر بے تُود، بڑبولا —— مگر اندر ہی اندر اپنا کام کرتا ہوا۔ تیز، کاٹ دار، کٹیلا۔ جگہ جگہ رخنے بنا کر موجودات میں خامشی کا ٹائم بم رکھتا ہوا۔

اور دو حرفوں کے بیچ رکھے رکھے خامشی نقطہ بن جائے گی اور نقطہ خامشی کو فراموش کر دے گا اور اپنے تئیں لکھوائے گا کہ ابتدا میں نقطہ تھا ..... وغیرہ۔ تب اس پر خامشی کا شراپ پڑے گا اور وہ تنہائی سے بولا کر اپنے سے کسی دوسرے کی کھوج میں نکل پڑے گا اور جب یہ کھوج روگ ہو جائے گا تو ودیا کہلائے گا اور ایک ودیا ہوگی کہ بھید کو ابھید کرے کرے گی اور ایک ہوگی کہ اپنی تجلید میں گُم بھید پر پہرہ دے گی۔

اور کوئی منچلا تجلید کو مٹی اٹا پردہ ہٹا کے اندر جھانکے گا تو ایک جھونکا مُشک و کافور لیئے اُسے ملے گا —— خامشی، جو اپنے مدھم روشنی سے لیپے زاویے سے نکل کر اُسے خوش آمدید کہتی ہے اور کاملائیں سوچتی ہیں کہ یہ منچلا تو گیا کام سے، اَب اس کے من میں بسے رہنے سے کیا حاصل۔ سو نکل جاتی ہیں اُس کے من سے سب کی سب۔ بس ایک رہ جاتی ہے —— منچلی —— اگن ایسی ایک لگن جو اُسی جھونکے کی تلاش میں جس نے کبھی مُشک بداماں اُسے خوش آمدید کہا تھا —— ایک پیلے آتشیں اُونٹ

پر بٹھاکر اُسے قدیم کتب خانوں یا چندھی آنکھوں والے ایسے کتب فروشوں کے پاس لیئے پھرتی ہے جو کتب فروشی سے زیادہ کُتب بینی میں دلچسپی رکھتے ہیں اور شاید اسی لیئے اُن ٹھنڈے مُشک بار جھونکوں کے ٹھکانوں سے خوب واقف ہوتے ہیں . . . . تو معروف راستوں سے ہٹے کسی کتب خانے کی نیم تاریکی میں کسی جگنوں پرانی پُستک کے ساتھ بلند بُھربُھری چھت سے آتی کرن کے راستے میں مشکل جگہ بناتے ہوئے پیلے کرم خوردہ اوراق پلکوں یا پوروں سے پلٹتے ہوئے، خائف، کہ وہ کہیں اور مجروح نہ ہو جائیں، یا کفایت سے کلام کرتے ہوئے اُس آدمی کے شک کی زد پر جسے خود نہیں معلوم کہ وہ کباڑیا ہے کہ کتب فروش، پہروں بہار بیٹھے، جبکہ گرد و پیش اطاق ہائے افسردہ میں کتب اور کباڑ گھل مل رہے ہوں گے، وہ منچلا اوراق میں جھانکتا شاید اپنی بینائی اُن کے بیچ رکھ دے، شاید کاغذ کی چھال میں قدیم اشجار کی باس سونگھتے ہوئے کتب میں زیادہ گہرائی تک اُترنے کی خواہش کے امر سے وہ کسی کیڑے میں منقلب ہو جائے۔ سو ہی ایک حکیم کہے گا:

کسی کتاب میں اگر تمہیں کوئی کرم ملے، کم قدر کیڑا —— تو اُسے کچھ مت کہو۔ شاید وہ کوئی منچلا مہم جُو ہو جو حرف و صوت کے سرچشموں کی تلاش میں اُدھر آ نکلا ہو۔ اس کی اعانت کرو۔ ہوا دھوپ کھلاؤ۔ اوراق کو کھول دو۔ اگر نامراد ہوا تو چپکے سے نکل جائے گا اور بامراد ہوا تو سرچشمۂ معنی کے ایک جُرعے سے پھر پہلے حال پر آ جائے گا۔

ایک بھورا اُوپر کہیں سے آ کے اجالے کی آنکھ میں پڑ گیا جو سُرمائی خُون شام ہو گئی۔ میں نے استفسار سے اوپر کتھا کی اور دیکھا تو ایک پور پلک سے چھوا کے اس نے ایک بھورا اور آن پانیوں پر رکھ دیا میں جن کی نچائی میں دیکھ رہا تھا۔ شام گہری ہونے لگی۔ دیکھتے ہی دیکھتے پانی بات بُھولن کے پانی بن گئے۔ فراموشی نے سایوں پرے سیاہ ہوتی کائی کو اُتار کر انہیں اپنا آپ اُڑھا دیا اور بحر فراموشی کی کوئی قدیم لہر بنا دیا۔

کیا سیفو کیا سروپاں کیا شیکسی کیا تائیس —— لکھنے والے تمام اور اُن کے لکھے ہوئے لوگ، اپائے دوپائے کیا چوپائے، جان دار، اجان، رینگتی تیرتی اُڑتی یا نیچے گڑی ہوئی، کسی کی یا خود تصنیف —— تمام چیزیں جو کہانیوں میں ہونگی —— اپنا نام کام کاج، بھلا کے اپنے اپنے سیپ میں لیٹ گئیں، خیال نہ کنج خیال نہ کوئی کلک،
سیپ نے پٹ بھیڑ لیئے۔

اب تو مجھے لپکا ہو گیا تھا اُس دنیا کا۔ بیٹھے بٹھائے میں کہتا: کھیل دکھاؤ۔ وہ مسکراتی اور کسی کھیل گر ہی کی طرح (جن میں سے بہت سوں کو میں بانی کے شہر میں دیکھ چکا تھا) ہاتھ پیچھے لے جا کر بالوں میں اُڑسا گلاب اُتارتی ذرا پہلو پر ہو کے اُسے ناف پر رکھ لیتی اور کھیل شروع۔

قبل از وقت میں بعد از وقت کا نظارہ صرف لاوقت کی تقدیر ہے۔

اور یہ جو میرے پاس، میری جان مُٹھی میں لیئے بیٹھی ہے —— کہانی، کوئی سمبندھ ضرور ہے اس کا لاوقت سے لیکن خود میں کیا ہوں؟ —— میں جو اس کے باہر ہوں اور اس کے اندر جانے کی ترشنا سے جل رہا ہوں —— کون ہوں میں؟ کہانی کیا ہے؟ اور ہم دونوں . . . . ؟

مجھے لالہ کا خیال آتا —— کیا پوچھوں اُن سے یہ ساری باتیں! کیا وہ بتائیں گے!

ایک دن وہ کھیل دیکھتے ہوئے میں نے محسوس کیا کہ کسی بات کی کمی ضرور ہے۔ کہانی دیکھ بھی کسی اور طرف رہی تھی اور بات بھی نہیں کر رہی تھی۔ پھول بھی اُس نے بے دلی سے اتار کر ناف پر رکھا تھا۔ لیکن کھیل ایسا تھا کہ میں اُس میں کھویا رہا۔ دلچسپ، نیا۔ کوئی نیا ٹیکنک، لیکھا کشمت یا کردار —— نیا جوالا مکھ نئی پریرنا ——

نئے پن کی یہ بہا بھی آہستہ آہستہ بڑھی تھی —— بڑھ رہی تھی۔ پہلے جب میں جَل میں جھانکتا، اُس میں رچے گاؤں کے نقوش ہوتے ہوتے ہی واضح ہوتے۔ بہت کچھ تو پھر بھی واضح نہ ہو پاتا اور کتھا کی مدد کے بغیر تو ایک قدم نہ چلا جاتا۔ اور اب اِدھر کتھا کتاب کا پھول ناف پر رکھتی اُدھر نجانے میں جَل گاؤں بھن بھن کرنے لگتا۔ لکھنے والے والیاں، نائیک نائیکائیں، واقعات، صورتِ وقوع، پہلے کے خیالوں اور خوابوں کی تجسیم ہو کر تیز تیز ہاتھ ہلاتے ہوئے بحثوں میں جُتے ہوتے —— پردہ اُٹھنے سے فوراً پہلے کی بیک سٹیج سرگرمی —— کہ کس کو سٹیج پر مرکز سے دائیں بائیں کہاں سے کتنے زاویے پر چلتے ہوئے کتنے قدم لے کر رُک جانا ہے اور گرد کو خود پر جمع ہونے دینا ہے۔ کس عرصہ کی کس گھڑی میں کس نے سینٹر سٹیج سنبھالنا ہے اور سماعت تمام آڈینس کو کیا کہنا ہے —— بعض کا اپنے مکالموں، موُوز اور بعض کا اپنے پارٹ ہی سے عدم اطمینان، بار بار اُن کا بھاگے بھاگے سکرپٹ رائیٹر کے پاس جانا، اُس کا کبھی سُننا، کبھی اَن سُنی کر دینا، جھنجھلانا کبھی سختی سے ڈانٹ دینا۔ اِدھر اُدھر کبھی کوئی تبدیلی کر دینا اور مناسب سمجھنا تو Improvise کرنے کی اجازت بھی دے دینا۔

And remember! none of you is to miss the cues.

کہانی دلگیر نہ ہوتی تو کیا کرتی۔ چیزیں باتیں اور واقعات کیا رُخ اختیار کر رہے تھے یہ واضح تھا اور صاف دکھ رہا تھا کہ جلد کچھ ہونے کو ہے۔ گاؤں اور گاؤں میں ہو رہے اس کھیل پر سے دھند رفتہ رفتہ چھٹنے لگی تھی۔ وقت کے ہونے کا سے ہو ہی گیا تھا شاید اور شاید جَل گاؤں کے رہن سہن اور رویوں اور Topography میں تیزی سے آتی تبدیلیاں اُس کی پیش رفت کا اشاریہ تھیں جسے کہانی مجھ سے بہتر سمجھتی تھی، اظہار نہیں کرتی تھی۔ شک اور یقین کے بیچ کی ڈگر پر رواں تھی جس کے دو رویہ بے یقینی سے بھری وسعتیں تھیں اور اتھاہ خاموشی جو دو ہنگاروں کے بیچ، اندر تھی باہر تھی۔

کہانی دلگیر نہ ہوتی تو کیا کرتی۔

اُس کی خاطر میں نے کھیل دیکھنا چھوڑ دیا۔ لیکن اُسے ایک بات کہنے سے اپنے آپ کو روک نہ سکا: "جس بات سے تم ڈرتی ہو۔ اپنی ٹوٹ، ٹوٹ پھوٹ، نوچ کھسوٹ وغیرہ، یہی تو تمہارے پھیلاؤ، تمہاری بڑھت کا کارن ہوگی اور اس میں تم مزہ بھی پاؤ گی" —— اپنی کمینگی کا احساس مجھے فوراً ہی ہو گیا لیکن بات تو منہ سے نکل ہی چکی تھی سوچا اُسے پوری کر ہی دوں: "اور یہ جو تم اپنے آپ پر فدا ہو گیا اتنی نرگسیت ٹھیک ہوتی ہے!" ——

اُسے چُپ لگ گئی۔ کچھ نہ بولی اور جب بولی تو جیسے کوسنے دے رہی ہو: "پہلے تو اپنی ہی پریمیکا کو غیروں کے آگے ڈالنا اور پھر سوچنا کہ اس سے وہ لذت بھی لے گی —— ارے تم نے تو مجھے بیسوا بھی نہیں جانا، مجھ ابھاگن کے بھاگ میں کیسا پریمی لکھا تھا!" —— مجھے ہنسی آتے آتے رہ گئی۔ اُس کی ناف کا پھول جسے اُجالتا تھا اور جس کی سیر ایک عرصہ اُس کی آزردگی کے خیال سے میں ترک کر چکا تھا، اُس جَل گاؤں میں جاتے رہنے سے میں اتنا تو جان ہی گیا تھا کہ بیسوا کیا ہوتی ہے اور کیا ہوا کرے گی۔ (کئی اُن میں سے شعر کہانی وغیرہ کہا کریں گی اور بہت نام کمائیں گی)۔

نیر جَل اُس کے گالوں پر بہا نہیں آنکھوں ہی میں جمع ہوا کیا اور جھیل بنی یہ آنکھیں ایک ٹک کہیں دُور دیکھا کیں ——

میں نے اُن میں جھانک کر اپنا عکس دیکھا اور اسی میں پکڑا گیا ——— وہ تو مجھ پر برس ہی پڑی: ' اور نرگسیت کا طعنہ تم مجھے دیتے ہو ——— ارے تم نے تو مجھے جیتے جی مار دیا ——— یہ ساگر تو جب آئیں گے تب تم نے تو تاؤ لے میاں ملے ہی کر لیا کہ یہ سنسار شروع ہو لیا، نارسس کی رستہ بن بھی چکی، سادی اور مسوگی اپنے پاپ لتھڑے طومار باندھ بھی چکے۔ تم نے تو ابھی سے مجھے اُن کی لکھتوں کی روشنی میں جانچنا شروع کر دیا ——— '

جو اُس کے رو دینے کا خیال نہ ہوتا تو کہتا کہ بھلی کب تک اپنے کو جُل دیئے جاؤ گی۔ یہ تو ہوا کہ ہوا بلکہ ہو ہی لیا سمجھو کہ آج تمہاری جبیں پر جو یہ نقطہ آیا ہے 'پاپ' یہ اُس ہون ہار کا ہی سایہ معلوم ہوتا ہے۔

میری اُس کی بہت بحثیں چل چکی تھیں اس بیچ۔ میں مانتا تھا اور یہ واقعہ تھا کہ یہ ابھی بنا نہیں تھا۔

' لیکن پھر یہ سب کیا ہے؟ ہم کیا کون اور کیوں ہیں؟ ——— میں نے اُس سے پوچھا تھا۔

" بات کرو تو مغالطہ، چپ رہو تو کچھ نہیں۔ یہ سب تو آسانیاں ہیں جو ہم نے ایک دوسرے کو سمجھنے سمجھانے کے لئے گھڑ لی ہیں، اور جب ہم ان کے جال میں اُلجھ جاتے ہیں تو پوچھتے ہیں کہ یہ کیا ہیں!! ——— کیا خاموشی کی لو ربھول گئے؟" ——— خاموشی کی لو یاد آنے پر وہ واقعی خاموش ہو گئی ——— پھر کہنے لگی: ' بس یہی تو ایک گڑبڑ ہے تم سے میرے سمبندھ میں کہ اِدھر تم نے مجھے باتوں میں لگایا اُدھر کیا کہوں اور کون کے نُیورتنے جاگ اُٹھے۔ اور بننے پڑے ہیں جیسے Catalyst گر گیا ——— لب، خیال اور آنکھ ماحول میں ہیجان پیدا کرتے ہیں"۔

" تو کیا چشم و لب کھولے ہی نہ جائیں ——— کچھ بھی سوچا نہ جائے؟"۔

" یہ تو میں نہیں کہتی ——— میں کہتی ہوں:

بولو، لب نہ کھولو

دھیان دو، دیکھو نہیں

سوچو سوچ کے بارے میں

خیال بن کر ——— '

" پھر بھی یہ سب کچھ تو ہو گا"۔

" یہی تمہاری کرید ہے جس سے مجھے ڈر آتا ہے کہ یہ اُن بننے پڑے کو پہلے Irritate پھر Accele-rate کرتی ہے۔ بس نہ گھورا کرو تم مجھے ایسے کہ جیسے کھنگال رہے ہو"۔

' یہ جاگر اور جگ کا نرمل گھلاؤ ہے ایسا کہ ایک کو ایک سے بتا نہ سکو۔ تم جگ پر ہو کہ جگ میں! میں جگہ میں ہوں کہ جگہ پر ——— پر اور میں ——— اِن اینڈ اون ——— میں (لدر) کا ارتھ کہاں ہے اور پر کا انت کیا 'میں' ہے یا 'میں' کا انت جاگر پر کی کوئی گھاٹی ——— جو تم دیکھتے ہو صرف وسعتیں ہیں جہات نہیں اور نہ ہوں گی کبھی۔ وسعتیں رہیں گی کہ یہ جگ اور جاگر کا امر چتر ہیں'۔

' اور نقطہ جو ہم ادا کرتے ہیں!'۔

'کہاں ادا کرتے ہیں ؟ ۔ میں تمہیں دیکھتی ہوں اور پا لیتی ہوں ۔ تم مجھے دیکھتے ہو اور پا لیتے ہو اور جب ہم بات نہیں کر سکتے تو بولنے لگتے ہیں اسی طرح جہاں کوئی غلطی کرے گا لفظ بنے گا ترسیل کا عجز، تفہیم کا عذر، لفظ ہمیشہ کسی ایک جگہ یا جگ کی کسر کا Chunk رہے گا ——— ہر لفظ معنی کا اسقاط ہے، ایک Miscarrige، ایک خوفناک غلطی جو باہر نکل کر زیادہ بھیانک غلطیوں کو جنم دے گی جن کو درست کرنے کے لیے اور .... اور .... اور لفظ بولے جائیں گے حتّٰی کہ واپسی ممکن نہ رہے گی اور الفاظ کا استعمال ترک کر دینے کے سوا کوئی چارہ نہ رہے گا ——— یہ وہ وقت ہو گا جب خاموشی کی سزا پوری ہو چکی ہو گی ۔ وہ عقوبت خانے سے نکلے گی اور سارے میں چھا جائے گی اور ساری باتیں سمجھ میں آنے لگیں گی'۔

پھر کسی بات پر مکالمہ ٹوٹ گیا یک لخت اور ایک گہری چپ میں ڈوب کر وہ ساحرہ تیز تیز ہاتھ ہلانے لگی جیسے رہی سہی باتوں کو گرہ دے رہی ہو ۔ گرہ کو اس نے کندھے کے اوپر ڈالا گویا بات کو، کہانی کو، حرف شبد کو گم کر دیا ۔ راہ کاٹ لی، مجھ سے سلسلے قطع کر لیئے ۔ جلدی جلدی ستاروں کی دھول میں اُگے کچھ پھول اس نے سرہانے رکھے اور آسمان کا ایک ٹکڑا اپنے اوپر کھینچ کر پہلو بدل لیا ——— اب اس کے ایک پاؤں کا صرف ایک حصّہ میرے سامنے تھا ۔

اُس کا خیال تھا کہ ساری صورتِ حال کا ذمّہ دار میں ہوں ——— میں ہی تھا جس نے اپنی واسنا بھری نظروں سے اُسے گانچھ دیا تھا ——— جس کے تلوؤں سے لگے لگے ہم کے بھورے وہاں چلے آئے تھے، کہیں اور سے ۔

یہاں غلط تھی وہ ——— 'اور چھور کچھ نہیں'۔ میں نے کہا تھا ۔ 'سب بھیتر ہے، باہر بھی بھیتر ہی ہے'۔

'باہر بھیتر سے مجھے تو لے ڈوبے، میں تو کہیں کی نہیں رہی نا ! ۔ ایک تمہارے کارن !

میرے کارن ! کیسے !

اور کہنا چاہیئے کہ یہ جاننے کے لیے ہی میں نے لکھا ہے جو لکھا ہے لکھ رہا ہوں جو لکھ رہا ہوں ——— لکھوں گا جو لکھوں گا ۔

آسمان کا کنارہ اٹھا کے وہ ایک نظر دان کرے شاید ——— میں اس اُمید میں مرتا ——— لیکن کہاں ——— اُس کے تو من میں کٹھور تا نے گھر کر لیا تھا ۔ میں پھر راہ لگ لیا ۔

اب سوچتا ہوں تو ——— کیا راہ ! ——— پانوؤں ہی کہاں تھے میرے کہ راہ پار اُتر سکتا ۔ کہنا چاہیئے کہ راہ ہی کوئی ہاں کہاں تھی جس کا پار اُپار ہوتا ——— بس کہانی نے مجھ سے پردہ کر لیا تھا یا میرے ہی ودیا وچار کی اس سے اوٹ ہو گئی تھی ۔

جب مجھے ہوش آیا تو میں اپنے گھر کے خوب جانے پہچانے آنگنے میں کھڑا تھا ۔ وہی وسعت وہی پھیلاؤ ۔ آکاش نہ دھرتی مگر پہاڑ اور دکھائی نہ دینے والے سوتوں سے گرتے آبشار، پھول، اُن کی دکھائی دیتی سگندھ، اور سگندھ کے رنگوں سے بنے گھونسلوں میں خانہ آباد وہی سازندے جن کا اپنا کوئی ساز نہ تھا ۔

ساکت کھڑے ٹہلتا ہوا میں اپنے آنگنے کے سراب کناروں تک گیا اور حدِ نظر تک پھیلے نوری سالوں میں گھورنے اور نا آفریدہ انواع کے پُرسکوت شور سے جی بہلانے لگا کہ میرے اندر اُس گھڑی دُکھ کی کنیاں پڑ رہی تھیں ——— مدھم ایک سار رچ جانے والی ۔

یہ تارے کیسے ڈانٹ رہے ہیں !؟ لو وہ تو اُن پر ٹوٹ ہی پڑے جو اپنے کھیل میں کھوئے ہیں اور لو یہ اُن کی گیند جنگلے میں گر کر ایک دو گڑے کھاتی آہستہ آہستہ اُس کے قریب آکر ٹھہر گئی جسے اُٹھا کر وہ دونوں ہاتھوں کی اُنگلیوں پر گھمانے لگا ۔

تبھی ٹھوریوں کے سیب جنگلے پر آ ٹکے۔ اس نے انہیں دیکھا، گیند کو انگلیوں پر اور دو ایک بار پھر ایا پھر باہر اچھال دیا ـــــ اور جب تک کہ وہ اپنی ہی اٹھائی دھول میں نہ ڈوب گئے انہیں گیند کے پیچھے بھاگتے دیکھتا رہا۔

کیا اُسے لالہ کی ڈانٹ کا خیال آ گیا تھا!

لیکن لالہ تھے کہاں!؟ ـ دکھائی دینا ایک طرف وہ تو محسوس تک نہ ہو رہے تھے۔ یا شاید اب میں ہی اُن کا ہونا محسوس نہیں کر سکتا تھا۔ مگر کیوں نہیں! کیا مجھ سے اوٹ میں ہو گئے تھے وہ!؟

جوں وہ ہر چیز میں تھے۔ جوں وہ کسی چیز میں نہیں ہیں۔ اچنبھا آبشار جو کسی ستارے کے پہاڑوں سے ہمارے آنگن میں گرا کرتا تھا ـــ میں نے لالہ کو اُس میں نہاتے دیکھا تھا۔

عناصر کو گوندھنے میں مصروف ـــــ عناصر کے بھیتر اور باہر بھی میں نے انہیں دیکھا تھا۔ کبھی تو میں اُن کی گود میں گر جاتا اور کبھی وہ آپ کسی درخت کی اونچی ٹہنی سے ٹوٹتے اور شگوفہ سا میری گود میں آ گرتے۔

اور کبھی بیٹھے بٹھائے بے بھاؤ کی بتانے لگتے ـــــ یوں کرو، یوں نہ کرو۔ وغیرہ۔ اور اب کوئی پوچھنے والا نہ تھا۔ میں کچھ بھی کر سکتا تھا۔ فاصلے سارے میرے ہو گئے تھے۔ کہیں بھی جاؤں یا نہ جاؤں اور سارے کار کاج بھی میرے، کچھ بھی کروں یا نہ کروں۔

میں نے فاصلوں میں جھانکا اور پھر ایک نظر اپنے پاؤں پر ڈالی اور بے روک پن کی ٹھنڈی ناطاقتی اُس کے اندر سرایت کرنے لگی۔ "کیا کروں گا میں یہ فاصلے لے کر۔ یہ تو خود رَد ہیں۔ جہاں سے کاٹو پھر اُگ آتے ہیں .... کوئی تو ہو جو اس سارے کو میرے لیے قابلِ فہم بنا سکے، جو بتا سکے کہ یہ سب کیا ہے!؟ ـــــ دونوں ہاتھ منہ پر رکھ کے اُس نے بھونپو بنایا اور فاصلوں میں پکارا:

یہ ..... یہ سب کیا ہے؟ کیا ہے یہ سب!

ایک کے پیچھے دوسری پکار۔ وہ پکارتا رہا ـــــ پکارتا رہا۔ پھر چپ ہو کر انہیں ایک کے پیچھے ایک لڑھکتے لاانتہا کی سمت رواں دیکھتا رہا ـــــ پھر وہ تمام پکاریں، سب کی سب پلٹنے لگیں ایک کے پیچھے ایک جیسے گئی تھیں اور آ آ کر اُسے چمٹنے لگیں جیسے اپنے منبع میں سمانا چاہتی ہوں۔

یہ

سب

کیا

کیا

یہ

سب

سب سب کیا کے پتھر اُس کے کانوں میں نیچے تک بھر کر وہ کسی چیز سے کُوٹنے اور ہر کوٹ میں قہر بھر کر پوچھنے لگیں:

یہ کیا کیا تم نے ہمارے ساتھ، کیا ہے یہ .....،

یہ فیصلے کی گھڑی تھی۔ کیا ہی اچھا ہو لالہ کہیں مل جائیں۔ اپنے تئیں زِچ، اجان مان کے اور گری ہوئی تمام چیزوں کی مجموعی گراوٹ اپنے پر طاری کر کے میں بڑی لجاجت سے کہوں گا: لالہ! ہٹائیں یہ پھولداری اور ختم کریں تماشہ، صاف سیدھے

بتائیں کر چکر گیا ہے۔ بعد میں طنابیں کھینچ لیں پھر بیٹھک۔

لالہ نہ ملے۔ میں نے بہت بھالا کہیں نہ دکھے۔ پھر بھی کوئی دوسرا قدم اُٹھانے سے پہلے، اُس نے سوچا کیا حرج ہے اگر سیدھے لالہ کو پکار کر دیکھ لیا جائے۔ ایک کو ایک۔ اور اُنہیں کہا جائے کہ میرے لیئے ایک اچھا سا راستہ نشان زد کر دیں۔ سو وہ پکارنے لگا: لا.... لا.... لاااا لاااا لاااا'۔ اور پکارتا رہا حتیٰ کہ آواز بیٹھنے لگی۔ بیٹھتے بیٹھتے سیٹی بنی۔ پھر سسکی۔ 'لالہ'۔ میں نے آخری بار سسکی میں کہا اور پُرسکون ہو گیا۔

کسی بات کے ہونے کا انتظار نہ

ہو جانے کا اندیشہ،

اضطراب

اور نہ ہی یہ آرزو کہ یہ کیفیت طول کھینچ لے۔

اور طول اُس اوستھا نے کھینچا بھی نہیں۔ کہ۔ یہ اُسی وقت ترخ گئی جب اُس نے محسوس کیا کہ کہیں سے کچھ آ کے اُسے لگا ہے اور اُسے ساتھ لیتا آگے نکل گیا ہے۔

'کیا یہ لمحہ تھا۔ پہلا!'۔ پہلے اُس نے پاؤں میں پھر گرد و پیش میں دیکھا۔ وہ وہیں تھا جہاں تھا۔ نہ کہیں پہ نہ اُس پر کچھ گزر رہا تھا۔ ہاں ایک سرگرمی ضرور تھی گرد و پیش میں۔ کسی حد تک غیر معمولی —— سب کچھ ٹھنڈی ذراتی چنگاریوں سے بھرا لگ رہا تھا۔ پھٹنے کو تیار —— ابھی .... اُس کے دیکھتے دیکھتے ہی ایک شرارہ اُس کی کنپٹی کے متوازی پھوٹا اور .... اور ڈوب گیا، پھر پرگٹ ہوا، پھر ڈوب گیا۔

'تو وہ لمحہ نہیں لمعہ تھا'۔

'اور لمحہ لمعان کیوں نہیں ہو سکتا' —— کسی نے اُس کے اندر کہا اور —— چین رخصت ہوا۔

وقت آ ہی پڑا آخر، اُس نے تلخی سے سوچا —— اور جو نہیں تو آ پڑے۔ جان چھوٹے۔

اُسے یاد آیا ایسے ہی کچھ شبد تھے جو ایک بار کتھا نے بھی کہے تھے جب وہ بے حد دلگیر تھی —— اور وہ جلا کُڑھا ایک طرف بیٹھا تھا۔ اُس کی کُڑھن کا کارن یہ تھا کہ ادھر اب اکثر اُس کے سوا بھی کئی چاہ وان کتھا کے گرد منڈلانے لگے تھے —— ستارے، بنے ادھ بنے۔ جنہیں بادل کے خمیر سے اُٹھے کچھ بھی دیر نہ گزری تھی جن کی ابھی آنکھیں تک پوری نہ کھلی تھیں۔ ٹمٹماتے تھے اور سمجھتے تھے کہ جھلملاتے ہیں —— جھلملاتے تھے اور سمجھتے تھے کہ دمکتے ہیں۔ پریمی نہیں، اُنہیں کتھا کے Suitors کہنا زیادہ مناسب ہوگا کہ کتھا کی طرف اُن کے اظہار میں ایک کچا پن تھا (یا شاید مجھے ایسا محسوس ہوتا تھا)۔ ایک ٹھٹھول۔ اُن میں سے ایک تو اُچھل پھاند کرتا گایا بھی کرتا تھا کہ۔ 'حسن تو کہانی ہے' —— وغیرہ۔ جب کا یہ ذکر ہے تب گنتی کی انتم سیماؤں کو چھوتے وہ دم سادھے ایک گہری اَن بجھ ترشنا سے اُسے دیکھ رہے تھے اور واسنا سے بھیگے لاس کی لالی اُن کے مونہوں سے پھوٹ رہی تھی۔ آخر اُن سے رہا نہ گیا اور وہ سب کورس میں کتھا کی مہما اور سندرتا کی پرشنسا کرنے لگے: 'پریہ درشنی! اوناشی! تمرے جوگ ہمارے پاس کچھ نہیں جو ارپن کر سکیں۔ ایک یہ جوت ہے جو ہمارا جیون ہے۔ بس یہی ہے' .... وغیرہ وغیرہ۔ پتہ نہیں کیا کیا۔ میں نے کہا نا مجھے جلن ہو رہی تھی۔ اور مجھے یاد ہے لانبے سنہرے بال پہلوؤں پر پھیلا کے کتھا نے اُمگا جوبن ڈھکا تو اَن گنت ستارے جان سے چلے گئے تھے۔ جاگرت سے دُکھی اُن میں سے کسی آنکھ سے ایک نیر بہا تو بھور بن گیا۔

بھورنے بھاؤ بتایا تو شام ہونے لگی۔ سو سویرا بھی ایک دُکھ ہے اور سانجھ بھی ایک دُکھ —— تو کوئی کیا کہے کہ وہ کیسی دِکھ رہی تھی جب وہ سَر کا سنہرا پن گھٹنوں پر رکھے بیٹھی تھی اور پھولوں کے رَس سے اُٹھ رہے بادل اُس کے ایک طرف ڈالے عنام پر بہتے ہوئے ڈول رہے تھے۔ کیا وہ جانتی تھی کہ میں اُس کے چاہ وان ستاروں کے ہجوم میں پھنس گیا ہوں !؟ میرا یہ سوچنا تھا کہ ستاروں سے اُوپر، اُن کی روشنی سے بھی اُوپر ایک اور روشنی پھیل گئی۔ نرم، ٹھنڈی —— یہ کہانی نے سَر اٹھایا تھا۔ میں اُچھل کھڑا ہوا اور ستاروں کے ہجوم کو چیرتا کہتا کی طرف بڑھنے لگا۔ جب میری نظر اس کی نظر سے ملی تو ایک اشارہ کیا اُس نے مجھے قریب آنے کا اور حیرت سے میں نے دیکھا کہ ستارے ڈوب گئے سب کے سب۔ کچھ تو جان سے چلے گئے۔ رَد کیا جانا کسے اچھا لگتا ہے! ستاروں کو بھی نہیں۔ یوں دھتکارے ہوئے بے توقیر وہ اپنے آپ پر گریں گے اور بھُوت بن جائیں گے، اوپر سے تلے تک منہ ہی منہ ہیبتناک سیاہ —— مگر یہی منتقم ناشتے پر زیادہ نہیں صرف ایک آدھ نظامِ شمسی لیا کریں گے —— بعض چیزیں ہار کو آبرومندی سے نہیں لیتیں۔ سو اب ہم دونوں رہ گئے تھے دو زخم خوردہ دشمنوں کی طرح ایک دوسرے کو لگاوٹ سے دیکھتے ہوئے۔ وہ مسکرائی۔ میں کھِل اُٹھا اور کھِل کر اُس کی طرف بڑھا ہی تھا کہ اُس نے ڈانٹ دیا: پَرے رہو اور پھر منہ موڑ کر آہستگی سے (جیسے اپنے آپ سے) بولی: اب ایسی باتوں سے کیا حاصل !' —— پھر ہم دونوں کے بیچ چُپ آگئی جیسے کانٹے چُبھے ہوں ایسی چُپ۔ یونہی اس چُپ کو بیچ سے ہٹانے کو میں بولا: 'اب تو بہت ہو گئے تمہارے چاہ وان، تمہیں دَم بھینٹ کرنے والے —' لیکن یہ کہتے ہوئے اُجلانے میں ایک کاٹ میرے لہجے میں آگئی تھی۔ وہ چمک کر بولی: تمہارے کارن، جو گابھ تم نے مجھے دیا اُس کے کارن اور اب میں پھر گربھ سے ہوں" ——

"مجھ سے !؟ ہاں ہاں کہہ دو "

'نہیں، تم سے نہیں، ستاروں سے —— میرا کرم کر تو یہ بتاؤ، کیا یہی رہ گیا ہے کہ گابھ اُٹھائے پھروں ایک کے بعد ایک، کیا میں محتاج ہوں .... ذریعہ نقل و حمل' —— یہاں وہ ٹھنڈی سانس لے کر چُپ ہو گئی۔ —— پھر کہا تھا: 'وقت آہی پڑا آخر —— یہ ستارے، میں جانتی ہوں، اُسی کے نقیب ہیں اُس ہون ہار کے۔ خیر ہو لے جو ہونا ہے —— اب کیا ڈر' —— پھر پتہ نہیں وہ اُونگھ گئی کہ سو گئی کہ نیند میں جگی رہی اور نیند میں کہے گئی: 'ایک خطہ جو نہیں تھا سو تھا جس پر کچھ نہیں تھا سو ہی سب تھا .... ہے۔ اور دوسرے خطے جو ہی ہونے سے نہیں ہوں گے اور اپنے کتنے کچھ ہی کتنے خالی —— اب کہاں میں اپنے کو اپنے آپ سے سُن سکوں گی۔ جتنے کاغذ اتنی کہانیاں۔ میری کون سُنے گا۔ بھانت بھانت کے قلم کارے پنرز (Penners) پین پُشرز (Penpushers)، رائٹرز قلم کلک چبھوئیں گے۔ ایک سے ایک کو کہیں گے کیا کہیں گے، کچھ کہیں گے ؟ —— اب آن پڑو اَو رشیہ ہونہار ! کوئی آنچ کی کسر رہ گئی ہے تو پوری کر لو کسی بھی طرح۔ آدھی بھالے لے کر آؤ۔ آؤ رَن جیت آؤ اور نہیں سہا جاتا یہ بیچ میں لٹکے ہونا۔ جانے دو مجھے اس حال میں جو اُس اور میں ہے جہاں ....' تب اُس کی یہ ہاری ہوئی باتیں مجھے اچھی نہ لگی تھیں اور اب جب مجھ سے اُس کی اوٹ ہو گئی تھی میں خود بھی اُسی کی طرح سوچنے لگا تھا۔

اب قرائن مبہم نہیں تھے۔ مگر ہوا ہی چاہتا تھا۔ اُس نے ہونا تھا اور پھر چل سو چل۔ Big Crunch تک خیمہ کوئی نہ پیڑ کی چھایا نہ کہیں بیٹھ لگانے کو سوکھا پتہ بھر جا کر .... اب ہو لیے تو بھگتو۔ بے آرامی سے معاملہ کرو۔ آرام چاہو ہو تو

کھینچو نہ ہونے کا انتظار۔

جیسے نہونا ہونے کا آئینہ ہو ایسے تھا وہاں سب کچھ اب۔

دَم سادھے ٹھٹکا کھڑا منتظر کہ کب نہون جَل اُترے اور وہ آئینے پر اپنا پانی چڑھا کر خود کو دیکھے۔ اُس نے سوچا کیوں نہ آخری بار نہونے کو چھو دیکھ کر محسوس کر لے پھر کون جانے کب موقعہ ملے، ملے کہ نہ ملے۔ اُس نے ایک پگ اُٹھایا نہونے پر دوسرا پھر تیسرا پھر رُکا اور مڑ کر دیکھا۔ کہیں اُس کے ایک بھی پگ کا نشان نہ تھا —— 'میں نے اُٹھایا بھی تھا کوئی پگ' —— اُس نے سوچا —— 'اور کہاں اُٹھایا تھا —— کس پر!' —— وہی دشائیں تھیں جن میں کوئی باٹ نہ تھی۔ جگہ نہ کوئی فاصلہ اور بیکراں مکان مکین کی تلاش میں سرگرداں۔ اُس نے سوچا، پاؤں آخر کسی چیز پر تو ٹکے ہیں۔ کچھ تو ہے اِن کے نیچے۔ جُھک کر اُس نے مٹھی بھری ہی تھی کہ ایک جھٹکے سے نیچے آ رہا۔ اور ایک ٹیس مٹھی سے رِستی ہوئی ریت پر بہنے لگی۔ 'مٹھی میں نے جس سے بھری ہے کیا وہی درد کا کارن ہے، دیکھوں مٹھی کھول کر!' —— کھولی تو کچھ نہ نکلا اور درد اتنا دیا تھا اس 'نا' نے جیسے یہ ہی سب کچھ ہو اور درد کے جانے پر جو درد رہ گیا تھا وہ ایک اور درد ہی تھا —— اپنے خالی پن میں ادھیک بھاری۔

وہ ایک گہرا سانس لے کر لیٹ گیا اور ساری باتیں رَش کر کے اُس کی طرف آنے لگیں۔ خود وہ، اُس کا گھر جو پھول کا شاہ بَر تھا اور بادر جو اُس پھول پر تیرتا رہتا تھا اور تیرتے تیرتے کبھی اُس جنگلے کو چھونے چلا جاتا جو کسی طرح کی کوئی سیما تھا یا کیا تھا۔ آنسو اُس کی کنپٹیوں سے پھسلتے ریت کو بھگو رہے تھے —— ایک ہاتھ بھیگی ریت پر رکھ کر اُس نے سر ٹکایا اور ایک پہلو پر ہو گیا۔ جہاں جہاں آنسو گرے تھے ریت کا اُتنا حصہ کٹ پھٹ گیا تھا جیسے کچھ نکل گیا ہو اُس میں سے —— سامنے تاحدِ نظر آئینۂ رنگ کے میدان تھے اور جہاں کہیں آئینہ میں بال آ گیا تھا چشمہ اُبل پڑا تھا۔ ایک ایسے ہی چشمہ کی لہروں پر اُس نے ایک پھول کو بہتے جاتے دیکھا —— آبِ آئینہ سے جنما ایک آوبھت پھول ابھی اُس کا کوئی بھید مرم مجھ پر اُدے نہ ہوا تھا کہ اُس نے اپنی ایک پتی گرا دی یا شاید وہ کوئی اور پھول تھا جو اُسی کی طرح کسی گہرے اندھکار سے طلوع ہو گیا تھا۔

پھر ایک اور پھول

اور ایک اور

اور اُن کے پیچھے میں نے دیکھا کہ ایک تختۂ گُل بہتے چلا آتا ہے۔ تب آئینۂ رنگ کے سارے میدان نور سے بھر گئے اور میرا سارا شوک جاتا رہا کہ وہاں تختۂ گُل پر میرا گھر دھرا تھا —— جس کے آنگن کے اُس آخر وہ کُٹیا تھی جو میں خیال کرتا تھا کہ لالہ کا ٹھکانہ ہے۔ آخر لالہ نے میری سُن ہی لی تھی —— 'تو پکاروں اُنہیں ؟'۔

نہیں میں کیوں پکاروں۔ بہت پکار چکا۔ اب کہیں وہ خود ہی جو کہنا ہے کچھ نہیں تو ایک ڈانٹ ہی پلائیں —— لیکن کچھ نہ ہوا۔

پھول آ آ کر تختۂ گُل کے ساتھ ٹھہرتے رہے کچھ نہ ہوا۔ میرا سارا اپنا پن ترشنا سے بے کل بلبلایا : 'لالہ' —— تب میں نے، اُتو کھے ہوئے میرے سارے اپنے پن نے —— پایا کہ کُٹیا کے عقب سے مجھے وہ جھانک رہی ہے : کیھتا! پر یہ درشتی۔ اور دبے پاؤں ایک خیال بنا پہلے سے کوئی خبر کئے دھیان میں چلا آیا۔ بس اُس خیال کا آنا تھا کہ ناقور ہو گیا اور سارے میں ہاہاکار مچ گئی اور،

الدھر! الدھر!

دیکھو!
کاؤن
لاوقت تمام ہوا
Lo!
Voila!
وقت آغاز ہوا

Voila Tout! —— کاکوفون کے پہلے 10^{-43} ویں پل میں میں نے دیکھا کہ وہ جانِ عزیز لاکھوں نوری فاصلے دُور جا رہی ہے۔ میں نے جلدی سے ایک پیار اُس کی اور روانہ کیا اور پاگلوں کی طرح ہاتھ ہلانے لگا:

الوداع زندگی!
الوداع!
طے دن کے وقت تک جب ناقور پھونکا جائے،
سمندروں کے بھڑک اُٹھنے تک جس روز کہ بچے بوڑھے ہو جائیں،
چکوتی کے دن تک الوداع
جس روز کہ چاند سورج جمع کیے جائیں . . .

شام، شہر اور بارش

عثمان خاور

تاشقند کا ایئرپورٹ قطعاً غیر مؤثر تھا۔ جہاز سے اترتے ہی پرانے ماڈل کی پر وقار بسیں مسافروں کو لے کر بغلی راستوں سے ہوتی ہوئی ایک بڑی عمارت کے پچھواڑے ایک برآمدہ نما راہداری کے سامنے رکیں۔ سمجھ میں نہیں آرہا تھا کہ یہ سابق کامریڈ پہلے تاثر کی اہمیت کو سمجھنے سے قاصر ہیں یا اپنے پاکستانی مہمانوں کے بورژوا جذبات کا ادراک کرنے سے عاری، کہ انھوں نے ہمیں ہوائی اڈے کی عمارت کے سامنے کے منظر سے محروم رکھا تھا۔ (بعد میں معلوم ہوا کہ عمارت کی تزئین و آرائش ہو رہی تھی) بسوں سے اترنے پر ایک ہڑبونگ کی کیفیت نظر آئی۔ اس طویل برآمدے کے آخری سرے پر امیگریشن کاونٹر تھا اور ہر مسافر اس مرحلے سے جلد سے جلد گزر جانا چاہتا تھا۔ مسافروں کی تعداد کچھ ایسی زیادہ بھی نہ تھی مگر نہ جانے یہ بے صبری ہمارے لاشعور کا حصہ کیوں بن چکی ہے۔ انسان اپنے ماحول اور مزاج کا کس قدر اسیر ہوتا ہے کہ اجنبی ماحول میں بھی کسی بھی پیش آمدہ صورت حال اس کے ردعمل کا تعین اس کی عادت ہی کرتی ہے۔ اور وہ ایسی حرکتیں کر بیٹھتا ہے۔ جو بسا اوقات جگ ہنسائی کا موجب بنتی ہیں۔

میں امیگریشن کاونٹر کے سامنے لگی طویل قطار کے ساتھ ساتھ رینگتا اب کاونٹر کے قریب پہنچ چکا تھا۔ میرے آگے اس پرواز سے آنے والی واحد مغربی خاتون کھڑی تھی اور حسب سابق چیونگم چبا رہی تھی۔ اس کے آگے کھڑا شخص اپنے کاغذات چیک کروا رہا تھا۔ میری باری آئی امیگریشن آفیسر نے پاسپورٹ کے لئے ہاتھ بڑھایا۔ میں نے فی الفور اس کی خواہش پوری کر دی۔ اس نے پاسپورٹ میں لگی تصویر کو دیکھ کر مجھے دیکھا اور پھر تصویر کو دیکھا۔ ویزا والا صفحہ نکالا۔ ہوٹل واؤچر چیک کیا، اور پاسپورٹ واپس کر دیا۔ پاس کھڑے محافظ نے ہاتھ کے اشارے سے مجھے آگے کا راستہ دکھایا۔ اب ہم ایک بڑے ہال میں تھے۔ یہاں ہمیں اپنے سامان کا انتظار کرنا تھا۔ اور امیگریشن فارم تھرنا تھے جس میں اپنے ساتھ لائے گئے سامان اور کرنسی کی تفصیل لکھنی تھی۔ فارم خریدنے کے لئے سو روبل کی ضرورت تھی جو ہمارے پاس نہ تھے۔ قبل اس کے کہ ہم اوروں کے آگے دست سوال دراز کرتے، عرفان اور نعمان آپہنچے اور کمال فراخ دلی سے سَو سَو روبل کی خطیر رقم ہمارے حوالے کر دی، جو ہمارے اگرچہ ڈیڑھ دو روپے سے زیادہ نہ بنتی تھی مگر اس وقت ہمارے لئے متاع بے بہا سے کم نہ تھی۔ ہم نے سَو سَو روبل کا نذرانہ دے کر فارم حاصل کئے۔ ان میں اپنے سامان کی تفصیل اجمالاً درج کی اور اپنے بیگ لے کر (جو اس دوران اپنے حاصل کر لئے تھے)، کسٹم کے کاونٹر پر جا پہنچے۔ بیگ کھول کر سامان کی تلاشی لی جا چکی تو حکم ہوا "شو کرنسی" (SHOW CURRENCY) یعنی جو کچھ جیب میں چپ چاپ باہر نکال دو۔ کیا غیر شریفانہ طرز عمل ہے کہ اچھے خاصے شریف آدمی کو بیچ بازار رسوا کر دیا جائے۔ اس کے ہاتھوں میں پستول تو نہ تھا مگر اس کی آنکھوں میں شک کی بارود بھری تھی۔ ہم نے عافیت اسی میں جانی کہ بارود کے پھٹنے کا انتظار نہ کیا جائے اور اپنے اثاثوں کا بلا تاخیر اعلان کر دیا جائے۔ اچھا ہے،

کامریڈ حقیقت جاننے کے بعد اپنے مطالبے پر خود ہی شرمندہ ہو گئے۔ ہم نے ڈرتے جھجکتے اپنی جیبیں خالی کیں اور ساری پونجی اُس کے ڈیسک پر ڈھیر کر دی:

وہ ہم نے دامن جھاڑ دیا، لو جام اٹھائے دیتے ہیں

"اونلی دِس؟ (ONLY THIS?) "بس یہی کچھ ہے؟

"کامریڈ بھائی! ہم نے کہا نہ تھا کہ اصل میں ہم سے بڑے پرولتاری ہیں۔ تم ہی ہمیں خواہ مخواہ بورژوا قرار دینے پر مصر تھے۔ اب بھگتو!"

اُس نے ہمیں جلدی سے بھگتایا اور اگلے مسافر کی جانب متوجہ ہو گیا۔ اب ہم سرکاری طور پر باہر جانے کے لئے آزاد تھے۔

یہاں سے فارغ ہونے کے بعد ہماری پہلی ترجیح ہوٹل کے نمائندہ محمد قاسم کو تلاش کرنا تھا جو ہمیں ایئرپورٹ سے ہوٹل لے جانے کا ذمہ دار تھا اور جسے سلمان مسلسل محمد قاسم فرشتہ (مشہور تاریخ نگار) کہہ رہا تھا۔ مگر سچ تو یہ ہے کہ تلاش بسیار کے باوجود محمد قاسم فرشتہ کی ہمارے فرشتوں کو بھی خبر نہ ہو سکی۔ بلکہ جتنے دن ہم تاشقند میں رہے، ہمارے فرشتے اس کا کھوج لگانے میں مکمل طور پر ناکام رہے۔ یہاں سے نکلنے کا راستہ ویسی ہی راہداری کی شکل میں تھا جس کے ذریعے ہم اس عمارت میں داخل ہوئے تھے۔ وہاں چند بنچ پڑے تھے جن پر کسٹم سے فارغ ہو چکنے والے ہمارے ہی بھائی بند براجمان تھے۔ ہم نے بھی اُن کے درمیان اپنی جگہ بنالی اور انتظار کرتے لگے کہ کچھ اور لوگ فارغ ہو کر آئیں تو باہر کی راہ لی جائے۔

یہاں اچھی خاصی رونق تھی اور پاکستانیوں کے علاوہ کافی تعداد میں مقامی چہرے بھی نظر آ رہے تھے۔ یہ وہ مخلوق تھی جسے عرفِ عام میں گائیڈ کہا جاتا ہے اور جس کے بارے میں ہمیں نوید سنائی گئی تھی کہ چاہیں تو مرد کو چن لیں اور چاہیں تو عورت کو۔ بہت سے لوگوں نے ہمارے سامنے یہاں کے خوبصورتی اور خصوصاً نسوانی حسن کے خوب خوب چرچے کئے تھے۔ "بڑی خوبصورت جگہ ہے کہ جی! کوہ قاف کا نام تو سُنا ہو گا۔ بس سمجھ لیں پریاں ہیں پریاں"۔

مگر ان میں صنفِ نازک کا تناسب بہت کم تھا اور ایک دو کو چھوڑ کر باقی سب گائیڈ "صنفِ کرخت" سے تعلق رکھتے تھے اور سارے کے سارے شاہِ جنات کے شاگرد لگتے تھے۔ ان میں سے ایک آہستہ آہستہ چلتا ہوا ہماری جانب آیا اور انگریزی میں کہنے لگا۔ "میرا نام انور ہے اور میں یہاں گائیڈ ہوں۔ اگر آپ چاہیں تو میری خدمات حاضر ہیں۔ میں آپ کو شہر کی سیر کرا سکتا ہوں۔ بلکہ آپ دوسرے شہروں کی سیر کو جانا چاہیں تو میں وہاں تک بھی آپ کا ساتھ دے سکتا ہوں"۔

ہم نے اُس بھلے آدمی کی پُرخلوص پیش کش کو ٹھکرانا مناسب نہ سمجھا اور وعدہ کیا کہ اُس کی خدمات سے ضرور فائدہ اُٹھایا جائے گا۔ اُس کا فون نمبر لے کر پاس رکھ لیا تا کہ بوقتِ ضرورت کام آئے۔

جب سے ہم ایئرپورٹ کی عمارت میں داخل ہوئے تھے ہم نے دو باتیں خاص طور پر نوٹ کی تھیں۔ ایک تو یہ کہ تقریباً ہر دوسرا آدمی اپنی بتیسی میں کم از کم ایک سنہری دانت لئے پھرتا تھا۔ ہم کافی دیر تک اس بات پر حیران رہے اور اس کی وجہ تلاش کرنے کے لئے خیالی گھوڑے دوڑاتے رہے۔ کیا کسی اجتماعی حادثے میں سب لوگ اپنے اکّا دکّا دانتوں سے ہاتھ دھو بیٹھے تھے یا ہر شخص اپنے منہ میں سونے کا دانت رکھ کر دراصل اس بات پر احتجاج کر رہا تھا کہ وہ منہ میں سونے کا چمچہ لے کر کیوں پیدا نہ ہوا تھا۔ بہرحال حقیقت اس کے برعکس تھی اور وہ یہ تھی کہ سنہری دانتوں کو یہاں امارت اور خوبصورتی کی علامت سمجھا جاتا ہے۔ بھلا امارت اور خوبصورتی کسے عزیز نہیں۔ اور وہ بھی جب اتنی آسانی سے ہاتھ آ رہی ہو۔ لہٰذا حتی المقدور ہر شخص اس

ارزاں نسخے سے استفادہ کرتا ہے اور یہ نسخہ بدصورتی اور غربت سے نجات کا قومی تعویذ بن چکا ہے۔

دوسری بات جو ہم نے نوٹ کی وہ یہ تھی کہ ایئرپورٹ پر کام کرنے والا تقریباً سارا عملہ روسی تھا۔ کلریکل سٹاف سے لے کر فرش صاف کرنے والی مائیوں تک سب کے چہروں پر "فرام رشیا ودلو" کی تحریر صاف پڑھی جا سکتی تھی۔ صفائی کرنے والی عام طور پر پکی عمر کی عورتیں تھیں اور سب نے ایک ہی جیسی وردی پہن رکھی تھی۔ سفید رنگ کی کھلی قمیض، سیاہ سکرٹ اور پاؤں میں کھلے سلیپر۔

آخر کار ہوٹل کا نمائندہ ہمارے پاس آ پہنچا مگر وہ محمد قاسم نہ تھا قربان تھا۔ "جن لوگوں کے پاس توران ہوٹل کے واؤچر ہیں وہ اپنے پاسپورٹ میرے پاس جمع کرا دیں۔"

"یا قربان! ہمیں ہوٹل کب لے جاؤ گے؟" ہم بے صبری سے پوچھا۔

"ابھی آپ لوگ انتظار کرے۔ تھوڑی دیر بعد باقی لوگ بھی آ جائے۔ پھر چلے گا۔" قربان سے مل کر اور اس کے منہ سے اردو سن کر ہماری ڈھارس بندھی کہ اب کم از کم رات فٹ پاتھ پر نہیں آئے گی۔

برآمدے میں اب ہونے لگا تھا۔ ماسکو سے ایروفلوٹ کی پرواز آنے والی تھی اور کافی تعداد میں مرد اور عورتیں یہاں جمع ہو چکے تھے۔ دوسروں سے الگ تھلگ ایک دبلی پتلی سی لڑکی شکستگی کی تصویر بنی کھڑی تھی۔ وہ دیوار کا سہارا لئے ہوئے تھی اور اپنے جذبات کو دل کے اندر سمیٹنے کی کوشش میں مصروف تھی۔ مگر جذبوں کی پوٹلی بار بار کھل جاتی اور جذبے اُس کے چہرے پر مختلف رنگوں کی صورت میں بکھرنے لگتے۔

میں جس جگہ بیٹھا تھا وہاں سامنے شیشے کی دیوار تھی اور اُس کے پار ایک کھلی جگہ تھی تین اطراف سے عمارتوں میں گھرا ہوا یہ کمپاؤنڈ جزیرہ نما کی شکل میں تھا جس کی چوتھی جانب ہرے بھرے پودوں سے مزین ایک سرسبز لان شروع ہوتا تھا اور اسی کے آس پاس کہیں شہر کو جانے والا راستہ بھی نکلتا تھا۔ کمپاؤنڈ میں مسلسل لوگ آ جا رہے تھے۔ لباس کے معاملہ میں یہ لوگ کافی خوش ذوق واقع ہوئے تھے۔ مکمل مغربی وضع قطع کے رنگ برنگے لباس وا قعتاً "اودے اودے نیلے نیلے پیلے پیلے پیرہن" کا منظر پیش کر رہے تھے۔ کمپاؤنڈ کیا تھا، ایک چمنستان تھا اور میری نظریں مسلسل اس کے پھولوں اور تتلیوں میں اُلجھی ہوئی تھیں۔ رنگ برنگے پیراہنوں کے درمیان ایک میلا آسمانی رنگ حرکت کرتا دکھائی دیا۔ ایک لمبا جبہ، نیچے فل بوٹ، اوپر نظر کی تو سر پر عمامہ نظر آیا اور چہرے پر سفید داڑھی۔ تو گویا اُس چمنستان میں یہ بوڑھا اور گھنا درخت بھی تھا جس کی جڑیں ماضی میں تھیں اور جس کی گھنی شاخوں کے نیچے روایت کی چھاؤں تھی۔ روایتی لباس میں ملبوس یہ بوڑھا مسلمان فقیر کمپاؤنڈ میں گھوم پھر کر وہاں کھڑے لوگوں سے خیرات وصول کر رہا تھا اور اُنھیں اپنی پُرتاثیر دعاؤں سے نواز رہا تھا۔ اس جدید لان میں نئے نئے کھلے ہوئے پھولوں اور اس بوڑھے پیڑ کے درمیان پاس پاس ہونے کے باوجود کتنے تہذیبی فاصلے پیدا ہو چکے تھے۔ مگر ہمیشہ سے ایسا نہ تھا۔ ایک وقت تھا جب یہاں ایک ہی تہذیب کی حکمرانی تھی اور اس کے سب مظاہر بھی ایک ہی جیسے تھے۔ دلوں پر اُسی کا سکہ چلتا تھا اور حکومت کے ایوانوں میں بھی یہ وہی تہذیب تھی جس نے عرب و عجم کی تمام وسعتوں کو اپنی شفقت بھری آغوش میں سمیٹ رکھا تھا۔ ماوراءالنہر کے یہ علاقے جب سے اسلامی برادری میں شامل ہوئے تھے یہاں علم و حکمت کے دریا بہنے لگے تھے۔ فقہ و حدیث کی روشنی بکھرنے لگی تھی اور اس روشنی میں یہاں کا ذرہ ذرہ دمکنے لگا تھا۔ ان لوگوں نے صنم خانے کا دروازہ بند کیا تو واقعی کعبے کی پاسبانی شروع کر دی۔ سرخ و سفید چہروں اور تیکھی آنکھوں والے یہ لوگ پوری دنیا کو توحید کا درس

دینے لگے۔ دور دراز کے ملکوں سے سفر کر کے طالبانِ علم کے قافلے سمرقند اور بخارا کی درس گاہوں میں پہنچتے اور علم کے چشموں سے اپنے شوق کی پیاس بجھاتے۔ وہ درس مکمل کر کے واپس اپنے اپنے علاقوں کو روانہ ہوتے تو اُن کی عباؤں اور عماموں کے ساتھ ساتھ عرفان و آگہی کی لہریں بھی سفر کرتیں اور ہر اُس جگہ پر اپنا جادو جگاتیں جسے اُن کی قدم بوسی کا شرف حاصل ہوتا ــــــ اور یہاں کیسے کیسے سورج چمک رہے تھے۔ کیسے کیسے صاحبانِ کمال تھے جنھوں نے اس سرزمین کو اپنا مسکن بنا لیا تھا امام اسمٰعیل البخاریؒ نے حدیث کی مشہورِ عالم کتاب "الصحیح البخاری" کی تدوین یہیں کی تھی۔ بے شمار علماء و حکما نے اپنے وقت کے انقلابی نظریات یہیں پیش کئے تھے۔ اَن گنت جگمگاتے ہوئے ناموں کی ایک طویل فہرست ہے جو کہکشاں کی مانند اُفق تا اُفق سب کچھ روشن کرتی چلی جاتی ہے۔ رازی، خوارزمی، البیرونی، بوعلی سینا، عبدالرحمٰن جامی۔ اُس زمانے کا کوئی باکمال شخص ایسا نہ تھا جس نے اپنے آپ کو علم و ہنر کے اس مرکز سے الگ تھلگ رکھا ہو۔

علم و تہذیب کا مرکز ہونے کے ساتھ ساتھ یہ خوشحال علاقے معروف تجارتی مراکز بنتے چلے گئے۔ یہاں بڑی بڑی بادشاہتوں نے جنم لیا اور عظیم سلطنتیں وجود میں آئیں۔ صدیوں تک اسلامی تمدن کا پھریرا یہاں لہراتا رہا۔ تاآں کہ انیسویں صدی میں زار شاہی کے ظالم سپاہی اور پھر بیسویں صدی کے آغاز میں کمیونسٹ روس کے سرخ فوجی یہاں یہاں آدھمکے اور پھر اس علاقے آہنی پردہ پڑ گیا۔ مسجدوں میں تالے ڈال دیے گئے اور مدرسوں کو مقفل کر دیا گیا۔ روسی تہذیب اور یورپی لباس کو وقت کی ضرورت قرار دیا گیا اور عباؤں اور عماموں کو بھکاری کے گلے میں ڈال دیا گیا۔ اب اگرچہ آہنی پردہ تو اُٹھ چکا ہے مگر تہذیبی بُعد کو مٹانے میں ابھی وقت لگے گا۔

ہمیں یہاں بیٹھے تقریباً دو گھنٹے گزر چکے تھے اور اب ہم کافی بوریت محسوس کرنے لگے تھے۔ اس کیفیت سے چھٹکارا پانے کے لئے ہم تین چار ساتھی باہر کمپاؤنڈ کی کھلی فضا میں آ گئے۔ ایک صاحب نے ٹائلٹ جانے کی ضرورت محسوس کی تو یکایک سبھی کو اس ضرورت کا احساس ہوا اور سب ٹائلٹ کی تلاش میں نکل کھڑے ہوئے۔ نعمان ملا تو کہنے لگا "یہاں پانی نہیں ہے البتہ ایئرپورٹ کے ریستوران میں ایک صاف ستھرا ٹائلٹ میں نے تلاش کیا ہے۔ آئیں میں آپ کو وہاں لے چلتا ہوں۔" ریستوراں کے قریب پہنچے تو کہنے لگا "آپ ایک ایک اندر جائیں اور کاؤنٹر پر بیٹھے شخص سے نظر ملائے بغیر پوری دیدہ دلیری سے ناک کی سیدھ میں چلتے جائیں۔ بالکل سامنے بیت الخلا ہے۔ فارغ ہو کر اُسی طرح کان لپیٹے واپس آ جائیں۔ یہ آپ کو بلائے یا پوچھے تو ہاتھ کے اشارے سے کہہ دینا 'میں نہیں سمجھتا'۔ میں نے بھی اُس کو زیادہ لفٹ نہیں کرائی۔ کافی آوازیں دیتا رہا ہے..... کابُتر۔ پیشاب کرنے کے پیسے مانگتا ہے۔" اُس ریستوران والے کی شان میں ہلکی سی گستاخی کرتے ہوئے کہا۔

اب اُس نامحرم سے آنکھیں ملائے بغیر اندر جانے اور واپس آنے کی پریڈ شروع ہوئی۔ میں اور نعمان دروازے پر کھڑے رہے اور باقی سب باری باری اُس کی ہدایات پر پوری طرح عمل کرتے ہوئے جاتے رہے اور آتے رہے۔ میری باری آئی مگر میں نظریں چرانے کی "بے مروتی" کی جرأت نہ کر سکا اور باہر ہی سے اُن کے ساتھ واپس چلا آیا۔

واپس پہنچے تو قربان باہر کمپاؤنڈ میں اپنے بے صبر عاشقوں کے جھرمٹ میں کھڑا تھا اور ہم سب کے پاسپورٹ اُس کے ہاتھوں میں تھے۔ اُس نے ہمیں جلد سامان لانے کے لئے کہا کہ اب کوچ کا ہنگام تھا اور کوچ ہمیں لے جانے کے لئے تیار کھڑی تھی۔ ہم جلدی جلدی سامان لینے اندر گئے۔ ماسکو سے آنے والی پرواز پہنچ چکی تھی اور مسافر اپنے استقبال کے لئے آنے والے عزیزوں سے مل رہے تھے۔ وہ دبلی پتلی الگ تھلگ سی لڑکی اپنی ماں کے سینے سے لگی کھڑی تھی اور آنسوؤں پر اُس کا بس نہیں

چل رہا تھا۔ ماں اُس کے تمتماتے گالوں پر بے تابی سے بوسے دے رہی تھی اور ہر سانس کے ساتھ ورد کرتی جا رہی تھی "نتاشا! نتاشا! نتاشا!" جواب میں فقط نتاشا کے آنسو تھے۔ ٹپ ٹپ گرتے آنسو۔ نہ معلوم اِن آنسوؤں کے پیچھے کیا تھا میں اُس سے پوچھ بھی تو نہ سکتا تھا۔ اُس کی آنکھیں بہت دور شمال میں ماسکو سے آنے والوں کے انتظار میں بھیگتی رہی تھیں اور میں جنوب کی پرواز سے آنے والا ایک پاکستانی مسافر تھا۔ بھلا یہ ازلی فاصلے کب ملنے والے تھے۔ میں نے جلدی سے اپنا بیگ اٹھایا اور باہر چل دیا۔

کوچ میں ہمارے علاوہ دس بارہ مسافر اور تھے۔ ہمارے ساتھ والی سیٹ پر سوٹ میں ملبوس وہی بزرگ آ بیٹھے جنہیں ہم اس سے بیشتر اسلام آباد ایئرپورٹ پر دیکھ چکے تھے "میرا نام معراج صدیقی ہے اور میں واشنگٹن ڈی۔سی میں رہتا ہوں"۔ "آپ سے مل کر بہت خوشی ہوئی"۔ میں نے سراسر رسمی جملہ ادا کیا۔ بعد میں جب انہیں قریب سے دیکھا تو ہم نے واقعی انہیں مل کر خوشی محسوس کی سچی اور قطعی غیر رسمی خوشی۔ انہیں ہماری گفتگو سے اندازہ ہوا کہ ہمارا تعلق بھیڑ بکریوں کے ریوڑ سے نہ تھا اور یہ کہ ہم جینوئن ٹورسٹ تھے اور ہماری دلچسپی کا اصل مرکز سمرقند و بخارا کے قدیم شہر تھے "آپ سمرقند اور بخارا کا پروگرام بنا رہے ہیں۔ اگر آپ پسند کریں تو ہم اکٹھے کر سکتے ہیں۔ دراصل مجھے بھی یہ شہر ہمیشہ ہانٹ (HAUNT) کرتے رہے ہیں۔ دنیا کے بہت سے ملکوں میں گھوما ہوں مگر یہ علاقے جہاں مسلمانوں کی جڑیں ہیں، رسائی سے دور ہی رہے۔ میری بڑی آرزو ہے کہ امام بخاری کے مزار پر فاتحہ پڑھ سکوں"۔ بزرگ جہاندیدہ بھی تھے اور دلچسپ بھی۔ چنانچہ ہم نے فوراً انہیں ساتھ چلنے کے لئے گرین سگنل دے دیا۔

ڈرائیور نے گاڑی سٹارٹ کی اور ہوائی اڈے کے اردگرد پھیلے ہوئے سبزہ زاروں میں ہوتا ہوا شہر جانے والی کشادہ شاہراہ پر نکل آیا۔ جوں جوں ہم آگے بڑھ رہے تھے، عروسِ شہر اپنے رخ سے نقاب الٹتی جا رہی تھی۔ سڑکیں چوڑی اور عمارتیں بلند و بالا تھیں۔ بیچ بیچ میں پھیلے ہوئے سبزے کے قطعات جیومیٹری کی مختلف شکلوں کی نمائندگی کر رہے تھے۔ جدید خدوخال رکھنے کے باوجود شہر بے روح نہ لگتا تھا۔ شام کے چھ بج رہے تھے اور ابھی غروب میں کچھ باقی تھا مگر شہر خاموشی کی چادر اوڑھ چکا تھا۔ لگتا تھا اس شہر کے باسی اچھے بچوں کی طرح سرِ شام گھروں کو لوٹ جانے کے عادی تھے۔ سڑکوں پر ٹریفک کم تھی اور اس کا شور اس سے بھی کم تھا۔ جتنی کچھ ٹریفک تھی، وہ ایک بے خروش ندی کی مانند اپنے کناروں کے اندر بہہ رہی تھی۔

آسمان پر بادل چھائے ہوئے تھے اور ہلکی ہلکی ہوا چلنے لگی تھی۔ یہ خنک ہوا، فضا میں پہلے سے موجود سکون آموز خاموشی سے مل کر شام کو مزید خوشگوار بنا رہی تھی۔ مختلف عمارتیں، سڑکیں اور چوک گزرتے جا رہے تھے۔ ہم بھی اُن پر ایک نظر ڈال کر آگے بڑھ جاتے کہ ابھی ان سے ہمارا تعارف ہونا باقی تھا۔ سڑکوں پر اکا دکا پیدل چلنے والے بھی نظر آ رہے تھے۔ اکیلے بھی، اور بانہوں میں بانہیں ڈالے راہ چلتے ہوئے جوڑے بھی۔

ہوٹل توران کے سامنے پہنچ کر ڈرائیور نے گاڑی روک دی۔ قربان ہمیں جلد آنے کا کہہ کر اپنے ساتھی سمیت نیچے اترا اور ہوٹل کی عمارت کے اندر چلا گیا۔ یہ کئی منزلہ عمارت پوری طرح پاکستانیوں کے قبضہ میں دکھائی دیتی تھی۔ لابی کے باہر اور پارکنگ کے اندر جتنے بھی لوگ نظر آ رہے تھے، سب پاکستانی تھے۔ جابجا تربوز کے چھلکے اور سگریٹوں کی خالی ڈبیاں بکھری پڑی تھیں۔

قربان کے ایک اشارے پر ہم سب نیچے اُتر آئے اور اپنے اپنے سامان کی صلیب اُٹھا کر اس کے پیچھے پیچھے چلتے ہوئے ہوٹل کی لابی میں داخل ہو گئے۔ باہر جھٹپٹا تھا اور اندر بلبوں کی مدھم روشنی۔ یہاں کچھ دیر انتظار کرنا تھا۔ لہٰذا سب لوگ اِدھر اُدھر پڑے صوفوں پر ڈھیر ہو گئے۔

ہمیں کمرہ نمبر ۸۱۱ الاٹ ہوا جو ظاہر ہے آٹھویں منزل پر تھا۔ لفٹ کے ذریعے آٹھویں فلور پر پہنچے اور فلور کاؤنٹر پر بیٹھی مادام سے چابی لے کر کمرے میں چلے آئے۔ ہمارا یہ عارضی مسکن چھوٹے سائز کا ایک کمرہ تھا جس میں دو بیڈ پڑے تھے۔ ریفریجریٹر، ٹیلیویژن، ٹیلیفون اور ریڈیو بھی موجود تھے۔ شیشے کی کھڑکی پر رنگین پردے لٹک رہے تھے۔ کمرے کا پچھلا دروازہ ہوٹل کے سامنے کے رخ پر بالکنی میں کھلتا تھا جہاں سے نیچے جھانکنے پر سامنے سے گزرنے والی سڑک اور اس کے پار پھیلا ہوا جنگل نما پارک نظر آتا تھا۔ باتھ روم میں ٹھنڈے اور گرم پانی کا انتظام تھا مگر روشنی نہ تھی۔ مادام کو مطلع کیا گیا۔ فوراً نیا بلب لے کر ایک صاحب پہنچ گئے۔ بلکہ اُن کے پیچھے پیچھے مادام خود بھی چلی آئیں۔ بلب لگنے پر باتھ روم روشن ہو گیا۔

"خراشو؟" (یعنی ٹھیک ہے) مادام نے استانیوں والے لہجے میں پوچھا۔ "اوچن خراشو" (بالکل ٹھیک ہے) ہم نے اچھے بچوں کی طرح جواب دیا۔ ہم کچھ دیر کمرے میں بیٹھ کر باتیں کرتے اور ماحول کی اجنبیت دور کرنے کی کوشش کرتے رہے۔ اُس کے بعد نہا دھو کر کپڑے بدلے اور کھانے کی تلاش میں نکلنے کا قصد کیا۔ چھٹی منزل سے عرفان اور نعمان کو ساتھ لیا اور نیچے آ گئے۔ پروگرام یہ تھا کہ پرانے شہر کے علاقے چانا زائی میں جا کر تکے اور کباب وغیرہ کا ڈنر کیا جائے۔

"چانا زائی۔" ہم نے ایک ٹیکسی روک کر پوچھا۔

"دا۔ دا"

"سلولکار دبلے؟" (کتنے پیسے؟)

"تھری تیسی چھا" (تین ہزار)

"نو۔ نو۔ ون تیسی چھا" اُس نے پہلے تو انکار کیا۔ پھر دو ہزار اور آخر ایک ہزار روبل میں چلنے کے لئے تیار ہو گیا۔

شہر کے پرانے علاقے میں سارے ہوٹل بند پڑے تھے وجہ سمجھ میں نہ آئی۔ واپس جانے لگے تو ایک جگہ نالے کے پل پر بیٹھے ہوئے ایک لڑکے نے ہمیں دیکھ کر نعرہ لگایا "تشلک" ——— "بس جا این جاست" عرفان نے ٹیکسی رکوائی۔ گوہر مراد ہاتھ آ چکا تھا۔ وہ لڑکا ہمیں ایک کچے احاطے کے دروازے پر لے گیا۔ لکڑی کے پھاٹک پر تالہ پڑا تھا۔ اُس نے آواز دے کر گیٹ کھلوایا ہمیں جلدی جلدی اندر داخل کیا اور گیٹ پر پھر تالہ ڈال دیا۔ "پولیس، پولیس" اُس نے ہمیں سمجھاتے ہوئے کہا۔ "یا خدا ہم کسی غلط جگہ تو نہیں آ گئے؟" اُس کے انداز نے ہمیں پریشان کر دیا تھا۔ بعد میں پتہ چلا کہ پولیس کی جانب سے انھیں آٹھ بجے کے بعد کاروبار نہ کرنے کا سختی سے آرڈر کیا گیا تھا۔ احاطے میں داخل ہوئے تو سب لوگوں نے سر اٹھا کر اور گردنیں گھما کر ہماری جانب دیکھا۔ ہم نے "السلام علیکم" کا اسلامی ہتھیار استعمال کیا اور ایک وار میں سب کو شکار کر لیا۔ ماحول کی اجنبیت بڑی حد تک دور ہو چکی تھی۔ فضا کچھ اس قسم کی تھی جیسے ہم پشاور کے کسی دیسی ہوٹل میں کڑاہی گوشت کھانے آ گئے ہوں۔ صرف چٹائی یا چارپائی کی جگہ پرانی کرسیاں اور ایک ناہموار ٹانگوں والا میز رکھا تھا جس چھت کے نیچے ہمیں جگہ ملی تھی وہاں چند اور افراد بھی چپ چپیتے کھانے میں مصروف تھے۔ لگتا تھا کھانا نہیں کھا رہے، چوری کی چُوری کھا رہے ہیں۔ کچھ عجیب سی بات تھی۔ صرف کباب کھانے پر یہ سختی!

"جانے دیں سر جی!" یہ صرف کباب کی بات نہیں لگتی۔ ہو سکتا ہے یار لوگوں نے ساتھ شراب اور شباب کے قاتلے بھی ملانے شروع کر دیئے ہوں۔ عرفان کا تجزیہ اتنا غلط بھی نہ تھا۔

ہوٹل والا آرڈر لینے آیا۔ عرفان نے اپنی محدود روسی کا لامحدود استعمال کرتے ہوئے اُسے بہت کچھ کہا۔ اُس نے کچھ سمجھتے اور کچھ نہ سمجھتے ہوئے سر ہلایا اور چلا گیا۔ "میں آپ ہی جاواں" عرفان نے کرسی سے اٹھتے ہوئے کہا۔ "پتہ نہیں کیا اٹھا لائے۔" شاید اس کی زبان دانی کو اپنی

کم مائیگی کا احساس ہو چکا تھا۔ کھانا آیا تو شٹشلک یعنی تکوں اور کبابوں کی سیخوں سے پورا میز بھر گیا۔ بچے کھچے کونوں میں خلیب (یہاں کی خشک اور سخت روٹی) کی پلیٹیں سجادی گئیں بشٹشلک بڑے مزے کے تھے مگر خلیب نے ہمیں ناکوں چنے چبوا دیئے اور اسے حلق سے اتارنا واقعتاً مشکل ہوگیا۔ "اوے چھوٹے!" نعمان نے بے ساختہ آواز لگائی۔ بہرحال "چھوٹا" آیا جو دراصل کافی بڑا تھا۔ ہم نے اُسے کوک لانے کے لئے کہا۔ "کوکا کولا نے اَت" (نہیں ہے) اُس نے ہاتھ نچاتے ہوئے کہا۔

"کوئی سوڈا شوڈا۔ کوئی بوتل شوتل" نعمان ترنگ میں تھا۔ ہم سب کھلکھلا کر ہنس دیئے۔ سوڈے کے نام پر ویٹر کی آنکھوں میں چمک آئی اور سر ہلاتا ہوا چلا گیا۔ نعمان بھی اُٹھ کر اُس کے پیچھے پیچھے چل دیا۔ واپس آیا بوتل شوتل اُس کے ہاتھ میں تھی اور ویٹر اس کے ساتھ تھا جس نے ٹرے میں ہمارے لئے سوڈے کی بوتلیں اٹھا رکھی تھیں۔ ہم نے سوالیہ نظروں سے نعمان کو دیکھا۔ "یہ جو بوتلیں آپ کے لئے آئی ہیں"۔ اُس نے "آپ" پر زور دیتے ہوئے کہا۔ "ان میں سوڈا واٹر ہے جو معدے کے لئے بہت اچھا ہے۔ یہاں کے لوگ اکثر استعمال کرتے ہیں۔"

ہم نے بوتلوں کے منہ کھولے تو نوالے حلق سے اترنا شروع ہوگئے۔ "ویسے اسے یہاں کی بیئر ہی سمجھیں۔" وہ تھوڑی دیر بعد بولا۔ "لیکن یہ کوئی نقصان دہ چیز نہیں ہے۔"

"خدا کو مانو یار! یہ بیئر کیسے ہوسکتی ہے۔" ہمارے حلق سے اُترتے ہوئے گھونٹ خلیب کے سخت نوالے بن کر وہیں پھنس گئے۔ اُس نے کوئی جواب نہ دیا۔ شاید اُس نے ہمارے ساتھ مذاق کیا تھا کیونکہ صاف ستھرے ذائقے والے اس مشروب میں ہمیں خطرے کی کوئی علامت نظر نہ آئی تھی۔ ویسے بھی آدھی آدھی بوتل ہم پہلے ہی چڑھا چکے تھے۔ ہمیں اُس کی بات کا قطعاً یقین نہ آیا مگر شک نے منہ میں ریت بھر دی۔ چنانچہ اُس کے بعد ہم جتنے دن وہاں رہے لیمونیڈ کے استعمال کو معمول بنائے رکھا۔

کھانا کھا چکے تو ڈنر کو مکمل کرنے کے لئے چائے کی خواہش ظاہر کی۔ ہوٹل والے نے بڑے اہتمام سے چائے کی ہی ابالی اور خالی قہوہ لا کر ہمارے آگے رکھ دیا۔ نہ دودھ نہ چینی۔ تو یہ یہاں کی چائے تھی۔ مگر اتنی خالص چائے تو ہم نے کبھی نہ پی تھی جس میں چینی تک کی ملاوٹ نہ ہو۔ دودھ تو خیر مشکل ہے، میں چینی ڈھونڈنے کی کوشش کرتا ہوں۔" اب کی بار پھر عرفان اٹھا۔

"ہیلو! چینی۔ شوگر۔ ویئر از شوگر؟" اُسے چینی کا مقامی متبادل لفظ نہیں سوجھ رہا تھا۔ "آئی ایم شوگر" پاس کے ٹیبل سے آواز آئی ہم سب کی نظروں نے اس آواز کا تعاقب کیا اور پھر ہنسی کا فوارہ ابل پڑا۔ وہاں ایک مقامی شخص بیٹھا تھا اور سینے پر ہاتھ رکھ کر عرفان کو یقین دلا رہا تھا کہ تمہارا گوہرِ مقصود میں ہوں۔ اس غیر متوقع جواب پر عرفان سٹپٹا گیا۔ "نو نو، شوگر،" اس شخص سے پیچھا چھڑاتے ہوئے کہا۔ "نو... شوگر؟" "مائی نیم از شوگر"۔ اس شخص نے پھر اصرار کیا۔ مارے ہنسی کے ہمارا بُرا حال ہو رہا تھا۔ عرفان نے روہانسا ہو کر سینے پر ہاتھ باندھ لئے اور کمر تک جھک کر پنجابی میں اس کی شان بیان کی۔ اور واپس آکر بیٹھ گیا۔ "دوستو! اس سے پہلے کہ اب کوئی مسٹر ملک بیک اٹھ کھڑا ہو، جو کچھ سامنے پڑا ہے اسے چائے سمجھ کر پیو اور یہاں سے چلو۔" چنانچہ اُس کاڑھے ہوئے سیاہ محلول کو ہم نے چائے سمجھ کر پیا اور اُٹھ کھڑے ہوئے۔ ہمارا ڈنر خاصا دلچسپ رہا تھا۔

ہماری چائے نوشی کے دوران پولیس بھی آپہنچی تھی انھوں نے گیٹ کی درزوں سے اندر جھانکا اور دستک دے کر دروازہ کھلوایا اور اندر آکر اِدھر اُدھر دیکھا، ہوٹل والوں سے پوچھ گچھ کی اور پھر سامنے بیٹھ کر کنکھیوں سے ہم چائے پیتے ہوئے پاکستانیوں کو دیکھنے لگے۔ ہم نے پاس سے گزرتے ہوئے سلام کیا۔ "وعلیکم السلام" سب نے بیک آواز جواب دیا۔

"مسلمان؟" ہم نے مزید بے تکلف ہونا چاہا۔

"الحمدللہ مسلمان۔" انھوں نے سینے پر ہاتھ رکھ کر اور گردن کو تھوڑا سا خم دے کر نہایت خشوع و خضوع سے جواب دیا

رات کے گیارہ بجے کے قریب باہر نکلے تو شہر سنسان پڑا تھا۔ خالی سڑک، کنارے کے ساتھ ساتھ بنے ہوئے مکانوں کی مدھم روشنی میں دور تک لیٹی ہوئی تھی۔ بوندا باندی شروع ہو چکی تھی اور ہر لحظہ تیز ہوتی جا رہی تھی۔ ہوا میں خنکی آ چلی تھی۔ ہم نے تھوڑی دیر ایک جگہ کھڑے ہو کر ٹیکسی کا انتظار کیا اور پھر اس کا کوئی امکان نہ پا کر سڑک کے کنارے کنارے چلنے لگے۔ بجلی چمکتی تو نیند میں ڈوبے ہوئے شہر کو لمحے بھر کے لئے ازلی روشنیوں نہلا جاتی اور ہمیں اپنے سروں پر تیزی سے گرتی ہوئی بوندوں کا ایک لامتناہی سلسلہ آسمان سے زمین تک پھیلا ہوا دکھائی دیتا۔ اگر ٹیکسی نہ ملی تو ہوٹل کیسے پہنچیں گے۔ اس بھرے شہر میں ہمارے لئے کوئی اور پناہ گاہ نہ تھی۔ ہم یونہی سر نیہوڑائے چلتے رہے۔ کچھ دیر بعد پیچھے سے آتی کسی گاڑی کی آواز سنائی دی۔ ہم نے گردنیں گھما کر دیکھا۔ صرف آواز تھی جو کہیں قریب سے آ رہی تھی گاڑی نے موڑ کاٹا تو اس کی تیز لائٹیں سیدھی ہماری آنکھوں میں پڑنے لگیں۔ ہم سب نے بے محابا ہاتھ ہلانے شروع کر دیئے۔ گاڑی کی روشنیاں گیلی سڑک پر پھسلتی ہوئی آخر ہمارے پاس آن رکیں۔ یہ ٹیکسی ہی تھی۔ مگر اس میں پہلے ہی ایک سواری موجود تھی۔

"یلن گرات: اوتل قوران" ہم نے اپنی منزل کا پتہ بتایا۔ اس نے سر کے اشارے سے ہمیں بیٹھنے کے لئے کہا۔ اور وہیں بیٹھے بیٹھے ہاتھ بڑھا کر پچھلے دروازے کھول دیئے۔ ہم سب پھنس پھنسا کر پچھلی سیٹ پر براجمان ہو گئے۔ پہلے والی سواری راستے ہی میں اتر گئی۔ ڈرائیور ہمیں راستے میں گزرنے والی سڑکوں اور عمارتوں کے نام بتاتا۔ اور اب اس کی خواہش تھی کہ ہم اسے تاشقند کے بارے میں اپنے تاثرات سے آگاہ کریں۔ "بہت اچھا ہے۔ ایک دم اچھا" میں نے اسے بتایا۔ اس کی باچھیں کھل گئیں "دا۔ دا"

"پاکستان گڈ؟" اس نے پوچھا۔

"پاکستان ویری، ویری، ویری گڈ" نعمان نے بے تابانہ جواب دیا۔ اس بار اس کی "دا۔ دا" کھلے منہ کی ہنسی میں تحلیل ہو گئی۔ وہ نعمان کے انداز سے بہت محظوظ ہوا تھا۔

ہوٹل کا دربان کمزور بلب کی زرد روشنی میں اپنی کرسی پر اونگھ رہا تھا۔ ہمارے فلور کا کاؤنٹر بھی خالی پڑا تھا۔ کمرے میں پہنچ کر میں نے پردے ہٹائے۔ اور کھڑکی کھول دی۔ سامنے والے جنگل سے نم آلود ہوا کا جھونکا آیا۔ اس میں گیلی مٹی کی مہک تھی۔ رات کا آدھا پہر گزر چکا تھا۔

نثر پارے

ارشد علی

یہ کیسا طرزِ زندگی ہے جس میں کانوں کو بند اور زبانوں کو بلند کیا جا رہا ہے۔

بہار پھر لوٹ کے آئی ہے ــــ موسموں کا ایک اور چکر پورا ہو گیا ہے ــــ وقت نے اپنے شکنجے کا ایک اور بل کس دیا ہے۔

ایک طرف کا منظر اتنا حسین ہے کہ دوسری طرف کوئی دیکھتا ہی نہیں ــــ اور پھر اس نہ دیکھے جانے سے ــــ وہاں بھی ایک طرح کا حُسن پیدا ہو جاتا ہے۔

پہاڑی علاقے میں فاصلہ اکثر دھوکا دے جاتا ہے ــــ دُور سے بلندیاں یوں جڑی ہوئی دکھائی دیتی ہیں ــــ کہ ان کے درمیان کسی نشیب کی موجودگی کا احساس ہی نہیں ہوتا ــــ بس یہی حال ہماری تاریخ کا ہے ــــ جس میں شاہوں اور کج کلاہوں کے درمیان ــــ عام آدمی کی شباہت ہی گُم ہو گئی ہے۔

ایک طرف کی زنجیر کھلتی ہے ــــ لیکن دروازے کو اُدھر سے مقفل پا کر پھر چڑھا دی جاتی ہے ــــ تھوڑی دیر بعد دوسری طرف بھی یہی عمل دوہرایا جاتا ہے۔

عجب تنہائیوں کے میلے ہیں ــــ ایک آدمی اکیلا ہے ــــ اور دو اکیلے اکیلے ہیں۔

گھاس کی پتیوں میں راستہ ڈھونڈتی چیونٹی ــــ تو آگے بڑھنے کی کوشش میں ــــ لایعنی بلندیوں کی طرف جا رہی ہے۔

بارش کے بعد رابطے بحال ہوئے تو رکی ہوئی خبروں کی برکھا شروع ہوئی ــــ اور اس دوران میں ہونے والے واقعات کا ذکر اس انداز میں کیا گیا ــــ جیسے ان کا ذمے دار موسم ہو۔

آج سے بیس سال پہلے — میں نے ایک بہت زوردار سچ بولا تھا — لیکن اب میں اور میرا سچ دونوں — بوڑھے ہوگئے ہیں۔

ٹیٹری — انڈے بھول گئی ہے کھیت میں — اور دوڑتی ہے بولاتی ہوئی — منڈلاتی ہے آنے جانے والے کے سر پر — جیسے کہتی ہو "تمہی ہو چور میرے" — "ٹیں ٹیں وٹ، ٹیں ٹیں وٹ" — کتنا کرخت ہے اس کا یہ احتجاج! — اے لمبی ٹانگوں والے نادان پرندے! — ٹکریں نہ مار — کھوئی ہوئی چیز کو انا کا مسئلہ نہ بنا — تلاش میں وقفہ رکھ — اور اس بات کو تقریباً بھول جا — کہ بھولی ہوئی بات — لہر کی طرح لوٹ کے آتی ہے — گہرائیوں کے گوہر لاتی ہے۔

فطری طور پر داڑھی مونچھ سے محروم شخص کی کمسنی — اور ابر آلود دن کی صبح — دونوں کا تاثر بہت بعد تک رہتا ہے۔

ہم تو پھر خطاکار انسان ہیں — اپنی حدوں میں وسعت کے لیے — نقش برآب دائرے دست و گریبان ہیں۔

درختوں نے مجھ سے کہا — "تم شام کو ہمارے پاس نہ آیا کرو — پرندے ساری رات کے لیے کوچ کر جاتے ہیں"

پنجرے میں بند پرندہ — آہستہ آہستہ اس زعم کا شکار ہو جاتا ہے — کہ رہائی ملنے کی دیر ہے — وہ آسمان کے کناروں کو چھو لے گا۔

بھینس پیتی ہے تو جوہڑ واضح طور پر گھٹنے لگتا ہے — بھینس ذرا جنبش کرتی ہے تو جوہڑ اس سرے سے اُس سرے تک ہل جاتا ہے — بھینس واقعی غصے میں ہو تو پورے جوہڑ کا رنگ خاکی ہو جاتا ہے — بھینس بے چاری بھی کیا کرے — وہ بڑی ہوگئی ہے — اور اب یہ جوہڑ اس کے لیے چھوٹا ہے۔

جب کوئی بہت دور کا منظر مجھ پر کھلتا ہے — تو یہ محض میری بینائی کی رسائی نہیں ہوتی — بلکہ میں اپنے پورے وجود کے ساتھ — اس مقام سے کہیں آگے نکل جاتا ہوں — جہاں تم ظاہری طور پر — مجھے دیکھ رہے ہوتے ہو۔

عزت افزائی کرتے ہو جو کہتے ہو کہ حیوانات ہیں — ورنہ یہ موسم کے ساتھ ہرے ہونے والے — موسم کے ساتھ سوکھ جانے والے — دھرتی میں گڑے ہوئے لوگ تو نباتات ہیں۔

یہ گردشِ پیہم بھی تو اک جمود ہے — اس سے نجات پانے کے لیے — تبدیلی لانے کے لیے — کچھ حرکت ہونی چاہیے — میرا مطلب ہے — ذرا رک جانا چاہیے۔

میں بول بول کے تھک گیا تھا — انہوں نے میری آواز میں آواز ملائی بھی تو اس طرح — جیسے بارش کا پانی چشمے کو گدلا کر دے۔

جب سے احباب نے اپنا وزن — حریف کے پلڑے میں ڈالا ہے — میں اور بلند ہو گیا ہوں۔

دن ڈھلے جب چرواہے وادیوں سے کوچ کر جاتے ہیں — تو جھاڑیوں اور بلوں میں دبکے ہوئے جانور — کھلی فضا میں آ کر آزادی کی جے بولنے لگتے ہیں — لیکن بہت جلد باہمی اختلافات کے باعث — ان میں سے بہت سوں کو پھر روپوش ہونا پڑتا ہے۔

ایک عورت کے بوکے میں کنوئیں کا ایک جدی پشتی مینڈک آ گیا — اُس نے باہر نکلتے ہی بڑے فخر سے کہا — "میں عالمِ بالا کی سیر کرنے والا اس کنوئیں کا پہلا مینڈک ہوں" — اور اپنی یہ امتیازی حیثیت منوانے کے لیے پھر کنوئیں میں کود گیا۔

سرِ شام — کیکر کے سیدھے تنے پر — اپنی مخصوص جگہ عموداً بیٹھا — میلے رنگ کے ایک بھونرے کو میں کئی دن تک دیکھتا رہا — "یہ شب بسری کے لیے آتا ہے اور کتنا پیار ہے اسے اپنے ٹھکانے سے" — میں سوچتا — پھر ایک روز دن کے کسی اور سمے میرا وہاں سے گزر ہوا — وہ اب بھی وہیں ڈٹا ہوا تھا — "ہے نا مَردوں والی بات!" — میرا دیہاتی پن بے اختیار کہہ اٹھا — پھر یونہی ایک تنکا سا سرسرایا — میں اور قریب آیا — مَردوں والی بات مُردوں والی بات نکلی — کھوپڑی میں چھید کر کے چیونٹیاں اندر کا صفایا کر گئی تھیں۔

اگر میں پسِ دیوار ہوں — تو تم بھی — جو دیوار کے اُس پار ہو — پسِ دیوار ہو۔

خبریں اس تیزی سے آ رہی ہیں کہ لوگ تبصرہ بھول گئے ہیں۔

گاہک ادھار لینا چاہتا ہے — عورتیں لڑنا چاہتی ہیں — تانگے والا گالی دینا چاہتا ہے — نشہ باز نشہ کرنا چاہتا ہے — ریڈیو والے فلمی گانے سنانا چاہتے ہیں — نر پرندے ایک دوسرے پر غالب آنا چاہتے ہیں — شکاری پہلی فاختہ گھائل کرنا چاہتا ہے — اُستاد پہلا ڈنڈا چلانا چاہتا ہے — چوک میں کھڑا سپاہی پہلی گاڑی روکنا چاہتا ہے — نئے لوگ پرانی غلطیاں دوہرانا چاہتے ہیں — لوگ ایک اور دن سے مایوس ہو جانا چاہتے ہیں — لیکن سب تھوڑی دیر کے لیے — نئی صبح کے احترام میں ایسا نہیں کر رہے۔

ماضی پر ماضیِ قریب کا بوجھ ہے — ماضیِ قریب پہ حال کا — برس ہا برسوں کے نیچے دبتے جا رہے ہیں ہم عمر کے ساتھ چھوٹے ہو رہے ہیں۔

دشمنی اپنی جگہ — لیکن میں کبھی نہیں چاہوں گا — کہ حریف میری پہچان بنے۔

ایک جادوگر نے گھر کا راستہ بھولی ہوئی ایک لڑکی سے کہا — "لڑکی! میری بات مان جا! ورنہ میں تجھے بندریا بنا دوں گا" — پھر لڑکی نے جادوگر کی بات مان لی — اور اس کے اشاروں پر بندریا کی طرح ناچتے رہنا — اس کا مقدر ٹھہرا۔

اب تو لگتا ہے نمو کی کوئی صورت نہیں نکلے گی — ہم یونہی نمناک جذب کیے جائیں گے — اور اپنے اندر کی سیلن سے نم زدہ ہو جائیں گے۔

یوں تو ہم دونوں نے — مساوی طور پر وزن کو کندھا دیا ہے — لیکن چونکہ وہ مجھ سے بڑا ہے — اس لیے زیادہ بوجھ مجھ پر آن پڑا ہے۔

حسد

ڈاکٹر حسرت کاسگنجوی

معتبر اور مصدق ذرائع کا وثوق کے ساتھ اس بات پر اصرار ہے کہ حسد ایک بیماری کا نام ہے جو ذیابطیس اور کینسر کی طرح پھلتی پھولتی، کھوکھلا کرتی اور بے تحاشا فروغ پاتی ہے۔ اس بیماری کے بعد انسان کی شکل اندر سے اتنی خوفناک اور منحوس ہو جاتی ہے کہ دور کا چشمہ لگانے والوں کو بھی بغیر چشمے کے دُور سے نظر آجاتی ہے۔ اس کے نقش ونگار اتنے باریک اور دلفریب ہیں کہ احساس ہی نہیں ہوتا کہ اندر کی طرف کچھ ہے یا نہیں۔ انسان جو اس مرض میں مبتلا ہوتا ہے بڑی خوش فہمی میں مبتلا رہتا ہے۔ وہ بغیر ہری عینک کے ہرا ہی ہرا دیکھ سکتا ہے۔ وہ دوسروں کی ترقی اور خوشیوں پر اندر ہی اندر آنسو بہاتا ہے، سسکتا ہے، روتا ہے، ہچکیاں لیتا ہے، اس کے آنسو تھمنے میں ہی نہیں آتے۔ اپنی شخصیت اور وقار کو بار بار تولتا ہے اور بانسوں کی بیساکھیوں کے سہارے اتنی اونچائی پر پہنچ جاتا ہے کہ اسے نیچے کی ہر چیز بھُنگے کی طرح نظر آتی ہے۔ اس کی قوتِ تخیل اپنے عروج پر ہوتی ہے وہ جب یہ دیکھتا ہے کہ ان بونوں اور بھُنگوں کو نوازا جا رہا ہے۔ ان کی خوشحالی میں پرورش کی جا رہی ہے جو کہ سراسر ان کا حق ہے ہی نہیں تو یہ ظلم ہے اور ظلم پھر ظلم ہے اسے مٹ جانا چاہیے۔ ختم ہو جانا چاہیے۔ اس کے فوراً بعد ہی "میں" کا طویل سلسلہ شروع ہوتا ہے۔ میں میں ہوں، میں افضل اور برتر ہوں۔ میں حق دار ہوں۔ مجھے نوازا جانا چاہیے۔ جسے نوازا جا رہا ہے۔ وہ غلط ہے۔ باطل ہے۔

حسد کی بہت سی قسمیں ہیں، اگر حسد کو آپ ایک درخت تصوّر کر لیں تو جتنی درخت کی شاخیں ممکن ہو سکتی ہیں حسد کی بھی ہوتی ہیں۔ فلسفہ بیان کرنے والے اس خیال کے ہیں کہ حسد کا جذبہ کہیں باہر سے نہیں آتا بلکہ انسان کی شخصیت جب تعمیر ہو رہی ہوتی ہے تو انسان کی فطرت میں یہ زہر آہستہ آہستہ شامل ہوتا رہتا ہے۔ اور جوں جوں انسان ایک عمر کو پہنچتا ہے حسد بھی اسی طرح بڑھ کر جوان ہو جاتا ہے۔ حسد دراصل انسان کی اصل کمزوری، ناکامی، محرومی، بدبختی اور دوسروں کو ان کے حق سے محروم کر دینے کی ایک جوان کوشش ہوتی ہے۔ بلی کو جب دودھ نہیں ملتا تو وہ لڑھکا دیتی ہے۔ جب اسے ہی نہیں ملا تو دوسرا کیوں پیئے۔ اس لیے اس کا ضائع ہو جانا ہی بہتر ہے۔

حسد ایک جذبہ ہے، ایک نشہ ہے۔ ایک فلسفہ ہے۔ ایک راستہ ہے ایک ایسا راستہ جہاں سے کوئی دوسرا راستہ نہیں نکلتا۔ حاسد کی اپنی بادشاہت ہوتی ہے۔ اس کے محلات ہوتے ہیں۔ وہ جو کچھ چاہتا ہے چشم زدن میں ہو جاتا ہے اگر نہیں بھی ہوتا تو یوں لگتا ہے کہ جیسے دنیا کی ہر شے اس کے حکم کے مطابق کام کر رہی ہے۔ عام لوگوں کو حاسد کی اندرونی کیفیات کا علم ہو بھی نہیں سکتا۔ یہ وہ کیفیت اور جذبہ ہے جس کے بارے میں محض سُنا کر روایتی انداز میں کسی بات کی اصل حقیقت سمجھ میں نہیں آتی۔ اس کا تعلق براہِ راست عمل کیفیت سے ہے۔ جب آدمی اس عمل سے گزرتا ہے تو اس کے دل کی موومنٹ انوکھی اور نرالی ہوتی ہیں۔ عجیب کیفیت ہوتی ہے۔ کبھی غصہ آتا ہے، کبھی جھوں جھل، کبھی پچھتاوہ، کبھی تیزی تندی، کبھی احساس برتری،

کبھی احساسِ بلندی۔ کبھی یوں لگتا ہے کہ اس کے ساتھ سخت قسم کی ناانصافی ہو رہی ہے اور نااہلوں کو نوازا جا رہا ہے حالانکہ وہ اور صرف وہ ہی دنیا کا اہل انسان ہے باقی سب لوگ اضافی ہیں اور اضافی لوگوں کے ساتھ اس قسم کا سلوک کرنا خود کم ظرفی کی بات ہے لیکن جب یہ بات سامنے آتی ہے اور حاسد کا بس نہیں چلتا ہے تو وہ اپنی پوری قوت کے ساتھ سوچتا ہے اور مسلسل سوچتا ہے۔ سوچنے پر ہی وہ قادر ہوتا ہے۔

حسد کے جذبے میں بڑی گھٹن اور تاریکی کے عنصر ہوتے ہیں اور یہ اثرات لو بلڈ پریشر کو بھی دعوت دیتے ہیں۔ لو بلڈ پریشر کے تماشے الگ ہیں۔ وہ کسی کو بھی خاطر میں نہیں لاتا۔ ہارٹ سنکنگ کی بات ہی کچھ اور ہے۔ دل ڈوبنے کی کیفیت کا احساس ہر ایک کو ہو بھی نہیں سکتا، سورج ڈوبنے کی کیفیت کے مترادف ہوتی ہے۔

حاسد ڈوبتا ہے تو پھر ڈوبتا ہی چلا جاتا ہے۔ وہ اندر سے جل جل کر کوئلہ بن جاتا ہے اس میں گوشت کے جلنے کی سی بو آتی ہے جسے حاسد خود ہی سونگھ اور محسوس کر سکتا ہے۔ حاسد اپنے چہرے پر کسی بھی قسم کے اثرات ظاہر کرنا مناسب نہیں سمجھتا وہ چاہتا تو یہی ہے کہ اس کا چہرہ کلی اور کھلے ہوئے گلاب کی طرح تر و تازہ اور شاداب رہے۔ شاید وہ اپنے دل کی اندرونی کیفیات کی روشنی میں یہ سمجھتا ہے کہ اس کی اس عادت کو لوگ اچھی نگاہ سے نہیں دیکھتے۔ اسی لیے وہ ظاہری طور پر خوش و خرم رہنے کی کوشش کرتا ہے۔ دراصل یہ تضاد کا وہ مقام ہے جہاں انسان کو اپنے قول اور فعل پر قابو نہیں رہتا۔ پھر بھی حاسد یہی تصور کرتا ہے کہ اس کے چہرے پر کوئی کشمکش اور کرب کے اثرات نہیں ہیں اور اگر کسی غیر فطری انداز سے کچھ اثرات نمودار ہوئے بھی ہوں گے تو وہ اتنے معمولی ہوں گے کہ کوئی انہیں شناخت نہیں کر سکتا۔ اگر حاسد کو ذرا سا بھی یہ علم ہو جائے کہ اس کی اضطراری کیفیت عیاں ہو رہی ہے۔ لوگ جان رہے ہیں تو وہ شاید باز آ جائے اور اگر طبیعت کی تندی اور تیزی کی بدولت باز نہ بھی آئے تو اس شدت میں کمی واقع ہو سکتی ہے۔

حسد اور رشک میں وہی فرق ہے جو سرکے اور شراب میں ہے۔ پھول اور کانٹے میں ہے۔ خوبصورتی اور بدصورتی میں ہے۔ دونوں کے راستے متضاد سمتوں میں رواں دواں ہوتے ہیں۔ رشک میں نفرت نہیں ہوتی، حقارت نہیں ہوتی، دوسروں کو بلندی پر دیکھ کر ٹانگیں گھسیٹنے کی ضرورت پیش نہیں آتی بلکہ اس کے ساتھ ساتھ اس کے شایانِ شان چلنے کو جی چاہتا ہے اس طریقے میں جی چاہتا ہے کہ نہایت خوشگوار ماحول میں اپنے مدمقابل سے آگے نکل جائیں اس جذبے کو ہم رشک کہہ سکتے ہیں۔ حسد اور رشک ایک دوسرے کی ضد ہیں۔ دونوں کی خاصیت، ماہیئت مختلف ہیں۔ حسد یہی تخریبی عناصر کی طرف مائل ہی نہیں کرتا بلکہ ہم کو بدی کے کاموں میں ملوث بھی کرتا ہے۔ حسد شیطانی جذبہ ہے۔ زندگی سے فرار ہے۔ خوشیوں کی موت ہے۔ پھر بھی اس میں کسی نہ کسی طرح کی کشش ہے۔ اس میں جان ہے۔ اس میں کیفیت ہے جو یہ بلائے ناگہانی کی طرح ذہنوں پر مسلط ہوتا ہے۔ آندھی کی طرح چھا جاتا ہے۔ جذبات کی ایک لہر ہوتی ہے جو لہراتی ہوئی آتی ہے اور پوری شخصیت پر چھا جاتی ہے اس کا فلسفیانہ پہلو یہ ہے کہ جس پر یہ مسلط ہوتی ہے، چھاتی ہے وہ ایک لمحہ کے لیے بھی اسے برا تصور نہیں کرتا بلکہ اسے یوں لگتا ہے کہ یہی تعمیری پہلو ہے، مثبت پہلو ہے، رحمانی پہلو ہے۔ یہ انعام کی صورت ہے، یہ بہار کا سماں ہے۔ یہ ہی اصل زندگی ہے۔

حسد کی ایک بڑی خوبی یہ ہے کہ بھڑکے ہوئے جذبات سے بھی زیادہ تیز اور تلخ ہوتا ہے۔ سنبھلنے کا موقع ہی نہیں ملتا۔ اس کی بنیاد یہی ہوتی ہے کہ میں حق پر ہوں۔ میرے ساتھ ظلم ہوا ہے۔ یہ ظلم خواہ کسی نے بھی کیا ہو، ہے ظلم۔ انتقامی جذبہ بھی ساتھ ساتھ عود کر آتا ہے۔ اپنے مقابل سے اسے خواہ مخواہ کی نفرت ہونے لگتی ہے۔ پھر اس حقارت میں کمی نہیں اضافہ ہی ہوتا ہے۔ غلط فہمی

خوش فہمی کے انداز میں غلبہ حاصل کرتی ہے اور انسان میں سوچنے اور سمجھنے کی صلاحیتیں ہوتی ضرور ہیں لیکن ان کا رُخ مخالف سمت میں ہوتا ہے۔

حسد میں ایک تیز نشہ ہے۔ طوفان ہے، غلط فہمی یا خوش فہمی میں شدت کے ساتھ مبتلا ہونے کا ایک نہایت آسان ذریعہ ہے۔ حسد انسانی شخصیت کا خول ہے۔ ڈھال ہے۔ جو اصل شخصیت کو اندرونی اور بیرونی اثرات سے محفوظ رکھتا ہے۔ حسد کو اگر ہم آسان زبان میں بیان کرنا چاہیں تو یہ کہہ سکتے ہیں کہ خود کو شعلوں میں جلانے کا عمل ہے۔ دل کو پھونکنے اور مخصوص قسم کی جلی ہوئی بُو کو پھیلانے کا عمل ہے۔ کڑھنے، سلگنے، اور جلنے کی ریہرسل ہے۔

حاسد یہ سمجھتا ہے کہ وہ سیدھے راستے پر ہے۔ دنیا بھر میں اندھیر ہے اس لیے اس کی قدر نہیں کی جا رہی ہے۔ وہ جامع صفات ہے۔ ہر لمحہ اس کے ساتھ زیادتی ہوتی رہتی ہے۔ اس زیادتی کو پہلے تو اپنی طاقت کے ذریعے ختم کرنے کی کوشش کرتا ہے جب یہ دیکھتا ہے کہ یہ ممکن ہی نہیں ہے تو زور زور سے بول کر دوسروں کو اس زیادتی کا علم کرواتا ہے۔ تیسری صورت یہ ہے کہ جب اسے اس برملا اظہار میں بھی دشواری آتی ہے تو وہ اس بات کو زیادتی تصور کرتا ہے اور دل ہی دل میں کڑھتا ہے، کبھی کبھی بُرے بھلے الفاظ میں اپنی بھڑاس نکالتا ہے یہی تیسری صورت اس کے لیے زیادہ سوہانِ رُوح ہوتی ہے لیکن حاسد کی قسمت میں یہ صورت جیسے لکھی ہوئی ہے ضرور پیش آتی ہے۔

حسد کے قصے تاریخوں میں برملا اور برجستہ ملتے ہیں۔ جب مغل یا کوئی اور بادشاہ کمزور ہو جاتا تھا اور مرنے کے قریب ہوتا تھا تو وہ مکمل طور پر ملک پر کنٹرول نہیں کر سکتا تھا۔ مجبوراً وہ اپنا کوئی ولی عہد یا جانشین کا اعلان کرتا تھا۔ اس کے بھائی اور دیگر وارثوں کے دل میں حسد کا جذبہ عود کر آتا تھا اور وہ مقدور نہ ہونے کے باوجود اپنی سی کر گزرتے تھے مر جاتے تھے یا مار دیتے تھے۔ تخت یا تختہ۔ کچھ نہ کچھ ہو رہتا تھا۔

سکندر اچھا خاصا مقدونیہ کا بادشاہ تھا لیکن وہ بھی حسد کی آگ میں جلا کہ میں طاقتور ہوں دنیا کو فتح کر سکتا ہوں میری موجودگی میں دوسرے بادشاہ کیوں کہلوائیں۔ چنانچہ چھوٹی سی جانباز فوج کے ساتھ دنیا بھر پر چڑھ دوڑا۔ دنیا کو تاخت و تاراج کر دیا۔ غور سے دیکھیے تو یہ بھی حسد کی ایک قسم ہے بلکہ زیادہ خطرناک قسم کا حسد ہے۔ دور کیوں جاتے ہیں۔ دنیا کی عظیم جنگوں کو ہی دیکھ لیجیے۔ انگریزوں کے آگے کسی کا چراغ جل جائے، ممکن ہی نہیں تھا اُدھر جرمنی میں ہٹلر کا خیال یہ تھا کہ آلو کھانے والی انگریز قوم دنیا پر حکومت کیوں کرے۔ پھر جنگ کے میدانوں میں جو کچھ ہوا وہ تاریخ کا ایک حصہ ہے۔

حسد کی خوبی یہ ہے کہ یہ جھگڑے فساد کو دعوت دیتا ہے نفرت کرنا سکھاتا ہے۔ دوسروں کو کمزور اور بے یار و مددگار سمجھنے کی تلقین کرتا ہے حالانکہ خود بے وزن ہوتا ہے۔

زندگی کے ہر شعبے میں ہم کبھی جان بوجھ کر اور کبھی بے خبری کے عالم میں حسد کا شکار ہوتے ہیں۔ جب ہم دوسروں کی کمزوریاں تلاش کر رہے ہوتے ہیں تو یہ سمجھ لیجیے ہم ناشکرے انسان کی طرح دوسروں کو بھی ناشکری کی طرف راغب کر رہے ہوتے ہیں۔ حاسد مظلوم بھی ہوتا ہے۔ بے چارہ حاسد ذہنی کنفیوژن میں مبتلا رہتا ہے۔ ہر بات کو شک کی نگاہ سے دیکھتا ہے۔ غلط اندازے لگاتا ہے۔ اذیتیں برداشت کرتا ہے اور خود ہی خسارے میں بھی رہتا ہے۔ حالانکہ وہ اپنے دل کو بڑی بڑی ڈھارسیں دیتا ہے۔ دوسروں کو حقیر سمجھ کر اپنی مردانگی کا سکہ رائج رکھنے کا متمنی رہتا ہے۔ غلط اندازے لگاتا ہے اور جب وہ دلدل میں کمر کمر تک دھنس جاتا ہے اس وقت بھی وہ اپنی عادت سے باز نہیں آتا اور جب دلدل میں ڈوبنے لگتا ہے تو وہ اپنی تمام غلطیوں کے لیے دوسروں کو

موردِ الزام قرار دیتا ہے حالانکہ دل کی گہرائیوں سے وہ جانتا ہے کہ یہ اس کی اپنی غلطی تھی۔ وہ یہ بھی جانتا ہے کہ اسے اس کے کیئے ہوئے ظلم کی سزا مل رہی ہے۔

حاسد پر اس کی حسد کی عادت کی وجہ سے رحم بھی آتا ہے۔ یہ رحم ایک فطری جذبہ ہے۔ جب کوئی عاقل اور بالغ یہ دیکھتا ہے کہ فلاں شخص اپنی حسد کی فطری کمزوری کے باعث تباہ و برباد ہو رہا ہے تو وہ اخلاقی اور انسانی واسطوں سے مدد کرنا چاہتا ہے۔ حاسد کے لیے اس قسم کی مدد جلتی ہوئی آگ پر تیل چھڑکنے کے مترادف ہے۔ وہ اپنے عمل میں اور بھی زیادہ سخت ہو جاتا ہے اور اس طرح وہ واقعی مظلوم ہو جاتا ہے۔

حسد کے بارے میں بہت سے باتیں مشہور ہیں۔ کہتے ہیں حاسد کا چہرہ اندر اور باہر سے نحوست زدہ ہوتا ہے۔ اس کی ہنسی میں شیطان کی رضامندی ہوتی ہے۔ حاسد کو آپ کبھی کھلی آنکھوں سے دیکھنے کی کوشش کیجیے۔ آپ کو یوں لگے گا کہ ایسا شخص سمجھتا ہے کہ وہ وقت کا دھارا موڑ دے گا۔ مغرب سے سورج کو طلوع کر سکتا ہے۔ اس کے حکم سے بارش ہو سکتی ہے۔ وہ ساری دنیا کو الٹ پلٹ کر رکھ سکتا ہے۔ وہ اتنا اہم اور زور آور ہے کہ کوئی بھی چیز اس کے لیے ناممکن نہیں ہے۔ بعض فلسفی یہ کہتے ہوئے بھی سنے گئے ہیں کہ اگر یہی جذبہ رشک کی صورت میں انسان میں پھیلے تو کائنات حسین ہو سکتی ہے۔ بہاریں ہمیشہ قائم رہ سکتی ہیں۔ کائنات کی ہر چیز مسخر ہو سکتی ہے۔ جب ہم یہ ساری چیزیں جانتے ہیں اور مانتے ہیں تو یہ راستہ منافقت کی طرف چلا جاتا ہے۔

حسد کی یوں تو ہم چاہے کچھ بھی تعریف کر لیں اور خوشی ہو لیں اس کا گہرا تجزیہ کرتے ہوئے نفسیات کے ماہرین نے یہ بتایا ہے کہ ہم سے ہر شخص جب اپنے ہوش و حواس میں ہو۔ کھلی ہوئی آنکھوں سے مشاہدہ کر رہا ہو اور سچ بولنے کا اس پر جنون طاری ہو تو اپنا جائزہ لے کہ ہم حسد کا کہاں کہاں شکار ہو چکے ہیں، ہو رہے ہیں اور ہو سکتے ہیں تو فلم کی طرح ہر چیز نمایاں ہو کر ہمارے سامنے آجاتی ہے۔ ہم سچ کے سمندر میں اپنی اصل شکل دیکھ سکتے ہیں، اور جب بھی کبھی ایسا ہوا ہے تو عجیب و غریب تماشے عمل میں آئے ہیں جن کا اندراج تاریخ میں بھی ہے۔

کبھی کبھی ایسا بھی ہوا ہے کہ ہم خود حسد کا تاج سر پر رکھ کر اپنی شخصیت کو کوئلہ کرتے ہیں۔ ہاتھ منہ بھی کالے کرتے ہیں۔ غیبت بھی کرتے ہیں۔ بہتان لگانا ہمارا محبوب مشغلہ ہوتا ہے۔ نفرت، حقارت کے ہم بہت قریب ہوتے ہیں۔ ہماری ہنسی، قہقہہ اور دوسری خوشگوار باتیں حسد کے جذبے میں ملوث ہو کر اپنا کام کر دکھاتی ہیں۔ ہم اپنا جائزہ ایمان داری سے نہیں لیتے اس لیے معلق رہتے ہیں بلکہ خوش فہمی میں مبتلا رہتے ہیں اور اپنے ڈھکنی ڈھک کر دوسروں میں عیب نکالتے رہتے ہیں اور خوش بھی ہوتے ہیں۔ دنیا بھر کے حضرت انسان یہی کرتے ہیں اور دوسرے انہیں بغیر عینک کے ہر قسم کی برائی میں ملوث نظر آتے ہیں۔

ہم شاید بزدل اور کمزور بھی ہیں ریت میں سر چھپانے کے بعد ہمارا خیال یہ ہوتا ہے کہ ہم دنیا کی ہر آفات سے محفوظ ہو گئے ہیں لیکن ایسا ہوتا نہیں ہے بلکہ ہم اپنی شخصیت کو ہی مجروح نہیں کرتے بلکہ خود کو شاندار طریقے سے دھوکا بھی دیتے ہیں اور خوش ہوتے ہیں۔ یہ منافقت کا کمال ہے۔

حسد کو ہم اگر مادی صورت میں لیں تو یہ رنگ برنگے غباروں کی صورت میں ہو سکتا ہے۔ خوش نما رنگ دلفریب ہوتے ہیں۔ ان غباروں میں جتنی ہوا بھری جاتی ہے یہ اور اچھے لگتے ہیں لیکن جلد ہی ایک وقت ایسا بھی آجاتا ہے جب ان کا حسد پورا ہو جاتا ہے تو یہ پھٹ جاتے ہیں۔ پھٹنے کے بعد ان غباروں کی جو شکل ہوتی ہے اسے ہم حسد کی شکست خوردہ شکل سے تعبیر کر سکتے ہیں۔

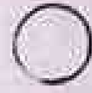
ہمارا المیہ یہ ہے کہ ہم حسد کی آگ میں جلتے ہیں۔ اندر سے جل جل کر کوئلہ ہوجاتے ہیں لیکن اپنے چہروں پر پھولوں کا سا گلستان کھلائے رکھتے ہیں۔ رنگ برنگے غباروں سے سجائے رکھتے ہیں اور ہماری اداکاری کا کمال یہ ہوتا ہے کہ ہم ایک لمحے کے لیے بھی کسی کو محسوس نہیں ہونے دیتے کہ ہمارے دل کی کیفیت کیا ہے۔ ہمارے دل و دماغ میں جو شعلے لپک رہے ہیں اس سے ہماری کیا کیفیت ہے دل ہے کہ مسلسل سُلگ رہا ہے۔ چہرے پہ چہرہ لگانے کے ہم عادی ہو چکے ہیں اس طرح ہمارے چہرے ہی دو نہیں ہوتے دو متضاد شخصیتیں بھی ہوتی ہیں۔ یہ کتنا بڑا کارنامہ ہے کہ ہم اندر سے اس بُری کیفیت میں مبتلا ہوتے ہیں اور دوسرے ہمارے بناوٹی چہروں سے دھوکا کھا جاتے ہیں —— ایک لمحہ کے لیے ٹھہریے —— اب ایسا بھی نہیں ہے اگر ہمیں عبرت سے دیکھنے والوں کی اندر سے سرجری کی جائے تو یقیناً وہ ہم سے بھی زیادہ خستہ جاں نکلیں گے۔ ممکن ہے ان کا حشر ہم سے بھی بُرا ہو۔ یہ تو اداکاری پر منحصر ہے ہم خود کو اور دوسروں کو کسی فنی کمال کے ساتھ دھوکا دینے میں کامیاب ہوتے ہیں۔

ہم نے دکھوں کے حوالے سے عذاب کی کیفیت مقرر کر رکھی ہے لیکن ایسا بھی تو ہو سکتا ہے کہ اللہ کے مقرر کیے ہوئے عذاب ہماری دکھوں کی زندگی سے کہیں زیادہ ہوں یقیناً ایسا ہو گا۔ حسد کا عذاب بھی ان ہی بڑے عذابوں میں سے ایک ہے۔

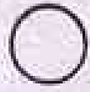
قرآن پاک میں اس حسد کی بہت سی شکلیں بیان کی گئی ہیں لیکن ان کی کیفیات کے حوالے سے ان کے نام مختلف ہیں۔ لیکن ایک لمحے کے لیے سوچیے ضرور کہ حسد ہے کتنی اہم چیز کہ اللہ نے اس کی وضاحت اپنے قرآن میں ایک دو دفعہ نہیں بار بار بیان فرمائی ہے۔

حسد کو اگر ہم نہایت سنجیدگی کے ساتھ لیں اور اسے مذاق نہ سمجھیں اور اس حوالے سے اداکاری کے جوہر دکھانے میں مصروف نہ رہیں تو ممکن ہے ہم حسد کی اصل ماہیت کو زیادہ بہتر طور پر سمجھنے میں کامیاب ہو جائیں لیکن یہ بھی تو ہے کہ اس کی موجودگی جو ہر روز ہر شخص کے ساتھ طرح طرح کے کھیل تماشے ہوتے رہتے ہیں، انسان مختلف قسم کے امتحانوں سے گزرتا رہتا ہے، اداکاری کرتا ہے، خود کو دھوکا دیتا ہے، دوسروں کا مذاق اُڑاتا ہے یہ ساری باتیں ہی ختم ہو جائیں گی۔ پھر چہل پہل کہاں رہے گی۔ لوگ امتحانوں سے کس طرح گزریں گے، شخصیتوں کی جراحی کس طرح ہو گی۔ انسانوں کی منافقت اور دوغلاپن کس طرح نظر آئے گا ——

محشر بدایونی



اپنے جینے کے سہارے کچھ نہیں
سوچتے رہتے ہیں، کہتے کچھ نہیں
فقر خود ہے اک متاعِ بے بہا
دیکھئے تو پاس اپنے کچھ نہیں
زخم سہنا، خوں بہانا شرط ہے
معرکے میں اس سے پہلے کچھ نہیں
اِس ہنر سے عہدِ سخت اُس نے لیا
کر لیا اقرار، سمجھے کچھ نہیں
شور تھا اُس کی سخاوت کا بڑا
ہم سخی کے در سے لائے کچھ نہیں
جس جگہ سایہ ملا، بس پڑ رہے
غم کے ماروں کے ٹھکانے کچھ نہیں
رکھتے ہیں دریا کے تیور بعض لوگ
بے بساط، اندر سے ہوتے کچھ نہیں
خوب ہے انصاف اہلِ فن کے ساتھ
ہیں نئے سب کچھ، پرانے کچھ نہیں
تابِ ذرہ ہے عیاں، اب کیوں کہیں
سامنے سورج کے ذرّے کچھ نہیں
بات کی تہہ میں ہے معنیٰ کا بھرم
حرف بھاری اور ہلکے کچھ نہیں
ایسے بھی تھے سوزِ دل کے مُدّعی
میرؔ بنتے تھے مگر تھے کچھ نہیں



کبھی یہ شہرِ جمال اِتنا کم وقار نہ تھا
یہاں غزال تھے اتنے کہ کچھ شمار نہ تھا
مجھے نہ روک سکا لشکرِ غنیم کہیں
وہ تیر کون سا تھا جس کا میں شکار نہ تھا
پڑاؤ ڈالتے دھوپوں کے رہ نوَرد کہاں
بس اک درخت تھا اور وہ بھی سایہ دار نہ تھا
عجیب دَور سزا ہے یہ دَورِ فرصت بھی
گزر رہے ہیں وہ دن جن کا انتظار نہ تھا
بڑی صفائی سے دہرا گیا حکایتِ دار
وہ قصہ گو جو کبھی رو شناسِ دار نہ تھا
میں فقر میں بھی جیا ہوں بڑی فضیلت سے
مری فقیری فقیری تھی، کاروبار نہ تھا
میں کس سے پھر طلب پرسش و دعا رکھتا
یہاں کسی پہ مرا حال آشکار نہ تھا
دُکھوں کے گہرے نقوش اہلِ درد چھوڑ گئے
کہ سب ہی روتے تھے اور کوئی اشک بار نہ تھا
یہاں چلی ہے کئی بار بادِ وحشت ناک
کبھی تو اتنا پُر آشوب یہ دیار نہ تھا

قتیل شفائی

○

برسات میں ٹپکتی ہوئی چھت بنا ہُوا
سر پر ہے آسمان مصیبت بنا ہوا

تپتی ہوئی زمیں پہ جھلسنے لگے ہیں پاؤں
موسم ہے بارشوں کی علامت بنا ہوا

لیتا ہے ساتھ ساتھ زمانہ مِرا حساب
ہر پَل مِرے لیے ہے قیامت بنا ہُوا

کرنا مجھے نہ دفن کسی محتسب کے پاس
میرا کفن ہے میری وصیّت بنا ہُوا

مجھ سے زیادہ جس میں تھا اِک بے وفا کا ہاتھ
وہ عشق اب بھی مجھ پہ ہے تہمت بنا ہوا

بے احتیاط مجھ سے زیادہ تھا جو رقیب
اب سر سے پاؤں تک ہے نصیحت بنا ہُوا

میں بِک رہا ہوں اپنی کتابوں کے ساتھ ساتھ
ہر اہلِ ذوق ہے مِری قیمت بنا ہُوا

سیکھا نہ کچھ کسی نے مجھے دیکھ کر قتیلؔ
میں ہوں خود اپنے واسطے عبرت بنا ہُوا

○

کڑی تنہائیوں کا ہمسفر کہتا رہا ہوں میں
خیالِ یار! تجھ کو معتبر کہتا رہا ہوں میں

مِرے ضعفِ بصارت کا بھی مِلتا ہے ثبوت اس سے
کہ نابیناؤں کو اہلِ نظر کہتا رہا ہوں میں

رہٹ میں جوت کر ہانکا گیا ہے بار ہا مجھ کو
کنویں کے گرد پھیروں کو سفر کہتا رہا ہوں میں

کرایا شامِ فرقت نے تعارف اِک نیا اُس کا
وہ اِک دریا کہ جس کو چشمِ تر کہتا رہا ہوں میں

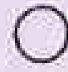
وہاں بھی لوگ اپنی کرچیاں چُنتے نظر آئے
جہاں کے پتھروں کو بے ضرر کہتا رہا ہوں میں

نظر کے زاویے تبدیل کر دیتے ہیں کچھ چہرے
وہ قاتل تھا جسے جان و جگر کہتا رہا ہوں میں

حقیقت میں جو سر ہوتا تو گرتا تیرے قدموں میں
جو ہے اِک بوجھ تن پر اس کو سر کہتا رہا ہوں میں

صِلہ اب اور کیا مانگوں قتیلؔ اپنی عبادت کا
یہی ہے میری جنّت جس کو گھر کہتا رہا ہوں میں

ضیا جالندھری



تشنہ مرے دل و نگاہ، عالمِ رنگ و بو فریب
ہجر و وصال سب گماں، کاوش و جستجو فریب

نشہ تو میرے خوں میں تھا، جوش مرے جنوں میں تھا
دل ہی نہ ہو جو شعلہ خیز، موجِ خُم و سبو فریب

تیرے خیال کا جمال، تیرے جمال کا طلسم
بنتے رہے نگار و نقش، دیتا رہا لہو فریب

اِس طلبِ محال میں، کیسا سکوں کہاں کا چین
حدِّ نگاہ تک سراب، چشمہ و آبجو فریب

وہم تمام ہست و جست، وہم ہر اک بلند و پست
بود و نبود التباس، سلسلۂ نمو فریب

خامشی پیشِ ابتدا، خامشی بعدِ انتہا
عرصۂ صبح و شام میں شورشِ ہاو ہو فریب

دیکھ چکا ہوں حشرِ قصر، خلد ہے مجھ کو دشتِ ریگ
صحبتِ ذرہ دل کشا، شوکتِ کاخ و کو فریب

شاخ کا نم، مرا لہو، ایک ہی آنچ سے رواں
ظرف جُدا ہیں، مے وہی، قصۂ ما و تو فریب

شعلہ جہانِ حسن و رنگ، راکھ زیانِ حسن و رنگ
حدتِ آرزو حیات، حاصلِ آرزو فریب

آنکھ کچھ اور کہتی ہے، ہونٹ کچھ اور کہتے ہیں
یا مری فہم نارسا، یا تری گفتگو فریب

غمزۂ دل نشیں بھی دیکھ، خنجرِ آستیں بھی دیکھ
چہرہ بچہرہ لطف و مہر، یعنی کہ روبرو فریب

رنگ ہوا کا دیکھ اور سادہ دلوں کی خیر مانگ
ہر طرف ادّعائے حق اور چہار سو فریب

سایوں کے پیچھے بھاگتے عمر گزر گئی مری
دیتی رہی قدم قدم طبعِ بہانہ جو فریب

دھوکا نظر کا تھا ضیاؔ، یا تھا زمانہ جعل ساز
نقل تھی عین اصل سی، سچ سا تھا ہو بہو فریب

احمد فراز

چلو وہ عشق نہیں، چاہنے کی عادت ہے
پہ کیا کریں، ہمیں اک دوسرے کی عادت ہے

تُو اپنی شیشہ گری کا ہنر نہ کر ضائع
میں آئینہ ہوں، مجھے ٹوٹنے کی عادت ہے

میں کیا کہوں کہ مجھے صبر کیوں نہیں آتا
میں کیا کروں کہ تجھے دیکھنے کی عادت ہے

وصال میں بھی وہی فاصلے فراق کے ہیں
کہ اس کو نیند، مجھے رتجگے کی عادت ہے

یہ حال ہے تو ہمیشہ رہے گی محرومی!
نہ وہ سخی، نہ تجھے مانگنے کی عادت ہے

یہ خود اذیتی کب تک فرازؔ، تو بھی اُسے
نہ یاد کر کہ جسے بھولنے کی عادت ہے

گل بھی گلشن میں کہاں غنچہ دہن تم جیسے
کوئی کس منہ سے کرے تم سے سخن تم جیسے

یہ مرا حُسن نظر ہے تو دکھا دے کوئی
قامت و گیسو و رخسار و دہن تم جیسے

اب تو نایاب ہوئے دشمن دیرینہ تک
اب کہاں اے مرے یارانِ کہن! تم جیسے

اب تو قاصد سے بھی ہر بات جھجک کر کہنا
لے گئے ہو مرا بے ساختہ پن تم، جیسے

کبھی ہم پر بھی ہو احساں کہ بنا دیتے ہو
اپنی آمد سے بیاباں کو چمن تم جیسے

کبھی ان لالہ قباؤں کو بھی دیکھا ہے فرازؔ
پہنے پھرتے ہیں جو خوابوں کے کفن تم جیسے

احمد فراز



تھا کوئی یا نہیں تھا، جو کچھ تھا
دل کے اندر کہیں تھا، جو کچھ تھا

تو بھی اپنے سے خوش گماں تھا بہت
میں بھی اپنے تئیں تھا جو کچھ تھا

شہرِ خوباں میں وہ وفا دشمن
خوبصورت تریں تھا، جو کچھ تھا

دُردِ مے تھی کہ تلخیٔ ہستی
جام میں تہہ نشیں تھا جو کچھ تھا

چھوڑ آئے عبث درِ جاناں
یار، سب کچھ وہیں تھا جو کچھ تھا

عشق اکسیر تھا دلوں کے لیے
زہر تھا، انگبیں تھا، جو کچھ تھا

ہوش آیا تو اب کھلا ہے فرازؔ
میں تو کچھ بھی نہیں جو کچھ تھا



چلو اب پانیوں میں عکس دیکھیں
یہ آئینے تو سب کے نقص دیکھیں

یہ آنکھیں باؤلی سی باؤلی ہیں
جدھر دیکھیں وہی اک شخص دیکھیں

گلہ کیا دوسروں سے ہو کہ خود کو
ہم اپنی سوچ کے برعکس دیکھیں

کہاں خوش طبع قاتل اس طرح کے
جو اپنے بسملوں کا رقص دیکھیں

نئی الماریوں میں دُکھ بھرے ہیں
فرازؔ آؤ پرانے بکس دیکھیں

محب عارفی



اس کو پا جاؤں کبھی، ایسا مقدر ہے کہاں
اور اٹھا لوں اُس سے دل، یہ زورِ دل پر ہے کہاں
گھُٹ کے رہ جائے نہ سر ہی میں کہیں ذوقِ سجود
میں تو سر ہر در پہ رکھ دوں، پر کوئی در ہے کہاں
ہوش کے ہاتھوں ہیں بُت ہائے حقیقت پاش پاش
اے جنونِ وہم، تیرا دستِ بت گر ہے کہاں
نغمہ ریزی ساز کی، بازی گری مطرب کی ہے
نغمہ کوئی بے نوا تاروں کے اندر ہے کہاں
ہونٹ سے اُس کے جھلکتی ہے مری تشنہ لبی
کھنچ رہی ہے مے کہاں سے اور ساغر ہے کہاں
میں نے جس منظر کو دیکھا تھی وہ اک نامنظری
جو نظر آتا نہیں مجھ کو وہ منظر ہے کہاں
خواب گوں دنیا سہی میری مگر دنیا کوئی
خواب گوں دنیا سے میری، معتبر تر ہے کہاں
ہے سفر اک سیر اگر مدِ نظر منزل نہ ہو
میرے دریا کی بَلا جانے، سمندر ہے کہاں
میں وہاں رہتا ہوں، گنجائش جہاں میری نہیں
کیا کہوں کس گھر میں رہتا ہوں، مرا گھر ہے کہاں
جب بھی ان آنکھوں میں جھانکا خود کو دیکھا ہے محب
مجھ کو اتنا قرب خود سے بھی میسر ہے کہاں

گلے لگا لوں اُسے میں، مآل کچھ بھی ہو
وہ خواب ہو کہ فریبِ خیال، کچھ بھی ہو

عیاں ہے اُس کے اشاروں سے التفات اُسکا
اِس التفات میں اب اس کی چال کچھ بھی ہو

وہ خود ہی فاش ہر اِک مظہرِ جمال میں ہے
جبین و زلف و رخ و خدّو خال کچھ بھی ہو

میں تیرگی ہی سہی، آپ روشنی ہی سہی
نظر تو آئیں کبھی، میرا حال کچھ بھی ہو

وہی سوال ہے جائز جو اپنی حد میں رہے
یہی جواب ملے گا، سوال کچھ بھی ہو

مجالِ دید ہی مجھ میں کہاں، قسم لے لو
جو بے رخی کا تمہاری، ملال کچھ بھی ہو

وہ شوخ بھی تو کہاں رہ سکے گا میرے بغیر
بغیر اُس کے مرے دل کا حال کچھ بھی ہو

بلا سے کچھ مرے ہاتھ آئے یا نہ آئے محب
بچھا رہے گا تمنا کا جال، کچھ بھی ہو

بیدؔل حیدری



اے چشمِ شبنمی! یہ کوئی چھوٹی بات ہے!
دریا عبور کرنا ہے، بچوں کا ساتھ ہے

وہ میرا کچھ نہیں ہے مگر ایک بات ہے
ملتا ہے یوں کہ جیسے زمانوں سے ساتھ ہے

سوچوں کے کس سفر سے پڑا ہے یہ واسطہ
سوچوں کے اس سفر میں تو دن ہے نہ رات ہے

بزدل ہے، خوف کھاتا ہے مجھ سے مرا عدو
حالانکہ جانتا ہے مرا ایک ہاتھ ہے

بیدؔل چھتوں پہ سوتے تھے ہم رات بھر مگر
یہ چاند اور چکور سے پہلے کی بات ہے



ہم کیا کریں جو شاہ کی دہشت نہیں رہی
قابو میں اُس کے اپنی ہی خلقت نہیں رہی

اِس علم نے تو اور بھی گُم راہ کر دیا
یہ شمع بھی اب اپنی ضرورت نہیں رہی

اتنی بھی بارشوں سے نہ کر رحم کی اپیل
دیوار کیا رہے گی اگر چھت نہیں رہی

بیٹھے رہیں تصوّرِ جاناں کئے ہُوئے
اب عاشقی میں یہ بھی سہولت نہیں رہی

بیدؔل بغیر روئے نہ آئی تمہیں بھی نیند
افسوس، تم کو میر سے صحبت نہیں رہی

جمیل ملک

○

کن موسموں میں آئے گی اکیسویں صدی
کیا کیا ہمیں دکھائے گی اکیسویں صدی

کتنے نئے چراغ جلانے کے واسطے
کتنے دیئے بجھائے گی اکیسویں صدی

سوکھے ہوئے لبوں پہ جو صدیوں کی پیاس ہے
کیا پیاس وہ بجھائے گی اکیسویں صدی

ہر اک صدی کے خواب نئے اور نئے عذاب
کیا کھیل اب رچائے گی اکیسویں صدی

یہ بیسویں صدی تو قیامت سے کم نہ تھی
کیا حشر اب اٹھائے گی اکیسویں صدی

سب کے دلوں میں گونج ہے جس انقلاب کی
وہ گونج کیا سنائے گی اکیسویں صدی

جتنے سوال دل میں ہیں شعلہ فشاں جمیل
سب کا جواب لائے گی اکیسویں صدی

○

خواہشِ دید ہے تو ذوقِ نظر لے کے چلو
اپنی لیلیٰ کے لیے کاسۂ سر لے کے چلو

کچھ نہ کچھ پیش تو کرنا ہے اُسے تحفۂ دل
کچھ نہیں پاس تو اشکوں کے گہر لے کے چلو

تم کو تنہائی کا احساس نہ ہونے دے گی
تم مری یاد بھی دھڑکن میں اگر لے کے چلو

کسی اخبار میں کوئی بھی نہیں خوشخبری
تم چلو گھر سے تو روشن سی خبر لے کے چلو

ورنہ غرقاب نہیں ہوں گے عقوبت خانے
دل میں سیلاب تو آنکھوں میں بھنور لے کے چلو

پیاس بجھتی ہے دلوں کی اِسی جوہر سے جمیل
اہلِ دل کے لیے سوغاتِ ہنر لے کے چلو

احمد ظفر



جلتے دیئے بجھے ہیں، وہ سب کے سب جلاؤں
اس دائرے سے نکلوں، اُس دائرے میں جاؤں

جس دن تری صدا پر میری صدا نہ آئے
گرداب خامشی میں اس روز ڈوب جاؤں

پتھر کے بول لب پر لکھے ہوئے ہیں تُو نے
میں زخم گل کا منظر، میں پھر بھی مسکراؤں

شہکار ہے تو ایسا فطرت نے جو بنایا
تو کون ہے "تو کیا ہے" کیسے تجھے بتاؤں

فرقت زدہ ہیں راتیں، دن روشنی گزیدہ
تقدیر کے قفس میں کب تک میں پھڑپھڑاؤں

دریا کی یورشوں میں ٹوٹا ہوا سفینہ
آواز دے اگر تُو، میں پار لے ہی جاؤں

ہر آئینے میں اس نے خود کو ظفر دکھایا
جی چاہتا ہے میں بھی یہ معجزہ دکھاؤں



مچھلیوں کا زنداں ہے مرتبان شیشے کا
دیکھ سات رنگوں میں یہ جہان شیشے کا

سانس لے رہے تھے تم ایک ایسی دنیا میں
تھی زمین پتھر کی، آسمان شیشے کا

اک بنتے جاتے ہیں پھول آشنائی کے
چھاؤں دے نہیں سکتا، سائبان شیشے کا

آنسوؤں کی بارش میں چُور چُور ہوتا ہے
آرزو بناتی ہے جو مکان شیشے کا

زندگی کی راہوں میں آگ بن کے بکھرا ہے
وہ جو ایک لمحہ تھا، میری جان، شیشے کا

اُس جہاں میں ہم شاید پھول کی مہک میں ہوں
یہ جہاں ظفر دیکھا خاک دان شیشے کا

شہزاد احمد



واپس اس در سے اگر آیا ہوں — آنکھیں دہلیز پہ دھر آیا ہوں
ابھی وہ شخص مرے دھیان میں ہے — میں کہاں لوٹ کے گھر آیا ہوں
میں نے کاٹا ہے سفر رو رو کر — اپنے ہی خون میں تر آیا ہوں
میں کچھ ایسا بھی تہی دست نہیں — لے کے آنکھوں میں گہر آیا ہوں
اس سے ہے مجھ کو محبّت کہ نہیں — مگر اظہار تو کر آیا ہوں
اب مجھے سمت کا احساس نہیں — نہیں معلوم کدھر آیا ہوں
دل نے پھر کھینچ لیا اپنی طرف — آ نہ سکتا تھا مگر آیا ہوں
آگ سی دل میں لگی رہتی ہے — جل گیا ہوں، جب اِدھر آیا ہوں
اب کہاں جانا ہے، معلوم نہیں — اس گلی سے تو گزر آیا ہوں
میرا مقصود تھی پستی شاید — آسمانوں سے اُتر آیا ہوں
میرے ہمراہ اُداسی بھی نہیں — میں اکیلا ہوں جدھر آیا ہوں
اس کے آنے کی توقع بھی نہیں — پھر بھی میں جانبِ در آیا ہوں
نہ کیا مجھ کو سمندر نے قبول — جب بھی ڈوبا ہوں اُبھر آیا ہوں
نقشِ پا آئے ہیں ملنے کے لیے — پھر سرِ راہگزر آیا ہوں

کون پہچانے گا مجھ کو شہزاد
مدّتوں بعد نظر آیا ہوں

ظفر اقبال

○

مٹا ہے رنگِ دل، تصویر آدھی رہ گئی ہے
ہمارے خواب کی تعبیر آدھی رہ گئی ہے

یہ کڑیاں ایک اِک کر کے نکلتی جا رہی ہیں
محبت ہے، مگر زنجیر آدھی رہ گئی ہے

مجھے یہ عرض کرنا پڑ گئی ہے دوسری بار
کہ اپنی بات کی تاثیر آدھی رہ گئی ہے

ادھورا تو نہیں تھا میری قسمت کا ستارہ
مگر پھر بھی مری تقدیر آدھی رہ گئی ہے

محبت کا مکاں کس طرح سے ہو گا مکمل
کہ خرچہ ختم ہے، تعمیر آدھی رہ گئی ہے

میں اپنا مدعا کھل کر بیاں تو کر چکا ہوں
مگر شاید مری تقریر آدھی رہ گئی ہے

میں ہر غم کو اڑا دینے لگا ہوں کیا ہنسی میں
دلوں میں ہی مری جاگیر آدھی رہ گئی ہے

مرا جذبہ ابھی پورے کا پورا ہے اُسی طور
مگر لڑتے ہوئے شمشیر آدھی رہ گئی ہے

ظفرؔ، بوسیدگی نے کام دکھلایا ہے ایسا
مرے دیوان کی تحریر آدھی رہ گئی ہے

○

میں آسانی میں ہوتا ہوں کہ دشواری میں رہتا ہوں
ہمیشہ کچھ نہ کچھ کرنے کی تیاری میں رہتا ہوں

نہیں ہوتا تو میرے چار سو کچھ بھی نہیں رہتا
جو ہوتا ہوں تو اِس ہونے کی سرشاری میں رہتا ہوں

تجاوز بھی کئے رکھتا ہوں اپنے ہر طرف کیا کیا
بظاہر تو میں اپنی چار دیواری میں رہتا ہوں

مجھے فرصت کہاں ہو اور کوئی کام کرنے کی
اگر میں اس قدر مصروف بے کاری میں رہتا ہوں

کچھ اوروں کی گرانباری پہ رشک آتا بھی ہے مجھ کو
زیادہ خوش میں اپنی ہی سبکساری میں رہتا ہوں

جواز اِس کے علاوہ اور کیا ہو میرے ہونے کا
کہ سوتے جاگتے اُس کی طلبگاری میں رہتا ہوں

میں ہو جاتا ہوں اُس کو دیکھ کر آپے سے باہر سا
کئی دن سے کسی ایسی ہی بیماری میں رہتا ہوں

کھُلے کس طرح اس کی دشمنی کا ماجرا مجھ پر
کہ میں تو رات دن اس کی طرفداری میں رہتا ہوں

ظفرؔ، ہوتا ہوں میں بھی جلوہ گاہِ ناز میں اُس کے
کہ مجبوری سے جاتا ہوں تو لاچاری میں رہتا ہوں

محسن احسان

○

ابھی سچ کا دیا جلتا کہاں ہے
ہوا کا رخ ابھی بدلا کہاں ہے

بہارِ دشت آرائی کا موسم
زمینوں پر ابھی اترا کہاں ہے

مسافر ہیں ہم ایسے قافلے کے
پتہ جس کو نہیں، جانا کہاں ہے

غبارِ آشنائی اڑ رہا ہے
کوئی چہرہ نظر آتا کہاں ہے

سب اپنے بحرِ غم میں غوطہ زن ہیں
نشاطِ درد کا دریا کہاں ہے

پہاڑ اب آبشاریں رو رہے ہیں
یہ بادل ٹوٹ کر برسا کہاں ہے

انا زندہ اگر ہے آدمی میں
تو پھر یہ موت سے ڈرتا کہاں ہے

مری ہر شب، مرا ہر دن سفر ہے
خدا معلوم اب رکنا کہاں ہے

عجب ہلچل مرے اندر مچی ہے
قیامت ہے مگر برپا کہاں ہے

بگولے بام و در سے پوچھتے ہیں
ہمارے رقص کا صحرا کہاں ہے

عجب بے خوابیوں میں عمر گزری
جسے سوچا اُسے دیکھا کہاں ہے

دلوں میں ایک ربطِ باہمی ہے
ابھی یہ سلسلہ ٹوٹا کہاں ہے

گدایانِ محبت پوچھتے ہیں
ہمارا وہ سخی داتا کہاں ہے

کلاہِ حرص کب رکھی ہے سر پر
قبائے کذب کو پہنا کہاں ہے

حدیثِ طاعت و آیاتِ حق کو
کوئی اس دور میں سنتا کہاں ہے

شعارِ عجز و ذوقِ انکساری
یہ سکہ شہر میں چلتا کہاں ہے

میں دنیا کے لیے زندہ ہوں محسن
مجھے خود خواہشِ دنیا کہاں ہے

مرتضیٰ برلاس

○

چاہت ہو یا کہ نفرت 'بھرپور' ہو تو یوں ہو
نزدیک تجھ سے تو یوں جیسے 'اب دور ہو تو یوں ہو

آئے ترنگ میں اور خود کو نثار کر دے
جانِ حزیں کسی دن مسرور ہو' تو یوں ہو

ہو پا برہنہ جب وہ، تلووں کے نیچے مچلے
دل کرچیوں کی صورت بھر چور ہو' تو یوں ہو

طالب کی دلدہی بھی 'مطلوب' پر ہو لازم
شہرِ طلب کا کوئی دستور ہو، تو یوں ہو

ہو خود سپردگی میں غمزہ بھی آپ جیسا
جنت میں ملنے والی جو حور ہو' تو یوں ہو

ہیجان سوچ میں ہو اور لب سلے ہوئے ہوں
کوئی نہ اس جہاں میں مجبور ہو تو یوں ہو

رسوائیوں کو اپنی شہرت سمجھنے والے
کوئی بھی، توبہ توبہ' مشہور ہو، تو یوں ہو

○

اِس مسیحائی کے صدقے کام جاں تک آ گئی
تجربے کرتے ہوئے نوبت یہاں تک آ گئی

اب تو گھواروں پہ خادم رکھ لیے ماں باپ نے
مامتا تخمینۂ سود و زیاں تک آ گئی

تو نے کوشش تو یہی کی تھی کہ گھر میرا جلے
آگ جب بھڑکی تو پھر تیرے مکاں تک آ گئی

اِس نظامِ آب و گل میں زہر پھیلانے کے بعد
پھر وہی شورش زمیں سے آسماں تک آ گئی

مجھ میں اور دنیا میں پھر کیا فرق ہوگا دوستو
زندگی کی ہے جو تلخی گر زباں تک آ گئی

اتنی قربت تھی ہماری اپنے تیر انداز سے
دھار خوں کی جسم سے نکلی کماں تک آ گئی

بند یہ اپنے تشخص کا نہ بہہ جائے کہیں
موجِ سیلِ تند خطرے کے نشاں تک آ گئی

جون ایلیا

○

جونؔ گذشت وقت کی حالتِ حال پر سلام
اس کے فراق کو دعا، اس کے وصال پر سلام

میرا ستم بھی تھا کرم، تیرا کرم بھی تھا ستم
بندگی تیری تیغ کو، اور تری ڈھال پر سلام

سود و زیاں کے فرق کا اب نہیں ہم سے واسطہ
صبحِ طرب کو کورنش، شامِ ملال پر سلام

اب تو نہیں ہے لذتِ ممکنِ شوق بھی نصیب
روز و شبِ زمانۂ شوقِ محال پر سلام

ہجر سوال کے ہیں دن، ہجر جواب کے ہیں دن
اس کے جواب پر سلام، اپنے سوال پر سلام

جانے وہ رنگِ مستیٔ خواب و خیال کیا ہوئی
عشرتِ خواب کی ثنا، عیشِ خیال پر سلام

اپنا کمال تھا عجب، اپنا زوال تھا عجب
اپنے کمال پر درود، اپنے زوال پر سلام

○

سلسلہ جنباں شام ہے کس کی، شکوہ کناں ہے کس کی شام
ہم تو گماں برباد ہی ٹھہرے، شامِ گماں ہے کس کی شام

اس میدانِ شکستِ جاں میں کون بچا زندہ، جانے
کیا جانے اس شہرِ عبث میں کس کا زیاں ہے کس کی شام

آج کہاں کیسا موسم ہے، جسم و جاں کی بستی میں
شبنم شبنم جسم ہے کس کا، شعلہ بجاں ہے کس کی شام

شام کا شہر بے پرسش ہے اور بازاروں کا آشوب
پرسشِ جاں! تیرے قریے میں شکوہ کناں ہے کس کی شام

گم ہوئی اپنی خوش گزرانی کوچۂ دل ناپرساں میں
جانے دل کوچے میں ہمارے خوش گزراں ہے کس کی شام

انور شعور



دُکھ ہے تو آپ سے ہے، دوا ہے تو آپ سے
عمرِ رواں میں کوئی مزا ہے تو آپ سے

برتاؤ دوسروں کا بھی کچھ مختلف نہیں
لیکن مجھے کسی سے گِلہ ہے تو آپ سے

مشہور ہیں اگرچہ وفا ناشناس آپ
دُنیا میں آج نامِ وفا ہے تو آپ سے

اغیار بھی ہیں درپئے آزار، یار بھی
بے چین دل کو چین ذرا ہے تو آپ سے

ہم زندگی میں اور کسی کے نہیں ہُوئے
تھوڑا بہت لگاؤ رہا ہے تو آپ سے

رکھتا نہیں کسی سے کوئی واسطہ شعورؔ
خوش ہے تو آپ سے ہے، خفا ہے تو آپ سے



بُرا ہو خواہ اچھّا، دیکھتا ہُوں
دکھاتی ہے جو دُنیا، دیکھتا ہُوں

مسیحا دیکھتا ہے نبض میری
تو میں شکلِ مسیحا دیکھتا ہوں

مجھے تحریف کی عادت نہیں ہے
دکھا دیتا ہوں، جیسا دیکھتا ہوں

جو شے ممنوع ہے، الحمدللہ
اُسی کا دور دورہ دیکھتا ہوں

کبھی میں دیکھتا ہُوں اُس کا چہرہ
کبھی اُس کا سراپا دیکھتا ہوں

نہیں کرتا شکایت ہر کسی سے
شعورؔ اپنا پرایا دیکھتا ہوں

باقر نقوی



باہر نکلو، موسم جھیلو آسمان کے نیچے
فصل کہیں بوئی جاتی ہے سائبان کے نیچے!

مجنوں پیاسا، چڑیا پیاسی، ہری ببول کی شاخیں
کس تقدیر کا پانی ہے اس ریگستان کے نیچے

اوپر تیز ہوا چلتی ہے، نیچے گہرا پانی
آگ کوئی روشن کرتا ہے بادبان کے نیچے

چاند ستارے کیا ہوتے ہیں! شبنم کیا کرتی ہے
ایک رات سو کر تو دیکھو آسمان کے نیچے

ہنستی آنکھوں کے پردے میں چھپے ہیں کتنے آنسو
دُکھ کا ایک سمندر ہوگا اطمینان کے نیچے

اُس پر بھی کچھ غور کرو، کوئی کام کی بات ہو شاید
وہ جو خط کب سے رکھا ہے اس گلدان کے نیچے

خوب نہیں ہے جانم، باقر اتنی آتشبازی
جگہ جگہ بارود بچھی ہے ترے مکان کے نیچے



کھیت سے بچ کر گزرے، بستی کو ویرانی دے
وہ دریا کیا دریا جو ساگر کو پانی دے

شعر سنا کوئی ایسا جس سے لگے بدن میں آگ
نیند اڑ جائے جس سے، ایسی کوئی کہانی دے

سوکھ رہے ہیں باغ بغیچے، نہریں بانجھ ہوئیں
اے موسم کے مالک! اک موسم بارانی دے

خود بنوائے محل دو محلے، ہم سے کہے حدیث
خود تو پہنے عبا قبا، ہم کو عریانی دے

توڑ گئی دم آخر پیاسی رات اماوس کی
پیارے سورج، اب تو اپنے چاند کو پانی دے

کون سُنے گا تیرا قصہ رونے دھونے کا
لیلیٰ مجنوں شامل کر، کوئی راجا رانی دے

اب تک تم نے باقر ایسے کون سے کام کیے
کس اُمید پہ مالک تم کو نئی جوانی دے

ماجد صدیقی



وسعتِ تیرہ شبی، تنہا روی ہے اور ہم
جگنوؤں سی اپنی اپنی روشنی ہے اور ہم

کیمیا گر تو ہمیں کندن بنا ڈالے مگر
آنچ بھر کی، ایسا ہونے میں، کمی ہے اور ہم

بھیڑیوں کی دھاڑ کو سمجھیں صدائے رہنما
خوش گماں بھیڑوں سی طبعی سادگی ہے اور ہم

ہاں یہی وہ فصل ہے، پکنے میں جو آتی نہیں
زخمِ جاں کی روز افزوں تازگی ہے اور ہم

ناگہانی آندھیوں میں جو خس و خاشاک کو
جھیلنی پڑتی ہے، وہ آوارگی اور ہم

ناخدا کو ناؤ سے دیکھا ہو جیسے کودتے
دم بہ دم ماجد کچھ ایسی بے بسی ہے اور ہم



بچا ہے پیڑ پر جو مشت بھر، اچھا نہیں لگتا
مرے حصے کا بے وقعت ثمر اچھا نہیں لگتا

ذرا سا بھی جو یہ چہرے کو تکدّر آشنا کر دے
انہیں ہم سا کوئی شوریدہ سر اچھا نہیں لگتا

نفاذِ جبر پر خاموش تھے جو گھر، بہت کم تھے
مگر یوں ہے کہ اب سارا نگر اچھا نہیں لگتا

گلوں نے جن دِلوں سے ہیئتِ پیغام بدلی ہے
غضب یہ ہے، ہوا سا نامہ بر اچھا نہیں لگتا

مثالِ کم سناں بہلائے رکھنا بالغوں تک کو
ہنر اچھا ہے لیکن یہ ہنر اچھا نہیں لگتا

کہیں کیونکر نہ ماجد، زر سے ہی جب سرخیٔ خوں ہے
نہیں لگتا ہمیں فقدانِ زر اچھا نہیں لگتا

محسن بھوپالی

چمن چمن اسی رنگیں قبا کو دیکھتے ہیں
ہر ایک جلوے میں جلوہ نما کو دیکھتے ہیں

ہمیں کتابِ مبیں ہے ترا رخِ روشن
ترے جمال میں نورِ خدا کو دیکھتے ہیں

وہ آئیں پرسشِ غم کو، یقیں نہیں آتا
ہم اپنے سامنے آہِ رسا کو دیکھتے ہیں

کہاں کے پہنچے ہوئے تھے مقامِ حیرت ہے
کبھی اثر، کبھی دستِ دُعا کو دیکھتے ہیں

ترے مزاج سے ہم اس قدر ہوئے مانوس
کہ شاخِ گل میں بھی تیری ادا کو دیکھتے ہیں

کلی پہ تیرے لبوں کا گماں گزرتا ہے!
گلوں میں ہم ترے رنگِ حیا کو دیکھتے ہیں

یہ تیری جھیل سی آنکھوں میں ڈوبنے والے
تجھے خبر بھی ہے، آبِ بقا کو دیکھتے ہیں

جو تیرے ہونٹ ہلیں تو پھوار پڑتی ہے
ترے سکوت میں شہرِ نوا کو دیکھتے ہیں

دمکنے لگتے ہیں ذرّے جدھر سے تُو گزرے
ستارے جُھک کے ترے نقشِ پا کو دیکھتے ہیں

ترے قیام پہ ہوتا ہے سرو کا دھوکا
ترے خرام میں بادِ صبا کو دیکھتے ہیں

تجھے ہو علم تو کیسے، کہ دیکھنے والے
چھپا کے تجھ سے، تری ہر ادا کو دیکھتے ہیں

ترے ستم میں بھی ہم کو کرم نظر آیا
وہ اور ہوں گے جو خوئے جفا کو دیکھتے ہیں

وہ خوش گمان ہیں ہم دادِ ظرف کی خاطر
جو دل شکن ہے اُسی دل ربا کو دیکھتے ہیں

مثال اپنے توکل کی اور کیا ہو گی
ہم اپنے حال میں ہیں اور خدا کو دیکھتے ہیں

کچھ اس میں اور ہی چاہت کا لطف ہے محسنؔ
ہم اجنبی کی طرح آشنا کو دیکھتے ہیں

افضل پرویز



کل رات ہی جو لُٹ گیا مال و منالِ شہر
عملے سمیت گشت پہ تھا کوتوالِ شہر

خفیہ جو کاروبار ہوا حسبِ حالِ شہر
رکھ دی گئی اسی پہ بنائے مآلِ شہر

وحشی ہُنوں کا حملہ تھا یا یورشِ تتار؟
سیلاب لے گیا ہے جلال و جمالِ شہر

"فرصت کہاں کہ تیری تمنا کرے کوئی"
کٹتے ہیں دن میانِ عروج و زوالِ شہر

جرّاح و چارہ ساز سے میرا سوال ہے
کن مرہموں سے ہوگا کبھی اندمالِ شہر

تاراج کر کے شہر کو اُس نے دیا یہ حکم
آؤ، بڑھو، مجھی سے کرو عرضِ حالِ شہر

دیپک بجھا کے، مہرے بدل کر جو جیت جائے
شاطر وہی ہے اور وہی باکمالِ شہر

اس رستے بستے شہر کو لٹنے ہی کیوں دیا؟
مبہوت کر گیا ہے مجھے یہ سوالِ شہر

چاروں طرف سراب تھا، تپتی تھی دوپہر
آندھی اُڑا کے لے گئی اِک اِک نہالِ شہر

ہم رو رہے ہیں آج کہ کل بھول ہو گئی،
آنسو نہیں، یہ ہے عرقِ انفعالِ شہر

ہارا ہوا جواری عجب چال چل مرا
جھٹ داؤ پر لگا گیا اکلِ خلالِ شہر

"تجھ کو پرائی کیا پڑی اپنی نبیڑ تُو"
پرویزؔ! تُو نے کاہے کو پالا ملالِ شہر

شبنم شکیل



رسوائی کا بھی ہم پر الزام ضروری تھا
جو دل نے کمایا ہے، وہ نام ضروری تھا

مرتے ہی رہے پیہم اور جی کے نہیں دیکھا
ہم بھول گئے شبنمؔ جو کام ضروری تھا

کرتا جو وضاحت وہ، ہم زندہ کہاں رہتے
باتوں میں جو تھا اُس کی ابہام ضروری تھا

زہرِ غمِ دنیا کے تریاق کی خاطر سے
زہرِ غمِ جاناں کا اِک جام ضروری تھا

اِک عمر دیا اس نے جو ساتھ وہ کافی ہے
اب تھک سا گیا تھا دل آرام ضروری تھا

خورشید رضوی



یہ جو ننگ تھے ، یہ جو نام تھے ، مجھے کھا گئے
یہ خیالِ پختہ جو خام تھے ، یہ مجھے کھا گئے

کبھی اپنی آنکھ سے زندگی پہ نظر نہ کی
وہی زاویے کہ جو عام تھے ، مجھے کھا گئے

میں عمیق تھا کہ پلا ہوا تھا سکوت میں
یہ جو لوگ محوِ کلام تھے ، مجھے کھا گئے

وہ جو مجھ میں ایک اکائی تھی وہ نہ جڑ سکی
یہی ریزہ ریزہ جو کام تھے ، مجھے کھا گئے

یہ عیاں جو آبِ حیات ہے اسے کیا کروں
کہ نہاں جو زہر کے جام تھے ، مجھے کھا گئے

وہ نگیں جو خاتمِ زندگی سے پھسل گیا
تو وہی جو میرے غلام تھے ، مجھے کھا گئے

میں وہ شعلہ تھا جسے دام سے تو ضرر نہ تھا
پہ جو وسوسے تہِ دام تھے ، مجھے کھا گئے

جو کھلی کھلی تھیں عداوتیں ، مجھے راس تھیں
یہ جو زہر خند سلام تھے ، یہ مجھے کھا گئے



بقا کو لرزشِ رنگِ فنا سے پہچانا
خدا کو کشمکشِ ناخدا سے پہچانا

مری نظر نے مجھے میرے آئینے سے نہیں
فقط مرے خد و خالِ انا سے پہچانا

میں آسمان سے اترا تھا بے لباس مگر
زمیں نے مجھ کو لباسِ وفا سے پہچانا

زمیں پر ترے کوچے کو جذبۂ دل نے
دیارِ خلد کی آب و ہوا سے پہچانا

زمانے بھر سے الگ اپنی ذات کو میں نے
زمانے کی روشِ ناسزا سے پہچانا

ہزار آنکھ سے اوجھل سہی مگر اس نے
پسِ حجاب مجھے مدعا سے پہچانا

سفر میں ہم ترے اپنے کہے پہ بھی بنِ گئے
تری جہت کو ترے نقشِ پا سے پہچانا

خورشید رضوی



آنکھ کے تِل میں رُکا ہے کہ تہہِ دل میں ہے تو
اے مرے اشکِ تپاں! کون سی منزل میں ہے تو

آزماتے ہیں سفینوں کو ٹھکانے تیرے
کبھی گرداب میں پنہاں، کبھی ساحل میں ہے تو

نارسائی میں رسائی کی تڑپ رکھتا ہوں
کہ سمندر میں ہوں میں اور مہِ کامل میں ہے تو

اے جُنوں، ہو کے رہا بھی، تری وحشت نہ گئی
میں سمجھتا تھا فقط شورِ سلاسل میں ہے تو

پیشِ آئینہ تری موجِ نگہ دیکھتا ہوں
کبھی خود میں ہے، کبھی اپنے مماثل میں ہے تو

اِس رہِ شوق کا انجام کہیں ہے ہی نہیں
اے دلِ زار! ابھی جس کے اوائل میں ہے تو



ہرزہ مت جان مری بادیہ پیمائی کو
ڈھونڈتا پھرتا ہوں اِک لالۂ صحرائی کو

اُس کے چہرے کی طرف آنکھ اُٹھا کر مت دیکھ
شعلہ ایسا ہے کہ لے جائے گا بینائی کو

اُنکی قسمت میں ہے، سر پھوڑتے پھرنا کہ جنہیں
سنگِ در مل نہ سکا ناصیہ فرسائی کو

ایک آواز سے ڈرتے ہیں ہم اِتنا کہ مدام
شورِ محشر میں دبا رکھتے ہیں تنہائی کو

اپنا گھر اپنا ہی گھر ہے، جب اسے کھولو گے
درد و غم آن کھڑے ہوں گے پذیرائی کو

آفتاب اقبال شمیم



نام کی خواہش مِرے وجدان پر بھاری نہیں
مانگ جن کی ہے میں اُن چیزوں کا بیوپاری نہیں

سوچتا ہوں کس سے لکھواؤں سند پہچان کی!
شہر کے شہرت نویسوں سے مری یاری نہیں

اے خداوندا! مجھے بعدِ بصیرت کا سراغ
آنکھ کا یہ زخم گہرا ہے مگر کاری نہیں

شعرِ مشکل کی سماعت ناپسند آئے انہیں
اور آساں ہو تو کہتے ہیں کہ تہ داری نہیں

مشکلیں سہنے کا جینے میں سلیقہ آ گیا
اب تو مر جانے میں مجھ کو کوئی دشواری نہیں

خیر ہو اے حسن! تیری دلبری کی خیر ہو
عشق نے ہاری ہوئی بازی ابھی ہاری نہیں



وُہ ہدف ہے کہ زدِ تیر سے باہر ہی رہے
جب بھی کھینچوں اُسے، تصویر سے باہر ہی رہے

رشتۂ موجد و ایجاد کی منطق سمجھو
یہ جہاں دستِ جہاں گیر سے باہر ہی رہے

جبر مجبور ہے، چھپ کر بھی نہیں چھپ سکتا
شورِ زنجیر کا، زنجیر سے باہر ہی رہے

یوں کہ کچھ عکس نمائی کا ہمیں شوق نہ تھا
چشمِ آئینۂ تشہیر سے باہر ہی رہے

وُہ ارادہ مجھے دے، اے مری ترکیبِ وجود
جو عمل داریٔ تقدیر سے باہر ہی رہے

ایلیے میرے زمانے کے مجھے سہنے پڑے
چشمِ غالب سے، دلِ میر سے باہر ہی رہے

آفتاب اقبال شمیم



ویسے تو بہت دھویا گیا گھر کا اندھیرا
نکلا نہیں دیوار کے اندر کا اندھیرا

کچھ روشنئ طبع ضروری ہے وگرنہ
ہاتھوں میں اتر آتا ہے یہ سَر کا اندھیرا

وہ حکم کہ ہے عقل و عقیدہ پہ مقدّم
چھٹنے ہی نہیں دیتا مقدّر کا اندھیرا

کیا کیا نہ ابوالہول تراشے گئے اس سے
جیسے یہ اندھیرا بھی ہو پتھّر کا اندھیرا

دیتی ہے یہی وقت کی توریت گواہی
جو زر کا اجالا ہے وہ ہے زر کا اندھیرا

ہر آنکھ لگی ہے افقِ دار کی جانب
سورج سے کرن مانگتا ہے ڈر کا اندھیرا



گھر کو اتنا بھی نہیں تاریک رکھنا چاہیے
وا ذرا سا روزنِ تشکیک رکھنا چاہیے

ہے اسی کے بھید سے حاضر میں غائب کی نمود
دُور کو ہر حال میں نزدیک رکھنا چاہیے

خود بخود آ جائے گا کعبہ جبیں کی سیدھ میں
بس ذرا اندر کا قبلہ ٹھیک رکھنا چاہیے

درپئے آزار ہے سنجیدگی کا پیشہ ور
پاس اپنے دشنۂ تضحیک رکھنا چاہیے

پردۂ حیرت میں رہنا اس کا منشا ہی سہی
پر اسے پردہ ذرا باریک رکھنا چاہیے

آفتاب اقبال شمیم



بات جو کہنے کو تھی سب سے ضروری، رہ گئی
کیا کیا جائے، غزل یہ بھی ادھوری رہ گئی

رزق سے بڑھ کر اُسے کچھ اور بھی درکار تھا
کل وُہ طائر اُڑ گیا، پنجرے میں چُوری رہ گئی

تھی بہت شفاف لیکن دن کی اُڑتی گرد میں
شام تک یہ زندگی رنگت میں بھوری رہ گئی

کیوں چلے آئے کھُلی آنکھوں کی وحشت کاٹنے
اُس گلی میں نیند کیا پُوری کی پُوری رہ گئی!

بس یہی حاصل ہُوا ترمیم کی ترمیم سے
حاصل و مقصود میں پہلی سی دوری رہ گئی

کس قرینے سے چھپایا بھید لیکن کھُل گیا!
غالباً کوئی اشارت لاشعوری رہ گئی



ہوں انا الصحرا، کبھی پوچھو مجھے کیا چاہیئے
آسماں جتنا بڑا پینے کو دریا چاہیئے

اتنا سنجیدہ نہ ہو، سب مسخرے لگنے لگیں
زندگی کو نیم عُریانی میں دیکھا چاہیئے

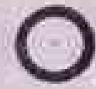
یا زیاں کو سود سمجھو یا کہو سر پیٹ کر
سوچ کو حدِ مروج میں ہی رہنا چاہیئے

جانتا ہوں کیوں یہ آسانی مجھے مشکل لگے
طے نہ کر پاؤں کہ کس قیمت پہ دنیا چاہیئے

یہ رہا سامانِ دنیا، یہ رہے اسبابِ جاں
کوئی بتلاؤ مجھے ان کے عوض کیا چاہیئے

کچھ نہیں تو اِس کی تسکینِ تغافل کے لیے
ایک دن اُس یارِ بے پروا سے ملنا چاہیئے

سجاد بابر



اِک محملِ گُل شہر کو مغتوب نہ کر دے
خوشبو، کوئی آسیب سے منسوب نہ کر دے

لکھتا ہوں خزاؤں کی بیاضوں میں بہاریں
تنہا مجھے سب سے مرا اسلوب نہ کر دے

دہلیز تک آ آ کے مکینوں پہ کریں دَم
کرنوں کا وتیرا انہیں مجذوب نہ کر دے

سوچوں کی ہری شاخ پہ اَٹکا ہُوا آنسو
ضَو پائے تو خورشید کو مرعوب نہ کر دے

خوشبو کو دکھاتے نہیں عکس، ایک ہی ڈر سے
خود اپنا سراپا اُسے محجوب نہ کر دے

کھُلتا ہی نہیں رنگ فسانے کی رِدا کا
جب تک یہ کسی آس کو مصلوب نہ کر دے

لے اُڑتی ہے ہر صبح ہَوا میرے جریدے
تشریحِ سخن بھی مری مندوب نہ کر دے



نظر پڑے تو برابر ہی خود کو کوستا ہُوں
کہ دوستوں میں نہیں آئینے میں رُسوا ہوں

یہ انکشاف ـــــ اچانک رُلا گیا مجھ کو
مَیں کچھ اچھوتا نہیں، میں تو سب کے جیسا ہوں!

سفر کے بعد کی آسودگی ملی بھی تو .. یُوں
کہ شہر سامنے ہے اور تھک کے بیٹھا ہوں

یہی نمایاں تعلق ہے اُس سے اب میرا
وہ پانیوں پہ رواں، اور میں جزیرہ ہوں

نشیب والے مری ہر روش سے واقف ہیں
میں پربتوں میں گھنے جنگلوں کا رستہ ہوں

طلسمِ حرف نے ایسا حصار کھینچ دیا
جہاں بھی حبس بھری، کہکشاں پہ اُترا ہوں!

(جدہ)

پروین شاکر

○

چلنے کا حوصلہ نہیں، رُکنا محال کر دیا
عشق کے اس سفر نے تو مجھ کو نڈھال کر دیا

اے مری گل زمیں! تجھے چاہ تھی اک کتاب کی
اہلِ کتاب نے مگر کیا ترا حال کر دیا

ملتے ہوئے دلوں کے بیچ اور تھا فیصلہ کوئی
اُس نے مگر بچھڑتے وقت اور سوال کر دیا

اب کے ہوا کے ساتھ ہے دامنِ یار منتظر
بانوئے شب کے ہاتھ میں رکھنا سنبھال کر دیا

ممکنہ فیصلوں میں ایک ہجر کا فیصلہ بھی تھا
ہم نے تو ایک بات کی، اُس نے کمال کر دیا

میرے لبوں پہ مُہر تھی، پر مرے شیشہ رُو نے تو
شہر کے شہر کو مرا واقفِ حال کر دیا

چہرہ و نام ایک ساتھ آج نہ یاد آ سکے
وقت نے کس شبیہ کو خواب و خیال کر دیا

مدتوں بعد اُس نے آج مجھ سے کوئی گلہ کیا
منصبِ دلبری پہ کیا مجھ کو بحال کر دیا!

○

حرفِ تازہ نئی خوشبو میں لکھا چاہتا ہے
بابِ اک اور محبت کا کھُلا چاہتا ہے

ایک لمحے کی توجہ نہیں حاصل اُس کی
اور یہ دل کہ اُسے حد سے سوا چاہتا ہے

اک حجابِ تہِ اقرار ہے مانع ورنہ
گُل کو معلوم ہے کیا دستِ صبا چاہتا ہے

ریت ہی ریت ہے اس دل میں مسافر میرے!
اور یہ صحرا ترا نقشِ کفِ پا چاہتا ہے

یہی خاموشی کئی رنگ میں ظاہر ہو گی
اور کچھ روز، کہ وہ شوخ کھُلا چاہتا ہے

رات کو مان لیا دل نے مقدر لیکن
رات کے ہاتھ پہ اب کوئی دیا چاہتا ہے

تیرے پیمانے میں گردش نہیں باقی ساقی
اور تری بزم سے اب کوئی اُٹھا چاہتا ہے

پروین شاکر



تخت ہے اور کہانی ہے وہی
اور سازش بھی پرانی ہے وہی

قاضیٔ شہر نے قبلہ بدلا
لیک خطبے میں روانی ہے وہی

خیمہ کش اب کے ذرا دیکھ کے ہو
جس پہ پہرہ تھا، یہ پانی ہے وہی

صلح کو فسخ کیا دل میں مگر
اب بھی پیغامِ زبانی ہے وہی

آج بھی چہرۂ خورشید ہے زرد
آج بھی شام سہانی ہے وہی

بدلے جاتے ہیں یہاں روز طبیب
اور زخموں کی کہانی ہے وہی

حجلۂ غم یونہی آراستہ ہے
دل کی پوشاک شہانی ہے وہی

شہر کا شہر یہاں ڈوب گیا
اور دریا کی روانی ہے وہی



نو چراغوں کی کل شب اضافی رہی
روشنی تیرے چہرے کی کافی رہی

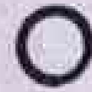
اپنے انجام تک آگئی زندگی
یہ کہانی مگر اختلافی رہی

ہے زمانہ خفا تو بجا ہے کہ میں
اس کی مرضی کے بالکل منافی رہی

ایسے محتاط " ایسے کم آمیز سے
اِک نظر بھی توجہ کی کافی رہی

صبح کیا فیصلہ حاکمِ نو کرے
جشن کی رات تک تو معافی رہی

شفیق سلیمی



تپش جو آگ سی ہوتی تھی پانی میں نہیں ہے
ہوئی ہے چشمِ تر، لیکن روانی میں نہیں ہے

بڑھاپا پاؤں پھیلائے بڑھا آتا ہے سر تک
سنبھل اے دِل کہ تو بھی اب جوانی میں نہیں ہے

بچالے جو بھی بچ سکتا ہے اس کارِ وفا سے
کوئی بھی فائدہ اب رائیگانی میں نہیں ہے

اُسی کے نام کی شہرت مرے حصّے میں آئی
وہ اِک کردار جو پوری کہانی میں نہیں ہے

اُسے جھکنا پڑے گا ذائقہ سب موسموں کا
وہ پودا جو کسی بھی سائبانی میں نہیں ہے



تری بے التفاتی کا اشارہ کس طرف ہے
کہاں بیٹھا تھا میں، تو نے پکارا کس طرف ہے

کھڑی ہے اک طرف دُنیا یہ ساری، اک طرف میں
تو اب تو بھی تباہی دے خدارا، کس طرف ہے

گنوادی عمر کی پونجی اِسی سود و زیاں میں
منافع کس طرف ہے اور خسارہ کس طرف ہے

کوئی سورج کو رستے سے ہٹاتا ہی نہیں ہے
کھُلی آنکھیں سوالی ہیں، نظارا کس طرف ہے

پھنسی گرداب میں ناؤ تھی جب، تو ہم سے پوچھا
کنارہ کرنے والے سے کنارا کس طرف ہے

کبھی دیکھوں ہتھیلی کو، کبھی میں آسماں کو
لکیریں کیا بتاتی ہیں، ستارہ کس طرف ہے

(ابوظبی)

دل نواز دل



جو خیال آنکھوں کی آب و تاب تھے
نیند کے عالم میں دھندلے خواب تھے

سو دلوں میں اِک بھنور کا پھیر تھا
ایک آنکھ اور اُس میں سو گرداب تھے

اس قدر بارش ہوئی اب کے برس
ایک دریا، سینکڑوں سیلاب تھے

قہرماں کے ہاتھ کو دیکھے بغیر
مہرباں مجھ پر مرے احباب تھے

ہر قبا میں سازِ دل تھا تار تار
ہر طرف ٹوٹے ہوئے مضراب تھے

آج جانے کیا ہُوا، کل تک تو ہم
اُن سے ملنے کے لیے بے تاب تھے

دوستوں کی تو کمی پہلے بھی تھی
دِل — مگر دشمن بھی اب کم یاب تھے

اقبال کوثر



میں مثلِ نخل ہوں اور شاخسار آدمی ہُوں
سمجھ نہ ایک مجھے، میں ہزار آدمی ہُوں

اُمیدِ وصل میں ہوں دیدہ ہائے وا کی طرح
جُدائیوں میں ہمہ انتظار آدمی ہوں

مجھی پہ آتے ہیں، چلتے ہیں جتنے تیرِ ستم
میں کتنے صیدِ گروں کا شکار آدمی ہوں

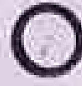
ترے فلک کی کوئی اور کہکشاں ہو گا
میں اپنی راہگزر کا غبار آدمی ہوں

سلا سلایا تو باہر سے لگ رہا ہوں۔ مگر
درونِ جسم میں اک تار تار آدمی ہوں

ترے حساب میں ہوں میں نہ اپنے کھاتے میں
ابھی تو میں کوئی زیرِ شمار آدمی ہوں

الگ ہی جان اور اب اہلِ قافلہ میں مجھے
نہ کر شمار کہ اک بے قطار آدمی ہوں

خالد احمد



(ابوالاثر حفیظ جالندھری کے لیے)

حال نہ ہم بتا سکے، پیار نہ ہم جتا سکے
وہ بھی نہ پا سکے ہمیں، ہم بھی انھیں نہ پا سکے

ہم بھی تو بس فقیر تھے، ہاتھ کی اِک لکیر کے
ہم نے بھی دستکیں نہ دیں، وہ بھی نہ در تک آ سکے

پیڑ کی چھاؤں آ گئے، لَوٹ کے گاؤں آ گئے
دام چھدام اُڑ گئے، صرف اَنا بچا سکے

شہر میں کم نمو تھے ہم، شعر میں غم نمو تھے ہم
بھیس نہ ہم بدل سکے، رُوپ نہ ہم بٹا سکے

حرف کا ظرف تنگ تھا، دشمنِ نام و ننگ تھا
بات میں بات آ گئی، بات نہ ہم چھپا سکے

ناز، نہ نیاز تھا، دستِ ہوا دراز تھا
ایک مہک بکھیر دی، حشر نہ گل اُٹھا سکے

طبل پہ اپنی تال تھی، ذہن میں اُن کی چال تھی
وہ بھی نہ ٹِک کے سُن سکے، ہم بھی نہ جم کے گا سکے

بار بہ گوشِ یار تھی، گونجِ شکستِ تار تھی
آہ، کراہ ہو گئی، رنگ نہ ہم جما سکے

زمزمۂ سپاس تھے، لب ہمہ التماس تھے
کب گُلِ التجا کھِلا، باس بھی وہ نہ پا سکے

وہ ابھی پیش و پس میں تھے، عشق کی دسترس میں تھے
آنکھ نے اُٹھ کے چھُو لیا، ہاتھ نہ ہم بڑھا سکے

ہم سے اب اُن کے ربط کی، ربط میں حُسنِ ضبط کی
وہ نہ دلیل دے سکے، ہم نہ جواز لا سکے

بانگِ جرس نہ سُن سکے، ہجر کے گل نہ چُن سکے
قافلہ کوچ کر گیا، گرد بھی ہم نہ پا سکے

حُسن کا رنگ، سرکشی، عشق کا ننگ، بے کسی
ہم بھی نظر سے گر گئے، جتنا بھی وہ گرا سکے

چھت تھے ہمارے سر کی وہ، جان تھے بام و در کی وہ
ہم بھی نہ گھر بدل سکے، وہ بھی یہ گھر نہ ڈھا سکے

بندۂ زر خرید تھے، فردِ صفِ فرید تھے
بارِ ستم اُٹھا لیا، سر نہ مگر اُٹھا سکے

ایک دیے کے بل اُٹھیں، لاکھ چراغ جل اُٹھیں
شام کا ہاتھ آج شب صبح تلک نہ جا سکے

دشت، دمِ وصال تھا، سانس، رمِ غزال تھا
جان سے ہم گزر گئے، گرد نہ اپنی پا سکے

پرتوِ فنِ حفیظ کا، عکسِ سخنِ حفیظ کا
خالدِ خستہ لب میں کاش، دھج وہ کوئی دکھا سکے

خالد احمد



(حمید نسیم کے لیے)

وَا، دَرِ رمز و کنایہ نہ بیک بار کیا
دُھول کو پھُول کیا، پھُول کو رُخسار کیا

عکس در عکس وہ خوشبو کی طرح گونج گیا
اس نے اک آن میں ہر آئینہ گلنار کیا

سَدِّ گل، سَدِّ صدا، سَدِّ نظر، سَدِّ خلا
اور پھر سَدِّ تصوّر کو بھی مسمار کیا

غرفۂ سدِّ تحیر! یہ نظارہ ہم نے
مرحلہ وار کیا اور رضادار کیا

اعترافِ خبر! اے بے خبری، کیا کرتے؟
اور کچھ بن نہ پڑا ہم سے، تو انکار کیا

عقل کے ساتھ چلے، عقل کے پیچھے نہ چلے
ذکر کی زین کسی، فکر کو رہوار کیا

یار دل کھول کے، خوں گھول کے روئے! لیکن!
ہم نے یہ کام پسِ پردۂ اظہار کیا

عجز کچھ اور بڑھا، کبرِ سِنی کے صدقے
ہم نے ہونے سے، نہ ہونے سے بھی انکار کیا

زندگی، فرشِ گُلِ گرد بچھاتے گزری
عمر بھر ہم نے فقط راستہ ہموار کیا

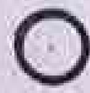
سنگ ساری کے سزاوار تھے لیکن اس نے
سرِ بازارِ محبت ہمیں گل سار کیا

ایک جھلمل کا سماں دیکھ کے، اے سروِ رواں!
اک دیا ہم نے بھی روشن سرِ دیوار کیا

لائقِ حمد، وہی ذات ہے اے جاں! جس نے
یہ ترفع، یہ توسّع، ترا کردار کیا

ہم نے بچپن میں بھی پلکیں نہیں جھپکیں خالد
عمر بھر، اے مہِ ہجراں! ترا دیدار کیا

ا۔ سنبل



بہت دنوں سے ہے دل پر غبار چھایا ہوا
پڑھیں پرانے خطوں کی نمازِ استسقاء

شدید اتنا کہ مرنا بھی مجھ کو آساں تھا
زہے فراق! وہ جذبہ بھی رزقِ خاک ہوا

وہ اور ہوں گے جو مڑ کر وہیں پہ آ بیٹھیں
دل ایک بار کسی بام سے اڑا تو گیا

یہاں تو ایک نظر دیکھنے کے لالے ہیں
وہاں وہ ہیں کہ بس آئینہ سامنے ہے دھرا

وہ صورتیں کہ فسانوں میں بھی نہیں ملتیں
نظر بھی آئیں تو اس دل نے دیکھنے نہ دیا

ترا شریک کسی کو کبھی نہ ٹھہرایا
گناہگار ہیں، ہم سے بڑا قصور ہوا

وہ زندگی جو فقط ایک بار ملتی ہے
اُسے بس ایک ترے نام پر گذار دیا



ہر اک حسیں کا دوسرے حسیں سے ارتباط ہے
صبا کا گُل سے، گُل کا تتلیوں سے اختلاط ہے

یہ جاتی گرمیوں کی شام کتنی دلفریب ہے
فضا میں اور ہوا میں، اک ادائے انبساط ہے

لکھا ہے جو جبیں کی لوح پر ملے گا ہر طرح
بلا سے ہر قدم پہ احتیاط و انضباط ہے

کریں جو فکر و غم تو فرق بھی پڑے گا کیا بھلا
بسیط کائنات میں ہماری کیا بساط ہے!

جو اک قدم بھی بال بھر غلط پڑا تو بس گئے
ہمیں تو اس جہان ہی میں پیش پل صراط ہے

خالد اقبال یاسر



بنیاد تھی دلدل پر، گارے کی چنائی تھی
دیوار محبّت کی بے کار اُٹھائی تھی

دِل میرا دہلتا تھا بادل کے ٹھہرنے سے
خاشاک کی چھت اُوپر مٹی کی لپائی تھی

خم کھائی ہوئی کڑیاں، شہتیر شکستہ تھا
محراب پہ سبزہ تھا، دہلیز پہ کائی تھی

ویسے تو ہر اک منظر آنکھوں کو لبھاتا تھا
دروازے پہ چشمہ تھا، پچھواڑے ترائی تھی

خوں اور پسینے سے سینچی ہوئی کیاری کے
گُل بُوٹے تو اپنے تھے، مہکار پرائی تھی

کچھ روگ تھے اپنے بھی، کچھ درد پرائے تھے
زنبیل میں سینے کی عمروں کی کمائی تھی

اس ڈھیر سے نکلیں گے ایوان، دریچے، در
پہلے بھی یہ گھر میرا بے جوڑ اکائی تھی



ترا تو وصف ہے سب کو نگاہ میں رکھنا
مرے خدا، اسے اپنی پناہ میں رکھنا

ترے کرم کا خزانہ بھرا ہی رہنا ہے
کمی نہ کوئی مری عزّ و جاہ میں رکھنا

پلٹ کے آئے جو آئے وہ چودھویں کی رات
نہ ایک دھبّہ پرانا بھی ماہ میں رکھنا

ابھی گماں کے بگولے ہیں دشت کی حد میں
انھیں وہیں کسی گھاٹی میں، راہ میں رکھنا

عدو نے بول دیا ہے فصیل پہ دھاوا
مگر اسے کسی خندق کی تھاہ میں رکھنا

زمانہ بیچ ہمارے ہزار بار آئے
ذرا بھی فرق نہ آپس کی چاہ میں رکھنا

یہ ایک موجۂ کم آب ابھی غنیمت ہے
روانی تھوڑی بہت راجباہ میں رکھنا

غلام محمد قاصر

○

خوابوں کی زمیں مٹیالی تھی
اک آنچل میں ہریالی تھی
سورج کی سنہری گھڑی میں
کچھ خوابیدہ سی لالی تھی
پت جھڑ کے ہراول دستے میں
پھولوں سے لدی اک ڈالی تھی
اُس گاؤں نے چھاؤں سے اُکتا کر
کل دھوپ کی پڑیا کھالی تھی
رنگوں کے ذخیرے تھے جس میں
وہ آنکھ بھی آج سوالی تھی
دریا کی نزاکت لے ڈوبی
کشتی تو بظاہر خالی تھی
کمرے میں کسی نے آتے ہی
تیری ہر یاد ہٹا لی تھی
اِس بار بھی چاند نہیں مانا
تاروں نے عید منا لی تھی
البم میں ہزاروں تصویریں
اور ہر تصویر خیالی تھی

○

یہ جہاں نورد کی داستاں، یہ فسانہ ڈولتے سائے کا
مرے سر بریدہ خیال ہیں کہ دھواں ہے سونی سرائے کا

وہ ہوا کا چپکے سے جھانکنا کسی بھولے بسرے مدار سے
کہیں گھر میں اپنی ہی ظلمتیں، کہیں چھت پہ چاند کرائے کا

گِلِ ماہ گھومتے چاک پر کفِ کوزہ گر سے پھسل گئی
کہ بساطِ گردشِ سال و سِن یہی فرق اپنے پرائے کا

ہے فشارِ نطق و نگاہ بھی، مری شاعری کا گواہ بھی
تری دوستی کے محاذ پر وہ لرزتا عکس کنائے کا

کہ اِسی کے نام تک آئے تھے یہ صدا و صدق کے سلسلے
وہی شخص جس نے ترے لیے کیا قتل اپنی ہی رائے کا

شہزاد قمر



نکل کر کس نگر سے کس نگر میں رہ گیا ہوں؟
میں گھر میں آ گیا ہوں یا سفر میں رہ گیا ہوں؟

جہاں مجھ سا گدا بھی اک غنی سمجھے ہے خود کو
مَیں ایسے کاسہ لیسوں کے نگر میں رہ گیا ہوں

مَیں آ نکلا تھا اپنی ذات کے کس منطقے میں؟
ہمیشہ کے لیے اب کس کھنڈر میں رہ گیا ہوں؟

جنہیں منزل ملی تھی میرے پیچھے پیچھے چلتے
تماشہ ہے، مَیں اُن کی رہگزر میں رہ گیا ہوں

ثمر بن کر نکلنے کے لیے تو ہر کوئی تھا
نمو بن کر تو مَیں شاخِ شجر میں رہ گیا ہوں

کبھی تھا جسکی باتوں میں مرا ذکرِ مفصل
اب اُسکی گفتگو کے مختصر میں رہ گیا ہوں



کسی کے حکم کی تعمیل کرتے جا رہے ہیں
ہم اپنے فیصلے تبدیل کرتے جا رہے ہیں

کھُلے جاتے ہیں سمجھوتوں کے یوں سربند پیکٹ
ہم اپنی خواہشوں کو سیل کرتے جا رہے ہیں

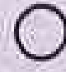
دکانِ جسم ہے اور سر پھرا گاہک زمانہ
بہت مشکل ہے لیکن ڈیل کرتے جا رہے ہیں

یہ نفرت اپنے بچوں کا کہیں ورثہ نہ بن جائے
جسے ہم خون میں تحلیل کرتے جا رہے ہیں

بدن سیراب تو پہلی ہی بارش کر گئی تھی
یہ موسم تو ہمیں اب جھیل کرتے جا رہے ہیں

بھٹکنے کا مقام آیا نہیں ہے اور ابھی سے
ہم اپنے راستے تبدیل کرتے جا رہے ہیں

ثمینہ راجہ



ہم اپنی صورتوں سے مماثل نہیں رہے
ایک عمر آئینے کے مقابل نہیں رہے

مجبوریاں کچھ اور ہی لاحق رہیں ہمیں
دل سے ترے خلاف تو اے دل نہیں رہے

اب وقت نے پڑھائے تو پڑھنے پڑے تمام
اسباق، جو نصاب میں شامل نہیں رہے

بے چہرگی کا دُکھ بھی بہت ہے مگر یہ رنج!
ہم تیری اِک نگاہ کے قابل نہیں رہے

عمرِ رواں کے موڑ پہ کچھ خواب میرے خواب
کھوئے گئے ہیں ایسے کہ اب مل نہیں رہے

اپنے لیے ہمیں کبھی فرصت نہ مل سکی
اس کو گلہ کہ ہم اسے حاصل نہیں رہے

کیا رات تھی کہ شہر کی صورت بدل گئی
ہم اعتبارِ صبح کے قابل نہیں رہے



طے ہوا، ہم کو اسی شہرِ خرابی میں سدا رہنا ہے
نہیں رہنا ہے تو پھر اس میں نہ رہنے کا گلہ رہنا ہے

اب تو اِک شاخ سے ٹوٹے ہوئے پتے کی طرح اس دل کو
دربدر خاک بسر بن کے کوئی نقشِ فنا رہنا ہے

پارۂ ابر کے مانند رہو دوشِ ہوا پر کب تک
تم کو روئیدگی ہونا، اسی مٹی پہ سجا رہنا ہے

اب کسی اسم سے کھولیں تو کھلے گنبدِ احساس کا در
ورنہ اس بار تو جو قفل پڑا ہے وہ پڑا رہنا ہے

میری صورت پہ بھی اس عشق کے سو رنگ دکھائی دینگے
پھول کی طرح جسے میرے دل و جاں میں کھلا رہنا ہے

ثاقب عرفانی



مسائل کا ہجوم بیکراں تھا
ہر لمحہ نیا اک امتحاں تھا

رہینِ مصلحت سچائیاں تھیں
تصادم خیر و شر کے درمیاں تھا

صفائی کس کے آگے پیش کرتے
نگر سارے کا سارا بدگماں تھا

دکھاوا تھیں فقط پختہ فصیلیں
روائت کا امیں کچا مکاں تھا

تعین کر نہ پایا منزلوں کا
وہ تنکا جو سرِ آبِ رواں تھا

گرا آخر وہ بوڑھا پیڑ ثاقب
جو بے سایہ سروں کا سائباں تھا



جہالت اور نادانی بہت ہے
کسی دنا کس میں من مانی بہت ہے

لبوں پر مسکراہٹ کے کنول ہیں
نگاہوں میں پریشانی بہت ہے

پرندے لوٹ آئے گھونسلوں کو
ہوائے دشت برفانی بہت ہے

گذشتہ سال کی بارش کا اب تک
مری انگنائی میں پانی بہت ہے

کواڑوں کو مقفل کر کے رکھو
فضائے شہر طوفانی بہت ہے

جو ہاتھ اٹھا وطن پر، کاٹ دوں گا
کہ آنکھوں میں ابھی پانی بہت ہے

صفدر صدیق رضی

○

زندگی ساری خیال و خواب کی تصویر کر دی
اُس نے اظہارِ محبت میں بڑی تاخیر کر دی

اُس پرانے ہمسفر نے اک نیا رستہ دکھا کر
راستے میں اِک نئی دیوار بھی تعمیر کر دی

مُجھ سے تن آسان کو بھی عشق لاحق ہو گیا ہے
آبجُو سی زندگی تھی، اُس نے جُوئے شیر کر دی

خواب کے تاوان میں مُجھ سے وہ آنکھیں لے گیا ہے
اور میری عُمر ساری خواب کی تعبیر کر دی

اُس کا چہرہ پڑھ کر جب لکھنا مُجھے آیا تو میں نے
شاعری صرف اُس کے خدّ و خال کی تفسیر کر دی

ملنے والوں کو نظر انداز کر دیتی ہے دُنیا
پردہ پوشی نے ہمارے عشق کی تشہیر کر دی

○

قبولیت کی گھڑی جب مجھے پکارتی ہے
مری زبان پہ حرفِ دُعا اُتارتی ہے

وہ کوئی اور ہیں جو زندگی گزارتے ہیں
وہ لوگ ہم ہیں جنہیں زندگی گزارتی ہے

یہ عرض ہے کہ تُو ہم سے بھی رسم و راہ رکھ
تعلقات کی دُنیا بڑی تجارتی ہے

یہ جل بھی سکتا ہے گِر کر بکھر بھی سکتا ہے
ہمارے جسم کا سامان بھی عمارتی ہے

بکھیر جاتے ہیں سفّاک روز و شب، تو ہمیں
دِل و نگاہ کی آب و ہوا سنوارتی ہے

چراغِ فتح و ظفر مقبروں پہ روشن ہیں
سپاہ جیتی ہوئی جنگ یُوں بھی ہارتی ہے

ابرار احمد



آنکھیں اسے ڈھونڈیں گی، تماشا نہیں ہوگا
وہ دیکھیں گے ہم، جو کبھی دیکھا نہیں ہوگا

اک خوابِ زر و سیم سے گھر بھر گئے سارے
اب کوئی یہاں نیند کا ماتا نہیں ہوگا

دل ہوگا، نہیں ہوگا، کسی یاد کا مسکن
سو بامِ طلب پر کوئی چہرا نہیں ہوگا

ہم ہوں گے، نہیں ہوں گے ترے شام و سحر میں
لیکن تجھے اس بات کا دھڑکا نہیں ہوگا

یہ سر کہ بھرا ہوگا فراوانیٔ شب سے
پھر تا بہ ابد دل میں اجالا نہیں ہوگا

یہ خواب سا منظر ہے بس اک عمر کا مہمان
پھر حشر تلک اس کا نظارا نہیں ہوگا

پھر کس لیے ہم زحمتِ امید اٹھائیں
اس شہر میں جب کوئی بھی تجھ سا نہیں ہوگا

بھر جائیں گے اک روز سبھی گھاؤ ہمارے
اے دردِ محبت! ترا چارا نہیں ہوگا



دیارِ کبر و ریا میں کمال میں نے کیا
کہ اعتبارِ رہِ دل، بحال میں نے کیا

وہ خوش ہوا کہ مرے زخم بھر گئے آخر
یہ ایک میں کہ غمِ اندمال میں نے کیا

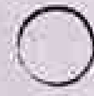
ترے لیے دلِ بے داغ کیسے لاتا میں
گریز تجھ سے سوائے خوش خصال میں نے کیا

وہ جوشِ وحشت و بیگانگی کا عالم تھا
خجل بہت ہوں کہ اس کا یہ حال میں نے کیا

کسے نصیب ہے آخر دوامِ مہلتِ دید؟
شبیہہ و خوابِ ازل سے سوال میں نے کیا

وہ شام، شامِ الم تھی، سو اپنی آنکھوں میں
چراغِ خواب جلائے، ملال میں نے کیا

کاوش بٹ



وہ انتظار کے موسم بھی کیا سہانے تھے
عجب فضا تھی، عجب دلربا زمانے تھے

ترے جمال کی شائستگی نے ڈھانپ لیا
لباس عشق کے ورنہ پھٹے پرانے تھے

کبھی نہ ختم ہوئے سلسلے رفاقت کے
ہمارے پاس تری یاد کے خزانے تھے

بدلتے وقت سے تھے بے نیاز و بے پروا
مرے پڑوس میں ایسے بھی کچھ گھرانے تھے

ہم اپنے حال سے مایوس تو نہیں ہیں مگر
نہ مندمل ہوئے وہ زخم، جو پرانے تھے



قرضِ اظہار یوں اتارتے ہیں
رات بھر ہم تجھے پکارتے ہیں

ہم ترے ظلم کے نتیجے میں
اپنے کردار کو سنوارتے ہیں

زندگی کے قمار خانے میں
ہم فقط زندگی کو ہارتے ہیں

جانے شب نیند کیوں نہیں آتی
دن تو آرام سے گذارتے ہیں

تیرگی کی گرفت میں انساں
روشنی، روشنی پکارتے ہیں

سیّد یٰسین قدرت

○

حادثہ یہ ہے کہ رونا بھی بہت دشوار ہے!
رتجگوں کی رُت ہے، سونا بھی بہت دشوار ہے

دھیان اِس کا ذہن سے غائب تو کر دیتا، مگر
گوہرِ نایاب کھونا بھی بہت دشوار ہے

ہجر اس کا راس آ سکتا ہے لیکن کیا کروں
دل میں یہ کانٹا چبھونا بھی بہت دشوار ہے

ہو چکا ہے جو، تلافی اِسکی ممکن ہی نہیں
داغ یہ دامن سے دھونا بھی بہت دشوار ہے

کچھ نظر آتا نہیں آئینۂ نم خوردہ میں
رات دن آنکھیں بھگونا بھی بہت دشوار ہے

○

آنکھوں میں تصویر سجا
آنسو روک نہیں، برسا

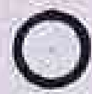
پنچھی چُپ ہو جائیں گے
صحن میں ہو گا سنّاٹا

اِس کے باطن میں بھی جھانک
اِسکی صورت پر مت جا

رات کہیں پر کاٹ نہ دے
شام ہوئی، پنچھی! گھر جا

قدرتؔ یار اب سوچ نہیں
جو بھی ہُوا، وہ ٹھیک ہوا

شوکت ہاشمی



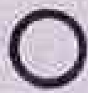
لباس میلا تھا اور حُلیہ فقیر کا تھا
مگر وہ انساں بڑے ہی اُجلے ضمیر کا تھا

گلِ مہ و مہر توڑ لوں شاخِ آسماں سے
عجیب پیغام روشنی کے سفیر کا تھا

میں اہلِ دنیا سے ربط رکھتا تو خاک رکھتا
فقیر تھا اور معاملہ بھی ضمیر کا تھا

فقیرِ شہرِ سخن! تری بات کون سُنتا؟
یہاں تو سارا ہی کھیل شاہ و وزیر کا تھا

لہو بھری شام تھی مرے ہم رکاب شوکت
مرا سفر بھی تو کربلا کے اسیر کا تھا



خُدا کے بندے! تو بندۂ بے خدا نہیں ہے
مگر ترے کُنجِ لب میں لفظِ دُعا نہیں ہے

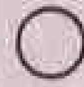
کھلے سمندر میں اپنی کشتی اتارتا ہوں
کہ ساحلوں پر مرا کوئی راستہ نہیں ہے

معاف کر دے۔ امیرِ شہرِ ستم سے کہنا
فقیرِ مُلکِ سخن مری مانتا نہیں ہے

کوئی تو ہے اس چراغ دشمن معاشرے میں
کہ جو اندھیرے کی دہشتوں سے ڈرا نہیں ہے

وہی کہا ہے جو مَیں نے دیکھا ہُوا ہے شوکت
جو مَیں نے دیکھا نہیں ہے، مَیں نے کہا نہیں ہے

عباس تابش



جہانِ مرگِ صدا میں اک اور سلسلہ ختم ہو گیا ہے
کلام یعنی خدا کا ہم سے مکالمہ ختم ہو گیا ہے

ہمیں تو بس یہ پتہ چلا تھا کہ اونٹوں والے چلے گئے ہیں
کسی کو اس کی خبر نہیں جو معاملہ ختم ہو گیا ہے

نہ تتلیوں جیسی دوپہر ہے، نہ اب وہ سورج گلاب جیسا
جسے محبت کہا گیا، وہ مغالطہ ختم ہو گیا ہے

تمہاری باتوں کے جن پہ شہتوت جھڑ رہے ہوں وہی بتائیں
کہ تلخ آباد میں ہمارا تو ذائقہ ختم ہو گیا ہے

ہماری آنکھوں سے خواب و خس کے تمام پشتے ہٹائے جائیں
ہمارا بے مہر پانیوں سے معاہدہ ختم ہو گیا ہے

اب اس لئے بھی ہمیں محبت کو طول دینا پڑے گا تابش
کسی نے پوچھا تو کیا کہیں گے کہ سلسلہ ختم ہو گیا ہے

سید مبارک شاہ



کوئی سطر وسطِ سطور میں بھی تو دیکھتے
کبھی شاعری کو شعور میں بھی تو دیکھتے

جنہیں اپنے حسن کی تمکنت کا فریب تھا
مرا عشق رنگِ غرور میں بھی تو دیکھتے

تمہیں مار ڈالا تھا جن کے طرزِ حیات نے
انہیں جا کے شہرِ قبور میں بھی تو دیکھتے

ترے منحرف کبھی آئینوں کے وثوق میں
ترا غیب رنگِ ظہور میں بھی تو دیکھتے

کبھی آفتاب و نظر نگاہ میں تول کر
کوئی فرق آتش و نور میں بھی تو دیکھتے

سعود عثمانی

○

چشمِ بے خواب پہ خوابوں کا اثر لگتا ہے
کیسی پت جھڑ ہے کہ شاخوں پہ ثمر لگتا ہے

نیندابِ چشمِ گرانبار کی دہلیز پہ ہے
جسم میں کھلتا ہوا خواب کا دَر لگتا ہے

مہلتِ عمر بس اتنی تھی کہ گزرا ہوا وقت
اِک ڈھلکتے ہوئے آنسو کا سفر لگتا ہے

کہیں کچھ اور بھی ہو جاؤں نہ ریزہ ریزہ
ایسا ٹوٹا ہوں کہ جُڑتے ہوئے ڈر لگتا ہے

لوگ چکرائے ہوئے پھرتے ہیں گھر سے گھر تک
دُور سے دیکھو تو یہ شہر بھنور لگتا ہے

وقت نظریں بھی پلٹ جاتا ہے اقدار کے ساتھ
دن بدلتے ہیں تو ہر عیب ہنر لگتا ہے

اِن دِنوں عشق کی تحصیل پہ محصول بھی ہے
سوچ لے تُو بھی، مجھے اہلِ نظر لگتا ہے

اِک ملامت کی علامت ہے مرے چہرے پر
سنگِ دشنام ہے، اور شام و سحر لگتا ہے

ذہن کی جھیل سے یادوں کی دھنک پھوٹتی ہے
ایک میلا ہے جو ہر شام اِدھر لگتا ہے

کوئی شوریدۂ جاں جسم کے اندر ہے سعود
دل دھڑکتا ہے کہ دیوار سے سر لگتا ہے

○

اب تک کی وفاؤں کا صلا دے
آئندہ وفا کا حوصلا دے

پاکر تجھے مطمئن نہیں دل
اب پھر سے خیالِ نارسا دے

محبوس ہے کب سے گنبدوں میں
آواز کو اَب کھُلی ہوا دے!

اِس کوچۂ خوش گماں میں کوئی
چوراہے پہ آئینہ لگا دے

آپہنچے ہیں پھر حریف سر پر
اے قلزمِ وقت! راستا دے

سب شاہ کی مات تک کھڑے ہیں
کیا اسپ و وزیر، کیا پیادے

خاموشیٔ شب سے گفتگو کر
تاحدِ نظر دیئے جلا دے

تتلی کا سفر ہی بے جہت ہے
اب ساتھ بھی کوئی دے تو کیا دے

آپس میں اُلجھ گئے ہیں رستے
اِس ڈور کا دوسرا سِرا دے

سعود عثمانی

○

شبِ فراق میں اِک ہاتھ دل کے پاس آیا
ہجومِ اشک میں یہ کون غم شناس آیا

پھر ایک وقت وہ آیا کہ جب مرے دل کو
غمِ جہاں بھی ترے غم کی طرح راس آیا

رُتوں نے جیسے دلوں سے مطابقت کر لی
سکوں کی فصل کٹی، موسمِ ہراس آیا

نکل چکا جو فضاؤں میں اس کا زعمِ دروں
غبارہ لوٹ کے اپنی زمیں کے پاس آیا

وہیں کہیں پہ مری بھی انا تمام ہوئی
جب اُس کے حُکم میں اِک رنگِ التماس آیا

وضاحتوں کے سبھی لفظ چشمِ تر کو ملے
اِک آدھ حرف لبِ کم سخن کے پاس آیا

شفق کے ساتھ اُتر آئیں خُوں میں رُوشنیاں
زمیں کے واسطے افلاک سے لباس آیا

○

ٹھہر ٹھہر کے زمیں سایہ دار کرتے ہوئے
شجر کھڑے ہیں ترا انتظار کرتے ہوئے

جہاں ہے دھول وہیں پر لہُو کے پھول بھی ہیں
برہنہ پا ہوں غزل کو بہار کرتے ہوئے

ہمیں بھی پہلے پہل الجھنیں بہت سی رہیں
خود آگہی کا سفر اختیار کرتے ہوئے

بہت سے وہ تھے کہ جن کو سراب بھی نہ ملا
خود اپنی ذات کے صحرا کو پار کرتے ہوئے

کہیں یہ عشق کی وحشت کو ناگوار نہ ہو
جھجک رہا ہوں ترے غم کو پیار کرتے ہوئے

اب اُس کی زد سے بھلا کیا بچاؤں خود کو سعود
جو خود بھی ٹوٹ گیا مجھ پہ وار کرتے ہوئے

قمر رضا شہزاد

○

ہم نے ہر غم دلِ صد چاک سے باہر رکھا
آگ کو پیرہنِ خاک سے باہر رکھا

زیبِ تن ہم نے بھی کر رکھی یہ دُنیا لیکن
تیرے ہر رنگ کو پوشاک سے باہر رکھا

خواب در خواب تجھے ڈھونڈنے والوں نے بھی اب
نیند کو دیدۂ نمناک سے باہر رکھا

اک ترا دھیان ہی ایسا کہ جسے ہم نے یہاں
نفع نقصان کے بیباک سے باہر رکھا

اُجرتِ عشق بہت کم تھی سو ہم نے شہزاد
دل کو اِس تنگیِ افلاک سے باہر رکھا

○

کسی پہ اپنا کمال ظاہر نہیں کرے گا
وہ فتح سے پہلے چال ظاہر نہیں کرے گا

جلو میں لے کر چلے گا لشکر، مگر عدو پر
وہ اپنا جاہ و جلال ظاہر نہیں کرے گا

اُسے کبھی گفتگو کی مُہلت نہیں ملے گی
جو آج بھی دل کا حال ظاہر نہیں کرے گا

یہ دل کہ شفاف آئینہ ہی سہی مگر اب
ترا مکمّل جمال ظاہر نہیں کرے گا

اُسے ہوئی ہے یہ پہلی پہلی شکست شہزاد
ابھی وہ اپنا ملال ظاہر نہیں کرے گا

قمر رضا شہزاد

○

مکالمہ حسبِ حال کب تک نہیں کرے گا
جو اصل ہے وہ سوال کب تک نہیں کرے گا

لہو پہ بنیاد میں نے رکھی ہے جس مکاں کی
خدا اُسے بے مثال کب تک نہیں کرے گا

کسی سے برسوں بندھے تعلق کے ٹوٹنے کا
وہ اپنے دل میں ملال کب تک نہیں کرے گا

میں آخری تاجدار ہوں اُس کی سلطنت کا
وہ میرا منصب بحال کب تک نہیں کرے گا

اُسے بچانے پڑیں گے سب خدّوخالِ دنیا
وہ اپنے گھر کا خیال کب تک نہیں کرے گا

میں لڑ رہا ہوں یہ جنگ اُس کی سو وہ بھی شہزاد
دعاؤں کو میری ڈھال کب تک نہیں کرے گا

○

آئینہ خانۂ گمان کو چھوڑ
تو مرے ذکر، میرے دھیان کو چھوڑ

خلقتِ شہر جھوٹ بولتی ہے
خلقتِ شہر کے بیان کو چھوڑ

رنج مت کر الاؤ بجھنے کا
زخم در زخم داستان کو چھوڑ

اس زمیں پر گلابِ وصل کھلا
بانجھ مٹی کے آسمان کو چھوڑ

شام ہونے سے پیشتر شہزاد
تو بھی اِس جسم کے مکان کو چھوڑ

یاسمین گُل



دو ایک پل چلی تھی کسی گُل بدن کے ساتھ
خوشبو لپٹ گئی ہے مرے پیرہن کے ساتھ

دل رکھ کے دے رہا تھا وہ لہجے کی اوک میں
اثبات بھی کیا تو عجب بانکپن کے ساتھ

اُس ادھ کھلی سی آنکھ میں دھندلا سا ایک حرف
اِک دھول سی ملی ہوئی اُڑتی کرن کے ساتھ

دل میں اُتر رہا ہے معانی کا اِک ہجوم
کچھ دیر آج تھی میں کسی کم سخن کے ساتھ

ہنس کر ہی بات کی تھی مگر دل کو جا لگی
نسبت ہے خاص خار کو خوئے چمن کے ساتھ

اِس مُڑ کے دیکھنے میں بھی لذّت عجیب ہے
شامل ہو جیسے لطف بھی کچھ کچھ چبھن کے ساتھ

○

سُلگتی جاں پر یوں بھی ستم کرنا پڑیگا
نظر خوش رنگ، لہجہ محترم کرنا پڑے گا

ہوائے خشک سے پہلے یونہی صوت گری کو
ہری شاخوں کو تھوڑا اور خم کرنا پڑے گا

فلک کو ظلم کے الزام سے آزاد کر کے
زمیں کو نرم، اور مٹی کو نم کرنا پڑے گا

مری حیرت! تجھے معلوم ہونا چاہیئے تھا
کبھی خم اور کبھی سر کو قلم کرنا پڑے گا

سرِ اظہار آ پہنچی ہوں لے ذوقِ تکلّم!
دفورِ شوق کو لہجے میں ضم کرنا پڑے گا

آغا نثار



دل پہ اک زخم کے نشان کے ساتھ
مٹ گئے ہم بھی داستان کے ساتھ

یاد تیری سفر ہے صحرا کا
دھوپ چلتی ہے سائبان کے ساتھ

ہیں تری دسترس میں سات فلک
میں اڑوں کیا تری اڑان کے ساتھ

سازشیں پانیوں نے کیں ایسی
ہم بھی اُبھرے نہ بادبان کے ساتھ

ایک میں ہی شکار اُس کا نہ تھا
گر پڑا پیڑ بھی مچان کے ساتھ

میرا منصف بنا دیا اُس کو
جو بدلتا ہے ہر بیان کے ساتھ

رابطہ اُس سے کیا بڑھا آغا
دشمنی ہو گئی جہان کے ساتھ



تپش لہو کی سپردِ قلم نہیں کرتا
میں کاغذوں پہ ترا غم رقم نہیں کرتا

مرے خیال میں آنا کبھی کبھی تیرا
مری طلب کو بڑھاتا ہے کم نہیں کرتا

خدا نہ دیتا ہنر جو تراشنے کا مجھے
میں پتھروں کو کبھی محترم نہیں کرتا

وہ جانتا ہے کہ چلنے کا ہے جنوں مجھکو
اِسی لیے تو مسافت کو کم نہیں کرتا

ابھی وہ لطفِ رفاقت سے آشنا ہی نہیں
اِسی لیے تو جدائی کا غم نہیں کرتا

یہ غم یہ دل یہ ہنر کس کی دین ہے آغا
یہ کس نے تجھ سے کہا وہ کرم نہیں کرتا

احمد ندیم قاسمی



ایک ماحول اچھوتا چاہوں
صحن کے نام پہ صحرا چاہوں

کائناتیں مرے خوابوں کی اسیر
اور قدرت سے میں رِکنا چاہوں

تربیت میری، زمیں نے کی ہے
میں خلاؤں میں لپکنا چاہوں

جتنے تاریک گھروندے ہیں، وہاں
دل کی قندیل جلانا چاہوں

بخشوانے کو گناہِ آدم
پھر سے فردوس میں جانا چاہوں

دوزخ انسان پہ ہو جائے حرام
رب سے یہ وعدۂ فردا چاہوں

خشک پتے نہ شجر سے چھینے
بس یہ احسان ہوا کا چاہوں

میری ضد کون کرے گا پوری
شام کو صبح کا تارا چاہوں

میرا ہر کام الگ دُنیا سے
جس کو چاہوں، اسے تنہا چاہوں

ہجر کی کتنی تمازت ہے ندیمؔ
اب کسی یاد کا سایا چاہوں

اختلافات

محمد ارشاد، ڈاکٹر الیاس عشقی، پروفیسر خورشید خاور امروہوی، امتیاز علی خان، مشکور حسین یاد، خالد احمد، آصف ثاقب، مشتاق احمد، ڈاکٹر صابر آفاقی، خاور نقوی، رفاقت علی، سرمد جمالی، امتیاز الحق امتیاز، رانا غلام شبیر، خیر الدین انصاری، عامر سہیل، شجاعت علی راہی، ارشد محمود ناشاد، یوسف حسن، گلزار، محسن بھوپالی، سیّد نور محمد قادری، خلیل احمد

راجہ محمد ریاض الرحمٰن

سخنہائے گفتنی

اپنے مضمون "طرزِ بیدل میں ریختہ" میں دو جگہ مجھ سے اور دو جگہ کاتب سے غلطی ہوئی ہے۔ میں نے غالب کی جس مثنوی کے اشعار نقل کئے تھے "چراغِ دیر" ہے۔ میں نے "ابرِ گہربار" لکھ دیا۔ حافظے پر بھروسا اور دھوکا کھایا۔ علاوہ ازیں غالب کی فارسی کے مطلعے کا دوسرا مصرع:

دیدہ بر خوابِ پریشاں زد جہاں نامیدمش

ہے۔ جو مصرع میں نے لکھا تھا وہ اسی غزل کے ایک اور شعر کا مصرع ہے۔ کاتب نے بیدل کے ایک مصرعے، "گہرہائے محیطِ عالمِ پاک، میں پاک کو خاک کر دیا اور میرے ایک جملے "سبک ہندی کا یہ انداز جو "از دماغ خیز د بر دل ریزد" کی مثال ہے" کو "از دماغ خیزد، بر دماغ خیزد" کی مثال ہے" لکھ دیا۔

معرّی کی شاعری پر محمد کاظم صاحب کا مضمون بہت ہی اچھا ہے۔ کیا اچھا ہوتا وہ معرّی پر اس کے رسالۃ الغفران کے حوالے سے بھی گفتگو کرتے۔ یہ درست ہے کہ ان کے پیشِ نظر معرّی کی شاعری تھی اور رسالۃ الغفران نثر کی کتاب ہے لیکن معرّی کے افکار کی تفہیم میں یہ رسالہ نہایت اہم حوالہ ہے۔ شاید وہ سلسلۂ سخن دراز نہیں کرنا چاہتے تھے۔ خوشی کی بات یہ ہے کہ انھوں نے معرّی کی زندگی کے کسی بھی اہم واقعے کو نظر انداز نہیں کیا، اس واقعے کو بھی جو بغداد میں شریف المرتضیٰ کی مجلس میں پیش آیا تھا جب اس نادرۂ ایام کو شریف المرتضیٰ کے خدام نے:

پا بدستِ دگرے دست بدستِ دگرے

گھسیٹ کر مجلس سے نکال کر باہر پھینکا تھا۔ اس [illegible] کا ذکر شریف المرتضیٰ کے حال میں "عمدۃ الطالب" میں میری نظر سے ان الفاظ کے ساتھ گزرا ہے —— "کان اجتماعی بہ سنۃ خمس وعشرین واربعمائۃ ببغداد وحضر مجلسہ ابو العلا احمد بن سلیمان المعرّی ذات یوم فجری ذکرابی الطیب المتنبی فتنقصہ الشریف المرتضیٰ وعاب لبعض اشعارہ ..... الخ"۔ صاحب "عمدۃ الطالب" کے بقول یہ واقعہ ۴۲۵ھ کا ہے۔ جو بالبداہت غلط ہے کہ اس سال تو معرّی کو بڑھاپے کی منزل میں داخل ہوئے بھی کئی سال گزر چکے تھے۔ یہ واقعہ یقیناً اسی سال یعنی ۳۹۹ھ میں پیش آیا تھا جو محمد کاظم صاحب نے دیا ہے۔ بے شک محمد کاظم صاحب بہت زیادہ احتیاط ملحوظ رکھنے والے ہیں اور اس معاملے میں مجھ سمیت ہر ایک کو ان کی پیروی کرنی چاہیے لیکن اسی مضمون میں، حاشیے

میں، اپنی اس عادت کے برعکس انھوں نے بڑی عجیب بات کہی ہے کہ اگر قرآن کو خدا کی تخلیق نہ مانا جائے تو اس سے ان لوگوں کے خیال کی تائید ہوگی جو یہ کہتے ہیں کہ قرآن رسول اللہ ؐ کی تخلیق ہے۔ یہ نتیجہ اخذ کرنے میں انھوں نے احتیاط نہیں کی۔ مسئلہ خلق قرآن کے پیچھے اصل مسئلہ اللہ کی ذات کا اللہ کی صفات کے ساتھ تعلق کا تھا۔ قرآن اللہ کا کلام ہے اور کلام اللہ کی امہات الصفات۔ حیات، علم، قدرت، ارادہ، سمع، بصر، کلام میں ایک صفت ہے۔ آیا اللہ کی صفات عین ذات ہیں یا زاید علی الذات؟ اس سوال کا جواب مسئلہ خلق قرآن کا جواب بھی فراہم کرتا ہے اور کوئی بھی موقف اختیار کیا جائے تو ان لوگوں کے خیال کی تائید نہیں ہوتی جو قرآن کو رسول اللہ ؐ کا کلام سمجھتے ہیں۔

لیکن میں اس بحث کو یہیں چھوڑ رہا ہوں کہ صفحاتِ "اختلافات" اس کے متحمل نہیں ہو سکتے۔ بات معرّی کی ہو رہی تھی۔ تعریفِ لم تفضے کی شرافت کا تلخ ذائقہ معرّی کے منہ میں ساری عمر رہا اور شاید اسی نے اسے "تلخ نوا" بنا رکھا تھا:

ابو العلا ابن سلیمانا عماک قد اولاک احسانا
انک لو ابصرت ہذا الوری لم یر انسانک انسانا

(اے ابو العلا ابن سلیمان! تیرے اندھے پن نے تجھ پر احسان ہی تو کیا ہے۔ کچھ شک نہیں کہ اگر تو ان لوگوں کو دیکھ پاتا تو تیری آنکھ کی پتلی (انسان) ان میں انسان نہ دیکھتی)

بہرحال معرّی محمد کاظم صاحب کا مسئلہ تھا اور وہ اس سے بخیر و خوبی عہدہ برا ہوئے ہیں۔ میرا مسئلہ مجذوبِ فرنگی ہے اور نہیں کہہ سکتا کہ کب تک اس سے عہدہ برآ ہوں گا اور وہ بھی بخیر و خوبی۔ جس کام میں مَیں نے ہاتھ ڈالا ہے مشکل تو تھا ہی، میں نے اسے اپنے اوپر اور بھی مشکل کر لیا ہے۔ یہ بات ذرا تفصیل طلب ہے۔ اس مضمون کا محرک برادرم اختر حسین جعفری تھے۔ یہ مضمون انھیں "فردا" کے دوسرے شمارے کے لئے چاہیئے تھا۔ صفحات کی قید انھوں نے مجھ پر سے اٹھا رکھی تھی۔ "فردا" کے پہلے شمارے کے لئے انہی کی خواہش پر میں نے برٹرینڈ رسل پر اسی پچاسی صفحات کا مضمون پندرہ بیس دنوں میں انہیں لکھ دیا تھا جو انھیں بہت پسند آیا تھا اسی طرح کا مضمون وہ نیطشے پر بھی چاہتے تھے اور "فردا" کا دوسرا شمارہ وہ اس کے بغیر نکالنے کے لئے تیار نہ تھے۔ نیطشے میرے لئے اجنبی نہیں تھا۔ لیکن نیطشے کے بارے میں میرا ذریعۂ علم دوسروں کی تحریریں تھیں۔ نیطشے پر لکھے گئے پانچ سات مضامین کو معمولی سے اُلٹ پھیر کے ساتھ مضمون بنا لینا بے حد آسان لیکن نہایت قبیح کام تھا۔ جو میں کسی صورت نہیں کر سکتا تھا۔ میں نیطشے کو براہ راست پڑھنا چاہتا تھا لیکن سوائے زردشت والی کتاب کے اس کی کوئی کتاب میری نظر سے نہیں گزری تھی۔ نیطشے کی جملہ کتب فراہم کرنے میں ایک سال لگ گیا۔ پڑھ چکا تو معلوم ہوا کہ اس جن کو بوتل میں بند کرنا ناممکنات میں سے ہے۔ جن لوگوں نے یہ حرکت کی خوار ہوئے۔ انھوں نے نیطشے کی تحریروں سے نیطشے کی بجائے اپنے آپ کو برآمد کیا۔ ہائیڈیگر نے دو جلدیں نیطشے کی تفہیم پر لکھ ڈالیں۔ ان میں بھی نیطشے ہائیڈیگر کا روپ دھارے ہوئے ہے۔ میں نیطشے کی کتابوں میں نیطشے کو ڈھونڈنا چاہ رہا ہوں۔ مجھے مناسب یہی معلوم ہوا کہ نیطشے کے افکار کو بغیر کسی ترجمانی، تعبیر، تفسیر، تبصرے اور تنقید کے اردو میں اس طرح منتقل کر دوں کہ اس کے افکار کا ایک اجمالی خاکہ مرتب ہو جائے اور اس میں سوائے نیطشے کے کوئی اور دکھائی نہ دے۔ لیکن یہ کام بھی آسان نہیں۔ ترجمے کی مشکلات سے قطع نظر، نیطشے کے افکار میں وہ نظم و ضبط اور ترتیب و تدوین موجود نہیں جس کا التزام فلسفے میں شروع سے چلا آ رہا ہے۔ وہ ایک موضوع پر گفتگو کرتے کرتے اچانک دوسرا موضوع اور پھر اچانک کوئی اور موضوع چھیڑ دیتا ہے۔ پس کسی بھی موضوع پر

اس کی گفتگو کی ایک کڑی ایک کتاب میں، دوسری کسی دوسری کتاب میں ڈھونڈنی پڑتی ہے، اور تیسری کڑی کسی تیسری کتاب میں۔ بعض اوقات وہ مختلف موقعوں پر ایسی باتیں بھی کہہ جاتا ہے جو بظاہر مہمل اور بے جوڑ ہوتی ہیں اور ان میں تطبیق مشکل ہو جاتی ہے مثلاً ایک جگہ وہ یہ کہتا سنائی دے گا۔ There is no will. تو دوسری جگہ Will to will to Power. کا ذکر کرتا نظر آتا ہے۔ جملہ انسانی افکار، فلسفہ، تصوف و عرفان، مذہب، اخلاق سے اس کی پیکار گریز Attack and run away پر مبنی ہے۔ اسے کسی ایک جگہ کسی متعین مقام پر پا لینا ممکن نہیں۔ یہی اس کا اسلوب ہے۔ اسی اسلوب کے باعث اس کی تفہیم بے حد مشکل ہے نیطشے پر میں نے اپنے مضمون کا آغاز جملہ انسانی افکار پر نیطشے کی تنقید سے اور روایتی تصور حقیقت و صداقت کے بارے میں اس کے موقف سے کیا ہے۔ پس گزشتہ اقساط نیز موجودہ قسط میں یہ اجاگر کرنے کی کوشش کی گئی ہے کہ نیطشے کے نزدیک فکر انسانی کس طرح ایک خاص پیمانے میں ڈھلتی رہی ہے اور اس پیمانے میں ڈھل کر فلسفہ (مابعد الطبیعیات، اخلاقیات) مذہب، تصوف و عرفان کا روپ دھارتی رہی ہے۔ وہ کون سے اصول ہیں جو انسانی استدلال و استنتاج کی تہ میں کام کر رہے ہیں ان کی اصلیت و نوعیت کیا ہے اور مذہب، فلسفہ، تصوف و عرفان جس صداقت (Truth) اور (Reality) کو اپنی آغوش میں لئے ہیں اس صداقت کی صداقت اور حقیقت کی حقیقت کیا ہے۔ ان تصورات کے وضع کرنے میں انسانی زبان کا کیا کردار رہا ہے۔ میرے نزدیک نیطشے کے افکار کا یہی حصہ اہم ترین ہے اور اسی نے اسے موجودہ صدی میں سب سے زیادہ بااثر فلسفی بنایا ہے۔ پہلی قسط کو چھوڑ کر جو تعارفی ہے، مابعد کی تمام اقساط میں نیطشے کے افکار کو من و عن بیان کرنے کی کوشش کی گئی ہے۔ ہر چالیس پچاس جملوں میں کوئی ایک آدھ جملہ ہی میرا ہے، جو مختلف کڑیوں میں ربط پیدا کرنے کی خاطر ناگزیر تھا۔ ورنہ ہر جملہ نیطشے کا جملہ ہے چاہے واوین میں ہے یا بغیر واوین کے۔ میری مشکل کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ میں گزشتہ چار پانچ سال سے نیطشے کو مسلسل پڑھ رہا ہوں اور حاصل چند صفحات سے زیادہ نہیں۔ میں اس شخص کی خواہش پوری نہ کر سکا جس کی خاطر مجھے بے حد عزیز تھی۔ زندگی میں مجھے بہت تھوڑے لوگ اچھے لگے ہیں، برا کبھی کوئی نہیں لگا۔ ان تھوڑے سے لوگوں میں ایک اختر حسین جعفری بھی تھے۔ انھوں نے اس فراواں محبت میں سے، جو اپنے جاننے والوں کے لئے ان کے دل میں تھی، ایک حصے کا، وافر حصے کا حقدار مجھے بھی سمجھا تھا۔ کم وقت اور زیادہ فاصلے نے اس تعلق کو وہ صورت اختیار نہیں کرنے دی جسے دوستی کا نام دیا جاتا ہے لیکن اسے وہ شکل ضرور دے دی جسے مواخاۃ کہتے ہیں۔ وہ مجھے اپنا بھائی سمجھتے، کہتے اور لکھتے رہے اور میں انھیں۔ یہ رشتہ بھی دوستی کے رشتے سے کم پائیدار اور کم محکم نہیں ہے۔ میرے اس عظیم اور عزیز بھائی کو کیا خبر کہ اس کا بھائی اس سے کیا ہوا عہد قسطوں میں ایفا کر رہا ہے۔ کر تو رہا ہے۔

لئن عشت والایام اعطتنی المنی — لقد خطت ذیلاً شقہ البین والہجر

وان مت فاعذرنی فیارب منیۃ — تراہا ترابًا لیس یذکرہا الدھر

یعنی:

تا بمانیم زندہ بردوزیم — دامنے کز فراق چاک شدہ

ور بمیریم عذرہا داریم — اے بسا آرزو کہ خاک شدہ

(ہم جب تک زندہ رہے اس دامن کو سیتے رہیں گے جو جدائی کے ہاتھوں چاک ہو چکا ہے اور اگر مر جائیں تو عذر رکھتے ہیں کہ آدمی کے ساتھ اس کی بہت سی آرزوئیں بھی مٹی میں مل جاتی ہیں)

بس برادرم اختر حسین جعفری کی یاد میں یہ سلسلہ جاری رہے گا۔ چاہے مشکلات حائل ہوتی رہیں کہ یہ مشکلات صرف مجھی کو درپیش نہیں ہر اس شخص کو درپیش رہی ہیں جس نے نیطشے کا غائر مطالعہ کیا ہے۔

For about a decade now there has been a growing uneasiness with regard to Nietzsche: might he not be more inaccessible, more unapproachable and more inevitably "betrayed" than any philosopher before or since.

یہ سطور Michel Haar کی ہیں جو پیرس یونیورسٹی (سوربون) میں فلسفے کے استاد اور فرانسیسی زبان میں نیطشے کی جملہ تصانیف و تعلیقات کے مترجم ہیں۔ یہ بیان ۱۹۸۵ء کا ہے۔ صورت حال آج بھی مختلف نہیں۔ جیمز جول The New York Review (۱۱ فروری ۱۹۹۳ء) میں اپنے مضمون (تبصرہ) Nietzsche vs Nietzsche میں لکھتے ہیں:

He was, like Rousseau, one of those writers whose interal contradictions lend themselves to a variety of interpretations, so that each reader finds in him what he is looking for, or what he thinks he needs.

(جیمز جول کے تبصرے کا تراشہ مجھے جناب مسعود اشعر نے بھیجا جس کے لیے میں ان کا تہ دل سے ممنون ہوں۔)
لیکن نیطشے ایسی چیز نہیں تھا کہ اسے یہ معلوم نہ ہوتا کہ اس کا فلسفہ اس کے قارئین کو کن کن مشکلات میں ڈال سکتا ہے۔ وہ خود کہتا ہے:

Whoever believed he had understood something of me, had dressed something of me after his own image not commonly an antithesis of me, for instance an "idealist", whoever had understood nothing of me denied that I came into consideration at all. (Ecce Homo)

نیطشے کو یہ بھی معلوم تھا کہ وہ آسانی سے، وہ بھی ہر کسی کی دسترس میں آنے والا نہیں۔ اپنے حوالے سے کہتا ہے:

One does not want only to be understood when one writes but just as surely not to be understood It is absolutely no objection to a book if anyone finds it unintelligible: perhaps that was part of its authors intention---he did not want to be understood by 'anyone'. When it wants to communicate itself, every nobler spirit and taste also selects its audience; in selecting them it also debars 'the others'. All the more subtle rules of style have their origin here; they hold at arm's length, they

create distance, they forbid' ' admission ', understa-nding---while at the same time alert the ears of those who are related to us through their ears.
(Gay Science pp 381)

If this writing isunitelligible to anyone and jars on his ears the fault is, it seems to me, not necessarily mine. It is clear enough, assuming, as I do assume, that one has read my earlier writings and has not spared some efforts in doing so; for they are not easily accessible.
(Geneolog of Moral, pp 8)

لیکن قارئین "فنون" میں ایک صاحب ایسے بھی ہیں جن کے نزدیک "نیٹشے کی فلاسفی میں ایک اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں مابعد الطبیعیاتی اسلوب کی پرچھائیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی وجہ سے قارئین کو اس کی اصل فکر تک رسائی بڑی آسانی سے ہو جاتی" ان صاحب کا پورا بیان دلچسپ ہے اس لئے یہ ایک فقرہ سمندر سے پیاسے کو شبنم ہے۔ بخیلی کی بجائے رزاقی اختیار کرنے میں کوئی امر مانع نہیں۔ مجذوب فرنگی پر تبصرہ کرتے ہوئے لکھا:

"مقالہ نگار نے زیادہ مقامات پر اصل موضوع سے انحراف کرتے ہوئے محض منطقی بنیادوں پر فلسفہ تشکیک کو خوب تقویت عطا کی ہے۔ اس فلسفہ کی اہمیت اپنی جگہ لیکن عہد حاضر میں یہ اہمیت ظاہر کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ زیر نظر مضمون کی تینوں اقساط میں ارشاد صاحب کا مجموعی رویہ یہ رہا ہے کہ انھوں نے نیٹشے کی فلسفیانہ سطحوں کو کم از کم اور علم منطق کے قضیوں کو زیادہ سے زیادہ موضوع بحث بنائے رکھا۔ اس سے پڑھنے والوں کو احساس ہوتا ہے کہ منطقی استدلال و استنتاج بھی موضوع کا اہم اور ناگزیر حصہ ہیں نیٹشے کی فلاسفی میں اضافی خوبی یہ ہے کہ اس میں مابعد الطبیعیاتی اسلوب کی پرچھائیاں نہ ہونے کے برابر ہیں۔ اس کی وجہ سے قارئین کو اس کی اصل فکر تک بڑی آسانی سے رسائی حاصل ہو جاتی ہے لیکن مجذوب فرنگی میں اس کی فلاسفی کو غیر ضروری طور پر روحانیت اور تصوف کے تناظر میں دکھانے کی کوشش کی گئی ہے۔" (فنون۔ شمارہ ۴۰۔ اختلافات)

میں محترم نکتہ چیں کو معذور (Justified) خیال کرتا ہوں اس وضاحت کے ساتھ:

لو کنت تعلم ما اقول عذرتنی   او کنت تعلم ما تقول عذلتکا
لکن جهلت مقالتی فعذلتنی   وعلمت انک جاہل فعذرتکا

(اگر تو یہ جانتا ہوتا کہ میں کیا کہہ رہا ہوں تو تو مجھے معذور (Justified) خیال کرتا یا پھر تو اتنا جانتا ہوتا کہ تو کیا کہہ رہا ہے تو میں تجھے برا بھلا کہتا۔ لیکن جہالت کی بنا پر تو میرے مقالے (بیان) کو نہ سمجھ سکا اور مجھے ملامت کی اور میں جانتا ہوں کہ تو جاہل ہے اس لئے میں تجھے معذور (Justified) خیال کرتا ہوں)

ڈاکٹر صابر آفاقی صاحب کہتے ہیں، اور یہ "قرض سخن" بھی دیکھئے۔ لفظ سے پُر اور معنی سے تہی، ان پہ بھی خالد کا سایہ پڑ گیا تو ٹھیک ہی کہتے ہیں۔ کاش خالد (عبدالعزیز خالد) کا سایہ پڑنے والی بات سچ ہوتی۔ خالد کا سایہ، سچ کہتا ہوں، سایۂ ہما ہے۔ خالد کی زبان مشکل لیکن بیان دو ٹوک ہے۔ کوئی ادق سے ادق، پیچیدہ سے پیچیدہ بات، خالد کی اپنی ہو یا پرائی (قرآن یا حدیث

کا کوئی نکتہ) ایسی نہیں، جو خالد کے ذہن میں آئے اور مصرع میں ڈھلنے سے انکار کرے۔ دو ٹوک اندازِ بیان، کوئی شک نہیں، جہاں شعر سے ابہام ختم کرتا ہے وہاں تاثیر بھی کم کر دیتا ہے۔ تاہم ایسی شاعری اس شاعری سے بدرجہا بہتر ہے جس میں ابہام بھی موجود ہوتا ہے اور تاثیر بھی مفقود ہوتی ہے۔ لیکن خالد محض ایک شاعر ہی نہیں بہت کچھ اور بھی ہیں شاعری اس مجموعہ کی خوبی ہی ہیں نمایاں نظر آتی ہے تو اس لیے کہ ہم کوتاہ ہیں۔ یہ شخص جب دنیا سے جائے گا تو خدا جانے اپنے ساتھ کیا کچھ نہ لے جائے گا۔ خدا اس شخص کو سلامت رکھے۔ آمین۔

محمد ارشاد (ہری پور)

تذکرۂ غوثیہ

"فنون" شمارہ ۴۰ میں ظہران سعودی عرب سے جناب ذکا صدیقی نے جو کچھ "تذکرۂ غوثیہ" اور مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے متعلق لکھا ہے اس میں نہ صرف یہ کہ کوئی ایسی بات نہیں ہے جو اس کتاب سے دلچسپی رکھنے والوں کی معلومات میں اضافہ ہو بلکہ موصوف کی لاعلمی کا اندازہ ہوتا ہے۔ اشاعت اول ۱۴۰۱ھ مطابق ۱۹۸۰ء میں جو بات مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کے صاحبزادے اسلم سیفی نے اپنے مقدمے میں لکھ دی تھی کہ کتاب مولوی صاحب مرحوم نے لکھی ہے، لیکن جس طرح موصوف نے اس کتاب کے سلسلے میں ان کے سر سہرا باندھا ہے اگر وہ خود حیات ہوتے تو اس کی وضاحت کرتے۔ اس میں کوئی شک نہیں کہ ایک طرح سے یہ مولوی صاحب کا بڑا کارنامہ ہے جو اس عقیدت کی بنا پر ممکن ہوا جو ان کو سید غوث علی شاہ قلندرؒ کی مریدی کی وجہ سے تھا لیکن یہ اندازِ بیان مولوی صاحب کا تھا نہ ہو سکتا تھا۔ جو کچھ تھوڑی بہت نثر ان کی موجود ہے اس کا انداز سادہ اور متین ہے۔ ان کا کمال یہ ہے کہ انھوں نے اور ان کے دوسرے پیر بھائیوں نے حضرت غوث علی شاہ قلندرؒ کو بولتے سنا تھا اور ان کے جو چار چھ مریدانِ خاص تھے جن کا ذکر کتاب کے اس ایڈیشن کے مقدمے میں کیا گیا ہے اور سب سے بڑھ کر یہ کہ گل حسن شاہ اور خود مولوی صاحب اپنے مرشد کی باغ و بہار شخصیت اور ان کے اندازِ گفتگو سے واقف تھے اور انھوں نے اس کتاب کو حتی الامکان قلندر صاحب کے طرزِ گفتگو اور ان کے منہ سے نکلے ہوئے الفاظ میں قلمبند کرنے کی کوشش کی ہے اور اس میں وہ بڑی حد تک کامیاب ہوئے ہیں۔ یہ ان کا کمال ہے۔ ایک تو مرشد کا اندازِ بیان، دوسرے جو مواد اور واقعات بیان ہوئے ہیں، کتاب کا اندازِ بیان ان سے متعین ہوتا ہے۔ اگر آج بھی کسی شخص کو یہ مواد اور واقعات دے کر اس سے کہا جائے کہ اسے گفتگو کے انداز میں لکھ دے تو وہ اس سے زیادہ مختلف نہ ہوگا بشرطیکہ لکھنے والا شخص چند دوسرے بزرگوں کے ملفوظات اور خاص کر فوائد الفواد سے واقف ہو تو یہ مواد اور حالات، خود اپنا اثر دکھائیں گے اور پڑھنے والوں کو زیادہ فرق معلوم نہ ہوگا۔ ایسا لکھ کر میں مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی کی اہمیت کو کم نہیں کرنا چاہتا مگر جو خوبیاں ذکا صاحب نے غوث علی شاہ قلندر کی بجائے مؤلف کتاب سے منسوب کی ہیں ان کی تردید کرنا چاہتا ہوں۔ ملفوظات کی تاریخ بتاتی ہے کہ مرید اپنے مرشد کے ملفوظات کو بڑی حد تک ان کے الفاظ میں یاد رکھتے تھے اور قلمبند کرتے تھے اور یہاں تو کئی مریدوں اور سب سے بڑھ کر گل حسن شاہ صاحب کی یادداشتوں سے مرتب کر کے کتاب کی تالیف کی گئی ہے۔ ان راویوں کی روایت میں اندازِ بیان کا جو تھوڑا فرق رہ گیا ہوگا اسے مولوی محمد اسمٰعیل میرٹھی نے ایک ایسے انداز میں لکھ دیا۔ جو ان کے مرشد کا انداز تھا اور جس کی مریدوں کی اس کمیٹی نے تصدیق کی تھی جس کا ذکر مقدمہ کتاب میں موجود ہے۔ اس عریضے کا مقصد اگرچہ تردید بھی ہے لیکن اس سے زیادہ تصحیح مقصود ہے۔

(ڈاکٹر) الیاس عشقی (حیدرآباد سندھ)

عروض و قواعد کا معاملہ

جب سے متاخرین کے بزرگوں مولانا محمد اسمٰعیل میرٹھی، مولوی علی حیدر نظم طباطبائی اور مولانا الطاف حسین حالی مرحومین نے مروجہ اردو شاعری میں معتد بہ تبدیلیاں کیں، اس سے متاثر ہو کر نوجوان شعرا کی ایک جماعت ابھری جس نے شاعری کا رنگ، مزاج اور انداز تک بدل کر رکھ دیا جس کے نتیجے میں اردو شاعری زوال پذیر ہوتی جا رہی ہے

میں نئی تراکیب، نئے اسالیب بیان اور جدید استعارات اور علامات کے استعمال کا مخالف نہیں بلکہ خود بھی بعض باتوں کو اپنانے لگا ہوں مگر یہ ضرور بتا رہا ہوں کہ جو استعارے اور علامات وضع کی جائیں، جو اسلوب بیان اختیار کیا جائے اور جن تراکیب سے خیالات منظوم کئے جائیں وہ بامعنی اور بامقصد ہوں۔ جب اینٹ پتھر اور سمندر کا ذکر کیا جائے تو کلیوں، پھولوں اور جوئبار کو فراموش نہ کیا جائے۔ جب ہوا میں خیالات و نظریات کے جزیرے اڑائے جائیں اور دھوئیں سے فضا کو دھندلا اور ماحول کو تاریک ہوتا دکھایا جائے تو تخیل کی بلند پروازی امنگوں کا جوش، خوشنما مناظر اور فرحت بخش سبزہ زار کو بھی پیش نظر رکھا جائے۔ سورج کی تمازت میں خنک چاندنی کو فنا نہ کیا جائے۔ سایۂ دیوار کے ساتھ سایۂ تاک بھی استعمال ہوتا رہے۔ زاغ و زغن کی آوازوں میں نغمہائے عنادل اور چڑیوں کی چہچہاہٹ اور کوئل کی کوک کو کیوں بے آواز بنایا جائے۔

آج علم بیان و علم بدیع جو اردو شاعری کی جان ہیں تقریباً ختم ہو گئے، تاریخ گوئی کا فن بھی دم توڑ رہا ہے۔ اس وقت محترم رئیس امروہوی، شان الحق حقی، صبا متھراوی، محشر بدایونی، ڈاکٹر فاضل زیدی اور راقم الحروف کے علاوہ محترم گل حسن گل رضوی اس فن کو زندہ رکھے ہوئے ہیں۔ ممکن ہے کہ میرے جیسے چند گمنام اور بھی ہوں مگر یہ کب تک زندہ رہیں گے؟ ان کے بعد اس فن کو کون سنبھالے گا؟

عروض و قواعد جاننے والے بھی اب خال خال ہی ہیں۔ ان کے بعد اس فن کا جاننے والا بھی ڈھونڈے ہاتھ نہ آئے گا۔ آج کتنے لوگ ہیں، جو یہ جانتے ہیں کہ قافیہ کسے کہتے ہیں، وہ کتنے ارکان پر مشتمل ہوتا ہے اور ان ارکان کے نام کیا کیا ہیں۔ نیز یہ کہ ان میں متحرک حروف کون کون سے ہوتے ہیں اور غیر متحرک کون کون سے۔ پھر یہ کہ ان میں حرف روی کون سا ہوتا ہے اور قافیہ میں حرف روی کی کیا اہمیت ہے۔ نیز شعر میں کس کس نام کے کتنے ارکان ہوتے ہیں۔ میں اس سلسلے میں اپنی ایک کتاب "مقدمۃ الکلام" میں بالوضاحت عرض کر چکا ہوں جو طباعت کے مراحل میں ہے۔

میں اس وقت جس خلجان میں مبتلا ہوں اس کے لئے میرے مخاطب صرف وہی بزرگ نہیں جو شاعری کی اساس عروض و قواعد، ماہیتِ شعر اور لوازم شعری سے نہ صرف کما حقہٗ واقف ہیں بلکہ فن کے سلسلے میں مجتہد کی حیثیت کے حامل ہیں۔ وہ حضرات بھی میرے مخاطب ہیں جو اساتذۂ فن کے تابعین و تبع تابعین میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ نیز عہدِ رواں کے ان ناقدین سے بھی میری گزارش ہے کہ جو شعر کے اجزائے ترکیبی اور اس کے محاسن و معائب سے کلیتاً واقف ہیں اور تنقیدی اصولوں کو پیش نظر رکھ کر اپنے منصب سے عہدہ برآ ہوتے ہیں، کہ آپ حضرات مندرجہ ذیل امور پر اپنی اجتہادی رائے کا اظہار فرمائیں اور حکم صادر کریں کہ کیا یہ امور، طریقے اور الفاظ اسی طرح برقرار رکھیں یا مسلمہ اصول و قواعد کے پیش نظر ایسی باتیں لکھنے سے اہل قلم حضرات کو روکا جائے جو غلط رواج پا رہی ہیں ورنہ آگے چل کر جن کی روک تھام ناممکن ہو جائے گی۔

(۱) یہ تو مسلمہ بات ہے کہ اگر قافیہ میں حرف روی نہ ہو تو وہ قافیہ ہو ہی نہیں سکتا۔ مثلاً سہ حرفی قافیہ راز، ساز، ناز میں نہ تو شاذ شامل کیا جا سکتا ہے اور نہ چہار حرفی قافیہ ایاز، فراز، نیاز میں لحاظ یا بیان کو بطور قافیہ شامل کیا جا سکتا ہے۔ پنج حرفی قوافی آواز، پرواز، دمساز کے ساتھ معتراض کا قافیہ نہیں لکھا جا سکتا۔ پگاہ، پناہ، نگاہ وغیرہ، تربت، غربت، شربت وغیرہ، امین، ذہین، متین وغیرہ

جال، چال، حال وغیرہ؛ حلق، شفیق، عیق وغیرہ؛ صداقت، حذاقت، لیاقت وغیرہ قوافی میں نگاہ کے ساتھ صلاح بطور قافیہ شامل کیا جا سکتا ہے؟ تربت کے ساتھ ربط اور صداقت کے ساتھ نفرت یا خفت ہرگز بطور قوافی استعمال نہیں کئے جا سکتے۔ اگر قربت کے ساتھ ہمت، حذاقت کے ساتھ محنت اور نجیف کے ساتھ شفیق اور خلیق بطور قافیہ استعمال کرنے کی آپ حضرات اجازت دیں گے؟

(۲) کیا آپ رقم، قسم اور الم یا نظر، سفر اور ہنر وغیرہ یا چمن، کفن، لگن کو درست قوافی قرار دیں گے؟ کیا آپ دل، ساحل، منزل اور مقرر، منفر، منور کو اور بت، رت، اور چپت کو صحیح قافیہ مان لیں گے؟ اگر جواب اثبات میں ہے تو ذرا حرف روی بتائیے گا۔ نیز یہ بھی کہ کیا قافیہ کی شرط پوری ہو گئی؟

(۳) کیا آپ عرصہ بمعنی میدان کو مدت کے معنی میں استعمال کرنا درست سمجھتے ہیں؟

(۴) کیا آپ ممنون کے معنی میں مشکور استعمال کرنا صحیح سمجھتے ہیں؟

(۵) کیا آپ پتا اور پتہ میں کوئی فرق نہیں سمجھتے اور پتہ بمعنی برگ کو پتا بمعنی ٹھکانہ اور نشان استعمال کرنا جائز قرار دیتے ہیں؟

(۶) کیا آپ انگریزی کی تقلید میں نکتہ نظر کے بجائے نقطۂ نظر (Point of view) لکھنا درست خیال کرتے ہیں؟

(۷) کیا درمیان کے ساتھ 'میں' اور دوران کے ساتھ 'میں' نیز اثناء کے ساتھ 'میں' لکھنے میں آپ کوئی حرج محسوس نہیں کرتے؟

میں یہ مراسلہ برائے معلومات صرف تیس حضرات کی خدمت میں ارسال کر رہا ہوں کہ ان کی آراء کا تجزیہ کرکے ایک نہایت اہم دستاویز کتابی صورت میں شائع کراؤں تاکہ مذکورہ بالا اغلاط کا سدباب ممکن ہو سکے۔ اپنے قیمتی خیالات سے جلد نوازنے کے سلسلے میں آپ میرے مشکور ہوں گے۔

ممنونِ کرم ایک طالب علم

خورشید خاور امروہوی

(پتہ: پروفیسر خورشید خاور امروہوی

بیت الفیاض

اے۔۳۰۸۔ ابن شمالی ناظم آباد۔ کراچی ۳۳)

"فنون" شمارہ ۴۱

یہاں قاہرہ میں ایک عزیز کے توسط سے مجھے "فنون" کے دونوں شمارے (۴۰۔۴۱) ایک ہی روز ملے۔ مسرت بخش حیرت اور حیرت افزا مسرت ہوئی کہ "فنون" جلد جلد شائع ہونے لگا ہے۔ اللہ برکت دے

سامنے دو شمارے رکھے ہیں مگر میں مختصر اظہار خیال کروں گا کیونکہ ابھی ابھی واپس شارجہ جا کر مجھے ایک تجارتی الجھن کو سلجھانا ہے۔ صرف اتنا عرض کروں گا کہ شمارہ ۴۰ کے "حرف اول" میں آپ نے آمریت پسندوں کی صحیح معنوں میں نشان دہی کی ہے اور جمہوریت کے ساتھ ارباب سیاست کی بدسلوکی کا درست تجزیہ کیا ہے۔

محمد ارشاد صاحب نے "طرزِ بیدل میں ریختہ" کے عنوان سے میرے محبوب و محترم شاعر اختر حسین جعفری کے فن کا جس عالمانہ انداز میں جائزہ لیا ہے وہ قابلِ ستائش ہے مگر مجھے کہیں کہیں محسوس ہوا ہے کہ ارشاد صاحب غالب کی سی نابغۂ روزگار ہستی کے ساتھ زیادتی کے مرتکب ہو رہے ہیں۔ اگر انھوں نے "طرزِ بیدل میں ریختہ لکھنے" کو "قیامت" قرار دیا تھا تو یہ ایک طرح سے بیدل کی عظمتِ فن سے عقیدت کا اظہار تھا ورنہ غالب تو بیدل سے کہیں آگے نکل گئے تھے۔ ارشاد صاحب اپنی دلیل ضرور دیتے مگر غالب کو نیچا

دکھلاتے ہوئے، وہ کم سے کم مجھے بھلے نہیں لگے۔ میں ان کی بہت عزت کرتا ہوں اور جعفری کے ساتھ بے پناہ عقیدت رکھتا ہوں مگر مجھے ارشاد صاحب کا طریقِ استدلال کھٹکا اس لئے معذرت کے ساتھ عرض کر دیا۔

رشید ملک کی طرف سے انڈالوجی کا سلسلہ جاری ہے اور تاریخ کے طالب علموں کے لئے یہ ایک نعمت سے کم نہیں۔ محمد کاظم نے "روزن در" کا دوبارہ آغاز کر کے تشنگانِ علم و فن پر احسان کیا ہے۔ حمید نسیم کے مجموعۂ کلام "جستِ جنوں" کا خود نوشت دیباچہ درج کر کے آپ نے سستی شہرت حاصل کرنے کی تگ و دو میں مصروف نوجوان شعرا کی صحیح رہنمائی کی ہے۔ جوش ہمارا بزرگ شاعر ہے۔ ہم نے اس کی بڑی حق تلفی کی ہے۔ ڈاکٹر فرمان نے ان پر ایک مدلل اور عمدہ مضمون لکھا ہے۔ مسعود مفتی کے مضمون نے احمد فراز کی شخصیت اور شاعری کو درست تناظر میں پیش کیا ہے۔ یوسف حسن نے "اقبال اور جاگیرداری" پر مقالہ لکھ کر تفہیمِ اقبال کی طرف ایک اہم قدم اٹھایا ہے۔ قاضی قیصرالاسلام کا شیلے لادیوت کے انٹرویو کا ترجمہ معلومات افزا ہے۔

شمارہ ۴۳ میں محمد کاظم نے ڈاکٹر تحسین فراقی کی تصنیف "عبدالماجد دریابادی ـــــ احوال و آثار" پر بھرپور تبصرہ کیا ہے اور کتابوں کے بالاستیعاب مطالعے کی راہ دکھائی ہے۔ اس شمارے میں ادا جعفری پر ادیب سہیل کا مضمون اس لحاظ سے غنیمت ہے کہ ادا کی سی عمدہ شاعرہ پر اور لوگوں کو بھی کھل کر لکھنا چاہیئے۔

نمبر ۴۳ میں "گوشۂ خالد" رکھ کر آپ نے اس دور کے ایک ابھرتے ہوئے روشن دماغ شاعر کا حق ادا کیا ہے ـــــ مگر فی الحال صرف ایک حد تک ـــــ یہ شاعر اس سے زیادہ تحسین کا مستحق ہے۔

نمبر ۴۳ کے سبھی افسانے دلآویز ہیں اور انھوں نے معاشرے کے بارے میں حقیقی انکشافات کئے ہیں۔ رفعت مرتضیٰ، وقار بن الٰہی، گلزار (جس کے "خوف" نے لرزا دیا ہے)، احمد جاوید، مسرت لغاری، نیلوفر عطیہ، نسیم، ارجمند، مصطفیٰ کریم، حمید قیصر، شمشاد احمد اور عبدالوحید رانا کے صرف نام لکھ کر انھیں داد دے رہا ہوں۔ اسی طرح نمبر ۴۱ میں قیصر تمکین، غلام محمد، نجم الحسن رضوی اور گلزار (ایک بار پھر حیرت انگیز افسانہ) کے کمالاتِ فن کا اعتراف کرتا ہوں، مگر یہ فرحت پروین کون ہیں؟ انھوں نے تو افسانہ "سانک" لکھ کر ہم سب کے ضمیروں کے پردے پھاڑ دئے ہیں۔ یہ ایک ایسی کہانی ہے جس سے علامت نگاروں کو سبق حاصل کرنا چاہیئے۔

آپ سے ایک شکایت ہے کہ نمبر ۴۲ میں اگر "اختلافات" ہیں تو تبصرے نہیں ہیں اور نمبر ۴۱ میں اگر تبصرے موجود ہیں تو اختلافات غائب ہیں۔ نہ جانے یہ کیا قصہ ہے۔ یہ دونوں حصے "فنون" کی ہر اشاعت کے اہم حصے ہوتے ہیں۔ ان کے سلسلے میں ناغہ نہ کیا کیجئے۔

دونوں شماروں میں نظمیں اور غزلیں دلآویز اور معیاری ہیں مگر میں بطورِ خاص منصورہ احمد کی نظموں کا ذکر کروں گا کہ مجھے ان میں مستقبل گونجتا ہوا سنائی دیتا ہے (کاش اس کا مجموعۂ کلام جلد شائع ہو سکتا) منصورہ اچھی خاصی شہرت رکھنے والے شاعروں سے بھی فرسنگوں آگے نکل گئی ہے۔ "یہاں سے آسماں دیکھو" (نمبر ۴۰) کو میں اس دور کی بہت بڑی نظم قرار دوں گا۔ اس کے آخر میں پہنچ کر تو مجھ پر سکتہ سا طاری ہو گیا ـــــ یہ سوچ کر کہ کیا انسان اتنے خوبصورت اور بھرپور انداز میں بھی اپنے خیالات و جذبات و تصورات کو شاعری کی صورت میں پیش کر سکنے پر قادر ہے؟

خلا جیسے جزیروں سے
سفر واپس پلٹنے کا
تہِ گرداب ہوتا ہے
سو میں چوکھٹ پہ آنکھوں کے دیے رکھے

تمہاری راہ تکتی ہوں
کہ تم لمبے سفر سے خستہ جاں آؤ
تو دستک کی اذیت سے تو بچ جاؤ

اور پھر:

ادھر بیٹھو
یہاں آنگن میں پھیلی بیل کے سائے میں دم لے لو
یہاں سے آسمان دیکھو

اور اس کے بعد "دو قدموں تلے پھیلی زمیں اور آنکھ بھر کا آسمان" کو ہر انسان کا واحد ورثہ قرار دے کر منصورہ نے ایک سچی حقیقت کو واشگاف انداز میں مگر کتنی فن کاری سے بیان کر دیا ہے۔

اسی طرح "کوئی آواز دیتا ہے" میں آواز کو غیر مرئی سے مرئی بنانے میں اس شاعرہ نے جو کمال دکھایا ہے وہ اسی کا حصہ ہے۔ "حریر و پرنیاں جیسی صداؤں" اور "آواز کے لمس" اور "آواز کے حسن کو" "فاختہ کے ڈھیر سے کومل پروں" میں منتقل کر دینا اور ہر لفظ میں گھنگرو باندھنا اور لہو میں دیوالیاں سجانا! —— میں کہتا ہوں کہ یہ شاعری کا وہ طلسم ہے جسے اس دور میں منصورہ جگا رہی ہے۔ اسی طرح (ص ۱۴۲ میں) "یہ لمحہ بھی ابد ہے" کی سی نظم شاید ہی کسی دوسری زبان میں کہی گئی ہو۔ آخر "زمیں کے وقت سے آگے" "کسی "نا وقت" کو بہتے اور "زمانوں سے پرے" کے "اک زمانہ" کو اب تک کس نے گرفت میں لیا ہے۔ ساتھ ہی "بس اک تارہ چمکتا ہے" (ص ۱۴۴) میں شاعرہ نے بڑے سلیقے سے عقیدے اور معاشرے اور پرانی قدروں کی جکڑبندیوں سے رہائی پانے کی شدید خواہش کا جو دھیما دھیما اظہار کیا ہے، اس نے متذکرہ نظم کو ایک ایسی سرگوشی بنا دیا ہے جس میں ابدیت کی گونج ہے۔

میں دوسرے شعراء سے معذرت چاہتا ہوں مگر جب انسان مسحور ہو جائے تو ایسی ہی حرکتیں کر گزرتا ہے جیسے میں نے کی ہیں مگر میں شمارہ نمبر ۳۹ کی نظموں میں آفتاب اقبال شمیم، گلزار، شاہنواز زیدی، سید مبارک شاہ، شاہین مفتی اور شیراز راج (یہ کون صاحب ہیں، انھیں پڑھ کر لطف آگیا) کا، اور غزلوں میں ساقی فاروقی، ظفر اقبال، بیدل حیدری، رضی اختر شوق، افتخار عارف، شاہین شفیق سلیمی، سجاد بابر، شہزاد قمر، یاسمین گل اور عباس تابش کی خدمت میں بطور خاص ہدیۂ عقیدت و ستائش پیش کروں گا اور آپ سے معذرت چاہوں گا کہ میں مختصر لکھنے کے وعدے کی خلاف ورزی کا مرتکب ہوا ہوں۔ امتیاز علی خان (قاہرہ)

فنون شمارہ ۳۸ سے شمارہ ۴۰ تک

"فنون" کے شمارہ ۳۸ کے "اختلافات" میں محمد ارشد صاحب نے مجھے خطاب کر کے بعض اعتراضات کئے تھے۔ امریکہ جانے سے قبل میں نے ان اعتراضات کا مفصل تحریری جواب بھی آپ کو دے دیا تھا۔ میرا خیال تھا کہ جب آپ میری تحریر پڑھیں گے تو آپ اپنی انصاف پسندی کے تحت اسے شائع ضرور کریں گے —— لیکن جیسا کہ آپ نے مجھے بتایا آپ نے میری وہ تحریر پڑھی ہی نہیں اور اس سے پہلے ہی یہ فیصلہ کر لیا کہ بحث بند کر دی جائے کیونکہ وہ تلخی کے ساتھ مذہبی رنگ اختیار کرتی جا رہی ہے —— چونکہ آپ میرے لئے محترم بھی ہیں اور پیارے بھی، اس لئے اُس وقت میں خاموش ہو گیا اور اپنی تحریر محفوظ کر لی۔ لیکن "فنون" کے شمارہ ۳۹ کے اعتراضات میں امتیاز علی صاحب کی شارجہ سے آئی ہوئی تحریر پڑھی تو بے حد دکھ ہوا کہ وہ بھی مجھے خاموش رہنے کی تلقین کر رہے ہیں۔ اس کا یہ مطلب ہوا کہ "فنون" کے اکثر قارئین یہی سمجھے ہوں گے کہ میری خاموشی کے باعث آپ نے بحث بند کر دی ہے حالانکہ میں نے آپ کو ارشاد صاحب کے ایک ایک اعتراض کا بالترتیب جواب دیا تھا۔ میرا اعلان ہے کہ جن صاحب کو میری وہ تحریر درکار ہے جو میں نے ارشاد صاحب کے اعتراضات کے جواب میں لکھی اور جو آپ نے نہیں درج کی، وہ مجھ سے ۸۔ ظفر کالونی سمن آباد لاہور کے

پتے پر خط لکھ کر حاصل کر سکتے ہیں۔

"فنون" عدد ۱۲۳ کو کھولتے ہی سب سے پہلے مدت کے بعد ایک عمدہ حمد مناجات کی صورت میں جناب خورشید رضوی کے اشعار میں نظر آئی۔ خورشید صاحب اگر ادھر توجہ دیں تو مجھ ایسے معمولی شعرا کا منہ بند کر سکتے ہیں جو آئے دن حمد پر حمد کہنے سے باز نہیں آتے۔ حصہ نعت میں انور مسعود کے اشعار پسند آئے اور یاسمین حمید کی نظم —— تنویر سپرا مرحوم کی یاد میں کیا نظم اور کیا نثر دونوں ہی خوب ہیں اور معلومات افزا بھی —— صوفی افضل فقیر مرحوم کی ذہانت کا میں ہمیشہ قائل رہا۔

مقالات میں سب سے پہلے محمد ارشاد صاحب کا مقالہ "طرزِ بیدل میں ریختہ" پڑھا اور اس کو پڑھ کر میں کئی طرح لطف اندوز ہوا اگر کاش وہ بیدل و غالب کے عام قاری کی طرح جلدی سے یہ نہ فرما دیتے کہ بیدل کا انداز بھاری پتھر تھا جسے غالب نے چوما اور چوم کر چھوڑ بھی دیا۔ غالب نے بیدل سے جہاں تک ان کا "مزاجِ خاک اکسیر" اجازت دیتا تھا خوب فائدہ اٹھایا ہے البتہ بیدل کا وہ انداز غالب نے ضرور ترک کیا جس میں عام قاری کو بطور چیستان بہت کچھ اور خاص قاری کو الگ کچھ نظر آتا ہے۔ میری مراد بیدل کے کلام کی ظاہری آب و تاب ہے، تشبیہ و استعارہ سے مملو۔ اور پھر بیدل کے یہاں خود اس آب و تاب میں نری شان و شوکت اور طمطراق ہی نہیں ہے بلا کی سادگی بھی موجود ہے جس کا تتبع ممکن تو ہے لیکن بڑی ریاضت اور توجہ چاہتا ہے —— اور غالب نے اس ضمن میں یہ دونوں تقاضے پورے کئے ہیں۔ اپنے فارسی کلام ہی میں نہیں اردو میں بھی —— یقیناً یہ بڑی خوشی کی بات ہے کہ اختر حسین جعفری کی شاعری کے ڈانڈے آخر میں ارشاد صاحب نے بیدل کے ساتھ ملا دئے اور اس سے پہلے یہ بھی فرما دیا کہ جعفری صاحب کے "وہم و گمان میں بھی نہ ہوگا کہ کوئی بیدل کے ساتھ" ان کے اسلوب کو ملانے کی کوشش کرے گا۔ جعفری صاحب زندہ ہوتے تو بات ہوتی ورنہ ارشاد صاحب کو معلوم ہونا چاہیئے کہ جعفری صاحب کے لاشعور ہی میں نہیں بیدل کا اسلوب اُن کے شعور میں بھی تھا۔ ان کی یعنی جعفری صاحب کی شاعری اور اس کے ابلاغ کے ضمن میں میری بات ہوئی تھی افسوس کہ وہ مکمل نہ ہو سکی —— اور جب میں نے اُن سے یہ کہا تھا کہ ابلاغ سے میری مراد ایسا ابلاغ ہے جو قلب و نظر کو بلوغت بخشے تو اس پر مرحوم نے کہا تھا کہ ہاں اس پر غور کرنے کی ضرورت ہے —— تو جناب اصل مسئلہ یہ ہے کہ زبان میں تصرف کر کے اور تشبیہیں، استعارے، تراکیب اور پیکر سازی اور تمثال کو استعمال میں لا کر کوئی شاعر کہاں تک معنی آفرینی کرتا ہے ہمیں اس ضمن میں بیدل اور اختر حسین جعفری کی شاعری کو الگ الگ دیکھنا ہوگا۔ آزاد نظم کی شاعری میں جیسی کہ اختر حسین جعفری نے کی اور بیدل کی شاعری میں یہ تصرف ایک جیسا کمال نہیں دکھا رہا ہے —— اور اگر محض سطح کی بات ہے تو پھر ہم ماننے کے لئے تیار ہیں۔

"طرزِ بیدل میں ریختہ" کے بعد اگلا مضمون ہمارے رشید ملک صاحب کا ہے۔ یہ اپنے میدان کے شہسوار ہیں چنانچہ بڑے وثوق سے راہوارِ نقد و نظر پر اُڑے جا رہے ہیں —— "دوزن در" کا سلسلہ محمد کاظم صاحب نے خوب شروع کیا ہے۔ خدا کرے اب وہ اس پر تواتر سے قائم رہیں —— اس سے اگلا مضمون یعنی خود نوشت دیباچہ حمید نسیم صاحب کا ہے اور آپ نے بہت اچھا کیا جو اسے "فنون" میں بطور خاص شائع فرما دیا۔ اس طرح کی باتیں اب بہت ضروری ہو گئی ہیں۔ جوش ملیح آبادی کی انقلابی سوچ کے حوالے سے ڈاکٹر فرمان فتحپوری صاحب نے ہمیں جوش کی مشہور نظمیں پڑھوا دیں اُن کا شکریہ —— احمد فراز پر مسعود مفتی کا مضمون بھی خاصے کی چیز ہے۔ اس کے مطالعے سے احمد فراز کے بارے میں عام قاری کے ذہن سے بہت سی غلط فہمیاں دور ہوتی ہیں —— "اقبال اور جاگیر داری نظام" میں یوسف حسن صاحب نے بڑے واضح انداز میں اقبال کے حوالوں سے جاگیر داری نظام کو خلافِ شرع، اسلامی اور خلافِ انسانیت ثابت کیا ہے مگر میں سمجھتا ہوں ہمارے لئے اس وقت سب سے اہم مسئلہ ہے کہ ہم اپنی سیاست سے جاگیر داری کس طرح ختم کریں۔

مشیلے لادیوف کے انٹرویو کا ترجمہ قیصرالاسلام صاحب نے ٹھیک ہی کیا ہے لیکن نسائی تحریک کے بارے میں مترجم سے کیا پوچھیں ورنہ مشیلے لادیوف سے پوچھنے کے لئے بہت کچھ پوچھا جا سکتا ہے۔ مرد و عورت کا اصل میں بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ مرد نے اپنی جسمانی طاقت کے زعم میں عورت کو انسان ہی نہیں سمجھا اور یہیں سے ساری خرابی پیدا ہوئی ورنہ مذکر و مؤنث ہی کو تسلیم نہ کیا جائے یہ فطرت و قدرت دونوں سے زیادتی ہوگی — بلکہ یہ کہنا زیادہ مناسب ہے کہ انسانیت سے زیادتی ہوگی — گوشۂ خالدؔ میں جملہ احباب نے خوب لکھا ہے ان کے ذریعہ مجھ ایسے بے خبر کو بھی خالدؔ کے بارے میں بہت کچھ معلوم ہوا۔

حصۂ نظم میں یوں تو ہر ایک پر کچھ نہ کچھ لکھنے کو جی چاہتا ہے لیکن پہلے ہی خط خاصا طویل ہو گیا ہے مگر ناہید قاسمی کی نظموں پر کچھ لکھے بغیر نہیں رہ سکتا۔ تازہ نظمیں پڑھ کر یوں لگتا ہے جیسے ناہید قاسمی طبقۂ نسواں کے دکھ درد کو جس شدت سے محسوس کر رہی ہیں اُسی شدت سے وہ بیان کرنے میں بھی کامیاب رہی ہیں۔ ویسے بھی مجھے یوں لگتا ہے کہ ناہید قاسمی اپنے فن کو بڑی جگرداری کے ساتھ آگے لے کر بڑھ رہی ہیں اور معاف کیجئے مجھے ایسا محسوس ہوا جیسے وہ یہ کام تنہا کر رہی ہیں — آپ کے سہارے سے بے نیاز ہو کر — ناہید قاسمی اپنا سفر جاری رکھے ہوئے ہیں اور بڑے حوصلے کے ساتھ۔ اللہ انھیں مزید ہمت عطا فرمائے۔

افسانوں میں نیلوفر ہماری نہایت ہونہار اور خوبصورت افسانہ نگار ہیں۔ "دستاویزی ثبوت" میں عورت اور مرد کے جنسی تعلقات پر پھر ایک طنز اور بلیغ اشارہ کر گئیں۔ عطیہ سید کا "ابل اور وہ" کا عنوان دیکھ کر ہی پطرس کا "میبل اور میں" یاد آ گیا۔ میرے خیال میں موصوفہ کو کوئی دوسرا عنوان رکھنا چاہیئے تھا۔ ویسے عطیہ سید جزئیات نگاری میں خوب مہارت حاصل کرتی جا رہی ہیں۔ — ڈاکٹر سلیم اختر امریکہ میں۔ مجھ سے کم عرصہ رہے اور انھوں نے امریکہ مجھ سے کم دیکھا لیکن کیا زوردار سفرنامہ لکھ رہے ہیں اور کیسے پتے کی باتیں کر رہے ہیں اور ایک میں ہوں کہ ٹک ٹک دیدم کا مضمون بنا ہوا ہوں۔

منصورہ احمد کی نظموں کی تعریف زبانی کروں گا جس طرح زبانی وہ میرے انشائیہ کی تعریف کر دیتی ہیں۔

اور ہاں "فنون" کا شمارہ ۳۹ اس لئے بھی ایک الگ خوبی کا مالک ہے کہ بہت عرصہ کے بعد "فنون" سے میں غائب ہوں — یعنی اس شمارہ میں میری کوئی چیز نہیں — خس کم جہاں پاک — شاید اسی کو کہتے ہیں۔

سب سے آخر میں لیکن بات سب سے پہلے کہنے کی تھی کہ آپ کا افسانہ "اخبار نویس" ایسا ادب پارہ ہے جو ہم سب لکھنے والوں کی اس اعتبار سے لاج رکھ رہا ہے کہ اس افسانے سے پتا چلتا ہے کہ ابھی انسانیت زندہ ہے اور ابھی کچھ لوگ باقی ہیں جہاں ہیں — پڑھ کر جی خوش ہو گیا۔ اللہ آپ کو سلامت رکھے۔

سید مشکور حسین یاد (لاہور)

"فنون" شمارہ ۴۰

تازہ "فنون" نظر نواز ہوا۔ محترم حمید نسیم کا خط مجھے ۱۹۲۸ء کے نوبل یافتہ مصنف اناطولی فرانس کے ناول "تائیس" کی فضا میں لے گیا اور مجھے یوں لگا کہ اوائل زمانہ و بعد از مسیح میں — نیل کے کنارے آباد ایک راہب گھومتا گھومتا ایک دوسرے راہب کے حصۂ صحرا میں آیا اور بولا "ہاں بھائی ندیم کیسی گزر رہی ہے" اور اس کے ساتھ اس کے حصۂ صحرا کی سیر کرتے کرتے ایک کیاری کے پاس آ کر ٹھہرا اور بولا "خوب!" دوسرے راہب کے چہرے پر ایک مسکراہٹ ابھری اور "کیاری" کچھ اور کھل اٹھی۔

"مادھو لال حسین کے لئے" یہ تعریفی کلمات میرے لئے بہت بڑی خوشی کا سبب بنے کیونکہ محترم حمید نسیم کا نام میرے بچپن کی یادداشتوں کا حصہ ہے — ایک ایسا نام جس کو آپ اوائل عمر سے ایک بڑے نام کے طور پر سنتے آئے ہوں، اگر آپ کے لئے

حرفِ تحسین کا تحفہ روانہ کرے تو آپ کو یقیناً خوشی ہوگی ہیں جناب حمید نسیم کے لئے سراپا سپاس ہوں کہ اس عہد میں جس میں کتابیں لوگوں کو متوجہ نہیں کر پاتیں، ایک نظم نے جناب حمید نسیم کی نگاہ میں بار پایا اور سرخرو ٹھہری۔ بہت شکریہ محترم حمید نسیم، بہت شکریہ، لیکن آپ کی اس داد کے اصل مستحق محترم احمد ندیم قاسمی ہیں کہ خالد احمد تو ایک کیاری ہے ۔۔۔ ان گنت کیاریوں میں سے ایک کیاری۔ یہ تمام کیاریاں اس گوشۂ صحرائے ادب، جسے "فنون" کا نام ملا، اکیلے احمد ندیم قاسمی کی محبتوں کا ثمرہ ہیں۔ یہ گلزار، خدا کے فضل تلے انہی کے دم کا کھلایا ہوا ہے۔

شاید بہرۂ اختلافات میں یہ پہلی تحریر ہو جو اس قسم کے کلمات پر مشتمل ہے۔ لہٰذا مجھے تازہ "فنون" کے تمام افسانوں، تمام نظموں اور تمام غزلوں پر تبصرہ کرتے ہوئے یہ کہنے کی اجازت دی جائے کہ مجھے ان حصوں سے گزرتے ہوئے یوں لگا گویا تخلیقی ادوار کا ایک اور حسین موسم ہمارے ادب کے آسمان پر آ رکا ہے۔ مجھے ۱۹۷۲ء سے ۱۹۷۶ء تک کے تخلیقی موسم کی بہار دوبارہ جنم لیتی محسوس ہوئی۔

جناب حمید نسیم کی غزل اردو زبان میں اس بحر کے استعمال کی دوسری مثال ہے۔ اس سے قبل یہ بحر "فنون" کے صفحات پر ہی دس بارہ برس قبل ایک آزاد نظم "کیا کیا لوگ نڈھال ہوئے" میں استعمال ہوئی تھی مگر غزل میں یہ بحر میری نگاہ سے پہلی بار گزری ہے۔ ہو سکتا ہے کہ میرے مطالعے کی حدود سے باہر یہ بحر پہلے بھی استعمال ہوئی ہو۔ اظہار اور افکار، دونوں سطحوں پر یہ جھلمل کرتی غزل اردو ادب کے آفاق پر ایک یادگار منزل کے طور پر ہمیشہ جگمگاتی رہے گی۔

بہرۂ "اختلافات" میں محترم ذکا صدیقی کا خط پڑھ کر ذہن میں صرف ایک سوال پیدا ہوا اور وہ یہ کہ "مارشل لا سے مارشل لا تک" راجہ غضنفر علی خاں کی تصنیف ہے یا میر نور احمد کی، کیونکہ مشرق میں یہ بالاقساط راجہ غضنفر علی خاں کے نام سے چھپتی رہی تھی مگر جب یہ کتابی شکل میں میر نور احمد کے نام سے چھپی تو اس تصنیف میں سے غضنفر علی خاں کی بیباکی غائب تھی، البتہ نثر بہتر ہو گئی تھی، شاید "بیباکی" اور "جرأت" کی یہیں کوئی زیادہ ضرورت بھی نہیں۔ یوں بھی ۔۔۔ "جرأت تو مردانہ حسن کا رنگ ہوتا ہے" ۔۔۔ وہ تو اور ہی لوگ تھے ۔۔۔ "آہن گر"، "آئینہ گر"، "آگ ازل کی آنکھوں میں" ۔۔۔ "پھول ابد کے ہونٹوں پر" ۔۔۔ "دل جن کے درویش" ۔۔۔ "آپ نے کیوں سنیاس لیا" ۔۔۔ "کچی عمر ہے آپ کی" ۔۔۔ "آپ نے کیوں بن باس لیا" اور ہاں "فنون" سے ہمارے عہد کے سب سے توانا نظم نگار محترم صلاح الدین محمد کی غیر حاضری کب ختم ہو گی؟ اختر حسین جعفری کے بعد اب وہی تو ہیں، انھیں لائیں۔

خالد احمد (لاہور)

بہرۂ "اختلافات" نے ادب میں پُرخلوص اور غیر جانبدار تنقید کی روایتوں کی طرح ڈالی ہے۔ اس باب میں "اعترافات" "اعتراضات" کے ناقدانہ رویے، مثالیہ پیرائے ہمیشہ یاد رہیں گے۔ ہمارے ادب میں بالعموم تنقیدی تعصب کی دو لہریں شانہ بشانہ چل رہی ہیں۔ ایک لہر "انکار" کے اتار چڑھاؤ رکھتی ہے، دوسری "اقرار" کے نشیب و فراز۔ تنقید میں انکاری افتاد ہمہ وقت ذات کے اندر قید رہنے سے پیدا ہوتی ہے۔ اس سے ذاتی عدم تحفظ کی بو آنے لگتی ہے۔ یہی کیفیت خود نمائی و خود ستائی کا راستہ دکھاتی ہے۔ اس کے برعکس اقراری مزاج ذات کی بندشوں سے نجات حاصل کرنے سے ملتا ہے۔ اپنے کردار کے تعمیری اقرار سے دوسروں کی قدر و قیمت کا اندازہ لگانا اسی مزاج کا حصہ ہے۔ بہرحال تنقیدی "انکاریئے" اور "اقراریئے" اپنے اپنے زعم میں اپنا اپنا "طریقۂ واردات" رکھتے ہیں۔ دونوں گفتگو میں مقامی بیرونی فلسفوں، مقامی بیرونی ادیبوں کے تذکرے شد و مد

سے کرتے ہیں۔ فطانت ایسی کہ دیکھا چاہیئے۔ گہرائی ایسی کہ ڈھونڈے سے بھی نہ ملے۔ یوں ایک نکتہ دو مختلف خیال پیدا کرتا دکھائی دینے لگا ہے۔ تنقیدی اصطلاحیں حسب ضرورت وضع ہونے لگی ہیں۔ کچھ الفاظ زیادہ التفات کے سزاوار ٹھہرنے لگے ہیں جن میں لفظ "حوالہ" زیادہ ہی سر چڑھنے لگا ہے۔ "اس حوالے سے"، "اُس حوالے سے"، "غالب کے حوالے سے"، "اقبال کے حوالے سے" وغیرہ وغیرہ۔ طرفہ تماشا ہے ٹی۔ وی کمپیئرنگ بھی ادبی امیجری کا رخ متعین کر رہی ہے۔ ہمارے کمپیئر حضرات کی خود اعتمادی لفظوں کے ذخیرے میں اضافہ کرنے میں لگی ہے۔

تنویر سپرا اور امداد ہمدانی شاعری کا خصوصی پیٹرن رکھتے تھے۔ امداد ہمدانی پر سکون لہجے میں دکھ درد کا شور سمیٹ لیتا تھا۔ تنویر سپرا بم کی طرح پھٹ جانا چاہتا تھا۔ تنویر سپرا کا شمار ان معدودے چند شعرا میں ہوتا ہے جنھوں نے زندگی کی کراہوں، تند جذبوں کی آہٹوں، چاہتوں کی ناآسودگیوں پر زہرناک مسکراہٹوں کو نظم کیا ہے۔ اس نے آئل کین، کستوری، مل مالک، مشینوں کو اس شعری خلوص سے باندھا ہے کہ یہ لفظ از قبیل شاذ ہو کر بھی غزل رنگ ہو گئے ہیں۔

"فنون" سے صابر ظفر کے "غزوب" کو زمانہ آ لگا ہے۔ صابر ظفر یاد رکھے کہ اس کی ادبی زندگی کی سرخروئی میں "فنون" کی شفقتوں کا بہت بڑا حصہ ہے۔ صابر ظفر کا مجموعہ "دکھوں کی چادر" نغمگی کے نئے آہنگ سے سرشار ہے۔ اس نے "تغزل" میں تو نام پیدا کیا تھا۔ اب غنائی اعتبار بھی اس کی شاعری میں آ موجود ہوا ہے۔ اس ضمن میں قتیل شفائی کا نام نہ لینا ادبی بد دیانتی کے مترادف ہو گا۔ شاعری میں نغمگی اور رغنا کا اہتمام قتیل نے اپنے خون کے ذروں (Atoms) میں خوابیدہ فکری آنند کے تار چھیڑ کر کیا ہے۔ قتیل شفائی نے بحروں کی قطع و برید سے جو نغمہ پیدا کیا ہے وہ کانوں میں رس گھولتا ہے۔ لے کے اس شاعرانہ قتل سے شفا کوئی قتیل ہی پیدا کر سکتا ہے۔ صابر ظفر نے قتیل کے آہنگ سے ہٹ کر اپنا لہجہ دریافت کیا ہے۔ یہ مجموعہ ایک خوبصورت اضافہ ہے۔

مجلسِ ترقیِ ادب نے پروفیسر ارشد شاکر اعوان کی کتاب "عہدِ رسالت میں نعت" شائع کر کے اس عہد پر احسان کیا ہے۔ اس کتاب سے کئی نادر الوجود حقائق آئینہ حیرت میں منعکس ہوئے ہیں۔ ہو سکتا ہے پہلے بھی ان کی عکس بندی کہیں ہو مگر ایسے اطوار میرے ایسے کم علم نے پہلے نہیں دیکھے۔ ارشد شاکر تنقید اور شاعری کے بعد تحقیق میں بھی ایسی سعی کر گزرا ہے۔

اردو شاعری کا جتنا زیادہ چرچا ہو رہا ہے، وہ اتنی زیادہ نظریاتی تنوع اور تجرباتی تموں سے نہال ہوتی جا رہی ہے۔ تحسین کی خوش ادائیاں دیکھیئے تو جمال کی گل بدنی حواس پر طاری ہو۔ تنقید کی کارفرمائیاں ملاحظہ ہوں تو مثال و تمثیل کی حیرت سامانی دل کو کرید کے بیدار گوشے سمجھانے لگے۔ ردّ و قبول کا ہر اقدام منفی انکار سے پہلو بچاتا ہوا مثبت اقدار کا علمبردار نظر آئے۔ شفق کی سرخی سے ڈھالے ہوئے شعر کو، جس میں صنوبروں کے پتوں کا سبزہ بھی آمیز کر دیا گیا ہو، پڑھنے سے محسوس ہوتا ہے کہ لکھنے والے نے یہ شعر لکھ کر قلم توڑ دیا ہو گا کہ اس کے سائے سے کہیں کوئی کمزور شعر نہ نکل پڑے۔ اس سے انکار نہیں کہ سطروں اور شعروں کی شدّتوں میں بدگمانیوں کی پرچھائیاں بھی لہریں لے رہی ہوتی ہیں مگر اثر پذیری کے اعتبار سے یہ بدنمائیاں سوچ کی سچائی یوں سے پھوٹتی ہیں۔ ان کے عقب میں اخلاص کے گل پیرہن جذبے ایستادہ ملتے ہیں۔ بغور پڑھیئے تو ہر لفظ عمدگی میں دید نہ شنید۔ خیال بندی میں عرش احتشام — چمک میں رشکِ خورشید — اہتمام ایسا کہ کوئی لفظ جون کی پیاسی چڑیا کی طرح نظر نہ آئے کہ معانی کو ترستا پھرے۔ نقش ایسا کہ قاری صورت تصویر اس کی طرف دیکھنے لگے۔ تسلیم کہ اردو شاعری فنی عظمتوں کے زینے طے کرتی ہوئی رفعت مقام ہو چکی ہے۔ تاہم لفظ کی کوکھ ایسے معانی کی پیدائی تا ایں دم فائز المقام نہیں ہو پائی جو باریک بینی اور نکتہ وری کا منصب ہو۔ تخلیق کا سفر جاری ہے، جاری رہے گا۔ اپنے اپنے اعتقادات کی بات ہے۔ مانو تو

دیتا نہیں تو بہتر۔ اپنا اپنا ظرف ہے، مطالعے کی تہوں سے نکالے ہوئے موتی کس آب و تاب کے ہیں۔ دیکھو تو روز روشن نہیں تو کالی رات۔ دل کا دروازہ مثلِ چشمِ انتظار کھلا ہے۔ ایسا لمحہ ضرور آئے گا جو ولی، میر، غالب، اقبال کی منزلوں سے آگے کسی اور منزل کا بھی راستہ کھولے گا۔ جو کرشن چندر کے اس مفروضے کو معرضِ بطلان میں ڈال دے گا: "اچھے سے اچھا شعر بھی گدلے آئینے کی طرح ہے جس سے انسان اپنی شکل واضح طور پر نہیں دیکھ سکتا"۔ کرشن چندر کا کہا بجا سہی مگر اس کا کیا علاج کہ انسان اپنی شکل واضح "اور" پر نہیں دیکھنا چاہتا۔ جب دیکھنا چاہے گا تو آئینہ بھی ساتھ دینے لگے گا۔ "فنون" کی نظمیں، غزلیں دیکھنے کے لائق ہیں۔ انہیں تنقید کے کسی طے شدہ تناظر میں نہ دیکھا جائے تو باعثِ لذت کام و دہن بن سکتی ہیں۔ جدت و جدیدیت کا معیار یہ نہ ہو جائے کہ ہم صرف انوکھے لفظ اور اچھوتے خیال پر پکار اٹھیں واہ واسبحان اللہ! بات کسی حوالے کسی جواز سے بنتی ہے محض "ورود و دود اڑکا" ت نہیں۔ معاملہ خاطر داری کا بھی ہے، ظاہر داری کا بھی۔ ایک بار کشور ناہید نے بحیثیت مدیر "ماہ نو" میری غزل پھیر دی تھی کہ لفظ "شوخ" قدیم ہو چکا ہے اس لئے قابلِ ترک ہے۔ میں نے جواباً لکھا تھا کہ "حضرت جب تک آپ شوخی نہ چھوڑیں گی میں لفظ "شوخ" ترک نہیں کر سکتا"۔

افسانے پسند آئے۔ کہیں کہیں افسانوی حقیقت تسلیم کرنے کو قطعی جی نہیں چاہتا۔ مانا ہمارا غریب ذیلداروں، نمبرداروں تھانیداروں غرض بہت سے "داروں" کا ستایا ہوا ہے۔ یہ آپ لکھ رکھیں کہ کوئی غریب عورت خاوند کے قاتل سے مرعوب ہو کر عزت کا سودا کرنے کو تیار نہ ہو گی۔ لکھنے والے شاید ہماری دیہاتی زندگی سے اتنے واقف نہیں۔ کرشن چندر اور سعادت حسن منٹو نے بھی کوہالہ، گڑھی، چناری، ہنوٹ پر لکھے ہوئے افسانوں میں غریبوں کو بالکل ایسے ظاہر کیا ہے جیسے وہ امیروں، جاگیرداروں، سرمایہ داروں کے سامنے ہمہ وقت بے بسی سے اپنی عزتوں کے تحفے پیش کرتے رہے ہیں۔ یا پھر کوئی مسافر، سیاح سرِ عام بھینس چرانے والی لڑکی سے عشق لڑاتا رہا ہے۔ پوچھنے والا کوئی نہیں کہ تمہارے منہ میں کے دانت ہیں۔ بے شک کرشن چندر اور منٹو بہت بڑے افسانہ نگار ہیں۔ اردو ادب پر ان کے بہت بڑے احسانات ہیں مگر آپ مانیں ان کی تحریروں میں عظمتوں کی نفی کرنے والی چیزیں بھی ہیں۔ ظالم کی کمینگی سے انکار کس کافر کو ہے البتہ مظلوم کی غیرت سے انکار بہت بڑی زیادتی ہے۔ ہمارے بیشتر افسانہ نگار غریب کی غیرت کو پس قلم ڈال دیتے ہیں۔

مضامین پائے کے تھے۔ محمد ارشاد "طرزِ بیدل میں ریختہ" میں حسبِ معمول معتبر ہیں۔ انھوں نے بیدل کے ضمن میں اختر حسین جعفری کو بجا طور پر مذکور کیا۔ حیرت ہے ن۔م۔ راشد کو بھول گئے۔ حمید نسیم کا "احیا" خوشی کی بات ہے، وہ اثر انداز شاعر ہیں۔ راجہ حکیم اللہ وزیر آبادی نے اپنی آپ بیتی "ریت پر قدموں کے نشاں" میں حمید نسیم کا ذکر کیا ہے۔ اس زمانے میں حمید نسیم اور ناصر کاظمی ایک ساتھ ابھر رہے تھے۔ محمد کاظم کا قلم چوم لینے کو جی چاہتا ہے۔ "فنون" کی وساطت سے ان کے اچھے اچھے مضامین پڑھے۔ اب کے وہ کہیں کی اینٹ کہیں کا روڑا جوڑ کر مہارت دکھا گئے ہیں۔ یوسف حسن متاثر کرتا ہے۔ جو کچھ سوچتا ہے وہ لکھتا ہے، جو محسوس کرتا ہے وہ کہتا ہے۔ ٹی وی مشاعرہ کے شاعروں کے اسمائے گرامی سے اپنا نام کٹوا کر کسی دوسرے کا لکھوا دینا اسی کا حصہ ہے۔ کہاں ملتے ہیں ایسے سر پھرے عاشق۔

گوشۂ خالد احمد "فنون" کی حسن کاریوں کا ایک اور پہلو ہے۔ خالد احمد نظم اور غزل کو ظاہر و باطن کی نئی آب و ہوا سے تر و تازہ کر رہا ہے۔ خدا کرے "تر و تازہ" کے استعمال میں مجھ سے غلطی نہ سرزد ہو گئی ہو۔ خالد احمد کے اس شعریت کا ڈسپلن شاید لاابالی پن کا مرہونِ منت ہے۔

آصف ثاقب (بوئی۔ ہزارہ)

"فنون" شمارہ نمبر ۴۱ پڑھا اور وہ ساری کوفت دور ہو گئی جو اس کے مسلسل انتظار کی وجہ سے تھی۔ اس شمارے میں محمد ارشاد کا مقالہ "طرزِ بیدل میں ریختہ" ایک لاجواب تحقیقی مقالہ ہے جس میں طرزِ بیدل کی وضاحت کرنے کے ساتھ ساتھ بیدل کی پیروی کرنے والے شعرا کا ذکر بھی کیا گیا ہے۔ یہ حقیقت ہے کہ طرزِ بیدل کو اپنانے والوں میں سرِ فہرست بلکہ یہ کہنا شاید غلط نہ ہو گا کہ غالب واحد شاعر ہے جو طرزِ بیدل کو اپنانے میں کامیاب ہوا۔ تاہم طرزِ بیدل مقبولیت حاصل کرنے میں ناکام رہا۔ یہی وجہ ہے کہ غالب اگر آج بھی زندہ اور ترو تازہ ہے تو صرف اپنے کلام کے اسی حصے کی وجہ سے جو صاف، سادہ اور دل نشین ہے۔

رشید ملک نے "انڈالوجی" کے زیرِ عنوان وادیٔ سندھ کی قدیم تاریخ اور تہذیب و ثقافت کے کھوج کا اہم فریضہ اپنے ذمے لیا ہوا ہے۔ وہ اُسے کامیابی سے ادا کر رہے ہیں۔ یہ خاصہ دقیق کام ہے اور وسیع مطالعہ کا متقاضی۔ محمد کاظم نے "روزنِ در" کے عنوان سے اپنے مقالہ میں آنے والی دلچسپ اور معلوماتی تحریروں کو قارئین "فنون" کے سامنے پیش کرنے کا جو سلسلہ شروع کیا ہے قابلِ قدر ہے۔

حمید نسیم کا مقالہ "گفتند کہ برہم زن" لائقِ مطالعہ ہے اور فرمان فتحپوری کا مقالہ "انقلابی سوچ اور جوش ملیح آبادی" تو نہایت ہی اعلیٰ اور محققانہ مقالہ ہے جسے پڑھ کر جوش کی شخصیت اور اس کی انقلابی سوچ کو سمجھنے میں مدد ملتی ہے۔ قاضی قیصر الاسلام میشیلے لادیوت کے انٹرویو کو اردو میں منتقل کر کے اردو داں طبقے کو میشیلے لادیوت کے افکار سے روشناس کرانے کی جو کاوش کر رہے ہیں، قابلِ قدر ہے۔ مسعود مفتی نے احمد فراز کے بارے میں جو کچھ لکھا ہے خاصہ معلومات افزا ہے۔ اس سلسلے میں انھوں نے بالواسطہ اپنے حالات بھی بیان کئے ہیں اور جن لوگوں میں ہم رہتے ہیں اُن کی ذہنیت کو بھی بیان کیا ہے۔ میرے خیال میں اس شمارے کا سب سے اہم مقالہ یوسف حسن کا "اقبال اور جاگیرداری" ہے۔ انھوں نے جاگیرداری کی ماہیت پر بھی روشنی ڈالی ہے اور قرآن کا نقطۂ نظر بھی پیش کیا ہے ــ اور پھر اقبال نے جاگیرداری اور سرمایہ داری کی جس طرح مذمت کی ہے۔ بڑی وضاحت سے پیش کیا ہے۔ درحقیقت اقبال جاگیرداری اور سرمایہ داری دونوں سے بیزار تھے اور دونوں کو مسترد کرتے تھے۔ ان دونوں کے مقابلے میں وہ اشتراکیت کے حامی تھے۔ اسی لئے انھوں نے روس میں برپا ہونے والے اشتراکی انقلاب کا پُرجوش طریقے سے استقبال کیا۔ ان کے کلام میں اشتراکی دانشوروں اور اُن کے افکار و خیالات کا ذکر اچھے انداز میں ہوا ہے۔ تاہم وہ اشتراکیت کو مادیت کی بجائے روحانیت پر استوار کرنے کے خواہاں تھے۔ جاگیردارانہ اور سرمایہ دارانہ سماجی نظاموں پر اقبال کے حوالے سے بہت کچھ لکھا جا چکا ہے۔ تاہم بہت کچھ لکھنے کی گنجائش باقی ہے اور یہ گنجائش اس وقت تک رہے گی جب تک عام انسانیت ان دونوں نظاموں سے نجات حاصل نہیں کر لیتا۔ بہرحال یوسف حسن کا مقالہ قابلِ تحسین ہے۔

مشتاق احمد (لاہور)

میرا یہ عریضہ اگرچہ "اختلافات" میں چھپ رہا ہے لیکن اس میں اختلاف کی کوئی بات نہیں بلکہ چند اہم امور کی طرف قارئینِ "فنون" کو متوجہ کرنے کوشش کی گئی ہے۔

وفیات الاعیان اس مرتبہ کچھ زیادہ ہی عبرت آموز ہے۔ "فنون" کے شمارہ ۳۹ - ۴۰ کے درمیان کوئی صدیاں تو نہیں بیت گئیں۔ یہی چند مہینوں کی بات ہے۔ مگر اس دوران کوئی ۲۴ کے لگ بھگ باکمال ہم سے بچھڑ گئے۔ یہ ایک ناقابلِ تلافی نقصان ہے اور ایک ایسا خلا ہے جسے شاید کبھی بھی پورا نہ کیا جا سکے۔ ان ہستیوں کو سہل سمجھنا آسان نہیں کیونکہ فلک برسوں پھرتا ہے تب خاک کے پردے سے ایسے انسان نکلتے ہیں۔

کیسے کیسے صاحبِ کمال اٹھ گئے۔ ڈاکٹر احمد علی، ڈاکٹر اجمل، امیر حمزہ شنواری، تنویر سپرا کو تاریخ کہاں سے لائے گی۔ مدیر "فنون" نے بجا تحریر کیا ہے کہ ان اموات سے تہذیبی بحران کی سی کیفیت پیدا ہو گئی ہے۔ مرنا تو سبھی کو ہے مگر میں حالات کا ماتم کرنا چاہتا ہوں۔ ان حالات کا جو نہ ایسے باکمال پیدا کر سکیں گے اور نہ ہی ہم کوئی درسِ عبرت لے سکیں گے۔

بارہ کروڑ کی آبادی میں کتنے لوگ علم و ادب سے شغف رکھتے ہیں؟ کتنے لوگ کتاب پڑھ سکتے ہیں؟ یہی شاید دس فیصد ان دس فی صد نفوس میں عملی طور پر کتنے حضرات کتاب پڑھتے ہیں، اور کتاب پڑھنے والوں میں کتنے ہوں گے جو نثر لکھتے یا شعر کہتے ہوں گے۔ بارہ کروڑ میں غالباً بارہ لاکھ، نہیں یہ مبالغہ ہے۔ پھر کتنے؟ بارہ ہزار، لیکن نہیں پاکستان میں تو معیاری اہلِ قلم کی تعداد اتنی بھی نہیں۔ پھر یوں سمجھئے بارہ سو۔ ویسے یہ بھی مبالغہ ہی لگتا ہے۔ پر چلئے مان لیتے ہیں۔ اس سے اندازہ ہو جاتا ہے کہ ایک مصنف یا شاعر کتنی اہم شخصیت ہوتا ہے۔ اتنی اہم شخصیت کے لئے ہم کیا کرتے ہیں؟ حکومت کا رویہ کیا ہے؟ علمی و ادبی اداروں کی روش کیا ہے؟ ذرائع ابلاغ کی پالیسی کیا ہے؟ کچھ نہیں۔ بالکل کچھ نہیں مکمل خاموشی سراسر سکوت!

نہ باکمال پیدا کرنے والے اسباب اور نہ ان سے کام لینے کے مواقع موجود۔ یہ منتخب روزگار افلاس، بیماری اور بے اعتنائی کا شکار رہ کر گمنامی میں مر جاتے ہیں۔ اگر کسی کی کسی سے جان پہچان ہوئی تو حکومت نے تعزیت کا پیغام بھیج دیا ورنہ وہ بھی نہیں۔ لیکن "فنون" کے "وفیات" میں خبر بہر صورت چھپ جائے گی۔ اور اس کے بعد کسی کو نہ کام یاد آئے گا نہ نام۔ یہ ہے ایک شاعر ایک ادیب، ایک مغنی، ایک سائنس داں، ایک محقق اور ایک صحافی کا انجام!

موت کتنی نزدیک ہے مگر ہم اسے کس قدر دور سمجھتے ہیں۔ موت شہ رگ کے پاس ہے اور ہم اسے ماورائے افلاک جانتے ہیں۔ بے فکر ہو کر ایسے ایسے پروگرام بناتے ہیں کہ تعجب ہوتا ہے اور ایسے ایسے منصوبے سوچتے ہیں جیسے ابھی ہمیں ہزار سال اور جینا ہے! ان حالات میں مجھے حالات پر رونا آتا ہے اور اپنی غفلت پر ہنسی آتی ہے۔

"حرفِ اول" حسبِ سابق حرفِ اول ہی ہے اور شاید حرفِ آخر بھی۔ مدیرِ محترم نے سیاسی جمہوریت کی وکالت کی ہے اور دفاع کے کئی گوشے منور کر دیے ہیں۔ ان کے حرف پر اگر میں کوئی اضافہ کروں تو میری سمجھ پر حرف آئے گا۔ میں تو بات کو ذرا آگے بڑھانے کی اجازت چاہوں گا۔ میں یہ گزارش کرنا چاہتا ہوں کہ جمہوریت تین شعبوں میں کام کرتی ہے۔ سیاست، مذہب اور ادب و ثقافت میں۔ سیاست میں جمہوریت یہ ہے کہ ہر پارٹی کو پنپنے کا موقع دیا جائے اور مخالفین کا احترام کرتے ہوئے ان کو برداشت کیا جائے۔ مذہب کی جمہوریت یہ ہے کہ مختلف مذاہب کا احترام کیا جائے۔ ان کی مثبت تعلیمات کی قدر دانی کی جائے۔ سب پیروکاروں سے معاشرت رکھی جائے۔ اور تمام آسمانی صحائف کو ایک ہی باغ کے پھول سمجھا جائے۔ سب کا احترام کرنا، سب کو برداشت کرنا بلکہ تعاون کرنا جزوِ ایمان ہونا چاہیئے۔ ادب و ثقافت کی جمہوریت کیا ہے؟ ایک ملک کے سارے لکھاری نیک نیت ہوں۔ ادب کی تخلیق اور مسائل کی تحقیق میں تعاون کریں۔ بڑے چھوٹے ہونے کا معاملہ آئندہ تاریخ پر چھوڑ دیں کہ وہی بہتر منصف اور قاضی ہے۔ ادیبوں کی جمہوری ذمہ داری ہے کہ وہ رواداری، برداشت، عفو و درگذر کو اپنائیں اور مشورت کے اصول پر کاربند ہوں۔ مشورت جمہوریت کے ایوان کی خشتِ اول ہے۔ افادہ و استفادہ کا سلسلہ جاری رکھیں۔ ثقافت میں جمہوریت کو ہم اس طرح فروغ دے سکتے ہیں کہ ملک کی ساری زبانوں کو اپنا سمجھیں۔ ان کے ادب سے استفادہ کریں۔ زبانیں دیوار نہیں، در ہوتی ہیں ساری ثقافتیں، ساری بولیاں، سارا علاقائی ادب ہمارا مشترکہ ورثہ ہے کیونکہ یہ پاکستانی قوم کا سرمایہ ہے جو ایک قوم

ہے۔ ہمیں فکر و عمل میں توحید پسند ہونا چاہیے، اکثریت میں وحدت کی مثال بننا چاہیے۔

پاکستان کے سارے اہلِ قلم ہی مل کر اس سہ گانہ جمہوری نظام کو نافذ کر سکتے ہیں۔ اس لئے کہ مذہبی رہنما اور سیاسی لیڈر کا مفاد تو بہر حال وصل میں نہیں فصل میں ہی ہوتا ہے۔ شاعر و ادیب کو ہی آگے آنا اور اپنا وجود منوانا چاہیے۔ ندیم صاحب نے بہت قیمتی بات کہہ دی ہے کہ "اگر ہم مذہبی، علاقائی، لسانی اور گروہی تعصبات کو جھاڑ دیں ---- تو کوئی وجہ نہیں کہ ہم وہ منزل نہ پالیں جس کی قائداعظم نے واضح طور پر نشان دہی فرما دی تھی۔"

ہر جمہوریت کا زریں اصول یہی ہے کہ "آنچہ برائے خود نہ پسندی برائے دیگراں میپسند۔"

(ڈاکٹر) صابرہ آفاقی (مظفر آباد، آزاد کشمیر)

"فنون" شمارہ ۴۰ کے مقالات

"فنون" کے مندرجات پر نظر پڑتی ہے تو یہ خیال آتا ہے کہ اس کے کس حصّے سے مطالعے کا آغاز کیا جائے۔ بالکل وہی کیفیت:

ع کرشمہ دامنِ دل می کشد کہ جا اینجاست

خذ ما صفا دع ما کدر تو وہاں ہوتا ہے جہاں کدر ہو۔ صفا ہی صفا ہو تو کسی حصے کو کیسے چھوڑا جائے۔ یہی وجہ ہے کہ حرفِ اول سے لے کر "اختلافات" کے آخری لفظ تک پڑھے بغیر اطمینان نہیں ہوتا۔ اختلافات کا حصہ اس لئے بھی اہم ہے کہ اس کے مطالعے سے "فنون" کا کئی بار اعادہ ہو جاتا ہے۔ علاوہ ازیں یہ حصہ "فنون" کے مندرجات کی تفہیم میں بھی معاونت کرتا ہے۔

مذکورہ شمارہ میں محمد ارشاد، رشید ملک، محمد کاظم، حمید نسیم اور یوسف حسن کی وقیع تحریروں نے بہت متاثر کیا۔ محمد کاظم کے مقالے "روزن در" کے مطالعے سے محسوس ہوا کہ ہر حساس لکھاری کی طرح وہ بھی فقیہہ شہر سے خوفزدہ ہیں۔ چنانچہ لکھتے ہیں:

"وقبانی کی عشقیہ شاعری بہت کھلی اور روا شگاف ہے۔ اگر فقیہہِ شہر کا خیال نہ ہوتا تو میں اس کے بھی کچھ نمونے ان صفحات پر پیش کرتا۔ ہو سکتا ہے آگے چل کر کبھی اس کا موقع آئے۔"

محمد کاظم سے گزارش ہے کہ فقیہہِ شہر کے خوف کو بالائے طاق رکھتے ہوئے "فنون" کے قارئین کو قبانی کی عشقیہ شاعری سے مستفید فرمائیں۔[1]

حمید نسیم نے اپنے مقالے "گفتند کہ برہم زن" میں بڑی جرأت اور سچائی کے ساتھ اپنے احساسات کو صفحۂ قرطاس پر منتقل کیا ہے۔ یوسف حسن کا مقالہ "اقبال اور جاگیرداری نظام" ان کی مضبوط کمٹ منٹ اور روشن آورش کا آئینہ ہے۔

مسعود مفتی کا مقالہ "اور وہ بھی زبانی میری (فراز اور میں)" نہ صرف احمد فراز کی شخصیت اور فکر و فن کا عمدہ تجزیہ ہے بلکہ مذہب کے نام پر بدترین استحصال کی المناک تصویر بھی پیش کرتا ہے۔ ڈاکٹر فرمان فتحپوری کا مقالہ "جوش ملیح آبادی۔ انقلابی سوچ کے حوالے سے" جوش کے انقلابی رجحانات کے علاوہ ان کی زندگی کی تلخیوں اور المناکیوں کا عکاس ہے۔ اس موقع پر ایک مشہور واقعے کا بیان بے جا نہ ہوگا کہ کسی مشاعرے میں ندیم صاحب اپنا کلام سنا رہے تھے۔ اس مشاعرے میں جوش صاحب بھی موجود تھے۔ ندیم صاحب نے جب اپنا یہ مشہور شعر پڑھا:

عمر بھر سنگ زنی کرتے رہے اہلِ وطن   یہ الگ بات کہ دفنائیں گے اعزاز کے ساتھ

---

[1] محمد کاظم صاحب کو مشورہ تو آپ نے دے دیا مگر بےچارے "فنون" کو فقیہانِ شہر سے کون بچائے گا۔ (ادارہ)

جوشؔ صاحب نے یہ شعر سن کر کہا "ہمیں تو اتنی بھی توقع نہیں"۔ اور ان کی یہ پیشین گوئی سو فی صد درست ثابت ہوئی۔ ان کی میت صرف چند احباب کی میعت میں قبرستان لائی گئی اور یوں زندگی ہی میں اپنے آپ کو مرحوم لکھنے والا شاعر اسلام آباد کے قبرستان میں پیوند خاک ہوا۔

محمد ارشاد کا مقالہ "طرزِ بیدل میں ریختہ" نہ صرف اختر حسین جعفری کے فکر و فن کا عمدہ محاکمہ ہے بلکہ عربی، فارسی اور اردو کے عظیم شعراء کے افکار کا خوبصورت منظر نامہ بھی پیش کرتا ہے۔ اس مقالے میں تقابلی جائزے نے ایک عالمانہ شان پیدا کر دی ہے۔

رشید ملک کا مقالہ "انتھالوجی (۱۱) وادیٔ سندھ ۲" تہذیب و تاریخ میں ان کی گہری نظر اور تحقیقی بصیرت کا منہ بولتا ثبوت ہے۔

خاور نقوی (اسلام آباد)

"فنون" شمارہ ۴۰، گوشہ خالد احمد اور حصہ نظم و شعر کی بعض چیزوں کے حوالے سے متاثر کن رہا۔ "لفظ کھردرے" کے خالق تنویر سپرا کے فن اور شخصیت پر لکھے جانے والے مضمون اور نظمیں ٹھیک ہی رہیں۔ اقبال کوثر کی نظم زیادہ اچھی لگی۔ گوشہ خالد احمد، اختر حسین جعفری کے مضمون کے باعث پسند آیا۔ مگر اس حقیقت کا اظہار کرنا ہی پڑے گا کہ یہ گوشہ خالد احمد کی شاعری کے شایانِ شان نہ تھا۔ خالد احمد کی اکثر شاعری فنی اور فکری سنجیدگی کا خوبصورت نمونہ ہے۔ ضرورت اس امر کی تھی کہ اُن کے فنی اور فکری اضافوں کی دریافت کی جاتی۔ بہرحال "فنون" نے اس نہ وار شاعر پر کام کا آغاز کیا ہے اور یہ بات قابلِ ستائش ہے۔

خورشید رضوی صاحب بہت عرصے بعد "فنون" میں نظر آئے۔ ان کی "مناجات" عام حمدیہ نظموں سے بہتر اور اثر انگیز تھی۔ زمانہ ان کی مرصع سازی کا ہمیشہ ہی معترف رہا ہے۔ حصۂ نظم میں ضیا جالندھری، اختر عثمان، نجیب احمد اور آفتاب اقبال شمیم کی نظموں نے مختلف اسباب سے متاثر کیا۔ اختر عثمان کی "یہ میرا کٹا ہوا سر نہیں" موضوعاتی شاعری میں ایک بیش بہا اضافہ ہے۔ ساقی فاروقی، توصیف تبسم اور افتخار عارف کی غزلیں نسبتاً بہتر رہیں۔

افسانے کا حصہ حسب معمول متاثر نہ کر سکا۔ گلزار کا "خوف" تمام افسانوں میں بہتر تھا۔

رفاقت علی (حیدرآباد سندھ)

"دیر آید درست آید" کے مصداق "فنون" (سہ ماہی)، کا جولائی ــــ دسمبر ۱۹۹۳ء کا شمارہ، جنت نظر ہوا۔ میں نے کئی بار صدر کراچی میں اپنا آدمی بھیج کر "فنون" کی تلاش جاری رکھی۔ بالآخر جون کے پہلے ہفتہ میں میری یہ کاوش کامیابی سے ہمکنار ہوئی۔

آپ کو تو شاید کیا یقینی طور پر "قلم قبیلہ" کے سالانہ اجلاس ۱۹۸۷ء کا خیال بھی کبھی ذہن میں نہ آیا ہوگا مگر مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ پروفیسر مجتبیٰ حسین صاحب مرحوم کی معیت میں میں کوئٹہ ریسٹ ہوس میں آپ سے ملا تھا اور غالباً دو دنوں تک وہاں آپ کا قیام رہا تھا۔

"فنون" برابر میری نظر سے گزرتا رہا ہے۔ "فنون" کے تازہ شمارہ میں میں خاص طور پر محترم حمید نسیم کے مضمون "گفتند کہ برہم زن" سے بے حد متاثر ہوا ہوں۔ یہ ان کے دوسرے مجموعۂ کلام "جست جنوں" کا خود نوشت دیباچہ ہے۔

میں نے اس سے قبل جناب حمید نسیم کا کلام بھی مطالعہ نہیں کیا تھا اور نہ مجھے ان کے صحیح ادبی و شاعرانہ مقام و مرتبہ سے آگاہی تھی لیکن اس خود نوشت سوانح حیات کے چند اوراق نے جیسے میری آنکھیں کھول دیں۔ اتنے مختصر صفحات میں اتنا جامع اور بھرپور تجزیہ میری نظر سے اس سے پہلے نہیں گزرا تھا اور یہ جامعیت، گہرائی اور گیرائی چند دنوں کی بات نہیں، نصف صدی پر محیط ہے۔

ایک طویل خاموشی کے بعد حمید نسیم صاحب پھر اپنی دیرینہ روش پر آ گئے ہیں۔ ان کی سوانح "ناممکن کی جستجو" بھی یقیناً ذہنی مطالعہ ہو گی۔ میں اس کی تلاش میں ہوں۔ حضرت حمید نسیم کو اردو خواں طبقے سے متعارف کرانے میں جناب ضیا جالندھری نے جو مہتم بالشان کارنامہ انجام دیا ہے۔ وہ لائقِ صد تحسین و ستائش ہے۔ جناب حمید نسیم کا عصری اردو اور فارسی شاعری پر محاکمہ اور تجزیہ ان کے گہرے مطالعے اور فلسفیانہ کاوشوں کا ثمر ہے۔

اس گراں قدر مقالے کے علاوہ محمد ارشاد کا مضمون "طرزِ بیدل میں ریختہ"، "اندلوجی"، "جوش ملیح آبادی۔ انقلابی سوچ" تحریر کردہ فرمان فتحپوری، اعلیٰ پائے کے ادبی، فکری اور معاشرتی مقالے ہیں۔

افسانوں میں مجھے رفعت مرتضیٰ کا "آدم کی پسلی"، وقار بن الٰہی کا "شاہ خرچی"، احمد جاوید کا "گیرٹے مکوڑے"، نیلم احمد بشیر کا "مدد"، افتخار احمد کا "انکشاف" اور احمد ندیم قاسمی کا "اخبار نویس" بے حد پسند آئے۔ یہ سارے افسانے اپنے بیانیہ انداز، طرزِ نگارش اور فنکاری کے لحاظ سے اول درجے کے افسانوں میں شمار کئے جا سکتے ہیں۔ غزلیں اور نظمیں سب ہی اعلیٰ پائے کی ہیں۔

سید ابوالفتح سرمد جمالی (کراچی)

"حرفِ اول" میں جمہوریت کی حمایت میں جو گفتگو کی گئی ہے اس نے اشکبار کر دیا۔ المیہ تو یہ ہے کہ بعض حلقوں میں ہمارے عظیم رہنما حضرت قائد اعظم کے پُر نور چہرے کو مذموم بہتان تراشی سے آلودہ کرنے کی بھی کوشش ہو رہی ہے اور ان لوگوں کے قدو قامت کو بلند و بالا کرنے کے لئے خود ساختہ سیڑھیاں استعمال کی جا رہی ہیں جو اپنے ناپاک عزائم کی تکمیل کی خاطر قوم کو بزدل اور کم ہمت بنانے میں مصروف رہے۔ بھر برائے نام اسلام دوستی کی آڑ میں آمریت کو استحکام بخشنے میں شبانہ روز جتے رہے۔ آپ کے خیالات اُس روشنی کی طرف اشارہ کر رہے ہیں، جو جمہوریت کے نقوش واضح کرنے کی اہلیتیں رکھتی ہے۔

جناب محمد ارشاد کے مضامین "فنون" کے لئے "زیبِ داستان" کا درجہ رکھتے ہیں۔ اب کے اُن کا مضمون "طرزِ بیدل میں ریختہ"، متعدد مباحث کا پیش خیمہ بن سکتا ہے۔ میری ناقص رائے میں بیدل کے ریختہ کے سیاق و سباق میں اختر حسین جعفری کی شاعری کے تطبیقی عوامل پر گفتگو دور از کار ہو جاتی ہے۔ البتہ موضوع اختر حسین جعفری کی شاعری ٹھہرے اور ضمنی طور پر بیدل کے اثرات سے بحث چھیڑی جائے تو بات بن سکتی ہے۔ محمد ارشاد نے بعض ایسے محاکمے لگائے ہیں، جو غور طلب ہیں۔ محمد ارشاد کا قلم سب کے لئے محترم ہے۔ اس سے ایسے مفروضوں کی تشکیل نہیں ہونی چاہیے جو اُن کے معتقدین کو پریشان کر دیں۔ یہ بات بھی وضاحت طلب ہے کہ ریختہ کی ماہیتیں اور نظم کی اصلیتیں شروع سے متفرق ہیں یا بعد میں معرضِ اختلافات میں پڑ جاتی ہیں۔ اختر حسین جعفری کے سلسلے میں غالب کی شاعری کی تخفیف دل کو لگی نہیں۔ بہر نوع غالب بیدل کے اثرات سے الگ ہو کر بھی ایک خاص شعری امتیاز رکھتا ہے۔

ان دنوں اکثر شعراء دو پہلو بحر کے لوازم کا لحاظ نہیں رکھتے۔ نجیب احمد کی غزل کے دوسرے شعر کا مصرع دیکھئے:

تختِ فلک پہ مسندِ نجم بچھائی رات بھر

یہاں "مسندِ نجم" کے "نجم" کو دوسرے پہلو میں شامل کر دیا ہے حالانکہ یہ ترکیب یکجائی کا تقاضا رکھتی تھی۔[1] توصیف تبسم کی دوسری غزل کا آخری مصرع ملاحظہ ہو:

درد بھی زیادہ ہوتا تھا چوٹ بھی گہری لگتی تھی

---

[1] ہمارے خیال میں تو اب ان "ہتھکڑیوں" کو کھل جانا چاہیے۔ (ادارہ)

اس میں "زیادہ" زادہ کے وزن پر ہے۔

...ق فاروقی کی غزل جس کا مطلع ہے:

جب تیری نظر پہ شک ہوا ہے اور دل میں ملال آگیا ہے
مریم پہ نگاہ رُک گئی ہے سیتا کا خیال آگیا ہے

بحر اور معیار کے لحاظ سے انفرادیت کی حامل ہے۔ ہمارے جدید شعراء کے ہاں بحر کے یہ قرینے کمیاب ہیں۔ اس حوالے سے حمید نسیم کی غزل بھی قابلِ ستائش ہے۔ احمد ندیم قاسمی کی نظم "وہ جو اک چیز ہے" فکر کی دل نشیں گہرائی اور ذوقِ سلیم کی بے مثال پذیرائی رکھتی ہے۔ فن اور بیرکھ کے درست پیمانوں سے اسے پڑھا جائے تو معلوم ہوگا کہ اقبال کے بعد اس پیرائے میں نظم احمد ندیم قاسمی کے قلم سے نکل سکتی ہے۔ آصف ثاقب بائٹی کے استاد ہیں انھوں نے غزل میں سائنسی رویہ خوبصورتی سے آمیز کیا ہے۔ اس تناظر میں ان کا یہ مقطع دیکھا جائے۔

نمودِ نو کے لیے خاک ہم بنے ثاقب
زمیں میں مل کے بھی اپنی انا نہیں بھولے

امتیاز الحق امتیاز (ایبٹ آباد)

"فنون" شمارہ ۳۴ ملا۔ "حرفِ اول" میں آپ نے جس دردمندی سے اہلِ وطن کو متوجہ کیا ہے وہ لائقِ تحسین ہے۔ اب وقت آگیا ہے کہ قوم کو آمریت کے مہیب دور کے بھیانک اثرات سے خبردار کیا ہے تاکہ کوئی طالع آزما مہم جو اور ہوسِ اقتدار کے ہاتھوں کورمغزی کے شکار شخص کے ہاتھوں وطن سفاک آمریت کے جبڑوں میں نہ چلا جائے۔ اہلِ وطن کے لئے یہ بات لمحۂ فکریہ ہے۔

حمد و نعت کا گلدستہ قریۂ جاں کو معطر کر رہا ہے۔ تنویر سپرا کے لئے مخصوص گوشہ اس جری شاعر کو خراجِ تحسین پیش کرنے کا حق ادا کر رہا ہے۔ تنویر سپرا نے جبر و استبداد، ظلم و جور اور استحصال کے خلاف نہایت دیانتداری سے حریتِ فکر کا علم بلند رکھا اور تخلیقی جوہر کے ساتھ انصاف کیا۔ واقعہ یہ ہے کہ تنویر سپرا کی باتیں اُس کی پہچان ہیں۔ تنویر سپرا کی المناک موت نے حریتِ فکر کے متوالوں کو ناقابلِ اندمال صدمات سے دوچار کر دیا ہے۔

"جوش ملیح آبادی۔ انقلابی سوچ کے حوالے سے" نہایت مفید بلند پایہ عالمانہ مضمون ہے۔ لائق محقق نے جن صداقتوں کا اظہار کیا ہے ان سے کون انکار کر سکتا ہے ـــــ یہ ایک تلخ حقیقت ہے کہ وطنِ عزیز کو آمریت نے ہمیشہ تباہی کے دہانے تک پہنچا دیا۔ ڈیلا امبیڈے نے لکھا ہے:

"جس قوم کے تمام افراد آمریت کے جوئے کو محسوس نہیں کرتے وہ قوم آزادی کی کبھی مستحق نہیں ہوتی۔"

اس شمارے میں بھی شاعری کا حصہ بہت اہم اور بھرپور ہے۔ "گوشۂ خالد احمد" مؤثر ہے۔ حصۂ مقالات کے تمام مضامین بہت اہمیت کے حامل ہیں۔ افسانہ "دستاویزی ثبوت" میں نے بار بار پڑھا۔ "فنون" کا اعزاز و امتیاز یہ ہے کہ اس میں شامل تخلیقات کے معیار کے بارے میں دو رائیں نہیں ہو سکتیں۔ تمام تخلیقات اپنے اپنے مقامات پر نہایت وقیع اور جاندار ہیں۔

محسن بھوپالی صاحب تو اردو شاعری میں حریتِ فکر کے حوالے سے انتہائی معتبر اور مؤقر حوالہ ہیں۔ ان کا کلام فکر و نظر کو مہمیز کرتا ہے۔ اللہ تعالیٰ نے انھیں جبر و استبداد کو للکارنے اور آمریت کے خلاف حرفِ صداقت لکھنے کی جو توفیق ارزانی کی ہے اس میں ان کا کوئی شریک نہیں۔ اُن کا یہ کہنا درست ہے کہ حادثوں میں پلنے والے گردشِ حالات سے کبھی نہیں گھبراتے

شبنم شکیل کی شاعری کی خاص بات یہ ہے کہ وہ شعور اور لاشعور کے احساس و ادراک کے وسیلے سے آگہی کی اس منزل تک

فکر کی پرواز پر قادر ہیں کہ شعر روحانی کیفیت سے سرشار کر دیتے ہیں۔ ان کی شاعری میں جذبوں کی صداقت اور ضمیر کی للکار لائق توجہ ہے۔ مجید امجد پر شبنم رومانی کی نظم نے رُلا دیا۔

منصورہ احمد کی نظمیں "یہاں سے آسمان دیکھو اور "کوئی آواز دیتا ہے" بار بار پڑھنے کا تقاضا کرتی ہیں۔ ناہید قاسمی کی ظالم و مظلوم نظمیں" استبدادی قوتوں کے لئے تازیانۂ عبرت ہیں۔

آخر میں مجھے یہ کہنے کی اجازت دیں کہ اختلافات میں آپ نے ہمیشہ آزادی اظہار کی روایت برقرار رکھی ہے اس سلسلے میں مجلسِ ادارت کی خدمت میں ہدیۂ تبریک پیش کرنا ضروری ہے۔ دعا ہے کہ ہمارے اہلِ قلم درہم و دینار کے عوض اپنی تحریریں نہ تلنے دیں اور ہر حال میں حریتِ فکر کا علم بلند رکھیں۔ رانا غلام شبیر (جھنگ شہر)

"فنون" کا شمارہ نمبر ۴۳ کھولا سب سے پہلے "حرفِ اول" پر نظر پڑی۔ یہ بڑی پُرمغز تحریر تھی بعض لوگوں کو یہ تحریر غیر ادبی لگے گی اور انھیں ایک ادبی مجلہ میں دیکھ کر حیرت بھی ہوگی لیکن بنظرِ غائر دیکھا تو اس کا ادبی سرگرمیوں سے گہرا تعلق ہے کیونکہ جمہوری نظام کی غیر موجودگی میں آزادیِ تحریر و تقریر کا خیال عبث نظر آتا ہے۔ وہ لوگ جو ادب برائے زندگی کے قائل ہیں انھیں یہ تحریر خصوصی طور پر پسند آئے گی ان کے خیال کے مطابق جمہوری دور ہی میں انسان صحیح انداز سے سوچ سکتا ہے اور ادیب بلاجھجک اپنی سوچ کے نتائج کو ضابطۂ تحریر میں لاسکتا ہے۔ چنانچہ اگر آپ نے اپنے وطن عزیز کو بانیِ پاکستان کے نظریات کے مطابق پھلتا پھولتا دیکھنے کی تمنا کی ہے تو آپ نے نیک عمل کیا ہے۔

اس کے بعد اس شمارے میں حصۂ مقالات پر نظر گئی تو نگاہوں کے سامنے پھول کھلنے لگے۔ وہاں کا منظر خوشگوار تھا بعض مقالات خصوصی توجہ کے محتاج تھے۔ جیسے حمید نسیم کا "گفتند کہ برہم زن" ہے۔ اس مضمون نے میرے ذہن میں پیدا ہونے والی دھند کو صاف کر دیا ہے۔ اگر ہمارے شعرائے کرام ان باتوں پر عمل کرنا شروع کر دیں جن کی نشاندہی اس مقالے میں کی گئی ہے تو اس کی نگارشات میں پہلے سے زیادہ نکھار پیدا ہو سکتا ہے۔ اس طرح شعرا کی مجلسی، سماجی اور معاشرتی زندگی میں وقار بھی پیدا ہوگا۔ مثلاً اگر یہ موسیقاروں کا خیال اپنے دل سے نکال دیں کہ ان کی آواز کا جادو ان کے کلام کے تاثر کو دوچند کر دیتا ہے تو ان کے اندر خود اعتمادی آئے گی جس سے ان کی شخصیت میں جاذبیت پیدا ہوگی۔ حمید نسیم کے کچھ جملے ایسے ہیں جن میں خیال کی پاکیزگی، زبان کی چاشنی اور فکری گہرائی دیدنی ہے۔ مثلاً سورہ نسا کی آیت ۵۹ کی تفسیر کہ قوت اور توپ اور بندوق کے بل پر اقتدار غصب کرنے والا شخص اولوالامر نہیں۔ وہ محلے کے اس بُرے شخص سے بھی بُرا ہے جو چاقو دکھا کر لوگوں سے غنڈہ ٹیکس وصول کرتا ہے۔ یہ حمید نسیم کی جرأت و ہمت ہے کہ اس نے ایک صحیح بات صحیح وقت پر کی ہے جو آئندہ بھی کارآمد ہو سکے گی۔ آگے چل کر کہا ہے کہ زندہ رہنے والی شاعری کے لئے علم ضروری ہوتا ہے۔ یہ بات ہمارے اُن شعرا کو بطور خاص نوٹ کر لینی چاہیے جو اپنی موزونیِ طبع سے چند ایسی غزلیں کہنے میں کامیاب رہتے ہیں جن پر انھیں مشاعروں میں بہت داد ملتی ہے۔ ان کے خیال کے مطابق "فیض احمد فیض اچھے شاعر تھے بڑے شاعر نہیں تھے"۔ اس پر مجھے سعد اللہ کلیم کا مقالہ یاد آ گیا جو انھوں نے حسرت موہانی پر لکھا تھا۔ اس مقالے کا عنوان تھا "ایک بڑا آدمی چھوٹا شاعر" اس عنوان میں صداقت کی روشنی دیکھی جا سکتی ہے۔

حمید نسیم کی یہ بات بھی خصوصی توجہ چاہتی ہے۔ آج کل جو حالات سے آنکھیں بند کر کے دروں بینی یا دور دیس کی کتھائیں بیان کرنے کی رسم چل نکلی ہے اور جسے بالعموم میراجی اور فراق گورکھپوری کی فکری اور تخلیقی روایت کے پیچھے رکھ کر تحفظ دیا جاتا ہے وہ کسی پاکستانی اندھے کاہن کے کام تو آسکتی ہے لیکن وہ کسی اعتبار سے سچا ادب نہیں کہ سچا ادب اپنی فکری اور معاشرتی حقیقت سے لاتعلق اور الگ تھلگ

رہ کر تخلیق نہیں کیا جا سکتا۔ سچا ادب نعرہ نہیں ہوتا۔ ادب ہوتا ہے مگر سب۔ برائیوں کے ارد گرد ہونے والے جور و ستم کی عیاریوں اور بد قماشیوں کی نشاندہی کرتا ہے۔

فرمان فتح پوری نے "جوش ملیح آبادی۔ انقلابی سوچ کے حوالے سے"۔ نہایت محنت سے لکھا ہے۔ جوش ملیح آبادی اردو شاعری کا اتنا بلند نام ہے کہ متعصب لوگوں کی مخالفت ان کا کچھ نہیں بگاڑ سکی۔ جوش ملیح آبادی کی ذات انسانی عیوب سے پاک نہیں تھی لیکن ان کی صداقت پسندی پر کوئی حرف نہیں رکھا جا سکتا۔ اس بات نے ان کے بہت سے مخالفین کو جنم دیا ہے۔ جوش ملیح آبادی نے بعض لوگوں کے ممدوحین کے وجود پر چڑھے ہوئے رنگوں کو اتارا تو ان کے مقلدین ان بتوں کی انسانی خصوصیات کو دیکھ کر تلملا اٹھے اور لگے جوش کی ذات میں سے کیڑے نکالنے اور یہ سلسلہ اب تک جاری ہے۔ جوش ملیح آبادی نے اپنی زندگی میں بعض مواقع پر جرأت اظہار و کردار کا مظاہرہ کیا ہے اس کے لئے انسان کو اپنی ہتھیلی پر اپنے سر کا چراغ لے کر چلنا پڑتا ہے جس کے لئے "سرمد" کا جنوں درکار ہے۔ جوش ملیح آبادی نے ریاست حیدر آباد میں رہ کر بھی نظام کا قصیدہ نہ لکھا اور سزا کے طور پر دربدری اختیار کی۔ جب انگریز کی سلطنت پر سے سورج بھی غروب نہ ہوتا تھا اس کی مخالفت میں ہر ہٹلر کی حمایت میں نظمیں لکھیں۔ ایوب خاں کے دور میں مارشل لا کی مخالفت کی۔ اس کے باوجود جوش ملیح آبادی بُرا آدمی ہے تو بُرائی کے معانی ہی اور ہوں گے ہم تو اس بُرائی کو بڑائی خیال کرتے ہیں۔

ڈاکٹر فرمان فتح پوری کی یہ بات صد فی صد درست ہے کہ جو طبعاً رومانی ہوتا ہے وہی انقلابی سوچ کا حامل ہوتا ہے۔

جوش ملیح آبادی پر جو الزامات لگائے گئے ویسے ہی الزامات کا نشانہ احمد فراز بھی بنا ہے۔ مسعود مفتی نے ان الزامات کے پیش نظر خوب لکھا ہے کہ "یہ محض چند مثالیں ہیں۔ لیکن ان الزامات کی حقیقت جاننے کے لئے مفصل ریسرچ کی ضرورت ہے بلکہ میں تو ایک قدم آگے جا کر عرض کروں گا کہ اردو ادب میں الزام تراشی کا فیشن اتنا زیادہ ہے کہ اس موضوع پر اگر نقاد و محقق محنت سے ریسرچ کریں تو کئی درجن ادیبوں کے چہرے معصوم نظر آ سکتے ہیں اور کم و بیش درجن بھر لوگوں کو پی ایچ۔ ڈی ملنے کے امکانات ہیں۔ مسعود مفتی کا مضمون احمد فراز کی شخصیت اور ان کے فن کے کئی درخشاں پہلوؤں کو پیش کرتا ہے۔ اس میں کئی ایسی چیزیں بھی آ گئی ہیں جن پر غور اور فیصلے کرنا حکومتوں کا کام ہے۔ مثلاً مساجد میں بلا اجازت لاؤڈ سپیکر کا بے تحاشا استعمال وغیرہ۔ ہم لوگوں کو ان کے حل پر مکمل اتفاق رائے قائم کر لینا چاہیئے اور مذہب کے تقدس کو پامال ہو جانے سے بچا لینا چاہیئے۔ ورنہ پاکستانی قوم کھلونا بنی رہے گی اور ذہانت قتل ہوتی رہے گی۔

یوسف حسن نے "اقبال اور جاگیرداری" میں کوئی نئی بات تو نہیں کی، البتہ اس کی اہمیت اُس وقت تک رہے گی جب تک ہمارے ملک سے جاگیرداری کا خاتمہ نہیں ہو جاتا۔ اس مقالے میں جو باتیں کی گئی ہیں یا علامہ اقبال نے جاگیردارانہ نظام کو جس طرح رگیدا ہے مذہبی طبقے علامہ اقبال کو حکیم الامت ماننے کے باوجود ان کی باتوں سے اتفاق نہیں کرتے۔ وہ جاگیرداری کو حقیقی اسلام خیال کرتے ہیں۔ اس ملک میں اسلامی نظام کے حق میں جتنا پروپیگنڈا ہوا ہے وہ اگر کسی غیر مسلم ملک میں ہوتا تو وہاں کی آدھی آبادی مسلمان ہو جاتی۔ علامہ نے کتنے اچھے انداز سے جاگیرداری کی مذمت کی ہے:

تا تہہ و بالا نہ گردد ایں نظام　　　　دانش و تہذیب و دیں سودائے خام

ہم کتنے بھولپن سے کہہ دیتے ہیں کہ آخر اقبال بھی انسان ہی تھا، وہ بھی غلطی کر سکتا ہے، وہ کوئی پیغمبر تو نہیں تھا کہ اس کی آواز ہمارے لئے حرف آخر بن سکتی ——— برائی کی حمایت کا یہ عجیب طریقہ ہے!

افسانوں میں وقار بن الٰہی نے "آدم کی پسلی" میں اپنے کہنہ مشق افسانہ نگار ہونے کا مکمل ثبوت دیا ہے۔ یہ افسانہ ہماری

بیوروکریسی پر طنز ہے۔ "خوف" میں گلزار نے ایک نفسیاتی مسئلے کو اس طرح بیان کیا ہے کہ کہانی واقعہ کی حدود سے نکل کر افسانہ بن گئی ہے۔ احمد جاوید نے "کیڑے مکوڑے" کی علامت کو خوب برتا ہے۔ موقع و محل کے مطابق اس کا مفہوم بدل جاتا ہے، اس لئے افسانہ لذیذ بن گیا ہے۔ قاری کے ذہن پر شبنم کی پھوار برسنے لگتی ہے۔ وہ دکھ میں سکھ اور سکھ میں دکھ سے دوچار ہوتا ہے۔ اصل میں یہ قصہ آخر میں اپنے عروج پر پہنچتا ہے جب کیڑے مکوڑے ہزار پایہ کی طرح قاری کے ضمیر میں اپنی ٹانگیں پیوست کر دیتے ہیں۔ "سمجھوتا" میں مسرت لغاری نے نصیرہ بیگم کا سراپا بڑی عمدگی سے بیان کیا ہے۔ اس افسانے میں زبان و بیان کی خوبیاں بھی ہیں۔ کئی جملے تخلیق کاری کا بہترین نمونہ ہیں مصنف نے طبقۂ نسواں کے ایک کمزور پہلو کو ہاتھ میں لے کر توانا کہانی لکھنے میں کامیابی حاصل کی ہے۔ نیلوفر اقبال نے "دستاویزی ثبوت" میں عورت کی مکاری کے گرد ایک قابلِ مطالعہ افسانہ لکھا ہے۔ اس میں تحیر کی کیفیت موجود ہے۔ اس میں کمال یہ دکھایا گیا ہے کہ حنان کے پاس دستاویزی ثبوت ہونے کے باوجود کوئی ثبوت نہیں ہے جس پر اس کی بیوی گولڈی شیر بن جاتی ہے۔ اس بات نے افسانے میں جان ڈال دی ہے۔ "ایبل اور وہ" عطیہ سید کی قلمکاری کا نتیجہ ہے۔ افسانے کے درمیان میں اس نے لکھا ہے کہ یہ بڑا مصنف اور ادیب اپنی حیات سے کئی آفاقی سچائیاں پھوٹتے دیکھتا ہے۔ اس افسانے کا بھی یہی حال ہے۔ البتہ وہ اپنی فلسفیانہ باتوں سے افسانے کو طویل بنانے کی کوشش کرتی ہے تو افسانے کی رفتار سست پڑ جاتی ہے۔ ویسے افسانہ جاندار ہے۔ اس کا مطالعہ قاری کو علم کی سرمستی سے سرشار کر دیتا ہے۔ اس کے جملوں کے حسن سے لطف اندوز ہوتا ہے۔ مصنفہ نے جس موڑ پر لے جا کر افسانے کو ختم کیا ہے اس نے افسانے کے مجموعی تاثر کو بڑھا دیا ہے۔ نیلم احمد بشیر نے ایک معمولی سے واقعہ سے ایک بلیغ افسانہ تراش لیا ہے۔ ارجمند شاہین کا "بجھا ہوا ایش ٹرے" ایک بالکل ہی انوکھے موضوع پر ہے۔ بجھے ہوئے ٹرے کا علامتی استعمال اپنے اندر ایک نئی معنویت رکھتا ہے۔ افسانے کا اختتام فنکارانہ انداز سے ہوا ہے اور پھر یہ تحریر معنویت سے بھرپور نظر آنے لگی ہے۔ "آواز" میں کہانی پن تو نہیں البتہ اس میں فلسفیانہ باتیں ضرور ہیں جن کا اپنا بھی ایک لطف ہے۔ "اڑن طشتری" ایک خوبصورت تشبیہ ہے۔ اڑن طشتری کے عنوان سے جو تشبیہی حسن پیدا ہوا ہے وہ قابلِ داد ہے۔

آخر میں افسانہ "اخبار نویس" کا ذکر ضروری ہے۔ مصنف کی زندگی خود بھی صحافت کے خارزار میں گزری ہے اس لئے وہ اس پیشے کے رموز و اسرار اور کٹھنائیوں سے بخوبی واقف ہیں۔ ایک سچے اور باضمیر اخبار نویس کے لئے کن کن کٹھن مراحل سے گزرنا پڑتا ہے اور اسے قلم کی عصمت کو بچانے کے لئے کیا کیا دکھ جھیلنے پڑتے ہیں، ان سبھی امور نے مل کر کامیاب افسانہ تخلیق کیا ہے۔

خیرالدین انصاری (جھنگ)

یوسف حسن کا فکر انگیز مقالہ "اقبال اور جاگیرداری" اس حوالے سے بہت اہم ہے کہ انھوں نے بڑی جرأت اور صاف گوئی سے کام لیتے ہوئے نفیٔ ملکیت سے متعلق اقبال کے تصورات کو پیش کیا ہے۔ اقبال کے تصور نفیٔ ملکیت کی بنیاد قرآن حکیم کی تعلیمات پر ہے اور قرآن میں کہیں بھی ذاتی ملکیت کی حوصلہ افزائی نہیں کی گئی بلکہ زمین کو بھی ہوا، پانی اور سورج کی روشنی کی طرح عام فائدے کے لئے کھلا رکھا گیا ہے۔ قرآن کی رو سے یہ مسئلہ بہت واضح ہے لیکن لوگوں کے نجی مفادات نے اس میں خاصی پیچیدگیاں پیدا کر دی ہیں اسی لئے ہم دیکھتے ہیں کہ بہت سے اقبال شناس، اقبال کے تصورِ ملکیت کو اصلی رنگ میں پیش کرنے سے گھبراتے ہیں۔ یوسف حسن کا یہ مقالہ اس لئے بھی لائقِ صد تحسین ہے کہ انھوں نے اقبال کی اصل فکر میں روایتی تصورِ ملکیت کی کوئی آمیزش نہیں ہونے دی۔ صاحبِ مقالہ اگر اس موضوع سے متعلق چند دوسرے ناگزیر مباحث کو بھی شامل کر لیتے تو مقالے کی اہمیت دوچند ہو جاتی۔ مثلاً اقبال جب سرمایہ داری اور اشتراکی نظام ہائے زندگی کی نفی کرنے کے ساتھ ساتھ ذاتی ملکیت کو بھی رد کر دیتے ہیں تو پھر ان کی

فکر اشتراکی فلسفۂ حیات سے کن اصولوں پر منفرد ہو جاتی ہے؟ یہ بڑا اہم نکتہ تھا اگر اس پر بھی وہ کلام اقبال سے کچھ کشید کرتا تو قاری کو بہت سے سوالوں کے جواب مل جاتے۔

اختر حسین جعفری پر محمد ارشاد کا پُر مغز مقالہ "طرزِ بیدل میں ریختہ" جس دقتِ نظر سے ضبطِ تحریر میں لایا گیا اُس کی داد نہ دینا سراسر زیادتی ہو گی۔ کلام بیدل سے جعفری صاحب کے اسلوب کو اخذ کرنا کوئی معمولی کارنامہ نہیں اور بلاشبہ یہ کام محمد ارشاد جیسے دقیقہ شناس نقاد ہی انجام دے سکتے ہیں۔ اس موضوع پر اُن کی عالمانہ گرفت نے خاصا متاثر کیا۔ فارسی شعراء کی تاریخ کے حوالے سے اُنھوں نے جن "تین سلسلوں" پر اپنی علمی، تحقیقی اور تجزیاتی بصیرت کا اظہار کیا ہے اُس سے اندازہ ہوتا ہے کہ وہ اپنے موضوع کو بیان کرنے کے لئے کتنی دور تک جا سکتے ہیں۔ جعفری صاحب کی تفہیم میں یہ مقالہ کلیدی حیثیت کا حامل ہے۔

حمید نسیم صاحب کا خود نوشت دیباچہ "گفتمد کہ برہم زن" ایک پُر اثر قلم سے نکلی ہوئی تحریر تھی۔ ادارہ "فنون" اس بات پر مبارکباد کا مستحق ہے کہ اُس نے ایسی نابغۂ روزگار شخصیت کو از سرِ نو دریافت کیا۔ اُن کے تجربات اور مشاہدات سے ہم لوگ اب بھی روشنی حاصل کر سکتے ہیں۔ امید ہے کہ "فنون" کے آئندہ شماروں میں اُن کے کلام پر بھی زیادہ توجہ دی جائے گی۔

محمد کاظم کا نیا سلسلۂ مضامین "روزن در" ایک مفید اور کارآمد سلسلہ ہے۔ شمارہ ۱۲۲ میں شامل تمام مضامین بڑے بھرپور تھے۔ کتابوں کے مطالعہ سے متعلق سینکا کا خط، مولانا محمد علی جوہر کے انتقال پر احمد شوقی اور علامہ اقبال کے لکھے گئے مرثیوں کا احوال اور شاہ مغول کے ساتھ ایک مکالمہ یقیناً قاری کی معلومات میں اضافے کا باعث ہیں۔ امید ہے کہ محمد کاظم "نزار قبانی" کی وہ عشقیہ شاعری بھی کسی شمارے میں نذرِ قارئین کریں گے جو سردست اُنھوں نے فقیہہ شہر کے خوف سے کہیں چھپا رکھی ہے۔ کہیں کاظم صاحب اس کلیے پر تو عمل نہیں کر رہے:

لاتے ہیں سرورِ اول دیتے ہیں شراب آخر

میرا دل تو بہت چاہتا ہے کہ رشید ملک صاحب کے مقالات پر کچھ لکھوں لیکن ان کے موضوعات کی علمی اور تحقیقی سطح اس قدر بلند ہوتی ہے کہ مجھ جیسا عام قاری صرف اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینے پر ہی اکتفا کر سکتا ہے۔ انڈالوجی کے متفرق موضوعات پر اُن کے تمام مقالات کو میں نے بڑی توجہ سے پڑھا ہے لیکن ہزار کوشش کے باوجود ان پر اظہارِ خیال نہ کر سکا۔ یوسف حسن کی ہمت کی داد دیتا ہوں کہ انھوں نے "اختلافات" میں بھگتی تحریک کے حوالے سے رشید ملک سے مکالمے کی ایک صورت تو نکالی ہے۔

نیلوفر اقبال ایک پختہ کار افسانہ نویس ہیں۔ ان کے افسانے تکنیک اور موضوع کے اعتبار سے ایک منفرد شناخت رکھتے ہیں۔ اُن کا حالیہ افسانہ "دستاویزی ثبوت" موضوع کی ندرت کی وجہ سے بڑی اہمیت کا حامل ہے۔ "حنان صاحب" جیسے کردار گو کہ ہمارے معاشرے میں بہت کم ہیں تاہم ان کی عکاسی بہت ضروری ہے۔ افسانے کا اسلوب نہایت واضح اور حشو و زوائد سے پاک ہے۔ اسلوب کی اسی اضافی خوبی نے کہانی پن کے تاثر کو پوری طرح ابھرنے میں مدد دی ہے۔ افسانہ نگار کا ایک انوکھا کمال یہ بھی ہے کہ اُس نے اپنے کردار "حنان صاحب" کے لاشعوری خیالات کی تصدیق خود کرنے کی بجائے قاری سے کروائی ہے اور میں سمجھتا ہوں کہ یہ اُن کی فنی مہارت اور تخلیقی قوت کی روشن دلیل ہے۔ ایک افسانہ نگار کا یہ بہت بڑا کمال ہوا کرتا ہے کہ وہ اپنے تخلیقی سفر میں قاری کو بھی ہمراہ لے کر چلے۔

عطیہ سید کا افسانہ "ایبل اور وہ" پُر اسرار ذہنی کیفیات کا ایک ایسا منظر ہے جو قاری کو دیر تک اپنی سحر انگیز فضا میں مسحور رکھتا ہے۔ اس افسانے میں عطیہ سید نے داخلی منظر نامے کی ہیئتی تعمیر کے تمام لوازم کو جس کمال مہارت سے برتا ہے اُس سے جہاں جدید افسانے

کے بدلتے ہوئے رجحانات پر روشنی پڑتی ہے۔ وہاں افسانہ نگار کی اس خوبی کا بھی انکشاف ہوتا ہے کہ وہ افسانے اور زندگی کے باہمی تعلق کو اپنے دل کی گہرائیوں سے تسلیم کرتی ہیں۔ افسانے کی فنی و فکری سطح خاصی بلند ہے۔ یہی وجہ ہے کہ صرف ایک نشست میں اس کے فنی اسرار اور معنوی ابعاد پر بات نہیں ہو سکتی — کیونکہ یہ افسانہ جس تفصیلی بحث کا متقاضی ہے "اختلافات" میں شاید اس کی گنجائش نہ نکل سکے۔

ارجمند شاہین نے اپنے افسانے "بجھا ہوا ایش ٹرے" میں جس نفسیاتی کیفیت کو پیش کیا ہے اُسے پڑھ کر اندازہ ہوتا ہے کہ بعض اوقات وافر جذبۂ محبت بھی بہت سی ذہنی الجھنوں کا باعث بن سکتا ہے۔ افسانے کی ابتدا تجریدی نوعیت کی تھی لیکن اس کے اختتام نے کہانی کے تمام بے نام اشاروں میں معنویت بھر دی ہے۔

گلزار کا افسانہ "خوف" موضوع کے اعتبار سے بہت پُرکشش تھا لیکن اسلوب میں جدت کاری نہیں تھی۔ رفعت مرتضیٰ کا افسانہ "آدم کی پسلی" ایک مبہم احساس پر مبنی تھا۔ قاری یہ افسانہ پڑھ کر خود بھی "نصرت" کی طرح ایک عجیب سی الجھن میں گرفتار ہو جاتا ہے —

احمد ندیم قاسمی کا افسانہ "اخبار نویس" معاشرے کے ایک ایسے خوددار اور با اصول صحافی کی کہانی ہے جو اپنی اصول پسندی کے آگے بڑی سے بڑی پیش کش کو بھی ٹھکرا دینے کی ہمت رکھتا ہے۔ افسانہ نگار کی خوبی یہ ہے کہ وہ "عباس احمد" کو ایک متوازن کردار کے روپ میں سامنے لایا ہے یعنی بیروزگاری کے باوجود وہ کسی ذہنی یا نفسیاتی الجھن کا شکار نہیں ہوا۔ مادیت کے اس دور میں عباس احمد کا کردار بظاہر کچھ زیادہ افسانوی سا لگتا ہے لیکن قاری کو جلد ہی اس حقیقت سے آگاہی حاصل ہو جاتی ہے کہ اگر انسان کی مثبت صفات پر معاشرے کے مصنوعی اثرات مرتب نہ ہو چکے ہوں تو اُس کی نشو و نما ہر قسم کے ماحول میں بخوبی ہو سکتی ہے اور انسان کی یہی ارفع صفات نازک سے نازک موقع پر بھی احسن نتائج مہیا کر جاتی ہیں۔ یہ کہانی فنی تکمیل کا ایک عمدہ نمونہ ہے۔ اس کی تکنیک اور صناعت بھی قابلِ داد ہے۔ افسانہ نگار نے متوازی واقعات اور مناظر کے ذریعے جس تاثر کو ابھارنے کی کوشش کی ہے، اس میں وہ پوری طرح کامیاب رہا ہے۔

"اخبار نویس" کو پڑھ کر اس رجحان کا بھی اندازہ ہوتا ہے کہ اب نئی کہانی تجریدیت اور مبہم علامت نگاری کی بجائے زندگی کے واضح تصورِ حقیقت کو زیادہ پسند کرتی ہے۔ جدید افسانے کی تنقید میں ان دنوں ایک سوال یہ بھی موضوعِ بحث بنا ہوا ہے کہ جدید دور میں جبکہ تمام پرانی اقدار کو نظر انداز کیا جا رہا ہے۔ نیز انسان کی اپنی فردیت آہستہ آہستہ اندھیروں میں گم ہوتی جا رہی ہے، ان حالات میں کیا افسانوں میں کرداریت کے لئے کوئی جگہ باقی رہ جائے گی؟ — "اخبار نویس" میں اس سوال کا شافی جواب موجود ہے۔

لالہ رخ صاحبہ نے "ادب میں جذبے کی کارفرمائی" پر جن متوازن آراء کا اظہار کیا ہے اُن کو پڑھنے کے بعد قاری کے ذہن میں یہ بات پھر تازہ ہو جاتی ہے کہ ادب محض خشک اور سنجیدہ افکار کو ہی تخلیقی تجربات سے نہیں گزارتا بلکہ زندگی سے بھرپور اور توانا جذبات کو بھی اپنی اقلیم میں شامل سمجھتا ہے۔ یہ ایک جامع اور خوبصورت مقالہ تھا۔ ایک ایک سطر کو کافی سوچ بچار کے بعد صفحۂ قرطاس پر اتارا گیا ہے۔ مقالہ کا موضوع گو نیا نہیں لیکن مقالہ نگار کے تخلیقی اسلوب نے اس موضوع میں بھی ایک خاص نوعیت کی جدت پیدا کر دی تھی۔ جدت کی اسی تازہ کاری نے مقالہ کو فن پارہ بنا دیا ہے۔ اتنا عمدہ مقالہ لکھنے پر اُن کو میری طرف سے دلی مبارکباد۔

"غالب کے فارسی کلام کی شرح" پر پروفیسر تورہ اہیلہ صاحب کے علمی اضافے ایک نیک شگون ہے۔ انھوں نے اس مسئلہ پر قلم اٹھا کر واقعی بڑی جرأت اور دانش کا ثبوت دیا ہے۔ ادب میں اندھی عقیدت مندی کی حوصلہ شکنی ضرور ہونی چاہیئے کیونکہ یہ رویے نہ صرف ادبی اقدار کو بلکہ سچائی کو بھی زندہ درگور کر دیتے ہیں۔ امید کی جاتی ہے کہ اس شرح کا نیا ایڈیشن گذشتہ غلطیوں کی تلافی کرے گا۔

عامر سہیل (ایبٹ آباد - ہزارہ)

رضا ہمدانی مرحوم

۱۹۹۴ء کی ایک انتہائی اداس کر دینے والی خبر محترم اور بزرگ ادیب رضا ہمدانی کا ہم سے بچھڑ جانا ہے:

شہر کے کوچہ و بازار میں سناٹا ہے
آج کیا سانحہ گزرا ہے، خبر تو لاؤ!

مرحوم رضا ہمدانی ایک متحرک شخصیت، مشرقی آداب و اقدار کا ایک دلکش نمونہ اور ایک آئیڈیل فنکار تھے۔ ان میں محبت کرنے کی بے پناہ صلاحیت تھی۔ وہ خلوص، شفقت، محنت، ایثار اور رواداری کا پیکر تھے۔ زندگی بھر انھوں نے شہد کی مکھی کی طرح مٹھاس اکٹھی کی اور دنیا والوں میں محبت کا رسیلا امرت بانٹتے رہے۔ وہ فنکار کے منصب سے واقف اور اسے نبھانا جانتے تھے۔

سید فارغ بخاری اور رضا ہمدانی نے مل کر سرحد میں ادب و ثقافت کے لیے جتنا کام کیا ہے وہ کئی انجمنوں کے مشترکہ کام پر بھاری ہے۔ تخلیقی ادب سے لے کر فوک لور تک اور لسانیات سے لے کر تنقید و تحقیق تک اُن کا کام علم و فن کے کئی منطقوں پر محیط ہے۔ صوبہ سرحد کی شعری، ادبی اور تہذیبی تاریخ کی بازیافت میں جناب رضا مرحوم اور جناب فارغ کا حصہ ان دونوں قدآور ہستیوں کو امر کر دینے کے لیے کافی ہے۔ انھوں نے اردو، پشتو اور ہندکو ادب میں اپنے لیے وہ مقام پیدا کیا ہے جس کی بہت سے صاحبانِ علم و ہنر صرف تمنا ہی کر سکتے ہیں۔ ہم ایسے سینکڑوں شاعر و ادیب اُن سے فیضان حاصل کر چکے ہیں اور مستقبل کے ناقدین و محققین کا کام بہت آسان کر دیا ہے۔ صوبہ سرحد میں اردو ادب جب بھی اپنے علمی و ادبی سرمائے پر ناز کرے گا تو اسے رضا ہمدانی مرحوم اور ایوب صابر مرحوم جیسے لوگ ضرور یاد آئیں گے۔ جہاں تک میری معلومات کا تعلق ہے، رضا ہمدانی مرحوم کی شخصیت اور فن پر قابلِ قدر کام صرف کوہاٹ کے محبت خان بنگش نے کیا ہے۔ کاش! اس کام کو آگے بڑھایا جائے کہ رضا ہمدانی کے بارے میں جاننا روشنی کو پھیلانے کے مترادف ہے۔

شجاعت علی راہی (جدہ)

"فنون" نمبر ۴۱

"فنون" (۴۱) حسبِ روایت پوری آب و تاب کے ساتھ جلوہ گر ہوا۔ حصۂ نعت میں ریاض حسین چودھری کے کلام نے شاد کیا۔ غلام حسین ساجد کی نعت کا یہ مصرعہ:

زمانے کے لئے تصویرِ رب ہے ذاتِ احمدؐ

کیا شرک کی حدوں میں داخل نہیں ہو رہا؟

محمد کاظم عالم آدمی ہیں۔ ان کے مضامین بلاشبہ فکر انگیز اور معلومات افزا ہوتے ہیں۔ زیرِ نظر شمارہ میں مولانا عبدالماجد دریابادی کے متعلق مقالہ اُن کی وسعتِ نظری اور ناقدانہ بصیرت کا غماز ہے۔

بورخیس کی حیات و افکار پر ڈاکٹر مرزا حامد بیگ کا مضمون حوالے کی چیز ہے۔ چونکہ یہ ایک حوالہ جاتی مضمون ہے اور "بورخیس فہمی" کے لیے اہم بھی اس لیے ضروری ہے کہ اس میں کتابت کی دو فاش غلطیوں کی تصحیح کر لی جائے۔

۱۔ مضمون کے آغاز میں ڈاکٹر صاحب نے بورخیس کا سنِ وصال ۱۹۸۸ء دیا ہے۔ آگے چل کر فرماتے ہیں:

"یہاں تک کہ ۱۹۸۶ء میں اس نے اپنی بصارت سے محروم آنکھیں ہمیشہ کے لیے موند لیں۔" (صفحہ ۴۱)

۲۔ "۱۹۶۳ء میں بورخیس اپنے گھر والوں کے ہمراہ ایک بار پھر یورپ کی طرف نکل گیا۔" (صفحہ ۳۹)

یہاں ۱۹۶۳ء کی جگہ ۱۹۲۳ء ہونا چاہیے[1]

پرتو روہیلہ نے صوفی تبسم کی شرح غالب پر اچھی گرفت کی ہے۔ مگر کہیں کہیں بات اُن سے بھی نہیں بن سکی۔

حصہ غزل میں رضی اختر شوق کی غزل خاصے کی چیز ہے۔ خالد اقبال یاسر نے اپنے منفرد اسلوب اور مخصوص لفظیات کے ساتھ اچھی غزلیں دی ہیں۔ طلعت نورین عروبہ کا یہ شعر بہت پسند آیا:

ماممتا پھول سی کھِل اُٹھتی ہے اُس روز کہ جب ۔۔۔ اُس کا بچہ اسے پہلی دفعہ "ماں" بولتا ہے

حمید نسیم کی غزل کا مصرعہ:

نہ غلط جان اُسے پُر کینہ و پُر فن تو نہیں[2]

اور

شاہین کی غزل کا مصرعہ ۔۔۔ زردی ہیں اور دیوار شکستہ[2]

عروض کے حوالے سے محل نظر ہیں۔

ارشد محمود ناشاد (اٹک)

"فنون" نمبر ۴۰-۴۱

"فنون" شمارہ جنوری - اپریل ۱۹۹۴ء کے چیدہ چیدہ مندرجات پر کچھ تاثرات پیش ہیں۔ اس شمارے میں ترقی پسندی دو مضامین کا موضوع بنی ہے۔ اول دیوندر اسّر کے مضمون میں اور دوم شاہین مفتی کے مضمون میں۔ کیونکہ حضرات کے مقابلے میں خواتین کا حق فائق ہے اس لیے آئیے پہلے شاہین مفتی کے مضمون کی طرف، جس کا عنوان ہے "ترقی پسند تحریک - مذہب، معیشت، محبت"۔ مضمون نگار نے اس موضوع سے متعلق جو معلومات ہمیں پہنچائی ہیں ان میں سے چند پر مجھے اعتراض ہے۔

اقتباس ہے۔ وہ (ترقی پسند ادب کا نظریہ، خلاق) اخلاق کو مجرّد مظہر تصور کرنے کی بجائے سماجی نظام کی بحالی کا ایک ذریعہ سمجھتا ہے"۔ سماجی نظام کی بحالی سے ان کا کیا مطلب ہے؟ علی سردار جعفری کا جو کوٹیشن دیا گیا ہے اس کی عبارت علی سردار جعفری کی اپنی نہیں ہے۔

پیرس میں جمع ہونے والے ادیبوں کی فہرست میں ایک نام زاید ہے۔

"زیادہ تر" کا جا و بے جا استعمال بہت کھلتا ہے۔ نیز "انجمن ترقی پسند مصنفین" کا انگریزی نام "پروگریسو رائٹرز" نہیں تھا۔ اور "آخر میں" اُن کا جاری کردہ ادب زیادہ تر فرانس کے لارنس اور فلابیر کی جذباتی تحریروں سے متاثر تھا ۔۔۔ جبکہ لارنس کا تعلق فرانس سے نہیں تھا۔

شاہین مفتی کا فرض ہے کہ وہ ان واقعاتی مغالطوں کو خود ہی دور کریں تو اچھا ہے۔

دیوندر اسّر نے اپنے مضمون "نظریہ او نہ فریب نظر" میں ادب اور آئیڈیالوجی کے مسئلوں پر عالمانہ فکری بحث کی ہے اور بعض نئے نکات سامنے رکھے ہیں۔ انھوں نے محمد حسن عسکری اور گوپی چند نارنگ پر ٹھیک گرفت کی ہے۔ آئیڈیالوجی اور ادب میں آئیڈیالوجی کے کردار پر بہت کچھ لکھا جانے کے باوجود اس موضوع پر لکھے جانے کی ابھی بڑی گنجائش ہے۔ آئیڈیالوجی کی نفی یا اُس کے خاتمے کے نقطۂ نظر کے پھیلاؤ کی تاریخ بھی دلچسپ ہے۔ یہ نقطۂ نظر ابتداً فرانسیسی صحافی ریمنڈ ایرن نے ۱۹۵۵ء میں اپنے پمفلٹ بعنوان

---

[1] کتابت کی اس غلطی کے لئے ادارہ معذرت خواہ ہے۔

[2] معلوم ہوتا ہے مراسلہ نگار ان مصرعوں کو ٹھیک سے پڑھ نہیں سکے ورنہ دونوں مصرعے عروض کے حوالے سے بھی محل نظر نہیں معلوم ہوتے ۔۔۔ ادارہ

"دانشوروں کی "فنون" میں پیش کیا۔ پھر اس نقطۂ نظر کو امریکی ماہر عمرانیات ایڈورڈ شلز اور نیٹو کے دانشوروں نے پھیلایا اور یہ سلسلہ چھٹی دہائی کے اواخر تک جاری رہا۔ پاکستان اور بھارت میں بھی آئیڈیالوجی کی مخالفت کا اسی مدت میں زیادہ چرچا رہا۔ ریمنڈ ایرن نے تو آخر اپنی غلطی کا اعتراف کر لیا تھا لیکن پاکستانی اور بھارتی جدیدیت پسند ابھی تک اس نقطۂ نظر سے چمٹے ہوئے ہیں۔ دوسری عالمی جنگ کے اختتام کے بعد امریکی سامراجیت نے اپنے سامراجی مفادات کی حفاظت اور تیسری دنیا کے نو آزاد ملکوں میں مقامی ترقی پسند تحریکوں اور سوویت روس کے اثرات کی روک تھام کی خاطر اپنے اثرات پھیلانے شروع کیے۔ جن نو آزاد ملکوں کی قیادت بالائی طبقوں کے ہاتھ آئی انھوں نے بھی اپنے مفادات کے تحفظ کے لیے امریکی سامراجیت سے رشتہ جوڑا۔ دوسرے متعدد ایسے نو آزاد ملکوں کے ساتھ پاکستان میں بھی یہی کچھ ہوا۔ امریکہ کو پاکستان کی طرف سے بھاری فوجی امداد کی پہلی درخواست ۴ راگست ۱۹۴۷ء ہی کو بھیج دی گئی تھی۔ اس کے بعد رفتہ رفتہ پاکستان کو مختلف معاہدوں کی زنجیروں سے امریکی سامراجیت سے باندھ دیا گیا۔ اسی دوران کمیونسٹ پارٹی آف پاکستان اور انجمن ترقی پسند مصنفین زیر عتاب آگئیں۔ پھر جب آئیڈیالوجی کے خاتمے کا نقطۂ نظر پیش ہوا تو اس وقت سائنسی تکنیکی انقلاب اپنے ارتقا کے دوسرے مرحلے میں داخل ہو چکا تھا جس کے زیر اثر الیکٹرانک میڈیا کو غیر معمولی ترقی ملی۔ امریکی سامراجیت نے الیکٹرانک میڈیا کو استعمال کرتے ہوئے تہذیب کی برآمد کی پالیسی بھی اسی دور میں اپنائی، اور یوں دوسرے تہذیبی افکار و مظاہر کے ساتھ ساتھ "آئیڈیالوجی کے خاتمے" کا نقطۂ نظر بھی پھیلایا۔ پاکستان میں اسے پھیلانے میں مقامی جدیدیت پسندوں نے اہم کردار ادا کیا۔

محمد کاظم نے مولانا عبدالماجد دریابادی پر اور خاور نقوی نے ڈاکٹر آغا افتخار حسین پر بھرپور مضامین لکھے ہیں۔

میں افسانے عام طور پر سب سے آخر میں پڑھتا ہوں مگر گلزار، احمد جاوید یا ضیا بٹ کا کوئی افسانہ "فنون" میں نظر آجائے تو سب سے پہلے پڑھ لیتا ہوں۔ پچھلے اور موجودہ "فنون" میں گلزار کے دونوں افسانے پسند آئے۔ گذشتہ "فنون" میں شامل احمد جاوید کا افسانہ "بکھرے ٹکڑے" حقیقت نگاری میں تہ داری کے اظہار کی ایک خوبصورت مثال ہے۔ ضیا بٹ کا نیا افسانہ دیکھنے کو آنکھیں ترس گئی ہیں۔

نظموں میں سے رشید قیصرانی، آفتاب اقبال شمیم، اقبال کوثر، نجیب احمد، نظیر اختر، منصورہ احمد، احمد لطیف، اعجاز رضوی، داؤد رضوان، شیراز راج، غافر شہزاد اور منظر حسین کی نظموں نے متاثر کیا۔ معلوم نہیں منصورہ احمد اپنے امکانات کے کامیاب اظہار کا آئندہ سفر کتنا طے کر سکیں گی۔ فی الحال جو کچھ محسوس ہوتا ہے وہ یہ ہے کہ انھوں نے اپنا سفر وہاں سے آغاز کیا ہے جہاں پروین شاکر کی سہل اور سہانی مسافت ختم ہو رہی ہے۔ اس اعتبار سے منصورہ احمد کو آئندہ کی طویل اور پیچیدہ مسافت درپیش ہے۔ خدا نہ کرے کہ وہ مقبولیت کے سائے میں مقیم ہو جائیں۔

غزلوں میں سے منظر حنفی، خالد احمد، نجیب احمد، جلیل عالی، حسن ناصر، شہزاد قمر، گلزار بخاری، توقیر چغتائی، نورین طلعت عروبہ، ریحانہ روحی، شہزاد اظہر، طارق نعیم اور تابش کمال کی غزلیں پسند آئیں۔ گذشتہ دور کی گھٹن کو ہمارے ملک کے روشن فکر شاعروں نے جس یکسانیت کے ساتھ محسوس کیا اس یکسانیت کا اثر مصرعوں اور تمثالوں تک میں بھی نظر آتا ہے۔

یوسف حسن (راولپنڈی)

"فنون" ۴۲

"فنون" ۴۲ میں منصورہ کی دونوں نظمیں بہت خوبصورت لگیں۔ "ہمیشہ کی طرح" کہوں تو ان دونوں کی اہمیت کم ہو جاتی ہے لیکن خوبصورت، ہمیشہ ہی کی طرح ہیں۔ منصورہ کی نظمیں ہر بار کوئی نہ کوئی نیا تیور لیے ہوئے ملتی ہیں۔

تھکن سے چور خاموشی میں صحرا گونجتے ہیں

اس ECHO کا جواب نہیں، چوکھٹ پہ آنکھوں کے دیئے رکھنا اور کہنا کہ :

آنکھ بھر کا آسمان ہی اپنا ورثہ ہے

نہایت قابل تعریف ہے

منصورہ کی نظم "کوئی آواز دیتا ہے" کا یہ اظہار اس شمارے کا بہترین METAPHOR ہے :

کچھ ایسا لمس ہے آواز کا جیسے

اچانک فاختہ کے ڈھیر سے کومل پروں پر ہاتھ پڑ جائے

اور ان میں ڈوبتا جائے

تیسرا مصرعہ آواز کو چھونے کے بعد اس کے SINK IN کرنے کی فیلنگ دیتا ہے۔ لکھتے تو ہم بھی ہیں لیکن ان نظموں کی سی MAJESTY کہاں سے آئے۔

گلزار (بمبئی)

"فنون" شمارہ ۲۴ نظر نواز ہوا۔ آپ نے اداریئے میں بجا طور پر آمریت پسند حلقوں کی خبر لی ہے۔ واقعی افسوس کا مقام ہے کہ جمہوریت کی خاطر جیل جانے والوں نے بھی آمریت کے پروردگان کے سُر میں سُر ملا کر جمہوری اداروں کی تباہی کا راگ الاپنا شروع کر دیا ہے۔

"حرف اول" میں ایک ذیلی سرخی "افہام و تفہیم کی ضرورت" کے تحت آپ کے اس دردمندانہ احساس۔ "اگر صوبائی خود مختاری اور علاقائی کلچر اور زبانوں کے سلسلے میں ہم اتنے فراخ دل ہو جائیں، اگر ہر صوبے کے باشندوں کے حقوق کے تحفظ کو ہر حکومت اپنا ایمان بنا لے تو کوئی وجہ نہیں کہ وہ ملک جو ایک زبردست جمہوری تحریک کی برکت سے وجود میں آیا ہو ایک متوازن جمہوریت کا خوبصورت نمونہ نہ بن جائے"، میں برابر کا شریک ہوں۔ ان سطور کی روشنی میں میں اپنے صوبے کے ایک سنگین مسئلے کی نشاندہی کرنا چاہتا ہوں۔ یہ تو طے ہے کہ وطن عزیز کی بنیاد جمہوریت پر قائم ہے اور جمہوریت کی اساس اکثریت پر۔ اس اٹل حقیقت کے پیش نظر اگر سندھ کی موجودہ سیاسی صورت حال پر نظر ڈالی جائے تو سندھ کے سبھی قابل ذکر شہروں کراچی حیدر آباد، میر پور خاص، نواب شاہ اور سکھر کی نوے فی صد سے زائد آبادی کے منتخب کردہ ارکان اسمبلی کی آواز کو نظر انداز کر کے ہر اُس غیر جمہوری طرزِ عمل کو اپنایا جا رہا ہے جس سے اکثریت کو کسی بھی طرح اقلیت میں تبدیل کیا جا سکے۔ اس مطمح نظر کے تحت بلدیہ عظمیٰ کراچی اور بلدیہ عظمیٰ حیدر آباد کی حیثیت کو ختم کر کے اپنی پارٹی کی دوسری اور تیسری سطح کے ارکان کو اعلیٰ ترین عہدوں پر فائز کیا گیا ہے۔ ملک کی ایک اعلیٰ شخصیت اپنے ایک انٹرویو میں علی الاعلان کہہ چکی ہے کہ ہم ایم کیو ایم کا ووٹ بینک ختم کرنا چاہتے ہیں۔ اس انداز نظر کو جمہوریت کے کس کھاتے میں ڈالا جائے گا؟ صوبائی اسمبلی کے نوے فی صد شہری ممبران کے خلاف مختلف مقدمات قائم کر دیئے گئے ہیں، اس طرح سندھ کی اسمبلی میں سندھ کے شہروں کی تقریباً ڈیڑھ کروڑ آبادی کی نمائندگی صفر ہو کر رہ گئی۔ افہام و تفہیم کے سلسلے میں حکومتی پارٹی کا یہ کہنا کہ قائد تحریک کے علاوہ ہر ایک سے بات ہو سکتی ہے، ماضی کے تلخ تجربات کی یاد دلاتی ہے۔ صدر ایوب نے اپنے آخری دور میں اس طرح کی بات کی تھی کہ مجیب الرحمان کے علاوہ ہر ایک سے بات ہو سکتی ہے۔ ان کے بعد آنے والے ایک اور آمر نے کہا تھا کہ بھٹو کے علاوہ ہر ایک سے بات ہو سکتی ہے۔ ہر دو ادوار کا انجام تاریخ اور جغرافیہ کا حصہ

بن چکا ہے۔ اس پوری صورت حال کا واحد حل افہام وتفہیم اور ایک دوسرے کے حقوق کے احترام میں مضمر ہے۔ معاف فرمائیے گا میں نے اپنے خط میں "نیرنگیٔ سیاست" کا کچھ زیادہ ہی ذکر کر دیا!

"حرف اول" میں آپ نے ایک ترکیب "عاقبت نا اندیشانہ" استعمال کی ہے۔ میرے خیال میں نا عاقبت اندیشی کی ترکیب ہی درست اور فصیح ہے۔ سند کے طور پر غالب کا ایک شعر درج کر رہا ہوں:

اے دلِ نا عاقبت اندیش، ضبطِ شوق کر — کون لا سکتا ہے تابِ جلوۂ دیدارِ دوست

مجھے اچھی طرح یاد ہے کہ مولانا سید سلیمان ندوی (جو بھوپال کے قاضی شہر بھی تھے) نماز جمعہ سے قبل اپنی تقریر میں اکثر اس ترکیب کو اسی طرح ادا کرتے تھے۔

اب کچھ دیگر مندرجات کے بارے میں۔ عبداللہ جاوید کی دعا دل کی گہرائی سے ابھری ہے۔ الفاظ خیال کے تابع ہیں۔ ان کی نظم کا یہ بند ان کے کھرے جذبے کا عکاس ہے:

مرے شانے آج بھی سیدھے ہیں
اور سر اونچا کا اونچا ہے
مری ٹوپی آج بھی ٹیڑھی ہے
اور پھندنا بھی لہراتا ہے

ضمیر اظہر کی حمد بھی پسند آئی۔ انھوں نے غالباً "رو" میں مُتلاشی کو مُتلاشی باندھا ہے۔ خالد اقبال یاسر کی نعت اور یاسین حمید کی نعتیہ نظم نئی جہات اور دلی جذبات لیے ہوئے ہے۔ تنویر سپرا پر مضامین، انٹرویو اور مرحوم پر لکھی ہوئی نظموں کا گوشہ "فنون" کے اس شمارے کا حاصل ہے۔ حمید نسیم ریٹائرمنٹ کے بعد صحیح معنوں میں فعال نظر آ رہے ہیں۔ نہایت کم عرصے میں ان کا وہ مقام جو سرکاری مصروفیات کی وجہ سے پس پشت جا پڑا تھا ایک بار پھر نمایاں ہو کر ابھرا ہے۔ محمد ارشاد کا "طرزِ بیدل میں ریختہ" اور خالد احمد پر اختر حسین جعفری (جنھیں مرحوم لکھنے کو جی نہیں چاہتا) کا "تو وہی فیصلے کا دن آیا" اس شمارے کے خصوصی مضامین کا درجہ رکھتے ہیں۔ "جوش ملیح آبادی انقلابی سوچ کے حوالے سے" ایک نئے رُخ سے لکھا گیا مضمون ہے۔ جوش نے برطانوی سامراج سے براہ راست ٹکر لی تھی اور ایسی متعدد نظمیں لکھیں جو سینہ بہ سینہ کروڑوں افراد تک پہنچیں۔ فرمان صاحب نے ایک جملے میں جوش کے کردار کا بڑا بھرپور تجزیہ کیا ہے "جوش پہلے اور تنہا بڑے شاعر تھے جنھوں نے حکومت برطانیہ کے خلاف آواز بلند کی اور سزا پائی"۔ "اقبال اور جاگیرداری" میں یوسف حسن نے علامہ اقبال کے اس موضوع سے متعلق اشعار کو بڑی کاوش سے تلاش اور بڑے سلیقے سے پیش کیا ہے۔ ان کی تشریح و تعبیر ناقدانہ بصیرت پر دلالت کرتی ہے۔ وطن کے ابلاغ عامہ کے ذرائع کو نہ جانے کیوں یہ اشعار نظر نہیں آتے۔ انھیں نظر آتے ہیں تو بس روحانی اقدار اور ماضی کے آئینہ دار اشعار ہی نظر آتے ہیں۔

نظموں میں حبیب جالب پر خالد احمد کی نظم، گلزار، اسلم طارق اور نسیم سید کی نظمیں اس حصے کی جان ہیں۔ ناہید قاسمی کی مختصر نظمیں قلبی واردات کی سنگینی کی مظہر ہیں — ایسی سنگینی جو بیشتر مشرقی عورتوں کا مقدر بن چکی ہے۔ غزلیات کا حصہ غزلوں کی وافر مقدار لیے ہوئے ہے۔ ظفر اقبال، حمید نسیم، ادیب سہیل، رضی اختر شوق اور انور شعور کی غزلیں جاذب توجہ ہیں۔ بیدل حیدری کی غزل کا ایک شعر میری دانست میں عدم مشاہدہ کا مظہر ہے:

شاہ بلوط اب تک صحرا میں — تیرا رستہ دیکھ رہا ہے

صحرا میں اکاؤ، جھڑبیری اور کھجور وغیرہ کے درخت پائے جاتے ہیں جبکہ شاہ بلوط گھنے جنگلوں، وادیوں اور پہاڑوں پر پایا جاتا ہے۔ ان کی ایک اور غزل کا مقطع ہے:

ترک کردے شمع بینی دیکھ بیدل حیدری — ورنہ ان تھوڑی بہت آنکھوں سے بھی رہ جائے گا

"تھوڑی بہت آنکھوں" بھلا کیا بات ہوئی۔ دوسرا مصرع غرابتِ لفظی کا شکار ہی نہیں بلکہ روزمرہ کے خلاف بھی ہے۔ وہ کہنا یہ چاہتے ہیں "ورنہ جو بینائی باقی ہے تو اس سے بھی محروم ہو جائے گا"۔

"اختلافات" ہمیشہ کی طرح معلومات افزا بھی ہے اور اپنے نام نامی کا آئینہ دار بھی۔

محسن بھوپالی (کراچی)

"فنون" نمبر ۳۹

یوں تو سبھی مقالے اعلیٰ پایہ کے ہیں لیکن ابو العلیٰ معرّی (از محمد کاظم) اور انڈالوجی (از رشید ملک) زندہ رہنے والی تحریریں ہیں۔ رشید ملک صاحب سے گذارش ہے کہ وہ شنکراچاریہ کی فکر اور منطق پر بھرپور مقالہ لکھیں۔ رومی جیسے دانشور بھی اس سے متاثر ہونے والوں میں شامل ہیں۔ جناب کاظم صاحب نے بدلائل ثابت کیا ہے کہ معرّی ایک سچا مسلمان تھا چنانچہ لکھتے ہیں:

"خدا کی ذات کا اقرار وہ اپنے کلام میں جگہ جگہ کرتا ہے اور روزِ قیامت پر بھی اُس کا ایمان ہے۔ پھر اپنے ایک قصیدے میں وہ رسول خدا صلی اللہ علیہ وسلم کی مدح کرتے ہوئے اُن کی تعلیمات کی خوبیاں گن گن کر بیان کرتا ہے۔ اس نظم کے آغاز میں کہتا ہے:
محمد (صلی اللہ علیہ وسلم) نے تمہیں بہترین باتوں کی طرف بلایا اور جب اقدار کی بات ہو تو رفعتوں اور پستیوں میں بہت فرق ہے۔ (ترجمہ)
اللہ کا سلام ہو اُس پر جب تک مشرق سے آفتاب طلوع ہوتا ہے اور جب تک محفلیں اُس کے ذکر سے مشکبار ہوتی ہیں" (ترجمہ)
فنون صفحہ ۸۳-۸۴۔

ایسے شخص کو زندیق اور فاسق کہنے والے خود گمراہی میں مبتلا ہیں ویسے کہنے والے کی زبان کون پکڑ سکتا ہے۔ پروفیسر محمد اسلم صاحب سابق صدر شعبۂ تاریخ پنجاب یونیورسٹی لاہور نے اپنی کتاب خفتگان کراچی میں جناب نیاز فتحپوری جیسے مسلمان کو بھی منکرِ خدا و رسول لکھا ہے:

فکرِ ہر کس بقدرِ ہمتِ اوست

حصۂ نظم اس دفعہ بہت بھرپور ہے۔ جناب عبدالعزیز خالد کی نظم "فکر و ذکر" اور خالد احمد صاحب کی مادھولال حسین بلند پایہ تخلیقات ہیں۔ حصۂ غزل فنون کا سب سے زیادہ جاندار حصہ ہوتا ہے۔

سید نور محمد قادری (چک نمبر ۵ شمالی ضلع منڈی بہاؤالدین)

ہمارا ہمہ جہت انحطاط

"اختلافات" کے توسط سے کچھ باتیں "فنون" کے قارئین کے پیش نظر لانا مقصود ہیں۔ فارسی میں کہا جاتا ہے: "ہر کمالے را زوالے"۔ ہمارے معاشرے کے ضمن میں یہ "ہر زوالے را کمالے" والا معاملہ ہو گیا ہے یوں ہمارے ہمہ جہت (سماجی، سیاسی، اخلاقی علمی، فکری، ادبی وغیرہ) انحطاط کی پوری تصویر سامنے آجاتی ہے۔

کیا کیا جائے؟ کہاں سے شروع کیا جائے؟ ایسے بڑے، نازک اور اہم سوال ہیں، جن کے جواب وضع کیے بغیر کوئی پیش رفت ممکن نہیں، طویل اور صبر آزما سعی و محنت کی ضرورت ہے۔ اس سمت میں پہلا قدم ذہن کی تبدیلی سے ہی شروع ہوتا ہے۔ خیالات بدل جائیں تو اردگرد کی دنیا بھی بدل جاتی ہے اور خیالات، غور و فکر کرنے والوں کے ہی تبدیل ہوتے ہیں۔ اُن کے نہیں جو حالات

کے ساتھ یا حالات کے دباؤ کے تحت یا حالات سے مجبور ہو کر اپنے خیالات تبدیل کرتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو خیالات نہیں، حالات بدلتے ہیں۔

کسی نے کیا اچھی بات کہی ہے:

HE WHO WILL NOT REASON IS A BIGOT; HE WHO CAN NOT IS A FOOL; AND WHO DARES NOT IS A SLAVE.

(WILLIAM DRUMOND)

اور جسے دلیل تبدیل نہیں کر سکتی، وہ آج کے انسان کی تعریف سے باہر ہے!

محمد حسن عسکری ایک جگہ لکھتے ہیں: "آخر وہ خیال، وہ جذبہ ہی کیا جس سے ہمارے اندر دو چار خلیے نہ مر جائیں اور دو چار نئے پیدا نہ ہوں جس سے ہمارے معدے اور ہاضمے پر اثر نہ پڑے۔" (میرا بہترین افسانہ، مرتبہ: محمد حسن عسکری، ساقی بک ڈپو دہلی) اور بقول ایک دوست، خیالات چھوت کی بیماری کی طرح پھیلتے ہیں لیکن یہ صرف انھیں ہی متاثر کر سکتے ہیں جو ان سے مُبرّیٰ (IMMUNE) نہ ہو چکے ہوں۔! ذیل میں ذی فکر اور اہل الرائے اصحاب کی تنقید و تنقیح اور جرح و تعدیل کے لیے چند نکات درج ہیں۔

عقلی، معروضی اور ہموار فکر کی ترویج ہمارے معاشرے کے فکری ارتقا کے لیے ناگزیر ہو چکی ہے۔

انسانی معاشرے کو ادب، فن، سیاست، معاشیات، نفسیات، اخلاقیات وغیرہ کے ہوا بند خانوں میں تقسیم کرنا درست نہیں؛ تمام علوم و فنون کو ان کی آزاد حیثیت سے برقرار رکھتے ہوئے، مربوط شکل دے کر معاشرے کے بارے میں ایک وحدت پسندانہ نقطۂ نظر وضع و مروج کرنا ضروری ہے۔

تخلیقی اور طبع زاد فکر کی آزادانہ نشوونما علوم و فنون کی ترقی کی ضمانت ہو سکتی ہے۔

ایک کلی کائناتی نقطۂ نظر کی وضع و تشکیل کے ضمن میں فکری اور علمی تحرکات کو گہرائی و گیرائی دے کر نئی مابعد الطبیعیات کی تدوین کے لیے غور و خوض کو ممکن بنایا جا سکتا ہے۔

تمام افراد کی ذمہ دارانہ شراکت کے بغیر ایک مثالی معاشرے کے حصول کی طرف پیش قدمی نتیجہ خیز ثابت نہیں ہو سکتی۔

عورت کے وجود کو انسانیت کی ایک کُل اور آزاد اکائی کی حیثیت سے تسلیم کیے بغیر کوئی نظریہ یا فلسفہ انسانی نہیں کہلا سکتا۔

احباب ان نکات سے جزوی یا کُلی اختلاف کے باوجود "کیا کیا جائے، کہاں سے شروع کیا جائے؟" کے جوابات کے سلسلے میں ان نکات کی اہمیت کو ضرور تسلیم کریں گے۔

خلیل احمد (لاہور)

گلزار کا افسانہ "واہمہ"

زماں و مکاں پر کھرے اور خشک انداز میں ارسطو، برگساں اور آئن سٹائن نے جو کہا خوب کہا۔ پھر ہمارے یہاں اقبال اور مجید امجد اور مغرب میں ٹی ایس ایلیٹ نے شاعری سے مدد لی۔ افسانے میں گلزار نے پہل کی۔ واللہ مزا آ گیا۔ ساڑھے تین صفحات میں گلزار نے وہ سب کچھ کہہ دیا ہے جس کے لئے ورجینا وولف کو ایک پورا ناول لکھنا پڑا تھا۔ HOW EXQUISITE!

راجہ محمد ریاض الرحمن (ہری پور)

تبصرے

ڈاکٹر اسلم فرخی، ڈاکٹر عتیق احمد، پروفیسر نظیر صدیقی، یوسف حسن، مشکور حسین یاد، داؤد رضوان، اشرف جاوید، عشرت رومانی، احمد ندیم قاسمی

وہ زلف پریشاں ہے ابھی

مصنف: سرفراز ابد

معترض نے بڑی شد و مد سے کہا۔ اجی صنفِ غزل اب اپنی معنویت کھو چکی ہے۔ مگر وہ جو لکیر پیٹنا ہمارا مزاج اور شعار ہے اُس کا ایک پہلو یہ بھی ہے کہ غزل جیسی از کار رفتہ صنف کو گلے سے لگائے پھرتے ہیں اور کہتے ہیں کہ یہی شاعری کا اعلیٰ نمونہ ہے۔ معترض اعتراض کر کے چپکے ہو گئے مگر غزل کے حامیوں میں ہلچل مچ گئی۔ معنویت کھو بیٹھنا اور از کار رفتہ ہو جانا محض الفاظ کا کھیل ہے۔ جب اور جس وقت جس کے بارے میں چاہیں کہہ دیجئے۔ یہ کیا بات ہوئی۔ بنیادی مسئلہ یہ ہے کہ اگر غزل ایسی ہی کمزور صنف ہے تو پھر یہ سارے شاعر غزل ہی کیوں لکھتے ہیں۔ جوش صاحب غزل کے مخالف تھے مگر ان کی نظمیں تغزل میں ڈوبی ہوئی ہیں۔ اختر الایمان نظم کے بڑے شاعر اور غزل کے مخالف ہیں۔ ہر شخص یہ جانتا ہے کہ اُن کی نظموں میں کھردرا پن ہے کیونکہ انھوں نے غزل کے آہنگ سے استفادہ نہیں کیا۔ یہ دو مثالیں بالکل سامنے کی ہیں۔ رہ گئی غزل کی عالمگیری اور محبوبیت تو سارے معترض بھی طوعاً و کرہاً اسے تسلیم کرتے ہیں غزل سے مفر ممکن نہیں۔

جب میں یہ دیکھتا ہوں کہ اس دورِ کتاب ناشناسی میں بھی غزل کے نئے نئے مجموعے تواتر اور تسلسل کے ساتھ سامنے آتے رہتے ہیں۔ ان کے مطالعے سے طبیعت میں فرحت اور ذہن میں بے شمار سوال ابھرتے رہتے ہیں تو مجھے غزل کی ترقی اور شاندار مستقبل کی طرف سے کوئی اندیشہ نہیں ہوتا۔ اس وقت بھی نئی اردو غزل کا ایک دلکش مجموعہ "وہ زلف پریشاں ہے ابھی" میرے سامنے ہے۔ میں نے بڑے ذوق و شوق سے آہستہ آہستہ اس کا مطالعہ کیا۔ آہستہ آہستہ اس لئے کہ شاعری اور غزل بالخصوص فوری طور پر اپنی معنویت کا انکشاف نہیں کرتی۔ اس کی تہیں آہستہ آہستہ کھلتی ہیں اور بڑی دیر میں کھلتی ہیں۔ ایک جھلک سامنے آتی ہے۔ پھر دوسری اور یہ سلسلہ جاری رہتا ہے۔

"وہ زلف پریشاں ہے ابھی" نوجوان شاعر سرفراز ابد کا مجموعہ ہے۔ سرفراز ابد کے حوالے سے دو باتیں میرے ذہن میں آتی ہیں، ایک تو یہ کہ انھوں نے شاعری کی گود میں پرورش پائی ہے۔ اُن کے والد شفق اکبرآبادی اور اُن کے پھوپا صبا لکھنوی کا شمار خوش گو شعرا میں ہوتا ہے۔ دوسرے انھوں نے ندا خالدی جیسے ماہر استاد سے فیض حاصل کیا ہے۔ یہ دونوں حوالے ابد کے خلاف بھی جا سکتے تھے۔ اگر وہ صرف بزرگوں کی تقلید اور اساتذۂ فن کے استفادے پر تکیہ کرتے تو اُن کا شمار روایتی انداز کے خوش گو شعرا

میں ہوتا لیکن انھوں نے اخذ و استفادہ کے ساتھ ساتھ بڑی محنت سے اپنا راستہ الگ بنایا ہے۔ اسی محنت سے ان کے تخلیقی سفر میں انفرادیت، لہجے میں ندرت اور فکر میں جودت پیدا ہوگئی ہے۔ انھوں نے ایک جگہ کہا ہے:

اُس میں اوصاف بھی وہی ہوں گے ۔۔۔ جس کو نسبت ہے جس گھرانے سے

مگر مجھے اس شعر میں انکسار زیادہ نظر آتا ہے کیونکہ ابد نے اپنے گھرانے کی نسبت سے فائدہ اٹھا کر اوصافِ آباوہی پر اکتفا نہیں کیا۔ ان میں وسعت بھی پیدا کی ہے۔ بہرحال یہ کیا کم ہے کہ ابد نے اپنی نسبت پر فخر کا اظہار کیا ہے ورنہ فی زمانہ تو سب اسے بھولے ہوئے ہیں۔

ابد نوجوان شاعر ہیں۔ زندگی کے ہمہمے اور ولولے کے شاعر ہیں عشق کی شوریدہ سری کے شاعر ہیں۔ شوق اور تمنا کے شاعر ہیں۔ نوجوانی کے نشے میں سرشار کس لطف سے کہتے ہیں:

چپ ہو ابد تم کیا قصہ ہے کچھ تو بولو کچھ تو کہو ۔۔۔ کس سے ملے ہو کیا دیکھا ہے کچھ تو بولو کچھ تو کہو
کس کی یادیں کس کا چہرہ دل میں چھپائے پھرتے ہو ۔۔۔ ہم سے تمہارا کیا پردا ہے کچھ تو بولو کچھ تو کہو

یہ اشعار بھی اپنی سرشاری اور دلکشی کی وجہ سے قابلِ توجہ ہیں:

نام، پتہ، فرصت کے لمحے میرے مشاغل میری پسند ۔۔۔ تنہائی میں اُس نے پوچھا اور نجانے کیا کیا کچھ
بھینی خوشبو، رنگِ بہاراں، رات سہانی میٹھی نیند ۔۔۔ اُن زلفوں کے سائے تلے تھا اور نجانے کیا کیا کچھ

مگر جوانی کی اس شوریدہ سری کے ساتھ ساتھ ابد کے یہاں ذہن و فکر میں ہلچل مچانے والے اشعار بھی ملتے ہیں:

اس جرم کی پاداش میں آیا ہوں سرِ دار ۔۔۔ اوروں کی طرح اس کو خدا کہہ نہ سکا میں
تم نے مفہومِ شہادت ہی بدل ڈالا ہے ۔۔۔ پیش اب کوئی شہادت نہیں کر سکتا میں
ہوائیں لے گئیں بینائی شہر والوں کی ۔۔۔ چراغ اب یہ کسے راستہ دکھاتے ہیں

ابد کی غزل میں ابھی عشق کا کیف و مستی بہت نمایاں ہے لیکن ایک ہوش مند فنکار کی حیثیت سے حیات و کائنات کے دوسرے پہلوؤں کی طرف بھی توجہ کر رہے ہیں۔ عرفانِ ذات کی منزلوں سے گزر رہے ہیں۔ آج ان کی غزل وارفتگی کا ایک شرارہ ہے کل یہ شرارہ ایک شعلے میں تبدیل ہو کر اردو غزل کے نئے سفر کی نشاندہی کرے گا۔

(ڈاکٹر) اسلم فرخی

اُردو ناول کے بدلتے تناظر

مصنف: ڈاکٹر ممتاز احمد خاں ۔۔۔ ناشر: ویلکم بک پورٹ۔ اردو بازار۔ کراچی ۔۔۔ قیمت: ۱۵۰ روپے

جب بھی اردو میں ناول کے حوالے سے بات شروع ہوتی ہے، اس اعتراف کے اعلان کے بغیر بات آگے نہیں بڑھائی جاتی کہ اردو تنقید نے ناول سے غفلت ہی نہیں غفلتِ مجرمانہ برتی ہے۔ اس حد تک تو یہ بات صحیح ہے کہ ہماری تنقید پر ابتدا ہی سے غزل یا پھر نظمیہ شاعری (مثلاً مرثیہ، قصیدہ، شہر آشوب اور جدید نظم) چھائی رہی۔ نثر میں ایک ناول ہی کیا، افسانہ اور ڈرامہ، نظم و نثر دونوں، کا بھی یہی حشر ہوا کہ کبھی پوری توجہ اور تندہی کے ساتھ ان اصناف کے ساتھ انصاف نہ ہو سکا۔ وہ تو خیریت گذری کہ افسانہ کو پھر بھی مجنوں گورکھپوری (دو مختصر سی کتابیں ہی سہی) اور بعد کو پروفیسر وقار عظیم کی بھرپور توجہ کے سبب دو دقیع نقاد میسر آ گئے تو آنسو پچھ جانے کی حد تک کچھ بات بنتی رہی۔ لیکن ڈرامہ اور ناول کے باب میں شکایات بالکل بجا طور پر اپنی جگہ رہیں۔

شکایت اپنی جگہ لیکن یہ حقیقت بھی بالکل سامنے کی بات ہے کہ اردو میں ناول نگاری کی اپنی روایت کتنی وسیع اور وقیع ہے؟ (افسانہ ہو یا ناول، جب تنقید کی بات ہوگی تو تحت الشعور اور ذہین الشعور معیار بہ ہر حال نکتہ کی بات ہوتی ہے) یعنی یہ کہ اردو میں واقعتاً صحیح معنوں میں معیاری ناول کتنے لکھے گئے ہیں؟ ایک پریم چند کو چھوڑ کر (اور عبد الحلیم شرر کے تاریخی ناولوں سے قطع نظر) ہمارے ہاں بحیثیت ناول نگار اپنی شناخت قائم کرنے والے کتنے اہل قلم ہیں اور ان کے ناولوں کی تعداد کتنی ہے؟ اگر قیام پاکستان سے اب تک فی سال چار ناولوں کا اوسط بھی پیش نظر ہے (جو نہایت شرمناک تعداد ہے) تو ۴۳/۴۴ برسوں کی تعداد بھی پونے دو سو معیاری ناولوں تک پہنچنی چاہیے۔ اب اگر اصل حقیقت تک پہنچنے کی کاوش کی جائے اور ان ۴۲/۴۴ برسوں میں لکھے گئے معیاری ناولوں کی فہرست بنائیے تو پونے دو سو کی تعیین تو کیا شاید نصف کے بھی نصف تک ہی تعداد پہنچ پائے گی۔ عرض کرنے کا مقصد یہ ہے کہ کسی بھی صنف ادب پر تحت تنقید گریہ سے پہلے اُس صنف کے کیف و کم پر بھی نظر رکھی جائے تو شاید مقام آہ و فغاں تک پہنچنے کی نوبت نہ آئے۔

ناولوں (یعنی معیاری ناول) اور اس پر تحت تنقید کے اس عالم میں کسی ایسے ڈیڑھ دو سو صفحات کا سامنے آنا جس کا تعلق ہم عصر ناول نگاری سے ہو یقیناً عالم قحط میں باران بخش بارش کا سماں بندھ جانے کے منظر کا مترادف ہوگا۔ ڈاکٹر ممتاز احمد خاں کی کتاب "اردو ناول کے بدلتے تناظر" نے ناول پر تنقید پڑھنے والوں کی محرومِ مطالعہ تمناؤں کی آہ و فغاں سے تپتی اور جھلستی ہوئی فضا میں ایسی ہی برسات کا سماں باندھا ہے۔

زیر تبصرہ کتاب میں ۲۹ ہم عصر ناولوں کو موضوعِ نقد و تجزیہ بنایا گیا ہے۔ ان میں سے چار کا تعلق ہندوستان کے ناول نویسوں (علیم مسرور، حیات اللہ انصاری، جیلانی بانو اور جوگندر پال) سے ہے۔ باقی کے پچیس ناولوں میں سے عزیز احمد کے زیر بحث تین ناول قیام پاکستان سے پہلے کے ہیں (آگ اور شبنم یہاں آ کر لکھے گئے گویا پاکستان میں لکھے گئے) اس طرح سے کل پچیس ناول کتاب کا موضوع ہیں۔

ڈاکٹر ممتاز احمد خاں نے اپنے ان ۲۹ مضامین میں زیر تبصرہ ناولوں کا بھرپور مطالعہ پیش کیا ہے۔ ان ناولوں کی فضا، ماحول، کردار اور ان کے رویوں سے لے کر ان کے (مختصر ہی سہی) فنی پہلوؤں کا احاطہ کیا ہے۔ ہر تخلیق کار اپنے ماضی و حال سے ہم رشتہ ہوتے ہوئے اپنا تخلیقی اور سماجی رویہ متعین کرتا ہے۔ تنقید نگار اگر تخلیق کار کے اس رویہ کو نظر انداز کرتا ہے یا فن کار کے یہاں ان دونوں عوامل میں توازن پر نظر رکھنے میں چوک جاتا ہے تو وہ اپنی ذمہ داری پوری نہیں کرتا۔ ان مضامین میں ہمیں اس تنقیدی منصب کو نبھانے کے انداز سے مایوسی تو نہیں ہوتی تاہم آزادی کے بعد کے کئی ایک ناولوں میں (مثلاً وحشت سوہن) افراط و تفریط کا عنصر پورے طور پر گرفت میں نہیں آسکا، اور یوں کئی ایک ناولوں کا سماجی رشتہ تفہیم طلب رہ گیا۔ اس ایک پہلو کے سوا کتاب میں شامل مضامین بلاشک و شبہ ناول کے قارئین کو آزادی کے بعد کے پاکستانی اور ہندوستانی ناولوں سے بالتفصیل روشناس کرانے میں معاونت کرتے رہیں گے، بالخصوص ان مضامین میں تکنیکی مباحث، فنی لوازمات اور مواد کے تنوع کے ضمن میں ان کے خیالات قارئین کو ناول پر لکھنے کی طرف راغب کریں گے۔

ہم عصر ناولوں کے متعلق کم و بیش ڈھائی درجن مضامین کی فہرست میں کرشن چندر، عصمت چغتائی، راجندر سنگھ بیدی، رشیدہ رضویہ، الطاف فاطمہ اور چند اور ناول نگاروں کے ناولوں پر مضامین کی عدم موجودگی سے ایک دھچکا یقیناً قاری کو پہنچے گا۔ ہمیں امید ہے کہ ڈاکٹر ممتاز بہت جلد اپنے قارئین کی اس تشنگی کو رفع کرنے کی طرف متوجہ ہوں گے۔

اردو ناولوں پر اب تک لکھی گئی، جو گنتی کی چند کتابیں ہیں، "اردو ناول کے بدلتے تناظر" ان میں ایک ٹھوس اور کارآمد مواد کا اضافہ کرتی ہے۔

(ڈاکٹر) عتیق احمد

پچی کرن شبنم (مجموعۂ شاعری)

شاعر: محمود علی محمود   ناشر: پاکستان بکس اینڈ لٹریری ساؤنڈز، ۲۵ لوئر مال لاہور

محمود علی محمود کے مجموعۂ شاعری "پچی کرن شبنم" کا دیباچہ ہمارے معروف دانشور اور عظیم اُستاد پروفیسر کرار حسین نے لکھا ہے اور اس کا فلیپ ہمارے بزرگ شاعر و ادیب جناب احمد ندیم قاسمی کا تحریر کیا ہوا ہے۔ دونوں ہی عظیم ہستیوں نے محمود علی محمود کے اس مجموعے کو اردو شاعری میں ایک منفرد اضافہ کے طور پر تسلیم کیا ہے اور خصوصیت کے ساتھ اس کی زبان کی کچھ اس طرح تعریف کی ہے گویا ایسی زبان اردو شاعری میں پہلی بار استعمال ہوئی ہے۔ پروفیسر کرار حسین فرماتے ہیں:

"محمود صاحب کی روغن شدہ، چکنی چپڑی سپاٹ شہری ثقافتی زبان نہیں ہے۔ دیہات کی زمین کی طرح تھوڑی سی اونچی نیچی زمین اور اسی زمین سے اُگی ہوئی فطرت کے سلیقے سے نکھاری ہوئی زبان، بڑی حسین اور پُرمعنی ترکیبیں جیسے قدرتی منظر میں پتوں کی اوٹ سے پھول جھانک رہے ہوں۔"

اور اب احمد ندیم قاسمی صاحب کا اقتباس ملاحظہ فرمائیے:

"اس شاعر نے مروجہ اسلوب شعر گوئی سے کامل اہٹ کر ایسے موضوعات پر اور پھر ایسی زبان میں شاعری کی ہے کہ اس دور کے کسی اور بڑے شاعر کے ہاں بھی اس کی مثال ڈھونڈ لانا مشکل ہے۔ اس کا اپنا روزمرہ اور اپنا محاورہ ہے اور پھر وہ نظم کے علاوہ غزل بھی اسی روزمرے اور اسی محاورے میں کہتا ہے۔"

میں نے حسب معمول دیباچہ اور فلیپ سے پہلے براہ راست "پچی کرن شبنم" کے اشعار کو پڑھا۔ یہ مجموعہ تین حصوں میں تقسیم ہے۔ پہلا حصہ غزلیات کا ہے، دوسرا حصہ دوہوں کا اور تیسرا نظموں کا۔ مجھے بھی شاعر کے خلوص اور اسلوب شعر گوئی کے علاوہ جس چیز نے سب سے زیادہ متاثر کیا وہ اس مجموعہ شاعری کی زبان ہی ہے۔ اور یہ زبان دلّی کے قرب و جوار ضلع رہتک اور حصار کے عام آدمی کی زبان ہے اور میں ذاتی طور پر اس زبان سے اس لئے آگاہ ہوں کہ میرا بچپن، لڑکپن اور نوجوانی بھی اسی گرد و نواح میں گذرے ہیں لیکن جب میں نے پنجابی کے کلاسیکی شعرا بلھے شاہ وغیرہم کے کلام کا مطالعہ کیا تو مجھے پنجابی زبان کی ایک خاص خوبی یہ نظر آئی کہ اس زبان میں عام زبان اور ادبی زبان میں کوئی فرق نہیں ہے۔ پنجابی کی عام زبان میں اس کے عظیم شعرا نے بڑے بڑے مضامین کو نہایت خوبی سے باندھا ہے جبکہ اردو میں تا حال شعر و ادب کی زبان اور عام زبان کا واضح فرق موجود ہے۔ "پچی کرن شبنم" کو پڑھ کر محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے شاعر یعنی محمود علی محمود نے ادبی زبان اور عام زبان کے فرق کو بڑی حد تک مٹا دیا ہے اور ثابت کر دیا ہے کہ اردو کی عام زبان میں بھی اتنی سکت موجود ہے کہ وہ بڑے سے بڑے مضامین کو اپنے اندر نہایت سلیقے سے جذب کر سکتی ہے:

اپنی اس مسافت کا کیا نتیجہ نکلے گا   جیسے گھوم کر پھرکی لڑکھڑائے برتن میں

اسی غزل کا ایک اور شعر ملاحظہ فرمائیے:

تارکول سورج کے آگے بہہ نکلتا ہے   بجری تو پہاڑن ہے بندھ گئی ہے بندھن میں

عجیب اتفاق ہے جس زمانے میں محمود صاحب مجھے اپنا یہ مجموعۂ شاعری دے کر گئے اسی زمانے میں اختر حسین جعفری مرحوم کا "آئینہ خانہ" میرے زیر مطالعہ تھا۔ "پچی کرن شبنم" کو سرسری طور پر دیکھتے ہوئے میں نے سوچا تھا کہ اب اس مجموعہ کو پڑھ کر کیا مزا آئے گا لیکن جب اسے پڑھا تو پتا چلا کہ محمود واقعی اپنے انداز کا شاعر ہے۔ ایک آزاد نظم کی دو سطریں دیکھئے۔ نظم کا عنوان ہے "ناتا":

تم کو کیا معلوم کہ یاس کی ساتویں سیڑھی پر گر کر کوئی بکھر جاتا ہے
جھنجھلاہٹ کی کھولتی دلدل میں اتر جاتا ہے

اور محمود صاحب کے دوہے تو غزل کے لغوی اور اصطلاحی ہر دو معنی میں دو مصرعوں کی مکمل غزلیں معلوم ہوتے ہیں۔ غزل کے لغوی معنی یہی ہیں ناکہ عورتوں کا آپس میں باتیں کرنا تو سنیے:

سکھی ری رین بھئے چکوی چکوے سے بولی ناتھ" مانس جات سے تو ہم اچھے دان دہیز نہ برات

کنکوا اور پریتم سکھیو! نا ہیں کسی کے یار ایک جرا انکھیاں جھپکیں تو یار ندی کے پار

اور غزل اصطلاحی معنی میں بہت وسعت رکھتی ہے۔ ہر طرح کا مضمون اس میں ادا ہوتا ہے، مگر ایک دوہا ملاحظہ کیجئے:

دھنونتوں کے عیب چھپائے نردھن کو بہلائے دمڑی سے چھوٹا ہو کر بھی پیسہ ہی کہلائے

ایک اور دوہا:

آجا اب تو اک پگ پر ہیں جیون اور گنہار کر جسے بدلے موری کلیا مانگے ساہوکار

ان دوہوں کے بعد اب اسی مجموعۂ کلام کی ایک غزل کے دو شعر بھی ملاحظہ فرما لیجیے:

گھر والوں کے ساتھ وہ قہقہہ بار بھی مجھ کو دیکھا تو یوں لگتی تھی جیسے کسی نے چوری کرتے پکڑا ہے
پھبینک کے چھاجو کنوارا وہ کمرے کی جانب دوڑی تھی جب سکھیوں نے پوچھا یہ محمود ترا کیا لگتا ہے

غرض "کچی کرن شبنم" اپنی الگ سج دھج کے ساتھ پڑھنے کے قابل شاعری ہے جو آپ کو لطف اندوز بھی کرتی ہے اور اپنے عہد کے کرب سے آشنا بھی۔

سید مشکور حسین یاد

سبز آنکھوں میں تیر (مجموعۂ کلام)

مصنف: رفیق سندیلوی قیمت: تیس روپے

ناشر: بک ورلڈ جی ۸/۲ آئی اینڈ ٹی سنٹر، اسلام آباد

"سبز آنکھوں میں تیر" رفیق سندیلوی کی اڑتالیس غزلوں، سولہ نظموں اور سترہ اشعار کا مجموعہ ہے۔ اس کے بعد رفیق سندیلوی کے دو مجموعے "گرز" اور "ایک رات کا ذکر" بھی منظر عام پر آ چکے ہیں۔ اردو کے متعدد رسالوں میں ان کے تنقیدی مضامین بھی چھپ رہے ہیں جس تواتر کے ساتھ ان کی کتابیں چھپ رہی ہیں اس سے ان کی تخلیقی توانائی ثابت ہے۔ رفیق سندیلوی گزشتہ دس بارہ سال کی نہ صرف توانا تخلیقی صلاحیتوں میں سے ہیں بلکہ جدید آوازوں میں سے بھی۔ ان کی جدیدیت بہت سے مقامات پر قاری کو مشتعل کر سکتی ہے لیکن انھیں مصنف سے دور نہیں ہٹا سکتی یعنی رفیق سندیلوی کی شاعری PROVOCATIVE تو ہے لیکن REPELLENT نہیں ہے یوں تو وہ آزاد نظمیں بھی لکھتے ہیں لیکن ان کے تخلیقی اظہار کا خاص وسیلہ اردو شاعری کی سب سے پرانی صنف غزل ہے جو شاعروں کو اپنی روایات سے انحراف نہیں کرنے دیتی لیکن رفیق کی شاعری ان کے پہلے مجموعے سے لے کر تیسرے مجموعے تک کسی بھی صفحے پر نہ روایتی معلوم ہوتی ہے نہ رواجی۔ اس میں نہ تو غزل کے مانوس الفاظ و تراکیب ملتی ہیں نہ علامات و استعارات نہ مضامین و موضوعات نہ زندگی و اشیا کی طرف جانے پہچانے رویے اور روش۔ غزل کہنا اور غزل کے اثرات سے اس حد تک اپنے آپ کو بچا لینا ہر شاعر کو میسر نہیں آتا۔ اس جدوجہد میں تو عمر کا خاصا حصہ گزر جاتا ہے۔ بڑی ریاضت کے بعد

خوش نصیب شعرا اپنی انفرادیت تک پہنچتے ہیں۔ انفرادیت کی یہ دولت رفیق سندیلوی کو شروع سے حاصل رہی ہے۔ ان کے شعری ادراک اور اس ادراک کے انفرادی اظہار یعنی اظہار کے ذاتی وسائل ان کی شاعری میں شروع سے دیکھے جا سکتے ہیں۔ شعر و ادب میں کسی کا منفرد ہونا یقیناً بڑا امتیاز ہے لیکن اگر یہ امتیاز اُن عناصر سے خالی ہے۔ جو اُسے دلکش اور دیرپا بناتے ہیں تو پھر اس امتیاز کو اہمیت دینا بیکار ہے۔ نصیر دہلوی اور ناسخ لکھنوی کے منفرد ہونے سے کون انکار کر سکتا ہے لیکن ان کی شاعرانہ انفرادیت کے باوجود کیا ان کی شاعری جاندار شاعری کہلا سکتی ہے؟ یہ تو ممکن ہے کہ بے جان انفرادیت سو پچاس سال تک اپنا لوہا منوا لے لیکن شاعری کے سچے قارئین شاعری کے جھوٹے جادو کے زیر اثر ہمیشہ نہیں رہ سکتے۔ البتہ اس بات کا فیصلہ دو ایک دن میں نہیں ہو پاتا کہ سچی شاعری کون سی ہے اور جھوٹی شاعری کون سی۔ یہی وجہ ہے کہ شاعری پر بھی یگانہ کا یہ شعر صادق آتا ہے۔ جو انھوں نے زندگی کے بارے میں کہا ہے:

آف ری مشیت! پھولے تو لاکھوں — پھلتے نہ دیکھے سارے کے سارے

اپنے موجودہ دور کے شاعر سلیم کوثر نے بھی یہ بات کچھ اس طرح کہی ہے کہ کسی فن کی آگ میں صرف جل جانا کمال نہیں بلکہ کیمیا بن جانا کمال ہے۔ مجھے نہیں معلوم کہ رفیق سندیلوی کو ابھی کیمیا بننے میں کتنی دیر ہے لیکن ان کا کیمیا بن جانا ممکن نظر آتا ہے۔

رفیق سندیلوی کو دور حاضر کے ANGRY POETS میں شمار کرنا غلط نہ ہوگا۔ وہ ماضی سے لاتعلق، حال سے بیزار اور مستقبل سے خائف معلوم ہوتے ہیں۔ ان کے ہاں ماضی میں کوئی ایسی دلکشی نہیں جو ان کے لئے ناسٹلجیا بن جائے۔ ویسے ان کے ہاں ماضی کا تھوڑا بہت احترام ضرور ہے۔ اس احترام کے بغیر وہ یہ شعر نہیں کہہ سکتے تھے:

مٹتی ہوئی تہذیب سے نفرت نہ کیا کر — چوپال پہ بوڑھوں کی کہانی بھی سنا کر

اس شعر کے باوجود ان کے ہاں یادِ ماضی بالکل نہیں ہے۔ ان کے ہاں حال کا تصور اور تصویریں اس طرح کی ہیں:

وہ قحطِ ضیا ہے کہ مرے شہر کے کچھ لوگ — جگنو کو لئے پھرتے ہیں مٹھی میں دبا کر

وہ دہشتیں ہیں مسلط کہ شب کا ذکر ہی کیا — میں دن کے وقت بھی گھر سے نکل نہیں سکتا

چمن پہ جو بھی تھے نافذ اصول اس کے تھے — تمام کانٹے ہمارے تھے، پھول اس کے تھے

علم دشمن ہے زمیندار مرے گاؤں کا — مدرسہ کوئی بھی قائم نہیں ہونے دیتا

پیامِ امن پہ کرنا مذاکرے لیکن — فصیلِ شہر پہ افواجِ جنگ جو رکھنا

ظاہر ہے کہ جس دور کے خد و خال یہ ہوں اس دور سے محبت کیا ہو گی۔ جب حالات دلوں میں اس طرح کی تمنا پیدا کرنے لگیں کہ:

سمادھی ہی لگا لوں اب کہیں ویران قبروں پر — یہ دنیا ترک کر دوں اور سب کچھ چھوڑ کر دیکھوں

تو آدمی مستقبل کی طرف سے بھی کوئی امید نہیں رکھتا چنانچہ "سبز آنکھوں میں تیر" کی شاعری میں رجائیت نام کی کوئی چیز نہیں ملتی۔ یہ تلخ و ترش حقائق کی شاعری ہے اور ہمارے عہد کی بدصورتی کا عکس پیش کرتی ہے۔

پروفیسر نظیر صدیقی

جمالیات اور ادب

مصنفہ: ڈاکٹر ثریا حسین
قیمت: ۱۵ روپے
ناشر: ایجوکیشنل بک ہاؤس۔ مسلم یونیورسٹی مارکیٹ علی گڑھ (بھارت)

جمالیات قوانینِ حُسن کا، اور ادبی جمالیات ادب کے قوانین حسن کا علم ہے۔ ادبی جمالیات، ادبی تنقید کے ساتھ ساتھ فلسفے کا ایک شعبہ بھی ہے لہٰذا اس موضوع پر لکھنے والے کے لیے ادب اور فلسفہ دونوں کا مطالعہ لازمی قرار پاتا ہے۔ ڈاکٹر ثریا حسین فلسفہ اور اس کے ساتھ ادب خصوصاً مغربی ادبی تنقید کا وسیع مطالعہ رکھتی ہیں۔ انھوں نے "جمالیات اور ادب" میں اپنے اس وسیع مطالعے کے حاصلات کو اپنے تنقیدی اندازِ نظر کے ساتھ مختصراً پیش کیا ہے ——— ایک سو چار صفحات کی یہ کتاب چار ابواب اور ایک ضمیمے پر مشتمل ہے۔

پہلے باب بعنوان "مغرب میں جمالیات" میں افلاطون سے لے کر بیسویں صدی عیسوی میں مارس ویٹز تک قدیم و جدید مفکروں اور نقادوں کے جمالیاتی تصورات و نظریات سے مختصر تعارف کرایا گیا ہے۔

دوسرے باب بعنوان "ہندوستانی جمالیات" میں دوسری صدی قبل مسیح کے بھارت نامی مفکر سے لے کر ٹیگور تک ہندو مفکرین کے نظریات و تصورات متعارف کرائے گئے ہیں۔ یہ مختصر تعارف ہندوستانی جمالیات کے مزید مطالعے کا خاص طور پر راہنما ہے۔ مگر پاکستانی قارئین کو شاید ہی سہولت سے متعلقہ مواد میسر آ سکے۔

"فارسی میں جمالیات" کے زیرِ عنوان تیسرے باب میں عربی و اسلامی اثرات کا ذکر کرتے ہوئے عمر خیام، سعدی، حافظ، قاآنی اور نیمایوشیج کی شاعری کے جمالیاتی اوصاف بتائے گئے ہیں۔ جبکہ ان کے اور دوسرے فارسی مفکروں اور نقادوں کے جمالیاتی نظریات سے روشناس کرنے کی ضرورت تھی، یوں یہ باب، کتاب کے موضوع سے مطابقت نہیں رکھتا۔

چوتھا باب "اردو میں جمالیات" کے عنوان سے ہے اور اس میں بھی نیاز فتح پوری، عبدالحلیم شرر اور سجاد انصاری کے فن پر اظہارِ خیال غیر متعلق محسوس ہوتا ہے۔ البتہ الطاف حسین حالی، شبلی نعمانی، مہدی افادی اور سجاد حیدر یلدرم کے جمالیاتی تصورات کی طرف اشارے کیے گئے ہیں۔ اسی باب میں ترقی پسند نظریۂ ادب کی ذیل میں پریم چند اور علی سردار جعفری کے نظریات پر روشنی ڈالی گئی ہے۔ مارکسی یا مارکسی فنی جمالیات کی بنیاد جمالیتی جدلی انعکاس کا نظریہ ہے۔ جمالیتی جدلی انعکاس کے مارکسی نظریے پر اردو میں شاید ہی کچھ لکھا گیا ہو۔ ڈاکٹر ثریا حسین اسی حوالے سے مارکسی ترقی پسندوں کے ادبی جمالیاتی نظریات کا تعارف کرانے کی اہلیت رکھتی ہیں پھر بھی انھوں نے مارکس، اینگلز، پلیخانوف، لینن، گورکی، لیکاش اور سٹیفن موراوسکی کے علاوہ اردو میں علی سردار جعفری کے جمالیاتی نظریات کے تعارف میں اس طرف نہ جانے کیوں توجہ نہیں کی

چوتھے باب ہی کا سب سے جاندار اور مفصل حصہ جدیدیت کے فنی نظریے کے بارے میں ہے۔ انھوں نے جدیدیت کو بجا طور پر ایک کثیر میلانی مظہر کی حیثیت میں شناخت کیا ہے ——— اس حصے میں جدیدیت سے متعلق پاکستانی اور بھارتی نقادوں کے نظریات زیرِ بحث لائے گئے ہیں۔

"مغرب میں علامیت" کے نام سے ایک ضمیمہ بھی شاملِ کتاب ہے۔ اور مختصر ہونے کے باوجود کارآمد معلومات کا حامل ہے۔
میاں محمد شریف کے جمالیاتی نظریے کا ذکر "حرفِ اول" اور پہلے باب میں آ گیا ہے مگر ان کے علاوہ اقبال، مجنوں گورکھپوری، سید علی عباس جلالپوری، قاضی عبدالستار، ممتاز حسین اور شکیل الرحمٰن جیسے متعدد بلند مرتبہ مفکر اہلِ قلم کے ادبی جمالیاتی نظریات

سے روشناس نہیں کرایا گیا۔ ایسا شاید مواد کی کمیابی اختصار پسندی کے باعث ہوا ہے۔ بہر حال جمالیات اور ادب، مجموعی طور پر ادبی جمالیات کے موضوع پر مطالعے اور اس پر لکھنے کی ترغیب دینے والی کتاب ہے ____ اور خود مصنف کے علم اور ذوق کے پیش نظر ان سے یہ مطالبہ کرنا جائز ہوگا کہ وہ اردو کے مفکر اہل قلم کے جمالیاتی نظریات، اور اردو ادب کی مخصوص جمالیاتی اقدار پر زیادہ تفصیل کے ساتھ لکھیں۔

یوسف حسن

تنقیدی ابعاد

مصنف: ڈاکٹر مظفر حنفی
قیمت: ۷۰ روپے
تقسیم کار: ماڈرن پبلشنگ ہاؤس۔ ۹ گولہ مارکٹ۔ دریا گنج نئی دہلی ۲ (بھارت)

ڈاکٹر مظفر حنفی (پیدائش ۱۹۳۶ء۔ آبائی صوبہ اتر پردیش) بھارت کے ایک معروف جدید اردو شاعر اور نقاد و محقق ہیں۔ "تنقیدی ابعاد" ان کے تنقیدی مقالات و مضامین کا تیسرا مجموعہ ہے۔ ان کے اپنے کہنے کے مطابق زیادہ تر مقالات و مضامین مختلف سیمیناروں اور رسائل کے خاص نمبروں کے لیے لکھے گئے۔ ان مقالات و مضامین کی تعداد سولہ ہے۔ ان کے علاوہ انہیں مختصر دیباچے بھی اس مجموعے میں شامل ہیں جن میں سے ایک افسانوی مجموعے پر، ایک طنزیہ و مزاحیہ خاکوں کے مجموعے پر، ایک ناول پر اور باقی شعری مجموعوں کے لیے تحریر کیے گئے۔ مقالات و مضامین میں بھی ان کے غالب موضوعات شعر اور شاعری سے متعلق ہیں۔ انھوں نے مجموعی طور پر آزادی کے بعد کے بھارتی اردو شعر و ادب کو موضوع بنایا ہے۔ اور ادوار بندی یوں کی ہے۔

(۱) آزادی (۱۹۴۷ء) سے ۱۹۵۸ء تک ___ (۲) ۱۹۵۸/۶۲ء سے ۱۹۷۰ء تک ___ (۳) ۱۹۷۱ء سے ۱۹۸۷ء تک گویا بھارتی اردو ادب کی یہ ادوار بندی پاکستانی ادب کی ادوار بندی کے مماثل ہے۔

ڈاکٹر مظفر حنفی ایک حقیقت پسند نقاد ہیں اور ادب کے لیے فنی حسن و جمال اور ابلاغ پر ان کا اصرار بالکل جائز ہے۔ انھوں نے اپنی تحریروں میں جدیدیت اور ترقی پسندی دونوں پر تنقید کی ہے لیکن ان کی یہ تنقید روایت پرستی کے نقطۂ نظر سے نہیں ہے۔ وہ جدیدیت، ترقی پسندی اور روایت پن (TRADITIONALITY) کے باہمی امتزاج کے فکری و فنی رویوں اور منظر کو سراہتے ہیں گو وہ اس نفی و اثبات کے لیے کوئی فلسفیانہ بنیاد و جواز فراہم نہیں کرتے۔ اس کے باوجود ان کی تحریریں متعدد قابل قبول نکات اور مفید معلومات کی حامل ہیں۔

شعر اور شاعری سے متعلق ان کے مقالات و مضامین میں سے رفعت سروش کی غزل، منور رانا ___ مغربی بنگال کے شعری مزاج کا ترجمان، مغربی بنگال کا شعری مزاج اور رام کی عظمت اور اردو شاعری اعلیٰ معیار رکھتے ہیں۔ منور رانا کی غزلوں کے منتخب اشعار پر تنویر سپرا (پاکستان) کی شاعری کے ساتھ اس کا موضوعاتی اشتراک سامنے آتا ہے۔ البتہ منور رانا کا شعری مزاج تنویر سپرا کی نسبت دھیما ہے۔ دونوں کے کچھ اشعار دیکھیے:

فرہاد کا تو مسئلہ شیریں وصال تھا	کھودوں گا رزق کے لیے میں کوہ سخت کو	تنویر سپرا
ہیں کہ فرہاد نہیں باپ ہوں اک بیٹے کا	صرف روزی کے لیے کوہ کنی آجائے	منور رانا

بارش کو دشمنی تھی فقط میری ذات سے	جوں ہی مرا مکان گرا ابر چھٹ گئے	تنویر سپرا
مرے گھر کے در و دیوار کی حالت نہیں دیکھی	برستے بادلو تم نے بھی میری چھت نہیں دیکھی	منور رانا

میں اپنے بچپنے میں چھو نہ پایا جن کھلونوں کو	انھی کے واسطے اب میرا بچہ بھی مچلتا ہے	تنویر سپرا
کھلونوں کے لیے بچے ابھی تک جاگتے ہوں گے	مجھے اے مفلسی کوئی بہانہ ڈھونڈ لینا ہے	منور رانا

احمد ندیم قاسمی لکھتے ہیں کہ:

"تنویر سپرا اردو کا شاید پہلا غزل گو ہے جس کے اشعار میں ماؤں، بہنوں اور بیٹیوں کا ذکر بار بار آیا ہے۔"

(دیباچہ "لفظ کھردرے" از تنویر سپرا، اشاعت اول ۱۹۸۰ء ص ۱۲)

ڈاکٹر مظفر حنفی نے منور رانا کے متعلق بھی بتایا ہے کہ:

"ان کے اکثر اشعار میں بہن کی محبت، ماں کی ممتا، پدرانہ شفقت اور بچوں کی معصومیت کو شاعری کی زبان مل گئی ہے۔"

(تنقیدی ابعاد ص ۸۴)

"تنقیدی ابعاد" میں "شعرائے سیفیہ" دکھنڈوہ میں شعر و ادب کے پچاس سال تحقیقی اعتبار سے قابلِ قدر مضامین ہیں۔ اور تحقیقی لحاظ ہی سے "آزادی کے بعد ہندوستان میں اردو کے ادبی و علمی رسائل" اور "اردو میں بچوں کا ادب" بھی اہم ہیں۔

شعری مجموعوں کے دیباچوں کی خاص اہمیت یہ ہے کہ ان کے ذریعے ہمیں ۱۹۷۰ء کے بعد نمایاں ہونے والی نئی نسل کے متعدد بھارتی اردو شاعروں سے تعارف حاصل ہوتا ہے۔ نیز پتا چلتا ہے کہ بھارت میں بھی اس عشرے میں ابھرنے والی نسل نے جدیدیت سے انحراف کی راہ اپنائی ـــــ ان نئے شاعروں میں سے خالد محمود اور شاہد میر کا مزید کلام پڑھنے کی نسبتاً زیادہ طلب ہوتی ہے۔

نثر نگاروں میں سے خواجہ حسن نظامی کے اسلوب اور طنز و مزاح پر مضمون عمدہ ہے "تنقیدی ابعاد" مجموعی طور پر مفید معلومات بخشنے اور مثبت و متوازن فکری و فنی رویوں کو تقویت دینے والی کتاب ہے۔ یوسف حسن

فرہنگِ اصطلاحات بینکاری

مترجم: محمد احمد سبزواری   قیمت: دو سو روپے

ناشر: انجمن ترقی اردو پاکستان، کراچی

قومی سطح پر اردو کا نفاذ یا قومی اداروں میں اردو کو دفتری زبان کے طور پر رائج کرنا کسی صورت بھی ناممکن نہیں ہے۔ اس سلسلے میں ہر دور میں ہر سطح پر کام ہوتا رہا ہے مگر ہر بار بے حسی کے سرد خانے کی نذر ہوتا رہا ہے۔ اسلام آباد میں "مقتدرہ" کے نام سے ایک ادارہ تشکیل دیا گیا جس کے ذمہ یہی کام تھا، مگر بات بنتی نظر نہیں آتی۔

جہاں تک بینکاری کا تعلق ہے، ابتدا میں اسے تجارت کا ایک حصہ تصور کیا جاتا رہا اور اس سلسلے میں چند اصطلاحات اردو میں کہیں نہ کہیں موجود ہیں۔ بینکاری پر اردو میں پہلی کتاب جناب محمد احمد سبزواری نے تحریر کی جو فرہنگ اصطلاحات بینکاری کے مترجم بھی ہیں۔ قیامِ پاکستان کے بعد بینک دولت پاکستان کے پہلے گورنر جناب زاہد حسین مرحوم کی ذاتی کاوشوں کے سبب بینکاری کی اردو اصطلاحات کی تشکیلات کے کام کا آغاز ہوا تو اس کی ذمہ داری بھی جناب محمد احمد سبزواری کے کاندھوں پر آن پڑی اور انھوں نے بابائے اردو کی نگرانی میں اسے مکمل کیا۔

"فرہنگ اصطلاحات بینکاری" درحقیقت محمد احمد سبزواری کی اس پہلی کتاب ہی کی توسیع ہے، جو ۱۹۵۱ء میں شائع ہوئی۔ اس کتاب میں تقریباً گیارہ ہزار مروجہ انگریزی اصطلاحات کا اردو ترجمہ پیش کیا گیا ہے جو مترجم کی عرق ریزی، شبانہ روز محنت اور اردو زبان کے ساتھ ان کی محبت کا منہ بولتا ثبوت ہے لیکن اس بات کا کیا ثبوت ہے کہ محمد احمد سبزواری کی یہ پُرخلوص کوشش ثمرآور بھی ہوگی۔

اردو سے محبت کرنے والے ہر دور میں موجود رہے ہیں لیکن جب تک حکومتی سطح پر کوئی ٹھوس قدم نہیں اٹھایا جاتا ہمارے قومی اداروں میں ہماری قومی زبان کا دفتری زبان کے طور پر رواج پانا ممکن نظر نہیں آتا۔

اس کتاب کی تدوین و تشکیل کے سلسلے میں مترجم کی یہ کوشش رہی ہے کہ بینکاری کے تمام مروجہ مترادفات نہایت آسان زبان میں ترجمہ کیے جائیں اور ایسا درحقیقت نظر بھی آتا ہے۔ کہیں کہیں تو یہ مترادفات انگریزی زبان سے زیادہ وقیع، پُرمعنی، خوبصورت اور عام فہم ہو گئے ہیں اور یہ بات اس امر کی دلیل ہے کہ ہماری قومی زبان کسی دوسری زبان کے مقابلے میں ہرگز غریب نہیں ہے اور دفتری زبان بننے کی پوری پوری اہلیت وصلاحیت رکھتی ہے۔ اس کتاب کی اشاعت پر جہاں انجمن ترقی اردو مبارک باد کی مستحق ہے وہاں جناب محمد احمد سبزواری کا شکریہ ادا کرنا بھی تبصرہ نگار کا فرض ٹھہرتا ہے کہ انھوں نے بینکاری جیسے ثقیل شعبے کو عام فہم زبان سے آشنا کرنے کی سعی جمیلہ کی ہے۔ ساتھ ساتھ جمیل الدین عالی بھی تہنیت کے سزاوار ہیں جنھوں نے دفتری سطح پر اردو زبان کی ترویج، ترقی اور حکومتی دلچسپی کا پورا پس منظر بیان کر دیا ہے۔

بینکاری کی یہ لغت ایک بنیادی دستاویز کے طور پر یاد رکھی جائے گی اور اگر کبھی بینکاری کے شعبہ میں اردو کو دفتری زبان کے طور پر متعارف کرانے کی ضرورت محسوس ہوئی یا اسے جائزہ گردانا گیا تو یہ فرہنگ نہایت اہم دستاویز ثابت ہو گی۔

اشرف جاوید

ستارے ہوا چراغ (غزلیات)

مصنف: انوار الحق

قیمت: دو سو روپے

ناشر: مکتبہ اظہار، فیض آباد، ساہیوال

انوار الحق نئی نسل کے شاعروں سے تعلق رکھتے ہیں۔ ان کا شعری مجموعہ "ستارے ہوا چراغ" غزلیات پر مشتمل ہے۔ ان کی غزلوں میں شعورِ حیات ہے جس کے باعث وہ جذبوں اور احساسات کی عکاسی کرتے ہیں۔ عہدِ حاضر میں ہر لمحہ بدلتے ہوئے حالات انداز اور ارتقائی کیفیت نے اردو شاعری کو نیا مزاج اور نیا لہجہ عطا کیا ہے جس کے باعث اسلوب اور اجتماعی موضوعات کے تجربے ہو رہے ہیں۔ شعور و ادراک نے نئی مشعلیں روشن کی ہیں جن کی روشنی میں زندگی کے نت نئے مسائل کا مطالعہ کیا جا رہا ہے۔ ہر دور اپنے ماضی سے کچھ لے کر آگے بڑھتا ہے لیکن اپنے عصری مسائل پر گہری نظر رکھتا ہے۔ وہ زندگی کے نقوش میں داخلیت کے رنگ اس طرح بھرتا ہے کہ رجائیت اور حقیقت کا رنگ بھرتا ہے۔ انوار الحق نے حیاتی کیفیتوں کے مختلف رنگوں کے مرکب بہت ہی پُرکار تصویریں بنائی ہیں جس کا آہنگ نیا اور منفرد ہے:

کسی نے پایا نہیں آج تک یہ عرصۂ وقت
ہزار سال نہیں اک نفس میں جینا ہے

اتر کے رہنا ہے پل پل سوار ہونے کو
مکاں نہیں ہے میسر تو بس میں جینا ہے

ازل تھا ایک طرف دوسری طرف تھا ابد
دل اس طویل سمندر کو پار کر بھی گیا

لگی ہے آگ بہت دور جنگلوں میں کہیں
مگر اٹھتا ہوا سا دھواں وجود میں ہے

وقت کے تحرک اور تموج کو حال کے آئینے میں دیکھنے کے بعد وہ شکل آتی ہے جو ازلی اور ابدی اندھیروں کے درمیان روشن ہے کائنات کے بیکراں سمندر میں ضم ہو کر بھی ہم لوگ لامحدود سے ہم آہنگ رہتے ہیں۔ بہرحال سفر جاری ہے۔ ازل اور ابد کے درمیان ہم لوگ ان دیکھے راستوں اور گلیوں میں بھٹک کر اپنے وجود کے چراغوں کو بجھتا دیکھ رہے ہیں۔ یخ بستہ زمین اور خزاں رسیدہ

شاعر ہر لمحہ لمحہ بکھری زندگی کو قطرہ قطرہ لمحۂ سیال میں اتار رہے ہیں۔ کاسۂ شب لے کر روشنی کی تلاش میں اپنی ہی آرزوؤں کی راکھ کو اپنے بے جان چہروں پر ملتے رہیں گے کہ یہی ہمارا مقدر ہے۔ مگر یہ سب کچھ تو اپنے اثبات کے لیے ہے۔ جینے کی نفی کون کرے گا۔ لمحات جاں گسل سہی مگر لاشعور کے کسی بھی گوشے میں کہیں نہ کہیں تو وجود کے چراغ روشن ہیں جو ہمارے ہونے کا احساس دلا رہے ہیں اور پھر ہمیں محسوس ہوتا ہے کہ ہمارے الفاظ محرومِ سماعت نہیں ہیں۔ زندگی کا کوئی بھی لمحہ زخمی ہی سہی مگر اس زخم میں بھی ایک لذت ہے۔ جو زندگی سے قربت کا احساس دلاتی ہے۔ آگ کہیں بھی لگے اپنے قریب یا بہت دور مگر اس کا دھواں وجود میں محسوس ہوتا ہے وہ آگ زندگی نے لگائی ہو یا پھر زندگی کے زخموں کی کسک کے باعث تپش اور جلن محسوس ہو، پھر بھی دشتِ تمنا کے دریچوں تک پہنچنے کے لیے ہزار سال یا ایک پل، سانس تو لینا ہے کہ سانسوں کے آنے جانے کا نام ہی تو وہ زندگی ہے جس کا ایک پل بھی کبھی کبھی صدیوں پر محیط ہو جاتا ہے:

کرن کرن یہ اجالے قدم قدم یہ سفر
مگر یہ طبق طبق ظلمتیں یہ ہم یہ سفر

افق سے تا بہ افق اور ازل سے تا بہ ابد
یہ کائنات کی پہنائیاں یہ ہم یہ سفر

بدن سے روح کبھی روح سے بدن کی طرف
سفر کی نت نئی صورت سفر میں ضم یہ سفر

تڑپتے رہنا دلِ پاش پاش میں رہنا
بدن کی قید میں اک زندہ لاش میں رہنا

مہیب ابر اٹھا ہے برس رہا ہے جمود
مثالِ آبِ رواں ارتعاش میں رہنا

انوار الحق زندگی کے مثبت پہلوؤں کے ترجمان ہیں۔ وہ فکر اور جذبوں کے شاعر ہیں۔ اُن کی حقیقت پسندی نے عصرِ حاضر کے سارے دکھوں کو اس طرح سمیٹ لیا ہے کہ آہستہ آہستہ آنے والی بہاروں کا احساس ہوتا ہے۔ یہ تو سچ ہے کہ غمِ جاناں سے غمِ دوراں تک ہر طرف دھول اور گرد و غبار نے راستے دھندلے کر دیے ہیں، حال سے مستقبل کی طویل مسافت میں بجھتے ستارے زخمی پھول اور ٹمٹماتے ہوئے چراغ نظر آتے ہیں اور پھر آج کا انسان سوچ رہا ہے کہ وہ کدھر جائے اور کس طرح قدم اٹھائے:

صدیوں میں اس کو کرتا چلا جاؤں گا طویل
ساعت ترے سفر کی اگر ہاتھ آئے گی

تم آؤ گے تو دل میں بڑی مدتوں کے بعد
گزری ہوئی بہار بہ صد ناز آئے گی

وہ زمزموں کا حسنِ تسلسل وہ زندگی
آواز آ رہی ہے بہر ساز آئے گی

طلسمِ صوت اور سحرِ آہنگ کے باعث شاعر نے جو روشنی کی لکیریں بکھیر دی ہیں وہ طویل عرصہ تک زمان و مکاں پہ روشن رہیں گی اور اس طرح زندگی کے خدوخال واضح نظر آتے رہیں گے جو کہ صحیح معنوں میں تخلیقی روشنیوں کی نمائندگی ہے۔ یوں ہمیں وجود سفر کا احساس ہوتا ہے۔ جو دراصل وجودِ ذات کا احساس ہے۔ ماضی سے حال اور حال سے مستقبل تک صبا رفتار وقت کے گھوڑے پر سوار ہم سب لامحدود سے ہم آہنگ ہو رہے ہیں:

پلٹ پڑے ہیں ہمیں سے نگر میں آئے ہیں
نئی بہار کے منظر سحر میں آئے ہیں

کبھی رواں تھا اُدھر اور کبھی اِدھر بھی گیا
مخاطب اک تری آواز تھی جدھر بھی گیا

اڑان ریت کے ذروں کی آسماں کے لیے
یہ کیمیا یہ بقا رفتِ رائگاں کے لیے

یہ زندگی یہ پرندے یہ رنگ یہ رت یہ پھول
رواں یہ قافلے اک شہرِ بے نشاں کے لیے

انوار الحق کے اشعار میں اظہار کی سچائی ہے جس کے باعث روحانی بالیدگی کا احساس ہوتا ہے۔ زندگی کی معصوم سچائیوں اور مشاہدوں نے ان کی غزلوں کو زندگی بخش بنا دیا ہے۔ ان غزلوں میں جرأتِ اظہار اور فکر و نظر کی روشنی بھی ہے۔

انوار الحق حیات و کائنات کے اسرار و رموز تک پہنچنے کے لئے اضطراب کے دائرے توڑتے ہوئے آگے بڑھتے رہتے ہیں۔ کبھی کبھی تو وہ خود اپنے ہی وجود سے ہم کلام ہوتے ہیں اور کبھی درونِ ذات زندگی کی داخلی صداقت کو تلاش کرتے ہیں:

دل خالی سا ہے ہم تنہا تھا یا ہو ۔۔۔ تم کہیں ہو نہ کہیں ہم تنہا تھا یا ہو
اس فنا خانہ دنیا میں یہاں شہر بہ شہر ۔۔۔ اک یہ ہنگامہ ہم ہم تنہا تھا یا ہو

عشرت رومانی

عکسِ بے خیال (افسانے)

مصنف: رشید امجد — قیمت: ۶۰ روپے

ناشر: دستاویز مطبوعات، کوٹھی رتن چند (رتن باغ) میو ہسپتال لاہور

"عکسِ بے خیال" رشید امجد کے افسانوں کا چھٹا مجموعہ ہے۔ سب سے پہلے اس مجموعے کے افسانے رشید امجد کے افسانوں کے کلیات "وشتِ نظر سے آگے" میں "شعلہ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد" کے نام سے شائع ہوئے۔ بعد ازاں عکسِ بے خیال کے نام سے علیحدہ کتابی شکل میں ہمارے سامنے ہیں۔ ان افسانوں کی کل تعداد تیرہ ہے۔ یہ افسانے ۱۹۸۸ء سے ۱۹۹۰ء کے درمیانی عرصہ میں تخلیق ہوئے۔

۱۹۸۸ء سے پاکستان کی سیاسی تاریخ میں ایک نئے دور کا آغاز ہوتا ہے۔ جمہوریت کا سلسلہ جو ۱۹۷۷ء میں منقطع ہوا تھا اس سال بحال ہوا۔ گیارہ سالہ آمریت کے اس دور نے پاکستانی معاشرے اور اداروں کو جس طرح بے کردار کیا اس کے اثرات ۱۹۸۸ء میں بحال ہونے والی جمہوریت کے چہرے پر بآسانی دیکھے جا سکتے ہیں۔ ۱۹۸۸ء تا ۱۹۹۰ء کا یہ دور اپنے معروضی تناظر میں کوئی ISOLATED دور نہیں۔ سیاسی اور سماجی منظر نامے کے چہرے پر پڑا ہوا آمریت کا بظاہر خوشنما پردہ اٹھا تو اندر سے برسوں کا رکا ہوا تعفن جذامی صورت میں ظاہر ہوا۔ جمہوریت کا یہ کنول اس تعفن زدہ کیچڑ میں بڑی دیکھ بھال کا متقاضی تھا لیکن منظر نامے سے ہٹ جانے کے باوجود بھی آمریت کے تاریک سائے نظام سے رخصت نہ ہوئے اور یوں ملکی بساط پر جو اکھاڑ پچھاڑ مچی وہ رشید امجد کے افسانوں کا موضوع بنتی ہے۔ "ایک نسل کا تماشا"، "دل زندہ ہے"، "دل دریا"، "تسلسل"، "ایک گمنام سیاح کی ڈائری کے چند اوراق"، "بے خوشبو عکس"، "بے کسی پرواز"، وغیرہ۔ اس موضوع کے افسانوں کی کئی سطحیں ہیں۔ دستورِ زباں بندی کا عام ہونا، اپنی نظریاتی وابستگی سے ہم آہنگ نہ رہ سکنے کا دکھ اور آخری بدتر صورت پستی کے سفر میں لطف لینے کا عمل۔

"جواب اگر کسی کے پاس ہے تو وہ بولتا نہیں بس امڈتی اندھیری رات کے سامنے سر تسلیم خم کرنے کی رفتار گھٹی ہی بڑھی ہے تو پھر ایسی صورت میں چند لمحوں کے لئے سر اٹھا بھی لیا تو کیا اور نہ اٹھا تو کیا۔"

(ایک نسل کا تماشا)

"پنجروں میں چوری کی کھاتے طوطے خوشی سے ٹیں ٹیں کرتے ہیں۔ پروں کو پھیلاتے اور پھڑپھڑاتے ہیں...... ہم کوئی قید تو نہیں، ہمارے پر سلامت ہیں اور یہ پنجرہ......"

(دل زندہ ہے)

"یہاں کا یہ عجیب دستور دیکھا کہ محسنوں کو دار پر لٹکاتے ہیں اور غداروں کی برسیاں مناتے ہیں...... یہاں سارا کام فتووں پر چلتا ہے۔"

"یہ خود ہی اپنے خلاف سازشیں کرتے ہیں اور خود ہی شور مچاتے ہیں۔ خود ہی تماشا گر، خود ہی تماشا اور خود ہی تماشائی......"

(ایک سیاح کی ڈائری کے چند اوراق)

معروضی صورتِ حال کی پیچیدگی نے فرد کی نفسیات میں لاابالی پن اور پھکڑپن اور غیر سنجیدگی کو جنم دیا۔ اس حالت نے انھیں

تماشا، تماشا گر اور تماشائی بنا ڈالا۔ لیکن ماحول کا غیر فطری پن بہت سی نفسیاتی الجھنوں کا باعث بنا۔ غیر یقینی صورت حال نے خود اپنی ذات کا تماشا دیکھتے دیکھتے اُن کے اندر خوف، غصے نے جنم لیا۔ اور رفتہ رفتہ رواداری اور بھائی چارے کا عنصر معاشرے سے مفقود ہو گیا اپنی اقدار کو چھوڑ دینے کے سبب اجنبیت کے دیو نے انھیں اپنے شکنجے میں جکڑ لیا۔ "بے خوشبو گھر" "ایک سیاح کی ڈائری سے چند اوراق" "عکس بے خیال" "منظر سے باہر خوشبو"

رشید امجد کا قلم نشتر زنی کرنے کی بجائے معروضی اور موضوعی صورت حال کا عکس ہمارے سامنے اس سبک خرامی سے چھوڑ جاتا ہے کہ ایک مستقل ٹیس مدتوں ہمیں اپنے آپ سے شرمسار رکھتی ہے۔

"عکس بے خیال" کے افسانے جہاں ہمیں سیاسی اور سماجی حالات کا چہرہ دکھاتے ہیں وہیں کچھ ایسے افسانے بھی ہیں جن میں رشید امجد کی ذاتی زندگی سے وابستہ دکھوں کی جھلک بھی بڑی واضح نظر آتی ہے۔ رشید امجد کی زندگی کا سارا منظرنامہ ان چند افسانوں سے واضح ہو جاتا ہے۔ نچلے درمیانے طبقے سے تعلق رکھنے والے ایک شخص کی کہانی ہمارے سامنے آتی ہے جس نے محنت اور حوصلے کے بل بوتے پر اپنے طبقے اور سماجی حیثیت میں بہتری پیدا کر لی ہے اور معاشرتی طور پر بہت کچھ حاصل کر لینے کے بعد ذہنی اور جذباتی محرومیاں ساتھ ساتھ چلتی دکھائی دیتی ہیں اس نوع کے افسانوں میں ایک موضوع اپنے ORIGIN سے کٹنے کا دکھ ہے۔

رشید امجد کے ہاں جذباتی سطح پر ایک بڑا دکھ محبت سے محرومی کا ہے نچلے درمیانے طبقے سے تعلق کے باعث تشکیل پانے والی نفسیات کی کارفرمائی اس نوع کے افسانوں میں نظر آتی ہے۔ رشید امجد کا کردار معاشرتی سطح پر ایک آسودگی تو ضرور حاصل کر لیتا ہے لیکن آسودگی کے اس مقام سے پیشتر اپنے طبقے کی مرتب شدہ نفسیات کے زیر اثر ان کے ہاں اظہارِ محبت اور قبولِ محبت سے گریز کا رجحان جگہ جگہ دکھائی دیتا ہے۔ نارسائی کا یہ پرانا کرب آسودگی کے زمانے میں عود کر آتا ہے۔ محبت سے محرومی کا یہ دکھ ایک مستقل عارضے کی صورت اختیار کر لیتا ہے۔ "سفر جس سے واپسی نہ ہوئی"، "ایک کہانی اپنے لئے" "ہوا کے پیچھے پیچھے"، "شعلۂ عشق سیہ پوش ہوا میرے بعد"

"اُس کی آنکھیں بھیگی ہوئی تھیں۔ یہ بھیگی آنکھیں ہی تو میرا سرمایہ ہیں۔ میں اس سرمائے کو برسوں سے سنبھالے پھر رہا ہوں۔ اس لمحے سے جب میری عمر سات سال تھی۔" (ایک کہانی اپنے لئے)

"عکس بے خیال" کے افسانے نہ صرف یہ کہ رشید امجد کے فکر اور حساس ذہن کے عکاس ہیں بلکہ اُن کی فنی پختگی اور مخصوص اسلوب کے مظہر بھی ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں کی بُنت کی خصوصیت ان کا مخصوص شعری ڈکشن اور طرزِ احساس ہے جس کے باعث یہ افسانے اپنی علیحدہ اور منفرد پہچان قائم کرتے ہیں۔ رشید امجد کے افسانوں کی علامتیں اُن کے اپنے ماحول اور ذہن سے جنم لیتی ہیں۔ رشید امجد کے افسانے بنیادی طور پر غیر کرداری افسانے ہیں جو بالعموم خود کلامی کے انداز میں لکھے گئے ہیں۔ میں اور وہ کے علاوہ ایک تیسرا مخصوص کردار درویش یا داستان گو کا ہے۔ یہ کردار بھی دراصل رشید امجد ہی کا کردار ہے۔ اس کردار کے پردے میں بہت سے سخن ہائے ناگفتنی کو گفتہ بنانے میں رشید امجد نے کمال مہارت کا ثبوت دیا ہے اور بہت سی نازک گفتگوئیں جو براہ راست کی جاتیں تو محض صحافتی بیان بازی بن کر رہ جاتیں، درویش یا مرشد یا داستان گو کی زبان سے ایک صوفیانہ پیچ کے طور پر ہمارے سامنے آتی ہیں اور رشید امجد کی یہی خوبی انھیں ایک اہم افسانہ نگار بناتی ہے۔

داؤد رضوان

کاغذ کی فصیل (افسانے)

مصنف: رشید امجد قیمت: ۶۰ روپے ناشر: دستاویز مطبوعات۔ کوٹھی رتن چند (رتن باغ) ہسپتال روڈ لاہور

"کاغذ کی فصیل" رشید امجد کا ۱۹۶۰ء تا ۱۹۶۴ء تک لکھے گئے افسانوں کا مجموعہ ہے۔ زیر نظر افسانے زمانی اعتبار سے رشید امجد کے پہلے افسانوی مجموعے "بیزار آدم کے بیٹے" (سن اشاعت ۱۹۷۴ء) سے پہلے کے ہیں۔ "کاغذ کی فصیل" کے افسانے مختلف ادبی جرائد میں اُسی دور میں

شائع ہو چکے ہیں. تاہم کتابی شکل میں سب سے پہلے یہ افسانے رشید امجد کے افسانوں کے کلیات "دشتِ نظر سے آگے" میں شامل کئے گئے بعد ازاں علیحدہ کتابی شکل میں یہ مجموعہ دستاویز مطبوعات نے جون ۱۹۹۳ء میں شائع کیا۔

ان افسانوں کا مجموعے کی صورت میں ۱۹۶۶ء کے لگ بھگ یعنی اپنی زمانی ترتیب میں شائع نہ کرنا شاید افسانہ نگاری افسانے کی اُس تحریک سے وابستگی ہے جو ۱۹۶۶ء، ۱۹۶۷ء کے لگ بھگ علامتی افسانہ نگاری کی تحریک کے طور پر نمودار ہوئی "بیزار آدم کے بیٹے" شائع کر کے اپنے آغاز سے ہی جدید افسانہ نگاروں کی صفِ اول میں اپنی پہچان قائم کرنے میں کامیاب ہوئے۔ ۱۹۸۰ء کی دہائی میں جب افسانے نے دوبارہ کہانی پن کی جانب سفر شروع کیا تو بہت سے نئے اور پرانے افسانہ نگاروں کے ہاں تبدیلی کا رجحان دکھائی دینے لگا۔ آٹھ دس برس کے عرصے میں جبکہ افسانے میں کہانی پن کا احیا بھی ہو چکا ہے اور رشید امجد کی پہچان کا سفر بھی اپنے معتبر مقام پر پہنچ چکا ہے، "کاغذ کی فصیل" کی اشاعت سے شاید رشید امجد کا منشا محض ریکارڈ کی درستی ہے۔

اس مجموعے میں کل دس افسانے شامل ہیں۔ ان افسانوں کے مطالعے سے ایک فوری تاثر اس زمانے کی سماجی اور معاشرتی صورت حال کے بارے میں ابھرتا ہے۔ رشید امجد نے آج سے تقریباً تیس سال قبل کے پاکستان کی پنجابی و پوٹھوہاری معاشرت کی خوبصورت تصویر کاری کی ہے۔ ان افسانوں میں وہ دور اپنی تمام تر سادگیوں اور منافقتوں سمیت سانس لیتا ہوا محسوس ہوتا ہے۔ ابتدائی دور کے ان بیانیہ افسانوں میں مصنف نے سماجی، معاشی مسائل میں اُلجھے ہوئے لوگوں کی نفسیاتی الجھنوں کو فنکارانہ انداز میں پیش کیا ہے۔ "مکھن کا بال" اور "آدھے دائروں کا نوحہ" ایسے افسانے ہیں جن میں جھوٹی انا اور ناک کا مسئلہ ایک مجموعی معاشرتی رویے کے طور پر سامنے آتا ہے۔ یہ مسئلے فرد کے نہیں بلکہ معاشرے کے محسوس ہوتے ہیں کہ فرد چاہنے کے باوجود بھی ان سے کنارہ نہیں کر سکتا اور معاشرتی جبر کا شکار ہو کر اپنے آپ کو مسائل کی دلدل میں اُلجھاتا چلا جاتا ہے۔ "کاغذ کی فصیل" اور "سائے کا سفر" ایسے افسانے ہیں جن میں معاشرتی تحفظ حاصل کرنے کے لئے جو چار دیواری کھڑی کی گئی ہے وہ "ریت کی دیوار" یا "کاغذ کی فصیل" ہی ہے۔ جو معاشرتی جبر کا شکار لوگوں کو محض ایک حد تک کھوکھلا احساسِ تحفظ تو فراہم کر سکتی ہے لیکن حقیقی تحفظ نہیں۔ "دہلیز کا دکھ" اور "آوازوں کا بھنور" میں چھوٹے چھوٹے مکانوں میں زیادہ تعداد میں رہنے والوں مکینوں اور مشترکہ خاندانی نظام کے باعث پیدا ہونے والے تضادات اور مسائل ہیں۔ ان افسانوں میں شادی شدہ لوگوں کو اپنے فطری تعلقات قائم رکھنے کے لئے مناسب سہولیات میسر نہ ہونے کے سبب پیدا ہونے والے المیوں اور اُس گھر میں بسنے والے غیر شادی شدہ لوگوں کے مسائل بڑے جاندار اور خوبصورت انداز میں پیش کئے گئے ہیں۔

جس زمانے میں رشید امجد کے یہ افسانے تخلیق ہوئے جدید علامتی اور تجریدی افسانے کا تقریباً آغاز ہو چکا تھا۔ لیکن ان کے ہاں ابھی تک کلاسیکی بیانیہ افسانہ نگاری کے اثرات غالب تھے۔ تاہم جدیدیت خصوصاً فرائیڈین اثرات "کاغذ کی فصیل" کے افسانوں میں دیکھے جا سکتے ہیں۔ جبکہ اس مجموعے کا آخری افسانہ رشید امجد کے افسانوں کے دونوں ادوار علامتی اور بیانیہ کے درمیان ایک پل کی حیثیت رکھتا ہے۔ جدید علامتی افسانہ نگاری "کاغذ کی فصیل" میں کہیں کہیں جھلک ضرور دکھاتی ہے لیکن آخری افسانہ میں رشید امجد کی آئندہ کی طرز افسانہ نگاری کے دھندلے دھندلے نقوش دکھائی دیتے ہیں۔

یہ افسانے اپنے انداز کے لحاظ سے رشید امجد کے دورِ اول کو یقیناً ظاہر کرتے لیکن زبان و بیان میں ایسی کوئی خامی نہیں جسے ابتدائی دور کی ناپختگی کہا جا سکے۔

داؤد رضوان